GNK
پریم ناتھ پردیسی کے افسانے
(ریاست کے پہلے افسانہ نگار کے مطبوعہ وغیر مطبوعہ افسانوں کا خزینہ)
مدون ومرتب
ڈاکٹر محمد افضل میر

پریم ناتھ پردیسی کے افسانے

(ریاست کے پہلے افسانہ نگار کی مطبوعہ وغیر مطبوعہ افسانوں کا خزینہ)

مدون ومرتب

ڈاکٹر محمد افضل میر

جی۔این۔کے۔پبلی کیشنز

PREM NATH PARDESHI KA AFSANA
by
DR MOHD AFZAL MIR

Year of 1st Edition 2020
ISBN 978-93-84717-62-8
Price Rs. 650/-

نام کتاب : پریم ناتھ پردیسی کے افسانے
(ریاست کے پہلے افسانہ نگار کے مطبوعہ وغیر مطبوعہ افسانوں کا خزینہ)
مصنف وناشر : ڈاکٹر محمد افضل میر
طبع اوّل : 2020
قیمت : 650/-
صفحات : 584
تعداد : 500
مطبع : براڑسنز، پنجاب

GNK PUBLICATIONS
Head Office : Near Old Bus Stand, Kumar Mohalla
Charari Sharief, Budgam - 191112 (J&K)
E-mail : gnkpublications@gmail.com
Mobile : 01951-295207, 7006738304

انتساب......

میری زوجہ محترمہ

مُنیرہ بانو کے نام

جن کی ذات میں بہت سی یادوں کے

حسین چراغ روشن ہیں۔

فہرست

............☆☆☆............

پیش لفظ

پریم ناتھ پردیسی جموں وکشمیر کے افسانوی ادب میں نہ صرف ایک پہل کار بلکہ ایک میر کارواں کی حیثیت رکھتے ہیں۔یہی وجہ ہے کہ انھیں جموں وکشمیر کا 'پریم چند' بھی کہا جاتا ہے۔ان کا سماجی وسیاسی شعور اتنا بالغ اور پختہ تھا کہ کشمیری معاشرے کا کوئی بھی مسئلہ ان کی نظر سے اُوجھل نہیں تھا۔خوش قسمتی سے جس دور میں وہ لکھتے رہے اس وقت جموں وکشمیر میں مذہبی رواداری اور یکجہتی کا ماحول تھا، ہندو، مسلمان اور سکھ مل جُل کر شخصی راج کے خلاف کمر بستہ ہوتے تھے اور آزادی کے لیے عمل پیرا تھے۔ پردیسی کی تحریروں نے عام رعایا کے فکر وخیال کو مہمیز کیا۔وہ خود بھی آزادی کی تحریک میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیتے رہے۔پریم ناتھ پردیسی افسانہ نگاری، شاعری، صحافت، رپورتاژ اور ڈرامہ نگاری سے جڑے رہے لیکن افسانہ نگاری ان کا پہلا عشق تھا اور انھوں نے آخری دم تک اس کا ساتھ نبھایا۔ان کی مقبولیت کا یہ عالم تھا کہ ان کے افسانوں کے پہلے اور دوسرے مجموعے کا پیش لفظ بالترتیب بابائے اردو عبدالحق اور راجندر سنگھ بیدی نے رقم کیا تھا تاہم مجھے یہ کہنے میں کوئی تامّل نہیں کہ جموں وکشمیر کے ادیبوں کے ساتھ اردو ناقدوں نے ہمیشہ سوتیلا رویہ اپنایا اور ان کی کوششوں کو نظر انداز کیا۔اس تغافل میں جموں وکشمیر کے معروف نقاد بھی شامل ہیں۔

یہ بات اظہر من الشّمس ہے کہ جموں وکشمیر میں اردو ادب کا سفر ہندوستان

کے دیگر اردو مراکز کے شانہ بہ شانہ چلتا رہا اور افسانہ نگاری کا چلن بھی بیسویں صدی کے اوائل میں شروع ہوا۔ البتہ اس کی ابتدا کے بارے میں مختلف محققوں نے الگ الگ نتائج برآمد کیے۔ ایسا ممکن ہے کہ پردیسی سے قبل بھی کچھ قلم کاروں کی تحریروں میں افسانوں کا شائبہ نظر آتا ہو مگر سچ تو یہی ہے کہ افسانے کے جو مروّج پیمانے ہیں ان کے حساب سے پریم ناتھ پردیسی ہی پہلے ادیب تھے جنھوں نے افسانے قلم بند کیے۔ اسی زمانے میں جموں و کشمیر میں کئی اخبارات کا اجرا ہوا جن میں مقامی افسانہ نگاروں کی تحریریں شامل ہوئیں اور اس طرح نئے لکھاریوں کی حوصلہ افزائی ہوتی رہی۔ دوسری جانب کچھ ادبی محفلیں بھی قائم کی گئیں جنھوں نے ان قلم کاروں کے لیے فورم مہیا کرلیا۔

مجھے یہ جان کر بے حد خوشی ہو رہی ہے کہ ڈاکٹر محمد افضل علیم، جس نے پریم ناتھ پردیسی پر ایک دقیقہ رس تحقیقی مقالہ قلمبند کیا ہے اور ڈاکٹریٹ کی ڈگری بھی حاصل کی ہے، نے پردیسی کی کلیات بہ عنوان 'پریم ناتھ پردیسی کے افسانے' تدوین و ترتیب دی ہے جو جلد ہی منظر عام پر آنے والی ہے۔ ڈاکٹر میر کا مذکورہ مقالہ پہلے ہی کتابی صورت میں بہ عنوان 'پریم ناتھ پردیسی -عکس در عکس' شائع ہو چکا ہے۔ مقالے تو خیر یونیورسٹیوں میں بے شمار لکھے جاتے ہیں مگر ڈاکٹر محمد افضل میر علیم نے اس مقالے کو لکھنے اور اس کے لیے مواد اکٹھا کرنے میں جس جانفشانی اور باریک بینی سے کام کیا ہے وہ تعریف کے قابل ہے۔ اس مقالے کے مطالعے سے یہ واضح ہوتا ہے کہ مقالہ نگار نے پردیسی کی شخصیت اور اس کے مختلف ادبی کارناموں پر تفصیل سے روشنی ڈالی ہے۔ 'پریم ناتھ پردیسی کے افسانے' میں ڈاکٹر محمد افضل میر علیم نے حتی المقدور کوشش کی ہے کہ وہ پریم ناتھ پردیسی کے تمام شائع شدہ افسانوں کو اس میں شامل کرلے۔ اس لیے انھوں نے کئی لائبریریوں کو کھنگالا اور کئی اخباروں کے پرانے

ایڈیشنوں کی ورق گردانی کی۔ دراصل پردیسی اور جموں وکشمیر کے دیگر اہم ادیبوں کی کتابیں عام طور پر کہیں دستیاب نہیں ہیں اور کسی ادارے نے ان کتابوں کے نئے ایڈیشن شائع کرنے کی کبھی کوشش نہیں کی۔ اس پر شومیٔ قسمت یہ کہ وادی میں کچھ برس پہلے زبردست سیلاب آیا جس نے اہم لائبریریوں کے گنجینۂ کتب کو تباہ کر دیا۔ اس لیے ضرورت اس بات کی ہے کہ ماضی میں لکھے گئے سنجیدہ ادب کو محفوظ کر لیا جائے اور اس کو ازسرِ نو شائع کیا جائے تا کہ آئندہ آنے والی نسلیں ان سے فیض یاب ہو سکیں۔ میں سمجھتا ہوں کہ ڈاکٹر میر کی یہ کوشش اس سمت میں اہم سنگ میل کا کام کرے گی۔

'پریم ناتھ پردیسی کے افسانے' میں مشمولات کی تفصیل یوں ہے:

(۱) افسانوں کا پہلا مجموعہ 'شام وسحر' (مطبوعہ ۱۹۴۱ء)

(۲) افسانوں کا دوسرا مجموعہ 'دنیا ہماری' (مطبوعہ ۱۹۵۱ء)

(۳) افسانوں کا تیسرا مجموعہ 'بہتے چراغ' (مطبوعہ ۱۹۵۵ء)

مذکورہ مجموعوں میں شامل افسانوں کی کل تعداد اُنچاس (۴۹) ہے۔ اس کے علاوہ ڈاکٹر محمد افضل نے اکیس (۲۱) ایسے افسانے ڈھونڈ نکالے ہیں جو اخباروں میں تو شائع ہوئے ہیں مگر کسی مجموعے میں شامل اشاعت نہیں ہیں۔ مصنف نے ان کی اشاعتی تفصیل بھی درج کی ہے۔ مزید اس نے ڈاکٹر برج پریمی کا حوالہ دیتے ہوئے لکھا ہے کہ انھوں نے باون (۵۲) ایسے افسانوں کی نشاندہی کی ہے جو بڑی تگ ودو کے بعد بھی حاصل نہ ہو سکے۔ پھر بھی میں سمجھتا ہوں کہ جو کچھ بھی ملا اور اس کلیات میں شامل کیا گیا ہے، وہ غنیمت ہے اور آنے والی پیڑھیوں کے لیے کارآمد ہوگا۔

اتنا تو طے ہے کہ پریم ناتھ پردیسی سوشلزم کے حامی تھے اور ترقی پسند تحریک سے جڑے رہے مگر نہ انھوں نے مارکسی نظریے کو اپنایا اور نہ ہی دوسرے ترقی پسند افسانہ نگاروں کی طرح اس کو پروپیگنڈا کا آلہ بنایا۔ فتح کدل، سرینگر میں ۱۹۰۹ء

کو جنھیں پردیسی کا اصلی نام پریم ناتھ سادھو تھا اور انھوں نے 'پردیسی' قلمی نام اختیار کیا تھا، حالانکہ شاعری میں 'رونق' تخلص کرتے تھے۔ ادب انھوں نے وراثت میں پایا تھا۔ والد کی بے وقت موت کے باعث پردیسی نے میٹرک کے فوراً بعد تعلیم ترک کی اور پھر محکمہ کسٹمز وا یکسائز میں ملازم ہو گئے جس کے سبب انھیں جموں وکشمیر کے دور دراز علاقوں کا دورہ کرنا پڑتا تھا۔ اس طرح ان کو زمینی حالات کا صحیح تجربہ حاصل ہوا جو ان کے اکثر افسانوں میں جھلکتا ہے۔ آزادی کے بعد وہ ریڈیو کشمیر سے منسلک ہوئے اور ریڈیائی ڈرامے لکھنے لگے۔ ۱۹۵۵ء میں انھوں نے اس دار فانی سے کوچ کر لیا۔

پریم ناتھ پردیسی غریب اور پسماندہ لوگوں کی زندگی کی عکاسی کرنے میں کامیاب رہے۔ انھوں نے وادی کے کسانوں، ملاحوں اور دیگر دست کاروں کی حالت زار کو بڑے ہی دلسوز انداز میں پیش کیا۔ اتنا ہی نہیں، چنانچہ وہ خود کشمیری پنڈت تھے اس لیے اپنے فرقے میں مروّج بُرے رسوم ورواج پر کھل کر لکھتے تھے اور چاہتے تھے کہ سماج ان بُری رسموں کو ترک کر دے۔ ان کے افسانوں میں ہمیشہ مقصدیت کارفرما رہتی تھی۔ انھوں نے وادی کی زمینی حقیقت کو جس طرح سے منعکس کیا اس طرح ملک کے بڑے سے بڑے افسانہ نگار بھی نہ کر سکے حالانکہ موخر الذکر افسانہ نگار خود کو کشمیری ظاہر کرتے تھے اور یہاں کے حسن وشباب کے گرویدہ نظر آتے تھے۔ ان کے لیے تو کشمیر کا حسن ادبی بازار میں بکنے والی ایک شئے تھی اور وہ اس کا بھرپور استعمال کرتے رہے۔ وہ غریب کشمیریوں کے جسم پر لگی ضربیں نہیں دیکھ پاتے تھے اور نہ ہی ان کے روح کے زخموں سے آشنا تھے۔ اس کے برعکس پریم ناتھ پردیسی پہلے ایسے افسانہ نگار تھے جن کو غریب کشمیریوں کی مصیبتوں اور بدنصیبوں کا احساس تھا اور وہ ڈنکے کی چوٹ پر اپنے افسانوں میں اس کا اظہار کرتے تھے۔ ان کے افسانوں میں فکر وخیال کی میچورٹی، مشاہدے کی گہرائی، انسانی نفسیات کی گرفت اور سماجی وسیاسی

شعور کا پرتو ملتا ہے۔موضوعات کا تنوع، دل کو چھونے والی منظر نگاری اور کردار نگاری ایسی کہ لگتا ہے وہ ہماری ہی بات کر رہے ہیں۔ان کے طرز انداز میں بھی انفراد ہے۔یہاں پر مختلف افسانوں کے تھیم اور ٹریٹمنٹ پر روشنی ڈالنے کا نہ موقع ہے اور نہ محل کیونکہ محمد افضل میرؔ نے ان افسانوں کو پیش کرنے سے پہلے اہم افسانوں پر روشنی ڈالی ہے جو افسانوں کو سمجھنے میں مددگار ہوگی۔صرف اتنا کہنا ضروری ہے کہ پردیسیؔ کے ہر افسانے میں کشمیر کا دل دھڑکتا ہے اور ہر لفظ غریب کشمیری کی آہ و فغاں بن کر سامنے آتا ہے۔'ان کوٹ'، 'دیوتا کہاں ہیں؟' اور 'بہتے چراغ' ان کے شاہکار افسانے ہیں جو برصغیر کے افسانوں کے اولین صف میں رکھے جانے کے قابل ہیں۔

آخر میں میں ڈاکٹر محمد افضل میرؔ کو مبارک باد پیش کرتا ہوں کہ ان کی کئی برسوں کی محنت رنگ لائی ہے۔یہ کتاب نہ صرف قارئین کی دلچسپی کا سبب بن سکتی ہے بلکہ ایک حوالہ جاتی کتاب کی حیثیت بھی رکھتی ہے۔مجھے امید ہے کہ اس کتاب کی اردو حلقوں میں کافی پذیرائی ہوگی اور خاص طور سے لائبریریوں کی زینت بن جائے گی۔

۷ نومبر ۲۰۲۰ء

دیپک بُدکی

اے-۱۰۲، ایس جی امپریشن، سیکٹر ۴-بی
غازی آباد-۲۰۱۰۱۲

☆☆☆

مقدمہ

پریم ناتھ پردیسی کی افسانوی زندگی کا آغاز اگرچہ ۱۹۳۲ء میں ہوا۔ لیکن ۱۹۳۶ء کے بعد ان کے افسانوں میں پختگی پیدا ہوئی۔ پردیسی کے پہلے افسانوی مجموعہ کا نام ''شام وسحر'' ہے جس کو ۱۹۴۱ء میں پردیسی نے خود شائع کیا۔ یہ ریاست جموں وکشمیر میں افسانے کے فنی تقاضوں پر اترنے والا پہلا افسانوی مجموعہ ہے۔ جس کو ادبی حلقوں میں کافی سراہا گیا۔ یہ افسانوی مجموعہ دین محمد پریس لاہور میں ملک محمد عارف کے اہتمام سے چھپا اور غلام محمد، نور محمد، جو کشمیر کے اس وقت کے بہت بڑے تاجرانِ کتب تھے، اپنی انتھک کوشش سے اردو اور کشمیری ادب میں گراں قدر اضافہ کر کے بہت بڑی خدمات انجام دیں۔

''شام وسحر'' کا مقدمہ ڈاکٹر عبدالحق نے لکھا تھا۔ اس افسانوی مجموعے کے مقدمہ میں وہ لکھتے ہیں:

> ''مجھے پنڈت پریم ناتھ پردیسی نے اپنی چند کہانیاں پڑھنے کو دیں جنہیں پڑھ کر مجھے بہت خوشی ہوئی۔ انہیں چھوٹے افسانے لکھنے کا بہت اچھا سلیقہ ہے۔ ان میں تخیل بھی ہے اور مشاہدے کی قوت بھی۔ ایک بڑی خوبی یہ ہے کہ ان افسانوں میں مقامی رنگ بھی پایا جاتا ہے۔ پریم ناتھ پردیسی کو اپنے ملک کے

غریبوں کے ساتھ بہت ہمدردی ہے اور انہوں نے بعض کہانیوں میں ان کی تکلیفوں اور ان کے دردِ دل کی کیفیت کو بڑی خوبی سے دکھایا ہے۔ انہیں اپنے خیالات کے اظہار پر قدرت حاصل ہے ان کی زبان سادہ و دلپذیر ہے"[1]

اس افسانوی مجموعے میں کل تیرہ افسانے ہیں، جن میں بیشتر افسانے تو مختلف رسالوں اور جرائد میں پہلے ہی چھپ چکے تھے۔ اس مجموعے کے حرفِ آخر میں پردیسی نے "شام وسحر" کے شائع کرنے کے مقصد کو بھی بیان کر دیا ہے:

"مدت سے میرے مہربان اور قدردان دوست اس امر کے لیے اصرار فرما رہے تھے کہ میں اپنے افسانوں کو کتابی صورت میں شائع کروں۔ چنانچہ "شام وسحر" کو اگر انہیں کے پیہم تقاضوں کا نتیجہ کہا جائے تو بے جا نہ ہوگا"[2]

ریاست کے مشہور محقق برج پریمی "شام وسحر" کے بارے میں لکھتے ہیں:

"پردیسی کے پہلے افسانوی مجموعے "شام وسحر" کی بیشتر کہانیاں "مارتنڈ" میں شائع ہوئیں۔ اکثر کہانیاں اسی پُراسرار دنیا کے ایسے ہی پُراسرار لوگوں کی کہانیاں ہیں "راجو کی ڈولی" "پارسل" "ماں کا پیار" "سنتوش" "سلاخوں کے پیچھے" "حسین پیمبر" "سچا دوست" "سندھیا کا شراب" اسی تخیل کے افسانے ہیں ان افسانوں کے موضوعات اور پس منظر سے قطع نظر یہ بات پھر بھی تسلیم کرنا ہوگی کہ ان افسانوں میں انسانی نفسیات کی باریکیوں کو کس حد تک سمجھانے کی کوشش کی گئی ہے"[3]

افسانوی مجموعہ "شام وسحر" میں شامل افسانے یوں ہیں۔

(۱) راجو کی ڈولی (۲) ماں کا احسان (۳) پارسل (۴) چونی (۵) میرا بوڑھا دوست (۶) اپنا سب کچھ (۷) انسان ساز (۸) بچوں کا ختنہ (۹) اُجرت (۱۰) چور (۱۱) طوفان (۱۲) پنچایت کا فیصلہ (۱۳) فرشتہ رحمت۔

اس افسانوی مجموعے میں مختصر افسانوں کے ساتھ ساتھ کچھ طویل افسانے بھی شامل ہیں۔ مختصر افسانوں میں ماں کا احسان، میرا بوڑھا دوست، چونی، انسان ساز، طوفان اور پنچایت کا فیصلہ، جبکہ طویل افسانوں میں راجو کی ڈولی، پارسل، اپنا سب کچھ، بچوں کا ختنہ، اجرت، اور فرشتہ رحمت شامل ہیں۔

''شام وسحر'' کے بعض افسانوں کا مطالعہ

راجو کی ڈولی:۔

راجو کی ڈولی ''شام وسحر'' کا پہلا افسانہ ہے۔ افسانہ ''راجو کی ڈولی'' سات حصوں پر مشتمل طویل افسانہ ہے۔ 'کہانی 'راجو'' کے گرد گھومتی ہے جو بچپن میں یتیم ہوئی اور بعد میں اپنے دادا رمضان جُو کے پاس رہا کرتی تھی۔ رمضان جو پیشے سے حجام تھا لیکن اس کے ساتھ ساتھ وہ تھوڑی سی حکمت بھی جانتا تھا۔ رمضان جو کی حکمت کے سامنے بڑے بڑے ڈاکٹر ہتھیار ڈال دیتے تھے۔ کیونکہ جو بیمار رمضان جو کے پاس آتا تھا، وہ رمضان جو کے ہاتھ لگانے سے ٹھیک ہو جاتا تھا۔ لوگ اس کو دانتوں کی بیماری کا مسیحا سمجھتے تھے۔ ایک دن کسی بیمار کا دانت کیا نکالا کہ اسکی اندر کی نس پھٹ گئی اور منہ سے خون کے چشمے پھوٹ پڑے، مریض بیہوش ہوا اور اس کو اسپتال لے جایا گیا لیکن مریض کے رشتہ داروں نے ایک تو رمضان جو کی خوب پیٹائی کی اور ساتھ ہی پولس تھانے میں رپورٹ بھی درج کروائی۔ اسی دن شام کو پولس نے رمضان جو کو

تھانے پہنچایا۔ معاملہ عدالت تک جا پہنچا جہاں پر رمضان جو کو غیر قانونی حکمت کرنے کی پاداش میں تین مہینے کی سزا ہوئی۔ جس سے گھر کا پورا ماحول بری طرح متاثر ہوا۔ اب گھر میں رمضان جو کی بیوی، بیوہ بہو اور اس کی بیٹی ''راجو'' بالکل تنہا رہ گئیں۔ اب ہونا کیا تھا مہینے بھر کے بعد ہی راجو اپنی ماں کے ساتھ ننہیال چلی گئی اور گھر میں صرف اس کی بیوی رہ گئی۔ کل تک رمضان جو ''راجو'' کے بغیر ایک پل بھی نہیں رہ پاتا تھا لیکن اب وہی راجو گھر چھوڑ کر چلی گئی تھی۔ کورٹ کے فیصلے کے دن گھر سے نکلتے وقت راجو نے اپنے دادا کو ڈولی لانے کے لیے بہت عاجزی کی تھی اور دادا نے لانے کا وعدہ بھی کیا تھا............

''راستے میں جدھر سے ہتھکڑی پہنے ہوئے رمضان کو لیا گیا، کھلونوں کی دکانیں تھیں۔ رمضان کو یاد آ گیا۔ ''لالہ آج مٹی کی ڈولی لانا'' ایک بار اس نے کانسٹبل سے کہا............ ''مجھے ڈولی لینے دو راجو انتظار کر رہی ہوگی'' کانسٹبل ہنس پڑا بولا............ ''احمق۔ جا رہا ہے جیل کو اور شوق ہے ڈولی کا۔ رمضان کی روح رونے لگی۔ سر نیچے کیے ہوئے وہ چلا گیا''[۴]

رمضان جو کو تھانے سے سیدھے جیل بھیج دیا گیا۔ اسے ڈولی کا ارمان ہمیشہ کانٹے کی طرح چبھنے لگا۔ لیکن رمضان جو کے ہاتھ میں کچھ بھی نہیں تھا کہ وہ راجو کی ڈولی خرید سکتا۔ تین مہینے کے بعد اس نے گھر کا ماحول پوری طرح بدلا ہوا پایا۔ اسی طرح کئی سال گزر گئے، رمضان جو کی بیوی بھی انتقال کر گئی۔ اب رمضان جو اپنا زیادہ تر وقت پاس کی مسجد میں ہی گزارتا تھا، لیکن بارہ سال کے بعد جب رمضان جو نے راجو کی شادی کے بارے میں سنا، تو وہ اپنی پوری زندگی کی پونجی جمع لے کر راجو کی ماں کے پاس پہنچ گیا اور اس طرح اس کے من کا بوجھ ہلکا ہو گیا۔

افسانے میں پردیسی نے خون کے رشتے کو بڑے ہی فنکارانہ انداز میں پیش کیا۔ساتھ ہی افسانے میں پردیسی نے پورے گاؤں کے ماحول کی عکاسی بھی کی ہیں۔رمضان جو سماج کا ستایا ہوا ایک شخص دکھایا گیا۔افسانہ میں کردار نگاری کی بنت کاری بڑی فنکاری سے کی گئی ہے جس سے افسانہ اتنا موثر بن گیا ہے کہ یہ قاری پر اپنی گہری چھاپ ڈالتا ہے۔افسانے کا اسلوب نہایت سادہ اور عام فہم ہے۔

مختصراً افسانہ میں مصیبت زدہ انسانوں کی داستانِ غم کی نقاب کشائی کی گئی ہے اور کہیں کہیں پر شاعرانہ اسلوب بھی برتا گیا ہے۔

ماں کا احسان:

''ماں کا احسان'' پریم ناتھ پردیسی کا ایک دلچسپ افسانہ ہے۔اس مختصر افسانے کو پردیسی نے تین حصوں میں تقسیم کیا ہے۔اس دلچسپ افسانے سے ہر انسان کے اندر ماں کی عزت اور حرمت بڑھ جاتی ہے۔افسانے میں امرتی کے کردار سے ماں کا پیار اور بے شمار احسانات کو ظاہر کیا گیا ہے کہ ماں اپنے اولاد کے لیے کن کن مراحل سے گزرتی ہے۔

افسانے میں امرتی نام کی عورت کی شادی ایک غریب موچی سے ہوتی ہے ،لیکن شادی کے بہت سالوں تک امرتی کے ہاں کوئی بچہ نہیں ہوتا ہے۔بہت سالوں کے بعد بھگوان نے امرتی کو نتھو کی شکل میں ایک بیٹا عطا کیا۔اس بچے کے لیے امرتی نے دنیا کے سارے دکھ جھیلے لیکن نتھو کی پرورش میں کوئی کمی نہیں رکھی۔چونکہ بچپن میں ہی نتھو کا باپ انتقال کر گیا اور بہو کے شوق کی وجہ سے امرتی نے نتھو کی شادی بچپن میں ہی انجام دی لیکن بھگوان نے نتھو کے گھر میں اتنے بچے دیے کہ ان کے لیے بعد میں کھانا ملنا بھی مشکل ہو گیا۔اس سب کے باوجود امرتی کو کبھی سکھ کا ایک پل بھی نصیب

نہیں ہوا۔ کیونکہ نھتو جب بیمار ہوا تو ماں نے اپنا قیمتی سرمایہ بھیج کر نھتو کا علاج کروایا لیکن اس کے بعد گھر کا کام کاج نھتو کے بڑے بیٹے جیون کے سر پر آ گیا، جو اپنے آپ کو گھر کا ان داتا سمجھتا تھا۔ جیون کا یہ رویہ دیکھ کر کبھی کبھار نھتو رو دیتا۔ جیون بہت شریر اور بد دماغ قسم کا لڑکا تھا جو ہر وقت غصے میں رہتا تھا۔ اور جو کوئی سامنے سے گزرتا وہ سارا اندلہ اسی پر اتارتا۔ دوسری بات نھتو کی بیوی نے بھی اپنے بچوں کو لاڈ پیار سے بگاڑ دیا تھا۔ سب سے زیادہ امرتی کو سزا دینے میں نھتو کی بیوی ہی آگے رہتی تھی۔ ایک دن جب امرتی بیمار ہوئی تو گھر میں کچھ بھی نہیں تھا۔ تو امرتی نے لاچار ہو کر اپنے گلے کا تعویز جو چاندی کا تھا اپنے بیٹے کے ہاتھ بیچنے کے لیے بھیج دیا لیکن جب تک وہ واپس لوٹا تب تک امرتی کا انتقال ہو چکا تھا اور اس طرح اس نے اپنے بے بس بیٹے کے آنے سے پہلے ہی دم توڑ دیا۔

پردیسی نے افسانے میں غریب گھرانوں کی منظر کشی اس طرح کی ہے کہ تصویر آنکھوں کے سامنے پھر جاتی ہے۔ خاص کر تب جب وہ نھتو کی بیوی کے کردار کو سامنے رکھتا ہے۔ اس افسانے سے انسان کے ہوش اڑ جاتے ہیں۔ اگرچہ افسانے کا اسلوب بہت سادہ اور دلکش ہیں لیکن پلاٹ میں خاص ترتیب کا خیال نہیں رکھا گیا ہے۔ افسانے میں پردیسی نے ماحول کی تصویر کشی بڑے فنکارانہ انداز میں کی ہے۔ آغاز سے اختتام تک افسانے میں دلچسپی قائم رہتی ہے۔ افسانے میں کشمیر کی افلاس زدہ زندگی کی بہترین مثال پیش کی گئی ہے۔

چوَنی:

''چوَنی'' پردیسی کا ایک مختصر لیکن پُر درد افسانہ ہے، جس میں افسانہ نگار نے ممتا اور افلاس کے بیچ معرکہ آرائی دکھائی ہے۔ ''چونی'' افسانہ تین حصوں پر مشتمل

ہے۔جس میں انّا تین معصوم بچوں کی ماں ہے جو پہلے ہی اپنے خاوند کو کھو چکی تھی۔اس افسانے میں انّا معمولی مزدوری کر کے بڑی مشکل سے اپنے تین معصوم بچوں کا پیٹ پالتی ہے۔ایک دن انا کو بڑی مشکل سے مزدوری میں ایک چوّنی حاصل ہوئی تھی جس کو انا نے بڑے بیٹے کے ہاتھ دے کر بازار سے سوداسلف خریدنے کے لیے دیے دی لیکن اس نے چونی کو قبرستان میں کھودیا۔جب چونی کھونے کی خبر انا سنتی ہے تو اس کے اُوپر غم کا پہاڑ ٹوٹ پڑتا ہے۔اس چونی کو کھونے کے بدلے میں وہ اپنے بیٹے جوّاد کو بہت زیادہ پیٹتی ہے اور بار بار جوّاد کولیکر قبرستان کی مٹی کو چھان مارتی ہے لیکن وہاں سے انّا کو کچھ حاصل نہ ہوتا۔اس مار پیٹ سے جواد بہت بیمار پڑ جاتا ہے جو بعد میں انا کی بے انہتا کوششوں کے باوجود صرف چھ دنوں میں انتقال کرتا ہے اور اس طرح انا اپنے شوہر کی دونشانیوں کو کھودیتی ہے جس میں ننھا جواد اور اپنے خاوند کا تحفے میں دیا ہوا چاندی کا تعویذ، جس کو بیچ کر انا نے جواد کے لیے ادویات خریدی تھیں۔

انا اس درد کو عمر بھر چھپاتی رہی۔اگر چہ بعد میں انا اور اس کے معصوم بچوں نے بڑے ہو کر بہت محنت کی اور ان کی مالی حالت میں بہت حد تک سدھار آیا۔لیکن تب تک جواد کے غم نے انا کی آنکھوں کی بصارت چھین لی تھی۔

> ''ایک جمعہ کو سچ مچ اسے قبرستان پر چونی ملی۔جس پر مٹی کی تہہ جم گئی تھی وہ اسے پا کر دیوانی ہوگئی۔اس نے چونی پہچانی یہ وہی تھی جو کچھ عرصہ پہلے جواد سے کھوگئی تھی۔وہ دوڑ کر جواد کی قبر پر گئی اور اپنا منہ قبر سے لگا کر بولی۔جواد چونی مل گئی میرے لعل اب نکلو باہر۔لیکن وہاں کون تھا جو جواب دیتا البتہ اسے محسوس ہوا۔جیسے کسی نے اندر سے لمبی سانس لے لی اور کروٹ بدل کر لیٹ گیا'' ۵

محض ایک مختصر اقتباس کی مثال سے وہ تاثر ذہن کو متاثر نہیں کرتا جو پورے افسانہ کو پڑھنے کے بعد ہوتا ہے جس کو ہم اپنی روزمرہ کی زندگی میں دیکھتے ہیں، لیکن کبھی محسوس نہیں کر سکتے، جس طرح ہم ''چونی'' کو پڑھنے کے بعد محسوس کرتے ہیں۔ اس افسانے میں پردیسی نے ماں کے کردار کو بہت متضاد دکھایا ہے کیونکہ ایک طرف اتنا نے اپنے بیٹے کو ''چونی'' کھودینے پر حد سے زیادہ پیٹا اور دوسری طرف اسی ماں نے جواد کے علاج کے لیے اپنے خاوند کی آخری نشانی اور تحفے کے بطور دیا ہوا چاندی کا تعویذ بھی بھیج دیا۔

افسانے کا پلاٹ بہت سادہ ہے۔اس افسانے میں کسی قسم کا الجھاؤ نہیں ہے۔تخلیق کار نے افسانہ میں چند ہی کرداروں سے اپنا نقطہ نظر واضح کیا ہے ۔افسانے کی دلچسپی کا عالم یہ ہے کہ یہ قاری کو شروع سے آخر تک ہر لفظ متاثر کرتا رہتا ہے۔افسانے میں پردیسی کے گہرے شعور کا اندازہ ہوتا ہے۔

انسان ساز:

''انسان ساز'' پردیسی کا ایک مختصر مگر دلچسپ افسانہ ہے جو چار حصّوں پر مشتمل ہے۔اس افسانے میں مصنف نے صرف دو کرداروں ''حسنیٰ'' اور ''رفیق'' کے ذریعہ زندگی کی ایک تلخ حقیقت کی عکاسی ہے۔افسانے میں ''حسنیٰ'' دنیا کو بدلنے کا ارادہ کرتا ہے۔اچھی سوچ کے باوجود انسانوں کو بدلنے کے لیے حسنیٰ جو راستہ اختیار کرتا ہے وہ انتہائی وحشیانہ ہے۔حسنیٰ شہر کے معصوم اور سیدھے سادے انسانوں کو پہلے اغوا کرتا تھا پھر اپنے مخصوص ٹھکانے پر پہنچا کر ان کا قتل کرتا تھا۔اس غار میں حسنیٰ نے مٹی کے کئی پتلے بنا رکھے تھے جن کو وہ روح دینا چاہتا تھا۔ایک روز وہ اپنا سارا راز ایک دوسرے نوجوان رفیق کو بتاتا ہے جو پہلے اس کے کام میں مدد کرنے کی حامی بھرتا

ہے اور موت کے خوف سے کچھ وقت تک مدد بھی کرتا ہے لیکن آہستہ آہستہ جب وہ غار کے راستوں کے بارے میں سب جان جاتا ہے۔ ایک دن حسنٰی باہر تھے اور رفیق نے غار کو اندر سے بند کردیا۔ اگرچہ حسنٰی نے رفیق کو غار کا پتھر ہٹانے پر بہت مجبور کیا لیکن رفیق نے اس کی ایک نہ سنی اور آخر کار رفیق حسنٰی کو پکڑوانے کے لیے پولس کے پاس چلا جاتا ہے۔

اس افسانے کو پڑھنے کے بعد انسان پہ ایک عجیب کیفیت طاری ہوجاتی ہے۔ موضوع اور اسلوب کے اعتبار سے بھی یہ افسانہ اعلٰی ادب کا نمونہ ہے۔ یہ افسانہ قاری پر شروع سے آخر تک ایک خاص پکڑ رکھتا ہے۔ اس افسانے کی زبان بالکل عام فہم ہے۔ ہر درجے کا انسان اس کو آسانی سے سمجھ سکتا ہے۔ یہی وہ افسانے ہیں جن کی وجہ سے پردیسی کو برصغیر کے افسانوی ادب میں اتنا اونچا مقام عطا ہوا۔ اگرچہ ''انسان ساز'' داستانی طرز کی کہانی ہے۔ اس افسانے میں شروع سے آخر تک تذبذب ہے۔

> ''رفیق نے حیران ہوکر پوچھا اور جب وہ ڈھانچے تیار ہونگے پھر؟'' حسنٰی نے کہا ''ہمارے پاس یہ گڑھا خون سے بھرا ہوگا۔ ان میں مساوی حصوں میں خون ڈال دیا جائیگا'' رفیق نے پوچھا ''اور روح وہ کہاں سے آئے گی'' حسنٰی نے چراغ کی طرف اشارہ کر کے کہا ''اس سے ! اس کی لو سے ! جو انسان بنانے سے پہلے ہی میں نے جلا رکھا ہے!''[۶]

جرم وسزا پر مشتمل یہ افسانہ مجرمانہ ذہن رکھنے والے انسان کی وحشت اور بربریت کے ساتھ نفسیاتی الجھاؤ کو بھی ظاہر کرتا ہے۔ پریم ناتھ پردیسی کا یہ افسانہ اصل میں عبدالحلیم شرر کی ناول ''فردوسِ بریں'' کے طرز پر لکھا گیا ہے ''فردوس بریں'' میں بھی ایک عارضی جنت بنائی گئی تھی جس کے لیے لوگوں سے غلط کام کروائے جاتے

تھے۔

اجرت: (چھ حصوں پر مشتمل)

اُجرت پریم ناتھ پردیسی کا ایک بہت ہی اچھا اور طویل افسانہ ہے جو چھ حصوں پر مبنی ہے۔ افسانے میں صرف تین کردار ہیں۔ خوبصورت رجنی، اس کا بوڑھا اندھا خاوند اور تیسرا ڈاکٹر ہوتا ہے۔ رجنی کی شادی اس اندھے سے ہوئی ہے جو بچپن میں بہت ہی برے اعمال کر چکا تھا اور اپنی ساری عمر ایک بدکار عورت کے ساتھ گزاری تھی۔ سب کچھ لٹ جانے کے بعد اس عورت نے زہریلے شراب سے اس کی بینائی بھی تباہ کر دی تھی۔ ایک دن رجنی اور اس کا اندھا خاوند گھر میں تھے کہ اچانک کسی نے باہر سے رات کو ٹھہرنے کی التجا کی۔ جب رجنی نے دروازے پر دیکھا تو ایک بوڑھا آدمی رات کو ٹھہرنے کے لیے پناہ مانگتا ہے۔ خاوند کی اجازت سے رجنی نے اس بوڑھے کو ٹھہرنے کی اجازت دے دی۔ اندر آ کر اس نے جو دیکھا تو وہ سراپا حیران رہ گیا اور اس نے رازدارانہ لہجے میں خوبصورت رجنی کو کہا کہ وہ ایک ڈاکٹر ہے اور وہ اسکے خاوند کی آنکھیں بھی ٹھیک کر سکتا ہے لیکن وہ بھاری قیمت مانگتا تھا۔ رجنی نے دھرم کا پالن کر کے سب کچھ دینے کا وچن دیا۔ حتیٰ کہ اپنی عزت بھی کیونکہ وہ اپنے سوامی کی آنکھوں کے لیے کچھ بھی قربان کرنے کے لیے تیار تھی جس پر بوڑھے ڈاکٹر نے دوسرے دن آنے کا وعدہ کیا۔ لیکن جب ڈاکٹر گھر پہنچتا ہے تو اس کو پتہ چلتا ہے کہ اس کی اپنی بیٹی کسی کے ساتھ بھاگ گئی ہے جس پر اس کو اپنی غلطی کا احساس ہوتا ہے لیکن وہ وعدے کے مطابق دوسرے دن آتا ہے اور ایک بدلہ ہوا انسان بلکہ ایک باپ اپنی بیٹی کے خاوند کا علاج کرنے والا ڈاکٹر۔ جس پر رجنی اور بوڑھا بہت خوش ہو جاتا ہے اور آخر میں رجنی اس کو اجرت میں وہی پھول واپس کرتی ہے جو اس نے رجنی کو ہوس

بھری نگاہوں کے ساتھ دیا تھا۔

ڈاکٹر نے کہا ''ہاں ایک بار کہدو'' میں نے تمہیں معاف کر دیا۔نہیں تو عمر بھر میرا ضمیر مجھے کوستا رہے گا۔زندگی کی راحت نہیں ملے گی۔ کہدو ایک بار''۔

رجنی آبدیدہ آنکھوں سے اس کی طرف دیکھتی اور آہستہ سے کہتی ہے۔''میں نے معاف کر دیا۔ جاؤ'' اور پھر ڈاکٹر چلا گیا۔!!

افسانے کو پڑھنے کے دوران ایک خاص قسم کی کیفیت قاری پر طاری ہو جاتی ہے۔افسانے میں جذبات نگاری سے بہت کام لیا گیا ہے،موضوع کے اعتبار سے بھی یہ کہانی پوری اترتی ہے۔مختصراً یہ کہانی ہم کو اپنے اعمال درست کرنے کی ترغیب دیتی ہے۔

ترقی پسند ذہن سے رچی ہوئی یہ کہانی، محض عورت کی قربانی یا جذباتیت کی کہانی نہیں ہے بلکہ سماج میں ہو رہی ناانصافیوں کی بھی قلعی کھول دیتی ہے۔

پنچایت کا فیصلہ: (دو حصوں پر مشتمل)

''پنچایت کا فیصلہ'' دیہاتی زندگی کی بہترین عکاسی کرتا ہے۔ پریم چند کی طرز پر لکھا گیا یہ افسانہ بہت ہی مختصر اور متاثر کن ہے۔اسے افسانہ نگار نے دو حصوں میں تقسیم کیا ہے۔اس افسانے میں ٹھاکر دادا کی سال بھر کی کمائی ہوئی کھیتوں کو جے رام اور دوسرے ڈھنگر گھس کر تباہ و برباد کرتے ہیں۔ جب ٹھاکر دادا کو خبر ملتی ہے تو اس کو بہت غصہ آتا ہے اور وہ جے رام کے بیل کو بہت زور سے مارتا ہے جس پر دونوں کے بیچ بہت ہی زبردست جھگڑا ہوتا ہے اور آخر کار معاملہ پنچایت تک پہنچتا ہے، جہاں پر ایک غیر متوقع فیصلے میں سرپنچ یہ فیصلہ سناتا ہے کہ جے رام بیس من مکئی ٹھاکر دادا کو ادا کرے گا اور ٹھاکر دادا اپنا اچھا بیل جے رام کو اس کے زخمی بیل کے بدلے میں دے

گا۔ یہ اس کے بیٹے کے مرنے کے بعد دوسرا موقع تھا جب ٹھاکر دادا اتنا مایوس ہوا۔ ناگوری نام کا یہ بیل اس سے چھینا جارہا تھا جو اس کے گھر والوں کے لئے بہت ہی قیمتی تھا۔ جب ٹھاکر دادا اور اس کے سبھی پوتے رونے لگے تو ٹھاکر کو اپنا بیٹا یاد آیا جو چند سال پہلے اس کو داغِ مفارقت دے کر انتقال کر گیا تھا اور اپنے پیچھے چند بچے چھوڑ گیا تھا۔ لیکن پنچایت کے فیصلے کے سامنے کسی کی نہیں چلی۔ کچھ دنوں کے بعد ٹھاکر دادا اپنے کھیتوں میں کام کر رہا تھا کہ جے رام ناگوری کو اسی راستے سے لے جارہا تھا۔ ٹھاکر دادا کے پوتوں نے ناگوری کو پہچان لیا اور اس کو پکڑنے لگے جس پر پہلے جے رام کو غصہ آیا لیکن بچوں کی ناگوری کے ساتھ ہمدردی کو دیکھ کر اس کا دل بھی نرم پڑ گیا۔ اس نے ناگوری کو بچوں کے حوالے کر دیا اور نتیجتاً معصوم بچوں کی معصوم اداؤں نے پنچایت کے فیصلے کو مسترد کر دیا اور سبھی لوگ خوشی خوشی رہنے لگے۔

افسانے کا پلاٹ ڈھیلا ہے جس سے واقعات کی ترتیب میں تسلسل نہیں رہا ہے۔ افسانے میں نمایاں کرداروں نے وہ سب نہیں کیا جو کام معمولی کرداروں سے سرزد ہوا ہے، خاص کر جے رام کے کردار کو بدلنا بہت ہی غیر فطری نظر آتا ہے۔ افسانہ نگار کا نقطہ نظر یہ ہے کہ دیہات کے چھوٹے چھوٹے مسائل کو اجاگر کیا جائے۔ افسانے میں دیہاتی زندگی کی بہترین عکاسی کی گئی ہے۔ اس میں دو رائیں نہیں کہ افسانہ پریم چند سے متاثر ہو کر لکھا گیا ہے۔

فرشتہ رحمت: (۷ حصوں پر مشتمل)

''فرشتہ رحمت'' پردیسی کا ایک نصیحت آموز افسانہ ہے۔ افسانے میں رحیم بیگ گاؤں میں عام اور سادہ لوح لوگوں پر طرح طرح کے مظالم ڈھاتا تھا۔ اسی وجہ سے رحیم بیگ کی نمبرداری چلتی تھی۔ گاؤں کا ہر فرد رحیم بیگ سے بے حد خوف زدہ تھا

کیونکہ رحیم بیگ اپنی عیاری اور رشوت سے تمام تحصیل اور پولس عملے کو اپنا غلام بنا لیتا تھا۔ ایک دن رحیم بیگ نے تمام کسانوں کو حکم دیا کہ پہلے اس کی کھیتوں میں پانی دینا اور بعد میں اپنی کھیتوں کو سینچنا۔ اس پر ایک کسان غلام محمد نے اعتراض کیا اور رحیم بیگ کے جانے کے بعد اس نے پہلے تمام کسانوں کے کھیتوں میں پانی بھرا اور بعد میں رحیم بیگ کی زمین میں۔ جب رحیم بیگ دوسرے دن کھیت پر پہنچا تو اس کو بہت غصہ آیا۔ جب اس کو اس بات کا علم ہوا کہ اس کی وجہ غلام محمد ہے تو اس نے غلام محمد نامی اس دلیر نوجوان کو بہت پیٹا اور اس کے تمام کھیت کو تباہ و برباد کر دیا۔

لیکن جب لوگوں نے غلام محمد کے اس دلیرانہ قدم کو دیکھا تو ان کی ساری ہمدردیاں غلام محمد کے ساتھ ہوئیں، جس پر غلام محمد نے لوگوں کو نمبردار بدلنے کا مشورہ دیا۔ اگر وہ رحیم بیگ کی غلامی سے آزاد ہونا چاہتے ہیں، جس پر لوگوں نے لبیک کہا اور غلام محمد کو ہمیشہ کے لیے نمبردار منتخب کر کے اپنے گاؤں کو ظلم سے آزاد کرا دیا۔ اس کے بعد غلام محمد نے گاؤں میں ترقی کے بہت سے اقدامات کیئے۔ گاؤں میں اسکول، اسپتال، پُل وغیرہ تعمیر ہو گئے۔ اسی اثنا میں رحیم بیگ نے غلام محمد پر جان لیوا حملہ کیا ،جس میں غلام محمد بال بال بچ گیا۔ پھر بھی غلام محمد نے رحیم بیگ کو معاف کیا اور گاؤں میں رہنے دیا۔

افسانے کے پلاٹ کو بہتر ترتیب سے مرتب کیا گیا ہے اور واقعات کا تسلسل بھی قائم رکھا گیا ہے۔ افسانے میں گاؤں کی ترقی کے لیے لوگوں کو ہوشیار رہنے کی ترغیب دی گئی ہے اور اس کے علاوہ اس افسانے میں پرانے زمانے میں ہو رہے کسانوں پر نمبرداروں کیمظالم کے خلاف اٹھ کھڑا ہونے کی ترغیب بھی دی گئی ہے۔ غلام محمد اور رحیم بیگ سماج کے دو مختلف کرداروں کی عکاسی کرتے ہیں اور لوگ اپنے طاقت یعنی ووٹ کے طاقت سے رحیم بیگ کو غلام محمد میں بدل سکتے ہیں۔ یہ

افسانہ قاری کو شروع سے آخر تک اپنی گرفت میں رکھتا ہے۔
لیکن رحیم بیگ کا اچانک تبدیل ہونا کچھ حد تک عجیب سا نظر آتا ہے اس کے باوجود یہ دیہی زندگی کی بہترین مثال قائم کرتا ہے۔

دنیا ہماری (دوسرا افسانوی مجموعہ):

پریم ناتھ پردیسی کا دوسرا افسانوی مجموعہ ''دنیا ہماری'' ہے۔ اس افسانوی مجموعے میں کل پندرہ افسانے ہیں۔ افسانوی مجموعے کو پردیسی نے جموں کے راج محل پبلیشرز سے شائع کیا تھا۔ اس کا صحیح سنہ اشاعت کا اندازہ لگانا مشکل ہے لیکن عام خیال یہ ہے کہ یہ مجموعہ ۱۹۵۱ میں جموں سے اشاعت پزیر ہوا۔ اس مجموعے میں شائع پندرہ افسانے اس طرح سے ہیں۔
(۱) جنت جہنم (۲) اگلے سال (۳) میرا حق (۴) سہارا (۵) کوا (۶) کاریگر (۷) سکھوں کی واپسی (۸) دنیا ہماری (۹) اصول کی دنیا (۱۰) سائڈ لائن (۱۱) چٹائیں (۱۲) لباس تلے (۱۳) لہروں کا رقص (۱۴) تین زاویے (۱۵) فرار۔
''دنیا ہماری'' کا انتساب پردیسی نے اپنے بچپن کے دوست رامانند ساگر کے نام کیا ہے۔ مجموعے کا پیش لفظ مشہور افسانہ نگار راجندر سنگھ بیدی نے لکھا ہے۔ وہ اپنے اس پیش لفظ میں پردیسی کے بارے میں لکھتے ہیں۔

> ''اس مجموعے کی کہانیاں سادہ ہیں اور اپنی سادگی اور معصومیت کی بنا پر ہمیں ٹالسٹائی کی یاد دلاتی ہے۔ اس میں نہ صرف عنصری عواطف اور نفسِ انسانی کی بنیادی کیفیات کی نقاب کشائی کی گئی ہے۔ بلکہ تفسیر کے ساتھ تنقید کا پہلو بھی نمایاں ہے۔ یہ کہانیاں اسی جذبے کے ساتھ لکھی گئی ہیں۔ ان کہانیوں میں گہرے فلسفے

کا دوراز کار تخیل اور ان دونوں چیزوں سے وابستہ صوفیانہ نکات
کو دیکھنے کی دعوت نہیں دی گئی اور جو کچھ کہا گیا ہے محسوس کر کے
کہا گیا ہے اور برملا کہا گیا ہے۔۔۔ پردیسی نے یہ کہانیاں بہت
ہی سوچ بچار کے عالم میں لکھی ہیں لیکن ان کہانیوں کی پرسکون
سطح کے نیچے ہم ایک ایسا دل دیکھتے ہیں جو انسانیت کے دُکھ
سے تار تار ہے۔۔۔ پردیسی کی کہانیوں کا طرہ امتیاز یہ ہے کہ یہ
کہانیاں ہمیں گوناگوں مصائب کو برداشت کرنا سکھاتی
ہیں'' ۷

''دنیا ہماری'' کے بعض افسانوں کا مطالعہ

اگلے سال:

''اگلے سال'' پریم ناتھ پردیسی کا ایک نمائندہ افسانہ ہے۔ یہ طویل افسانہ ہے جو ۵ حصوں پر مشتمل ہے۔ جس میں کسانون کی خستہ حالی اور مجبوری کا استحصال کرتے ہوئے بیوپاری طبقے کا اصلی چہرہ سامنے لانے کی کوشش کی گئی ہے۔ افسانے میں ابراہیم اور حاجی بدرالدین نام کے دو کردار ہیں جن میں ابراہیم ایک غریب کسان ہوتا ہے اور بدرالدین ایک بہت بڑا بیوپاری ہے۔ اس افسانے میں بدرالدین اپنا کاروبار ابراہیم کے کھیتوں سے شروع کرتا ہے اور صرف پندرہ برسوں میں وہ منشی بدرالدین سے حاجی بدرالدین اور پھر سیٹھ بدرالدین بن جاتا ہے۔ جبکہ ابراہیم خان نہ حاجی بن سکا اور نہ سیٹھ۔

جب ابراہیم خان بدرالدین کو دام بڑھانے کے لیے اصرار کرتا ہے تو حاجی بدرالدین نے یہ کہہ کر انکار کر دیا کہ دام اگلے سال بڑھیں گے اور اس پر ابراہیم خان نے بھی بدرالدین کے دیئے ہوئے پیسے واپس لوٹا دیئے اور بڑی ہمت کر کے کہا ''اس سال سودا بھی نہ ہوگا حضرت! خدا نے چاہا اگلے سال سودا کریں گے'' اور اس طرح اس نے حاجی بدرالدین کو حیرت میں ڈال دیا۔

''اگلے سال'' میں افسانہ نگار نے زمین داروں کے بیچ ہو رہی زیادتیوں کو اجاگر کیا ہے اور وہ اس میں کسی حد تک کامیاب بھی ہوئے ہیں۔ افسانے کا اسلوب بہت ہی متاثر کن ہے اگر چہ اس میں بڑے کردار صرف دو ہی ہے لیکن کمال فن دیکھے کہ پردیسی نے دو کرداروں سے سماج میں دو طبقوں کی ترجمانی کی ہے۔ حاجی بدرالدین ساہوں کاروں اور دلالوں کی ترجمانی کرتا ہے اور ابراہیم خان کسان طبقے کو ظاہر کرتا ہے۔ بیوپاری کے ظلم کو پردیسی اس طرح پیش کرتے ہیں:

> ''پندرہ سال پہلے کرتہ پہننے والا بدرالدین آج حاجی بن کر میرے ساتھ سودا کرنے کے لیے اپنے کارندے بھیجتا ہے اور میں جہاں تھا وہیں ہوں نہ محمد ابراہیم بنا۔ نہ ابراہیم خان! نہ بدن سے میلا کرتہ گیا اور نہ کبھی نئی ٹوپی خریدنے کی توفیق ہوئی۔ اس نے میری محنت سے لاکھوں روپیہ بنائے صرف اس لیے کہ اپنی محنت کی قیمت دنیا سے طلب کرنے کا مجھے شعور نہیں اور بیوپاری میری نا اہلیت سے فائدہ اٹھا کر اپنے لیے دونوں دنیا حسین بنا رہا ہے''۔[8]

افسانے کو پڑھنے سے اس دور کے کسانوں کی بہترین عکاسی ملتی ہے اس افسانے میں پرانے زمانے کے اس طریقے کو بھی ظاہر کیا گیا ہے جس میں ''پیشگی'' رقم

کے سیاق وسباق کو مدنظر رکھتے ہوئے پریم چند کے طرز پر افسانہ لکھا گیا ہے۔

میرا حق:

''میرا حق'' پردیسی کا ایک طویل افسانہ ہے جو ۶ حصوں پر مشتمل ہے۔ یہ ایک بہت اچھا افسانہ ہے۔ افسانے میں شنکر داس اور عبدل کے کرداروں سے نمک حلالی اور احسان مندی کی بہترین مثالیں پیش کی گئی ہے۔ شنکر داس لاہور سے چھاپ خانہ لاتا ہے اور عبدل کو اس میں ملازم رکھتا ہے۔ عبدل، شنکر داس کی ہمسائیگی میں رہنے والا ایک شریف اور ایماندار انسان تھا۔ اگر چہ شنکر داس کو عبدل سے چند امیدیں وابستہ تھیں لیکن عبدل نے شنکر داس کی امیدوں سے کہیں زیادہ محنت سے پریس میں کام کیا، جس کو دیکھ کر شنکر داس کا دل اندر ہی اندر خوش ہو جاتا ہے۔ عبدل کا دن رات اب پریس میں ہی گذرتا تھا۔ حتیٰ کہ پریس کے ویران آنگن کو بھی عبدل نے اپنی محنت سے خوبصورت باغیچے میں تبدیل کیا۔

''شنکر داس فرطِ عقیدت سے اس کے قریب گئے اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر بولے ''تم اتنا کام کیوں کرتے ہو عبدل کیا تم مجھے احسان سے اس قدر دبا رکھو گے کہ دوسری دنیا میں بھی نہ اتار سکوں''۔۹

عبدل پندرہ برس تک پریس میں کام کرتے رہے اب شنکر داس بھی بوڑھا ہو چلا تھا اور اس نے اپنی جگہ اپنے بیٹے گوپی ناتھ کو پریس میں رکھا تھا اور بڑے پنڈت اب زیادہ وقت گھر میں ہی گذارتے تھے۔ عبدل اس بات سے بخوبی واقف تھے کہ جب سے اس نے پریس میں کام کیا۔ اس نے سکھ چین کی روٹی کھائی اور سب سے بڑھ کر ان کے دو بیٹوں کو پریس میں ملازمت بھی فراہم ہوئی۔

لیکن ایک دن عبدل کے ساتھ ایک ناخوشگوار واقعہ پیش آیا۔ یوں ہوا کہ

گوپی ناتھ کے بیٹے نے پریس کے باغیچے سے معصوم پھولوں کے چند پودوں کو اُکھاڑ دیا جن کو عبدل نے بڑی محنت کے بعد بویا تھا۔ اس پر عبدل نے بچے کو ڈانٹ پلائی جب گوپی ناتھ نے بچے کو روتے ہو دیکھا تو اس سے رہا نہ گیا اور اس نے عبدل کو بہت زور کا تھپڑ امارا اور پریس سے بھی نکالا۔ جس سے عبدل کے دل کو بہت ہی ٹھیس پہنچی۔ اس کے ایک سال کے بعد پریس میں نقص پیدا ہوا جس کو ٹھیک کرنے کے لیے چھوٹے پنڈت نے شہر کے تمام کاریگروں کو بلایا۔ عبدل کو اس بات کی خبر ہوئی تو بڑی ہمت کر کے اس نے گھر سے نکل کر پریس کو ٹھیک کر کے نمک حلالی کا ثبوت فراہم کیا اور پریس کو ٹھیک کرنا اپنا حق سمجھا۔ عبدل نے جب پریس کا نقص نکالا تب گوپی ناتھ کو عبدل کی کاریگری کا اندازہ ہوا اور کہا............

”گوپی ناتھ ششدر رہ گیا اس نے کہا ”عبدل تم کتنے بڑے کاریگر ہو“

عبدل نے کہا ”کاریگر نہیں ہوں بندر ہوں بے حیا بندر“

گوپی ناتھ کو باغیچے کا واقعہ یاد آیا اور اس نے زمین کی طرف دیکھ کہا عبدل تم مجھے معاف نہ کرو گے؟“

عبدل نے اس کے شانے پر ہاتھ رکھ کر مسکراتے ہوئے کہا۔

معاف نہ کیا ہوتا تو آج یہاں کیسے آتا۔ یہ سچ ہے کہ تم نے میرا حق چھینا۔ لیکن میں اپنا فرض نہ بھول سکا“۔ [۱۰]

”میرا حق“ پردیسی کے فن کے کمال کو ظاہر کرتا ہے۔ افسانے میں سماج کے بہت سے مسائل کی نشاندہی ہوتی ہے۔ جس میں بے روزگاری بھی ایک بہت بڑا مسئلہ ہے۔ اس کے علاوہ شنکر داس اور عبدل کے کرداروں سے اس دور کے ہندو مسلم اتحاد کو بھی ہمارے سامنے لایا گیا ہے۔ اس افسانے میں ہماری ساری ہمدردیاں عبدل

کے ساتھ ہے جس نے گوپی ناتھ کے بُرے برتاؤ کے باوجود بھی اپنے فرض کو پورا کیا۔ یہ افسانہ شروع سے آخر تک قاری پر اپنی گرفت مضبوط رکھتا ہے۔

سہارا:

''سہارا'' نسوانی ذہنیت کے الجھاؤ پر لکھا ہوا ایک بہترین افسانہ ہے۔ افسانے میں متوسط طبقے کی لڑکی کی ذہنی امنگوں، آرزوؤں اور الجھاؤ کی عکاسی کی گئی ہے۔ نصیرن ایک عام ہندوستانی لڑکی ہے جو شادی کی عمر کو پار کرنے کی وجہ سے ایک عجیب الجھن کا شکار ہو جاتی ہے اور اس دباؤ کے تحت اس کا ذہن روز بروز تبدیل ہوتا رہتا ہے۔ وہ ایک انگریز میم صاحبہ کے بچے کی پروش پر مامور ہوتی ہے۔ ہر روز وہ اس بچے کو باغ میں سیر وتفریح کے لیے لے جاتی ہے، وہاں باغ میں بہت سی کشمیری عورتیں سوکھے پتے جمع کرنے کے لیے روز آیا کرتی تھیں تاکہ سرما کے موسم میں کانگڑیوں میں استعمال کیا جائے۔ باغ میں نصیرن پر ایک خاص کیفیت تب طاری ہو جاتی ہے جب وہ اپنی سے چھوٹی عمر کی لڑکیوں کے بارے میں سنتی ہے کہ ان کے چار چار بچے ہیں۔ یہ سب دیکھ کر نصیرن پر ایک نفسیاتی دباؤ پڑ جاتا ہے۔ ایک دن اسی کیفیت میں وہ جب بنگلے پر پہنچی تو اس نے باورچی خانے میں موجود نوبت خان سے شوربہ مانگا اور نوبت خان نے نصیرن کے چہرے پر اپنا ہاتھ پھیر لیا۔ جس پر نصیرن کو بہت زیادہ غصہ آتا ہے۔ حتیٰ کہ اس کو اپنی عیش پرست زندگی سے وہ کشمیری عورتیں اچھی لگنے لگتی ہیں۔ اسی اثناء میں وہاں سے ایک بھنگی کا گزر ہوتا ہے جو طویل عرصے سے نصیرن سے اپنی بیٹی کے لیے دوپٹہ مانگتا تھا کیونکہ وہ بھنگی بھی اپنی جوان بیٹی کے عزت کے لیے کوشاں تھا۔ اس ساری صورتِ حال سے نصیرن کو اپنے عزت نفس کی بہت فکر لگی رہتی ہے جس سے اس کے ذہنی دباؤ میں اضافہ ہوتا ہے۔

افسانے میں نصیرن کی نفسیاتی کیفیت کے ساتھ ساتھ کشمیری عورتوں کی کسمپرسی کی بھی عکاسی کی گئی ہے۔ افسانے میں ایک مرد کے سوا سارے کردار عورتوں کے ہیں۔ اس میں عورتوں کے چار روپ ہمارے سامنے آتے ہیں۔ ایک روپ میں عورت میم صاحبہ ہوتی ہے، دوسرے میں نصیرن، تیسرے میں کشمیری عورتیں اور چوتھے میں بھنگی کی بیٹی کا روپ ہے۔ ہر عورت کا رہن سہن ایک دوسرے سے مختلف ہے۔ اس کے علاوہ اس افسانے میں مرد کے وحشیانہ پن کی بھی ایک جھلک دکھائی دیتی ہے۔ افسانے میں late Marraige کے اثرات پر بھی روشنی پڑتی ہے اور انگریزوں کی شاہانہ زندگی کے علاوہ کشمیری عوام کی بدحالی بھی سامنے آتی ہے۔ یہ کہانی پردیسی کی ادبی کاوشوں میں ممتاز حیثیت رکھتی ہے۔

کاریگر:

''کاریگر'' پریم ناتھ پردیسی کا ایک مختصر اور شاہکار افسانہ ہے۔ افسانے کے ذریعے مصنف نے سماج کے تین اہم طبقات کی نشاندہی کی ہے۔ ان طبقات کے طریقے کار اور روزمرہ کو اپنے افسانے کا موضوع بنایا ہے۔ افسانے میں ایک ہندستانی سیاح، جو کہ نفسیاتی معلم ہوتا ہے، اپنی معشوقہ کو خوش کرنے کے لیے پیپر ماشی کا ایک سنگار بکس بنانے کے لیے دوکاندار کو آرڈر دیتا ہے۔ دوکاندار سیاح کا ذوق دیکھ کر اس کو اپنے کارخانے کے بہترین کاریگر مام دین سے ملواتا ہے۔ سیاح مام دین کے کام سے بہت ہی متاثر ہوتا ہے لیکن جب وہ مام دین کی اُجرت سنتا ہے تو اس کو حیرت ہوتی ہے کہ اتنی محنت کا ثمرہ نہ ہونے کے برابر ہے۔ جبکہ مام دین اس کام کے لیے بہت زیادہ پیسوں کا حقدار ہے۔ بہر حال سیاح نے اپنے ذوق کے مطابق مام دین کے سامنے اپنے سنگار بکس کی فرمائش کی اور کہا کہ اچھا سنگار بکس بنانے پر وہ مام دین کو

معاوضے کے علاوہ انعام بھی دیگا۔

مام دین نے مقررہ وقت پر اس سیاح (نفسیات کے معلم) کے لیے اس کے کہنے کے مطابق ایک نرالا نقشے والا سنگار بکس تیار کیا۔

جب سیاح دس دن کے بعد اپنا سنگار بکس لینے آتا ہے تو وہ مام دین کے ہنر کو دیکھ کر محوِ حیرت ہو جاتا ہے کیونکہ مام دین نے سنگار بکس پر ایک اژدہے کی شکل بنائی تھی، جو منہ کھولے کسی چیز کی طرف بھاگا جا رہا تھا۔ پہلی نظر میں سیاح بہت ہی متاثر اور خوش ہو جاتا ہے لیکن نہ جانے کیوں اس کو سنگار بکس کے اژدہے میں مام دین کی روح نظر آتی ہے اور جیسے وہ اژدہا پوری دنیا کو تباہ و برباد کرنے جا رہا ہے۔ اس خیال کے بعد نفسیات کا معلم مام دین سے معافی مانگتا ہے۔ اور اس کے بعد وہ وہاں سے بہت تیزی سیس نکل جاتا ہے اور مالکِ دوکان یہ سب دیکھ کر حیران رہ جاتا ہے۔

اس افسانے کے بارے میں حامدی کاشمیری ایک جگہ لکھتے ہیں:

> ''کاریگر میں ایک بدیسی سیاح، جو نفسیات کا معلم ہے، لکڑی پر کام کرنے والے کاریگر مام دین سے ملتا ہے۔ وہ ایک معمر کاریگر ہوتا ہے، میلی سی شلوار میں ملبوس جس کے تانبے کی طرح سیاح مائل و سرخ جسم کی ہڈیاں تک گنی جا سکتی ہیں وہ حسن کار لیکن نحیف و نزار ہے اور افلاس کے بوجھ سے دبا ہوا ہے......
> سنگار بکس پر اژدہے کی تصویر کھدائی ہوئی ہے جو منہ کھولے کسی چیز کے پیچھے بھاگے جا رہا ہے لیکن دوسرے ہی لمحے وہ محسوس کرتا ہے''[11]

یہاں پر یہ بتانا ضروری سمجھتا ہوں کہ یہ سیاح بدیسی نہیں بلکہ ہندوستانی ہوتا ہے جیسا کہ حامدی صاحب لکھتے ہیں اس افسانے میں مزدوروں کی افلاس زدہ زندگی

کو بڑے فنکارانہ انداز میں پیش کیا ہے۔ ساتھ ہی یہ دکھانے کی کوشش کی گئی ہے کہ کس طرح غریب کاریگر اور مزدور اپنا خون پسینہ ایک کر کے محنت مزدوری کے بعد سرمایہ دار طبقے کے ظلم کا شکار ہو جاتے ہیں۔ کاریگر میں مام دین محنت کش طبقے کی نمائندگی کرتا ہے اور دوکاندار استحصال طبقے کی۔ اس افسانے کا اسلوب نہایت آسان اور سادہ ہے۔ چند ہی کرداروں کے باوجود اس افسانے میں سماج کے بہت اہم مسائل کو اُجاگر کیا گیا ہے۔ افسانے کو پڑھتے وقت انسان اپنے آپ کو اس افسانے کے کردار میں کہیں نہ کہیں ضرور پاتا ہے۔ شروع سے آخر تک یہ افسانہ قاری پر ایک مضبوط پکڑ قائم رکھتا ہے اور قاری پڑھنے کے دوران خود بھی سہم جاتا ہے۔ سیاح کے ذوق اور پسند کو مصنف کچھ اس طرح بیان کرتے ہیں:

> ''پھر اس نے مام دین سے کہا۔'' استاد ہمیں ایک سنگار بکس کی ضرورت ہے جس پر کوئی خوبصورت سی چیز ہو۔ میرا مطلب ہے ہمارے مذاق کے مطابق بیل بوٹے نہیں ڈنٹھلوں سے لپٹی ہوئی مچھلیاں نہیں بس کوئی جادو کوئی پرندہ اُڑتا ہوا بھاگتا ہوا، آزاد اور مسرور خوبصورت اور جاذبِ نظر! سمجھ گئے؟''[۱۲]

سائڈ لائن:

''سائڈ لائن'' پردیسی کا ایک طویل افسانہ ہے جو ایک افسانہ نگار نا گندر کی کہانی ہے۔ اس کہانی میں مصنف نے اپنی زندگی کے بارے میں لکھا ہے۔ ''سائڈ لائن'' انگریزی زبان کا لفظ ہے جس کا معنیٰ دوسرا راستہ یا دوسرے ذرائع کہہ سکتے ہیں۔ افسانے میں مصنف کشمیر کی بے روزگاری کو اپنا موضوع بناتا ہے اور اپنے آپ کو اس افسانے میں بحیثیت ایک کردار پیش کرتا ہے۔ پہلے وہ ایک سرکاری ملازم ہوتا ہے

اور اضافی وقت میں وہ افسانے بھی لکھتا ہے، اگرچہ افسانوں سے مصنف کو بہت شہرت ملتی ہے لیکن گھر کا گزارا وہ اسی نوکری سے چلاتا ہے جس نوکری سے وہ نفرت کرتا ہے اور آئے روز اس نوکری کو چھوڑنے کی بات کرتا ہے۔ جس اخبار میں اس کے افسانے چھپ جاتے ہیں اس کا نام ''نئی صبح'' ہے۔ جس کا ایڈیٹر بہت ہی چرب زبان ہوتا ہے اور وہ مصنف سے یہ وعدہ کرتا ہے کہ اگر وہ نوکری کو خیر آباد کہتا ہے تو وہ اس کو اخبار میں نوکری دے گا۔ دھوکے میں آکر افسانہ نگار نوکری چھوڑ دیتا ہے، اور سوچتا ہے کہ اس کی سائڈ لائن یعنی افسانہ نگاری بہت مضبوط پیشہ ہے۔ لیکن نوکری چھوڑنے کے کچھ ہی دنوں بعد اس کو پتہ چلتا ہے کہ افسانے لکھنے سے اس کو عزت اور شہرت ضرور ملے گی لیکن پیسہ نہیں جس سے وہ اپنی دنیا بسا سکے۔ اور چونکہ عزت نہ کھانے کی چیز ہے اور پہننے کی۔

افسانے میں کئی تصویریں ابھرتی ہیں جن میں اخبارات کے مالکان کا رویہ قابل ذکر ہے۔ جو مصنفین کی محنت کا معاوضہ ادا نہیں کرتے۔ اس کے علاوہ کشمیر میں ملازمتوں میں کم تنخواہ کا بھی اشارہ ملتا ہے جو کہ ڈوگرہ سرکار کا شیوہ تھا۔ افسانے کا اسلوب منجھا ہوا ہے۔ آخر پر افسانہ نگار کو جو نا امیدی اس اخبار کے دفتر سے ہوتی ہے وہ سب سے زیادہ قابل دید ہوتی ہے۔ کیونکہ وہ قاری پر ایک عجیب اثر پیدا کرتی ہے۔ اور کس طرح اخبار کے مالک نے ناگندر جیسے شریف افسانہ نگار کو بے سروسامانی کی حالت میں چھوڑ دیا:

> ''ایڈیٹر نے مسکرا کر کہا اور پھر ساری ہمدردی کو لفظوں میں جمع کر کے کہا۔'' افسوس ہے ہمارے پاس اس وقت گنجائش نہیں......''[۱۳]

اس ایک جملے نے کس طرح ناگندر کی پوری دنیا ہی اجاڑ دی۔ اس کا اندازہ

ایک بے روزگار کے سوا کون کرسکتا ہے۔ یہ کہانی دراصل پریم ناتھ پردیسی کی نجی زندگی کی عکاسی کرتی ہے۔ ناگندر کوئی اور نہیں بلکہ خود پریم ناتھ پردیسی معلوم ہوتا ہے۔

چتائیں:

''چتائیں'' ایک مختصر افسانہ ہے۔ اس میں افسانہ نگار نے ہندو سماج کو تنقید کا نشانہ بنایا۔ جس میں ہندو سماج میں موجود مختلف بُرے اور غیر مذہبی عقیدے عام اور غریب لوگوں کے لیے جینا مشکل کرتے ہیں۔ افسانے میں ایک بزرگ ریٹائر اسکول چپراسی سورج رام کی بیٹی کی درد بھری کہانی پیش ہوئی ہے۔ سورج رام کی بہت سی اولادیں پیدا ہوتیں ہیں لیکن صرف جانکی ہی بچ سکی اور باقی سبھی پیدا ہوتے ہی مرجاتے ہیں۔ جانکی کی پرورش نازونعم سے ہوتی ہے۔ جوانی کی دہلیز پر قدم رکھتے ہی سورج رام اس کی شادی ایک کھاتے پیتے پنڈت گھرانے کے اکلوتے ملازم بیٹے سے کرتا ہے۔ تاکہ وہ آرام وآسائش کی زندگی گزار سکے لیکن شومئی قسمت جانکی صرف دوسالوں میں ہی بیوہ ہو جاتی ہے۔ افسانے کا مرکزی کردار دوسالوں کے بعد گھر لوٹتا ہے۔ جب اس کو جانکی کے بارے میں یہ معلوم ہوتا ہے کہ وہ دوسال کے بعد ہی بیوہ ہوگئی ہے تو اس کو بہت دکھ ہوتا ہے۔ شیوراتری کے تہوار پر لوگ اس کا انتظار کرتے ہیں کہ ہرسال کی طرح اس سال بھی ہمیں اپنی نظموں اور گیتوں سے محظوظ کرے گا۔ لیکن وہ عمداً اس سال تہوار کے دن ''روداد جانکی'' سناتا ہے جس کی وجہ لوگ اس کو بڑی بے رحمی سے اسٹیج سے گھسیٹتے ہیں اور بے عزت کر کے نیچے لاتے ہیں، شاید اس لئے کہ اس نے سچ جو بولا تھا۔

افسانے میں ایک کم عمر ہندو ودھوا (بیوہ) کی داستانِ غم کے ذریعے ہندو سماج کے بُرے رسوم کے بارے میں آگاہی ملتی ہے۔ افسانہ نگار عورتوں کی دوسری

شادی کے بارے لب کشائی کرتے ہوئے گویا ہوتے ہیں کہ ایک بیوہ عورت پر سماج اور مذہب کے نام پر ظلم کے پہاڑ توڑے جاتے ہیں اور کس طرح لوگ سماجی رسوم کو مذہب سمجھ کر جاہل بن جاتے ہیں۔ ان بُرے رسوم کے بارے میں پردیسی لکھتے ہیں:

> ''ایک معصوم لڑکی کا سب کچھ ہمارے سامنے لُٹ جاتا ہے اور ہم آنسو بہانے کے سوا کچھ نہیں کر سکتے۔ ہمارے چاروں طرف بھولی بھالی زندہ لڑکیوں کی ہزاروں ''چتائیں'' جلتی ہیں اور ہم ان شعلوں کی تپش تک محسوس نہیں کرتے کس قدر مردہ دلی، کتنی خوفناک غفلت!''[۱۴]

لباس تلے:

''لباس تلے'' پردیسی کا ایک طویل افسانہ ہے جو طنز کے پیرایے میں لکھا گیا ہے۔ ''لباس تلے'' پریم ناتھ پردیسی کی ایک شاہ کار تخلیق ہے۔ مزاحیہ طرز پر لکھا گیا یہ افسانہ ایک غریب نوکر کے احساسات اور جذبات سے روشناس کراتا ہے کہ امیر اور غریب کی زندگی میں کتنا بڑا فرق ہوتا ہے۔ اس افسانے میں وشومبر ایک معمولی نوکر ہوتا ہے جس کو اپنا مالک بڑے دن کی خوشی کے موقعہ پر اپنا پرانا اوورکوٹ دان میں دیتا ہے۔ اس کوٹ نے مانو وشومبر کی دنیا ہی بدل دی۔ اس کوٹ سے اس کو اپنا مالک بہت ہی سخی نظر آنے لگتا ہے۔ بلکہ ہر طرف اس کو اپنا پن محسوس ہوتا ہے۔ دو دن بعد جب وہ کوٹ پہننے کے بہانے بازار چلا جاتا ہے جہاں دل میں چھپے بہت سے ارمان نکالنے کا یقین تھا اگرچہ وشومبر کے پاس صرف بارہ آنے تھے جس میں اس کو ضرورت کی چند چیزیں بھی خریدنا تھیں لیکن اس سب کے باوجود نیم عریاں تصاویر کی دوکان پر چڑھ گیا اور اپنے آپ کو بے عزت کر کے واپس لوٹ آیا۔ اسکے بعد وشومبر کو ایک بہت پرانا قصہ یاد آیا کہ جب اس نے بہت پہلے ایک طوائف سے مار کھائی تھی کیونکہ وشومبر نے

اس کی طرف صرف دیکھا تھا وہ بھی پرانے کپڑوں میں لیکن آج وشومبر کوٹ پہننے سے انسان لگ رہا تھا۔ اس پرانی یاد کے سہارے اوورکوٹ پہن کر وشومبر سارے کام چھوڑ کر طوائف کے دروازے پر پہنچ گیا۔ لیکن وہاں پر وہ ایک ڈرنک کی بھی قیمت ادا نہیں کر سکا۔ جس پر ووشومبر کو بہت حزیمت کا سامنا کرنا پڑا۔ اور اس کو وہاں سے بری طرح نکالا گیا جس پر وشومبر کو یقین ہو گیا کہ مالک کے کپڑے پہننے سے کوئی مالک نہیں بن جاتا ہے اور جب اس روز وشومبر گھر پہنچ جاتا ہے، آنگن میں پہنچ کر کتّے نے بھی بھونکنے سے وشومبر کو مالک کا کوٹ اتارنے کی الٹی میٹم دے دی۔ اور تب جا کر وشومبر کو یقین ہوتا ہے کہ اچھے کپڑے پہننے سے غریب کبھی بھی مکمل انسان نہیں بنتا کیونکہ آنگن کے کتے کو بھی وشومبر کا کوٹ پرایا لگا جبکہ کتا وشومبر کو بھی اور اور کوٹ کو بھی برسوں سے جانتا تھا۔ افسانے میں مزدوروں اور غریبوں کی زندگی کا بہترین نقشہ کھینچا گیا۔ افسانے کو پڑھنے کے بعد ایسا لگتا ہے کہ قاری ان کرداروں کو برسوں سے جانتا ہے۔ افسانے کا اسلوب سادہ سہل اور عام فہم ہے۔ افسانہ قاری پر ایک پر گہری چھاپ چھوڑتا ہے، افسانے میں اگرچہ تضحیک بھی ہے لیکن ساتھ ہی سماج کے لیے ایک نصیحت بھی ہے۔ اسی تناظر میں پردیسی ایک جگہ لکھتے ہیں:

> ''وہ (وشومبر) آگے چلتا گیا۔ بالکل؟ غیر ارادی طور پر کبھی کبھی جب بے اختیار اس کے ہاتھ جیبوں میں چلے جاتے اور انگلیاں پیٹ سے چھو جاتیں تو اسے احساس ہوتا کہ اوورکوٹ کی جیبیں پھٹی ہوئی ہیں۔ وہ گھبرا کر آگے پیچھے دیکھتا کہ کسی نے انگلیوں سے پیٹ کو چھوتے ہوئے تو نہیں دیکھا۔ لیکن دنیا باطن کو نہیں دیکھتی وہ صرف ظاہر پرست ہے اور وشومبر ظاہری طور پر آج بالکل شریف اور مکمل انسان دکھائی دے رہا تھا''۔ ۱۵

''بہتے چراغ'' کے بعض افسانوں کا مطالعہ

بہتے چراغ پریم ناتھ پردیسی کے افسانوں کا آخری مجموعہ ہے۔اگرچہ یہ مجموعہ پردیسی کے وفات کے بعد ۱۹۵۵ء میں ہی شائع ہوا۔اس مجموعے کواس وقت کے قابل قدر سیاست دان غلام محمد صادق نے ترتیب دیا اور بعد میں شائع بھی کروایا۔ اس مجموعے میں کل ۲۰ افسانے ہیں چونکہ یہ افسانوی مجموعہ پردیسی کی وفات کے بعد شائع ہوگیا ہے تو اس میں برج پریمی کے بقول پردیسی کے تین غیر مطبوعہ افسانوی مجموعوں کا انتخاب شامل ہیں۔

''یہ دراصل ان کے تین غیر مطبوعات کا منتخب مجموعہ ہے''بہتے چراغ'' میں سچے کشمیر کے سچے ترجمان کی روح نظر آتی ہے۔ اس مجموعے میں ان بدنصیب لوگوں کے دل دھڑکتے ہیں جو جنتِ کشمیر کے دوزخ میں صدیوں سے رہتے آئے ہیں...... موضوع کے لحاظ سے یہ افسانے متنوع موضوعات پر مبنی ہے، ان میں امنِ عالم کی شدید خواہش بھی نظر آتی ہے اور استحصالی قوموں کیساتھ لڑنے کا جوش بھی ۔ کشمیری کاریگروں اور فن کاروں کی بھوکی زندگی کا احساس بھی ہوتا ہے''۔[16]

ریاست کے اردو افسانوں کے حوالے سے''بہتے چراغ''ایک سنگ میل کی حیثیت رکھتا ہے۔ان افسانوں کے ذریعہ پردیسی نے لوگوں کوشخصی نظام، مذہبی تعصّبات،توہمات،اقتصادی نابرابری اور افلاس کے خلاف اکسایا ہے۔

''بہتے چراغ'' کے تعارف میں کشمیر میں ترقی پسند تحریک کے صدر اور سابق

وزیر اعلیٰ غلام محمد صادق لکھتے ہیں۔

''اس مجموعے کی بیشتر کہانیاں انکی ۱۹۴۸ء تک لکھی ہوئی کہانیوں میں سے منتخب کی گئی ہیں اور اس دور کی نمائندگی کرتی ہیں......
پردیسی کی کہانیوں کے دو الگ مجموعے ''شام وسحر'' اور ''دنیا ہماری'' قبائلی حملے کے متعلق ایک رپورتاژ ''پانچ دن''۔ اس مجموعے کی تقریباً تمام کہانیاں ان کے غیر مطبوعہ مجموعوں ''ڈھول'' کیچڑ کے دیوتا اور ''جنگ اور نغمہ'' سے لی گئی ہیں'' [۱۷]

پردیسی کی زندگی کے گونا گوں مسائل و مصائب اور اپنے ہم وطنوں کے ساتھ احساس یکجہتی کا ایک احساس بہتے چراغ کے افسانوں میں ملتا ہے۔ ان میں سے بیشتر افسانے برصغیر کے مختلف نامور رسالوں اور جرائد میں شائع ہو چکے ہیں۔ اس افسانوی مجموے کو پردیسی کی وفات کے صرف آٹھ مہینے بعد منظر عام پر لایا گیا۔ اس افسانوی مجموعے میں سید احتشام حسین، پریم ناتھ درؔ اور سہیل عظیم آبادی کے تاثرات بھی شامل ہیں۔

سید احتشام حسین پردیسی کے افسانوں کے بارے میں لکھتے ہیں:

''خلوص اور بے تکلف انداز پردیسی کے افسانوں کی جان ہے، نہ ان میں کھینچ تان ہے اور نہ تصنع، نہ واقعات توڑ مروڑ کر بیان کیے گئے ہیں اور نہ نتیجہ محض نتیجہ نکالنے کے لیے نکالے گئے ہیں۔
پردیسی کو کشمیری تہذیب اور روایات سے محبت تھی اور ان ہی کو وہ اپنے افسانوں میں پیش کر کے عام انسانوں کی خدمت کرنا چاہتے تھے۔ [۱۸]

بہتے چراغ میں افسانوں کی ترتیب وار فہرست کچھ اس طرح سے ہے۔

(۱) ڈھول (۲) کاریگر (۳) لباس تلے (۴) اُجالے اندھیرے (۵) کتبے (۶) انکوٹ (۷) سوغات (۸) سیلز مین (۹) اگلے سال (۱۰) ٹیکہ بٹنی (۱۱) جہاں سرحد ملتی ہے! (۱۲) پھسلن (۱۳) خون اور سکے (۱۴) دیوتا کہاں ہیں (۱۵) نئی صبح (۱۶) امام صاحب (۱۷) سنکرات (۱۸) جھنجنا (۱۹) نئی سڑک (۲۰) بہتے چراغ۔

ڈھول:

ڈھول پردیسی کا بے حد دلچسپ اور معنی خیز افسانہ ہے۔ افسانے میں ایک لاچار عورت کی داستانِ غم کو پیش کیا گیا ہے جس سے کشمیری عورت کی مفلسی اور لاچاری کا بھی خوب اندازہ ہوسکتا ہے۔ اس لاچار عورت کی شادی آٹھ سال پہلے ہوئی تھی لیکن شومئی قسمت اس کے بطن سے کوئی بچہ پیدا نہیں ہوا۔ اس کو پتہ چلا ہے کہ بچھواڑے کے علاقہ میں ایک نرس رہتی ہے جو کوئی خاص دوائی بناتی ہے جس سے مایوس مریض بھی خوش ہوتے ہیں لیکن اس دوا کو خریدنے کے لیے پانچ روپیوں کی ضرورت ہے ۔ جس کو اس نے جمع کرنے کی بہت کوششیں کیں لیکن ہر بار ناکام ہوئی۔ کیونکہ جب بھی اس نے آنے دوآنے کر کے تین یا چار روپیہ جمع کیے تو اس کا بدذات خاوند یہ جمع پونجی شراب پر خرچ کرتا تھا اور اس کا خواب چکنا چور ہو جاتا۔ ایک بار بڑی مشکل سے اس نے خاوند سے بچا کے پانچ روپیہ بھی جمع کیے تھے لیکن عین وقت اس کا خاوند بیمار پڑا اور اس کو تھیلے کا منھ کھول کر اس کا علاج کرانا پڑا بلکہ کچھ پیسے ادھار بھی لانے پڑے۔ اس کے باوجود بھی خاوند اس معصوم عورت کو طعنہ دیتا تھا۔ دن گزرتے گئے ، ایک صبح وہ ڈل کے کنارے پانی لانے کے غرض سے گئی جہاں پر اس نے ایک ہندوستانی سیاح کو کشمیری آدمی کے ہمراہ لوگوں کو فوٹو کھینچتے ہوئے دیکھا۔ بہر حال یہ ایک معمول تھا کہ باہر کے سیاح اکثر کشمیری عورتوں اور بچوں کے میلے بدن کی

تصویریں اتارتے رہتے تھے لیکن اس بار کچھ عجیب سا ہوا۔ ایک سیاح نے اپنے کشمیری نوکر سے اس کو کہلوایا کہ وہ اس کی تصویر اتارنا چاہتا ہے پہلے تو اس نے منع کیا لیکن بعد میں پانچ روپیہ کے لالچ نے اس کو دوا کی پڑیا یاد دلائی اور وہ فوٹو کھینچنے پر آمادہ ہوگئی۔ اس وقت اس کو اپنے خواب پورے ہوتے دکھائی دے رہے تھے۔ اسی روز اس نے اپنے مستقبل کے لیے پانچ روپیہ کی پڑیا لائی اور ساتھ میں اپنے خاوند کے طعنوں کا جواب بھی دیا جو اس کو ہر وقت بانجھ عورت کہہ کر ذلیل کرتا تھا۔ کچھ مہینوں کے بعد جب اس کا خاوند ٹھیک ہونے لگا اور کام پر جانے کے لائق ہو گیا۔ تو اچانک ایک دن اس نے وہی تصویر ساتھ لائی جو اس سیاح نے پانچ روپیہ کے بدلے میں کھینچی تھی بس اس تصویر کی وجہ سے اس کے خاوند نے کیا کچھ نہیں کہا جس کو سن کر وہ عورت فرش پر گر گئی اور جیسے وہ بچہ اس کی پیٹ سے غائب ہو گیا اور اس کی جگہ صرف ڈھول نظر آ رہی تھی۔ اتنے مصائب جھیلنے کے بعد بھی اس عورت کے نصیب میں خوشی کے چند لمحات کے سوا کچھ بھی نہیں تھا حتیٰ کہ بڑی سے بڑی قربانی بھی اس عورت نے اپنے خاوند کے لیے پیش کی تھی۔

اس افسانہ سے انسانی روح کانپ اٹھتی ہیں کہ نازک اور نحیف عورت پر کتنا ظلم ہو رہا ہے۔ خاص کر ان عورتوں کا درد اس افسانے میں عیاں ہے جن کے ہاں بچہ نہیں ہوتا۔

افسانے میں کشمیری عورتوں کی کسمپرسی اور کشمیر کی غریبی کو خاص طور پر اُجاگر کیا گیا ہے ۔ اس کے علاوہ سماج کے کچھ ایسے مسائل کی طرف ہمارا دھیان متوجہ کیا گیا ہے۔ جو اکثر لوگوں کی نظروں سے اوجھل ہوتے ہیں لیکن پردیسی اکثر ان ہی مسائل کو افسانوں میں جگہ دیتے ہیں۔

''اس نے اپنا ہاتھ آہستہ سے اُبھرے ہوئے پیٹ پر پھیرا۔

اسے شدت سے محسوس ہوا جیسے اس کے پیٹ میں وہ بچہ نہیں جو
اس کی زندگی کی لو کو جلائے رکھے گا بلکہ ڈھول ہے جو ہمیشہ ہمیشہ
کے لیے اس کے مستقبل پر چھائی رہے گی"۔ ۱۹

کتبے:

"کتبے" پردیسی کا ایک طویل افسانہ ہے۔ "کتبے" پردیسی کی کہانیوں میں ایک منفرد مقام رکھتی ہے۔ اس افسانے میں ایک سپاہی کے دو روپ سامنے آتے ہیں۔ سلام آباد اوڑی کا رہنے والا سپاہی رحم علی جب تبادلے کے بعد سرینگر میں ایک سرکاری عمارت کی پہرہ داری پر تعینات ہوتا ہے تو اس کو سلام آباد کے تھانے کے وہ دن یاد آتے ہیں جہاں پر اس نے بے پناہ دولت اور شہرت حاصل کی تھی۔ اس دولت سے رحم علی نے سلام آباد میں ایک محل نما مکان تعمیر کیا تھا اور دو شادیاں بھی کیں تھیں تاکہ گھر میں بہت بچے ہوں اور بڑے مکان میں وہ چہل پہل قائم رہے۔ لیکن شہر میں ڈیوٹی کے دوران نہ وہ پیسے ملتے تھے اور نہ وہ عزت۔ "دو دنوں کی ڈیوٹی میں رحم علی کو کوئی سستی محسوس نہیں ہوئی۔ لیکن تیسرے دن اس کو ڈیوٹی سے بہت نفرت ہوئی کیونکہ وہ اس طرح کی ڈیوٹی کا عادی نہیں تھا اس کو کبھی اپنے بچوں کی یاد آتی رہی اور کبھی اپنی بیویوں کی۔ لیکن کافی دیر کے بعد اس کی نظر ایک چنار پر پڑی جس کی طرف دو دنوں تک شاید اس نے دیکھا ہی نہیں تھا۔ لیکن جب چنار پر اس نے غور سے دیکھا تو اس پر بہت سے نام کنندہ تھے۔ کچھ پنڈت نام تھے، کچھ سکھ نام تھے اور ساتھ ہی بہت سے نام مسلمانوں کے بھی کنندہ تھے۔ پہلے تو رحم علی کو اسلامی تعلیمات یاد آ گئی لیکن فوراً اس کو بچپن میں پڑھا ہوا سبق، جس میں اشوک کے کتبوں کے بارے میں پڑھا تھا، یاد آیا۔

جس نے اشوک کو آج تک زندہ رکھا تھا۔ اور آخر کار اس نے سنگین کی نوک سے اپنا نام بھی چنار کے تنے پر کنندہ کیا۔ اپنے شعور کے مطابق اس نے اپنے آپ کو سلام آباد اوڑی کا اشوک بنا دیا اور ڈیوٹی کے اختتام پر رحم علی نے اس پر فخر بھی کیا کہ اب جو بھی یہاں سے چلے گا۔ رحم علی کا نام ضرور پڑھے گا۔ رحم علی نے چنار کو اپنے بندوق کے سنگین سے کریدنے کے منظر کو پردیسی کچھ اس طرح پیش کرتے ہیں:

''اس جذبے سے متاثر ہو کر فوراً بندوق کو ایک طرف رکھ کر اس نے سنگین اُتار دی اور اس کی نوک سے چنار کی ننگی چھاتی چھیلنے لگا ۔یہ ایذا ضرور ہے مگر اس ایذا کے پیچھے جو ابدیت ابھرنے والی ہو تو ایذا، ایذا نہیں رہتی۔ وہ اپنا نام کھودتا رہا کھودتا رہا۔ ایسی جگہ جہاں اس کی انفرادی شخصیت اوڑی کے تھانے کی طرح جُداگانہ حیثیت رکھتی تھی۔ کھودتے کھودتے اس سے یقین ہوتا جاتا تھا جیسے وہ اشوک بنتا جا رہا ہے، سلام آباد کا اشوک جیسے وہ اب کبھی نہیں مر سکتا'' [۲۰]

اس افسانے میں رحم علی کے فرض اور انا میں ایک جنگ ہوتی ہیں کہ کس طرح وہ اپنے آپ کو زندہ رکھنے کے لیے چنار کے پیڑ کو نقصان پہنچاتا ہے باوجود اس کے کہ اس درخت پر لکھنے کو حکومت نے پابندی بھی عائد کی تھی۔ دوسرے رخ سے دیکھا جائے تو اس افسانے سے پولیس کا نظریہ بھی واضح ہو جاتا ہے۔ کس طرح رحم علی نے سلام آباد میں بہت دولت کمائی تھی، کچھ لوٹ مار سے اور کچھ رشوت سے جو کہ پولس کا ہمیشہ سے شعار رہا ہے۔ اس میں تخیل آمیزی سے خیالی مناظر کو افسانوی رنگ میں ظاہر کیا گیا ہے۔

ان کوٹ:

''ان کوٹ'' پردیسی کے افسانوں میں شاہکار حیثیت رکھتا ہے جو ڈوگرہ دور میں لوگوں کے مصائب پر لکھا گیا ہے۔ افسانہ نگار کے مطابق مہاراجہ حکومت نے کشمیر میں ہمیشہ ایک مصنوعی قلعت پیدا کر کے انسانی تاریخ کی بدترین مثال قائم کی۔ اس قحط سالی کی ترجمانی اسی افسانے سے ہوتی ہے۔ ''ان کوٹ'' اصل میں اس دن کو کہتے ہیں جب مہاراجہ سال میں ایک بار لوگوں میں مفت اناج تقسیم کرتا تھا اور اپنی مصنوعی رحم دلی کا سکہ لوگوں پر بٹھانا چاہتا تھا۔ ''ان کوٹ'' میں لوگ چاول لینے آتے ہیں جہاں پر لوگوں کی بہت بڑی تعداد صبح سے انتظار کرتی ہے لیکن حکومت کے کارندے اناج تقسیم کرنے کا وقت سورج ڈھلنے سے پہلے بتاتے ہیں اور لوگوں کے دن بھر کے انتظار کو پردیسیؔ نے بہترن انداز میں بیان کیا ہے۔ اس دن کی منظر نگاری بھی کمال کی ہے۔

ایک بوڑھے کے گود میں بچہ دن بھر جاگتا رہا لیکن اناج بانٹنے کے وقت وہ سو گیا۔ اگرچہ بوڑھے نے اس کو بہت جگانے کی کوشش کی تھی لیکن جب وہ جاگ گیا تب تک ان کی باری چلی گئی تھی۔ جس پر وہ دوبارہ سپاہی کے پاس چلا گیا لیکن وہاں پر ڈوگرہ سپاہیوں نے اس کو بے رحمی سے پیٹا اور پھر گسیٹ کر باہر نکالا۔

اس افسانے میں مہاراجہ کے عملے، سپاہیوں اور تحصیل عملے کے کرداروں کی سراپا نگاری کی گئی ہے، کس طرح وہ عام لوگوں پر ظلم و بربریت کے پہاڑ توڑتے تھے۔ یہ افسانہ انسان کو کشمیر کے ماضی کی بدترین تاریخ سے آگاہ کرتا ہے کہ کس طرح مظلوم کشمیری ظلم برداشت کرتے تھے۔ ''ان کوٹ'' میں پردیسی نے اچھوتے موضوع پر قلم اُٹھایا ہے ۔ یہ ہماری سیاہ تاریخ کی اہم کڑی کے بطور پیش کیا جا سکتا ہے۔ پردیسی نے پہلے ''بتہ

ہر'' کے عنوان سے کشمیری ڈراما لکھا تھا لیکن اس وقت کے گورنر نے ''بتہ ہر'' کو اسٹیج کرنے سے پہلے ہی ضبط کیا گیا۔ اسی لئے انہوں نے ''بتہ ہر'' کو ''ان کوٹ'' کے عنوان سے افسانہ لکھا ہے۔ مختصراً ''ان کوٹ'' ہمیشہ کشمیر کے ماضی کی تلخ حقیقت کی یاد دلاتا رہیگا۔ اس افسانے کو صحیح تناظر میں پڑھنا بھی بہت کمال ہے ایک جگہ پردیسی لکھتے ہیں:

> ''قطار میں بیٹھے ہوئے وہ لوگ جن کی باری آنے والی تھی۔ اس کی بے مہری برداشت نہ کر سکے۔ اس سے باہر نکال دو حضور، ہماری باری پر گڑبڑ مچانے آیا ہے'' منشی کے اشارے پر دو مہاراجہ گارڈ آگے آئے اور اسے بری طرح سے پیٹتے ہوئے باہر دھکیل دیا''[۲۱]

سوغات:

''سوغات'' پردیسی کا ایک بہت ہی طویل افسانہ ہے۔ ''سوغات'' ایک تواریخی اور جذباتی بنیادوں پر لکھا ہوا افسانہ ہے جس میں قدیم کشمیر بلکہ برصغیر کے تاریخی نوعیت کے اہم واقعات ہیں۔ اس افسانے میں ماں کے پیار، جذبات اور احساسات کی بھی خوب ترجمانی کی گئی ہے۔ نیل کنٹھ اپنی ماں کا اکلوتا بیٹا ہوتا ہے جو کسی کام سے روالپنڈی جانا چاہتا ہے جبکہ ماں اس کو یہ کہہ کر روکتی ہے وہ اس کے بغیر نہیں رہ سکتی۔ آخر کار بیٹے نے ماں کو منا لیا۔ ماں ہمیشہ زمانے کو کلجگ اور بیٹا ترقی یافتہ تصور کرتا ہے۔ اسی دوران بیٹا اپنی ماں کی فرمائش پر کوئی تحفہ لانا چاہتا ہے لیکن ماں ہر بار منع کرتی رہتی ہے۔ اس کے برعکس وہ بہو اور اس کے بچوں کے لیے کپڑے اور دوسرے چیزوں کی فرمائش کرتی ہے۔ آخر کار نیل کنٹھ یہ کہہ کر گھر سے نکلتا ہے کہ

اب وہ خود ہی ماں کے لئے تحفہ لائے گا۔ پندرہ دن گزر گئے اور نل کنٹھ واپس آ گیا۔ لیکن اب وہ بدلا ہوا لگ رہا تھا۔ اس نے وہ دیکھا تھا جس کا اس نے کبھی تصور ہی نہیں کیا تھا۔ ترقی یافتہ شہر کی چکا چوند نے اس کی آنکھوں کو خیرہ کر دیا تھا۔ وہ کشمیر کو راکھشستوں کا شہر کہتا تھا اگر چہ ماں کشمیر کو بھگوانوں کا دیس کہتی تھی۔ بیٹا کہتا کہ بھگوان گندگی میں نہیں رہتا بلکہ وہ پنڈی اور دہلی جیسی خوبصورت جگہوں پر رہتا ہے۔ ماں جنگ و جدل کو انسانی ترقی میں روکاٹ سمجھتی ہے جبکہ نیل کنٹھ جنگ کو انسانی ترقی کا ضامن قرار دیتا ہے۔ بیٹے نے رام اور راون کی مثالیں پیش کی اور ماں چُپ ہوگئی اس کے بعد پھر بیٹے نے کورووں اور پانڈوں کے جنگ کی روداد سنائی اور کہا کہ پہلے جنگ شطرنج پر عورتوں کو داو پر لگا کر کی جاتی تھی اب لڑائیاں دولت اور ملکوں کے تقسیم پر ہوتی ہیں۔ ایک جگہ مصنف لکھتے ہیں کہ:

''انسان جوں جوں ترقی کرتا جائیگا اسے پھیلاؤ کے لیے دنیا سمٹتی ہوئی سی'' سکڑتی ہوئی سی دکھائی دے گی''۔۲۲

یہ جملہ مصنف کے وسیع نظر کی دلالت پیش کرتا ہے۔ افسانے میں مذہبی تصورات کو کھل کر پیش کیا گیا اور کھل کر تنقید بھی کی گئی۔ اور پھر جب تحفہ دیکھنے کی باری آئی تو نل کنٹھ نے وہ سب لایا تھا جو ماں نے کہا تھا اور آخر کار سوغات کی باری آتی تو نیل کنٹھ نے لفافہ کھولا اور ماں کے منہ سے ہلکی سی چیخ نکلی۔ کیوں کہ اس میں ماں کے آخری رسوم کے لیے کفن تھا۔ ماں نے بڑی عاجزی کے ساتھ کہا کہ ''میں ابھی مرنا نہیں چاہتی ہوں'' اور اس طرح نیل کنٹھ کو اپنی سوغات پر بہت افسوس ہوا۔ اگر چہ اس نے وہ تحفہ بہت ہی محبت سے لایا تھا۔ وہ ماں کو اچھا نہیں لگا بلکہ ماں کا دل بہت ہی آزردہ ہوا۔

اس افسانے میں پلاٹ مختصر ہیں، ایک خاص ترتیب کے ساتھ کرداروں کو

پیش کیا گیا ہے۔ دو کرداروں کے اردگرد یہ افسانہ موثر انداز میں پیش کیا گیا ہے
۔افسانے کا اسلوب نہایت سادہ اور عام فہم ہے یہ افسانہ شروع سے آخر تک پڑھنے
والے پر ایک خاص گرفت رکھتا ہے اور قاری متاثر ہوئے بغیر نہیں رہتا۔ اگرچہ اس
کا نام سوغات ہے لیکن افسانہ بین سطور میں کئی پرتیں رکھتا ہے۔

سیلز مین:

''سیلز مین'' دلچسپ افسانہ ہے۔افسانے کا مرکزی کردار ایک سیلز مین ہوتا
ہے جو دوکان پر بیٹھ کر سیاحوں کو اپنی چرب زبانی اور مکاری سے مال خریدنے پر مجبور
کرتا رہتا ہے۔ایک دن وہ اپنی ذاتی مجبوری کی وجہ سے بہت پریشان ہوتا ہے کہ ایک
انگریز جوڑا داخل ہوتا ہے تو وہ حسبِ معمول اس جوڑے کو مال خریدنے پر بہت ہی
مجبور کرتا لیکن انگریز جوڑا من پسند چیزیں ہی خرید لیتا ہے ۔آخر پر وہ پامسٹ
(Palmist) بن کر انگریز جوڑے سے بہت پیسے وصول کر لیتا ہے۔ اپنی ضروریات
کو پورا کرتا ہے۔

افسانے کا اندازِ بیان بے حد نرالا ہے۔اس میں سیلز مین کی گھر کی حالت کی
بہتر عکاسی اور سیاحوں کے ساتھ غلط رویے کو بھی پیش کیا گیا ہے۔سیلز مین کے انداز
گفتگو کے بارے میں ایک جگہ پردیسی لکھتے ہیں:

> ''یہ اس گفتگو کا مخصوص اور آخری انداز تھا کہ ہر چیز جس پر خریدار
> کی آنکھ تھوڑی دیر کے لیے اٹکتی۔ وہ دوکان کی آخری چیز بن کر رہ
> جاتی حتیٰ کہ وہ چیز پھر سارے شہر میں دستیاب ہونی مشکل
> ہو جاتی حالانکہ اسی دوکان میں ایسے سینکڑوں جوڑے کسی الماری
> میں گرد کے نیچے محفوظ ہوتے ہیں'' ۲۳

دیوتا کہاں ہیں؟:

"دیوتا کہاں ہیں؟" پریم ناتھ پردیسی کا ایک طنزیہ افسانہ ہے جس میں ہندو مذہب کے برے رسوم کو نشانہ بنایا گیا۔ پنڈت رام ناتھ جو کبھی ایک معمولی کارخانے کا ملک تھا لیکن چاپلوسی، بددیانتی اور بے ایمانی سے وہ چند سالوں میں بہت سی کپڑوں کی ملوں کا مالک بنا۔ رام ناتھ ہر سال اپنے گھر میں ہون کا اہتمام کرتا تھا اور دیوتاؤں کو بھوگ چڑھاتا تھا۔ اس کے خیال میں دیوتاؤں کو بھوگ چڑھنا دراصل ایک قسم کا معاہدہ ہے جو بھگوان اور پنڈت رام ناتھ کے بیچ ہوا ہے۔ وہ بھگوان کا بھوگ چڑھاتا تھا اور بھگوان اس کی کپڑے کی ملوں میں دن بدن اضافہ کرتا تھا اور اسکو نئے نئے کنٹریکٹس (ٹھیکے) ملتے تھے۔

ایک سال اس ہون میں کچھ بھک منگے بہت سویرے ہی چلے آئے لیکن رام ناتھ کو جب پتہ چلا تو اس نے ان کو رسوا کر کے باہر نکالا۔ اگرچہ پہلے نوکروں نے ان کو شام تک ٹھہرنے کے لیے کہا تب تک ان کو بھوک نے نڈھال کر دیا اور ان کو آہستہ آہستہ ناامیدی ہوئی اور پھر نوکروں نے ان سے کہا کہ جب تک دیوتا نہیں آئیں گے تب تک کسی کو کھانا نہیں ملے گا۔ وہ شام دیر گئے تک دیوتاؤں کا انتظار کر رہے تھے لیکن کوئی دیوتا نہیں آیا۔ تو وہ سب وہاں سے بھوکے چلے گئے لیکن وہ ہر کسی سے یہی سوال کرتے تھے کہ دیوتا کہاں ہیں؟

افسانے میں رام ناتھ کو مالدار اور لالچی لوگوں کا ترجمان بنا کر پیش کیا گیا ہے، جو ہون کو بھگوان کے ساتھ ایک سودا سمجھتا تھا۔ رام ناتھ اس ہون اور بھوگ کو دیوتاؤں کی خوشنودی حاصل کرنے کا راز سمجھتا تھا اور اس کے مطابق جس شخص نے یہ بھید نہیں جانا وہ کامیاب نہیں ہو سکتا۔ جس طرح اس کے پرانے کاریگر تھے وہ تب بھی

کاریگر ہی تھے اور آج بھی کاریگر ہی ہیں۔ اس کی وجہ تسمیہ یہی تھی کہ ان کو بھگوان خوش رکھنے کا سلیقہ نہیں آتا۔ افسانے میں دوسری طرف بھکاریوں کی حالت زار کی عکاسی ہوتی ہے۔

افسانے کا پلاٹ بے حد متاثر کن ہے جو کشمیر کے غریب عوام کی بے بسی اور لاچاری کا منہ بولتا ثبوت ہے۔ افسانے میں کمال کی منظر نگاری کی گئی ہے۔ افسانہ پڑھنے کے بعد برے رسومات کا قلع قمع کرنے کو جی چاہتا ہے جو افسانہ نگار کی ایک بڑی کامیابی ہے۔ بھوک اور ہَون کی آگ کا نقشہ پردیسی کچھ اس طرح کھینچتے ہیں:

''اندر شامیانے کے نیچے اونچی آواز میں شانتی پاٹھ ہو رہا تھا اور باہر ایک مضطرب اور مجبور ماں اپنے بھوکے بچے کو بہلانے کی ناکام کوشش کرتی ہوئی صحن سے نکل رہی تھی۔ وہ ہر قدم پر رک رک کر مڑ مڑ کر یہ دیکھنا چاہتی تھی کہ دیوتا نہیں آئے جو اتنی بڑی تقریبوں پر سب سے پہلے بھات اور پکوان کھاتے ہیں۔ حتیٰ کہ ایک بے زبان بھوکے بچے سے بھی پہلے!
وہ گویا ہر آنے جانے والے سے پوچھ رہی تھی دیوتا کہاں ہیں؟
دیوتا کہاں ہیں؟'' (بچّے نے کہا)......۲۴

امام صاحب:

''امام صاحب'' ایک بوڑھے مفلس انسان کی داستانِ غم ہے جس کی کسمپرسی کو نہایت فنکاری سے پیش کیا گیا ہے۔ امام صاحب نے اپنے آنگن میں ایک چھوٹی سی مسجد شریف تعمیر کروائی، جس میں شہر کے چند دوکاندار، بینک کے کچھ ملازم اور کچھ ہمسایہ نماز جمعہ ادا کرنے آتے ہیں اور نماز کے بعد امام صاحب ایک چغہ، جو اس کو

ورثے میں ملا تھا، ایک کھونٹی پر رکھتا ہے۔ نماز کے بعد لوگ اس چغے کے جیبوں میں چند پیسے ڈالتے ہیں اور امام صاحب کا ہفتے کا خرچ نکل آتا ہے۔ ساتھ ہی امام صاحب کی ایک بیٹی مہری ہے جو صرف ایک بچہ جننے کے بعد ہی بیوہ ہوگئی۔

ایک روز صبح بہت بارش ہورہی تھی اور جمعہ کا دن تھا۔ پوری مسجد میں پانی ٹپک رہا تھا اور نمازیوں کا آنا مشکوک لگ رہا تھا۔ مہری اور امام صاحب آسمان کی طرف حسرت بھری نگاہوں سے دیکھ رہے تھے۔ موسم کے تیور دیکھ کر مہری نے مسجد کے ٹاٹ کھڑے کر کے رکھ دیئے لیکن اللہ کا کرم تھا کہ گیارہ بجے کے قریب آسمان سے بادل صاف ہوگئے بارش بھی رک گئی۔ مہری نے بھی مسجد میں چٹائی بچھائی۔ امام صاحب نے حسبِ معمول نماز جمعہ پڑھائی اور ساتھ ہی چغے کو بھی کھونٹی پہ لٹکا کے رکھا۔ اس دن بھی لوگوں نے چغے کی جیبوں میں ہاتھ ڈالے تھے لیکن کچھ لوگ ویسے ہی چلے گئے جن کی طرف امام صاحب دور تک حسرت بھری نظروں سے دیکھتے رہے کہ شاید وہ واپس آجائیں۔ اس بار امام صاحب کچھ مایوس تھے کیونکہ ایک تو کم لوگ نماز ادا کرنے آئے تھے اور دوسری بات یہ تھی کہ چغے کا ایک طرف کا جیب بالکل ہلکا محسوس ہورہا تھا۔ ٹٹولنے پر دیکھا کہ ایک جیب سے تین روپے اور ساڑھے بارہ آنے نکلے اور دوسری جیب سے ایک بہت بڑا نوٹ نکلا جو امام صاحب نے اس سے پہلے کبھی نہیں دیکھا تھا۔ نوٹ دیکھ کر امام صاحب اور اسکی بیوہ بیٹی بہت پریشان ہوگئے، پہلے تو انہوں نے اس کو کسی مرید کا کھوٹا سکہ ٹھہرایا اور کبھی وہ اسے دشمنوں کی چال قرار دے رہے تھے لیکن کافی سوچنے کے بعد امام صاحب کو اپنا ایک مرید یاد آیا جو کہ بینک میں ملازم تھا۔ جب امام صاحب نے یہ بڑا نوٹ اس کو دکھایا، تو اس نے امام صاحب کو بتایا کہ یہ نوٹ نقلی نہیں بلکہ اصلی سو روپیہ کا نوٹ ہے۔ پہلے تو امام صاحب کو یقین نہیں آیا لیکن جب بینک کے ملازم نے اس کے ہاتھ میں ایک روپیہ کے سو نوٹوں

کا بنڈل تھما دیا تو امام صاحب کو یقین کرنا ہی پڑا۔ گھر پہنچ کر امام صاحب نے اپنی بیٹی سے کہا کہ اگر کوئی مجھے ڈھونڈنے آئے تو کہنا کہ وہ گاؤں گیا ہوا ہے اور دو تین دنوں کے بعد آئیگا۔ پھر امام صاحب پچھلے کمرے میں چلے گئے اور کمبل اوڑھ کر نوٹ گننے لگے۔

اس افسانے میں پردیسی نے مفلسی کی انتہا کو اپنے فن سے بہترین انداز میں پیش کیا اور ساتھ ہی نگریزوں کے دور کی تباہ حالی کو بھی پیش کیا۔
افسانے کا ٹریٹمنٹ بہترین ہے جس میں انسان کے مختلف روپ نظر آتے ہیں۔ اسلوب بھی نہایت سادہ ہے، دلچسپ انداز کا یہ افسانہ پردیسی کے فن کے عروج کو ظاہر کرتا ہے۔ یہ افسانہ طنزیہ انداز میں لکھا گیا ہے۔

> ''امام صاحب نے جوتی اتار دی۔ لاٹھی ایک طرف کو رکھ دی اور کھڑکی کے برابر بیٹھ گئے انہیں بہت ملال تھا کہ کچھ نمازی چوغے کا خیال کیے بغیر ہی چل رہے تھے، ایسے لوگوں کو نہ خدا کا خوف ہوتا ہے اور نہ اوروں کی مفلسی سے ہمدردی۔ مگر یہ ہو بھی کیسے سکتا ہے، دنیا نفسا نفسی کا دوسرا نام ہے'' ۲۵

جھنجھنا:

''جھنجھنا'' مصنف کا مزاحیہ لہجے میں لکھا ہوا اپنی نوعیت کا پہلا افسانہ ہے۔ ''جھنجھنا'' ایک پنڈت گھرانے کی کہانی ہے جس پر بھگوان نے تمام نعمتوں کا نزول کیا تھا۔ اس گھر میں امن واشتی، اتحاد اتفاق اور ایک دوسرے کی فرماں برداری نے جیسے ڈیرا ہی ڈالا تھا۔ اس پنڈت گھرانے میں تین بھائی تھے۔ بڑا بھائی واسو دیو، جس کا کام دن بھر گاؤں میں آوارہ گھومنا تھا، گاؤں میں ہر فتنے اور لڑائی کے پیچھے واسو دیو کا

ہاتھ ضروری ہوتا تھا۔ اس کے بعد آفتاب رام تھا، جس کی ایک دوکان تھی لیکن آفتاب رام شرافت سے کم اور گالی گلوچ سے زیادہ کام لیتا تھا۔ سب سے چھوٹا بھائی گنگا دھر تھا، جو شہر میں نوکری کرتا تھا اور آج وہ ٹھیک چار مہینے کے بعد شیوراتری کا تہوار منانے گھر آیا تھا۔ گنگا دھر بہت ہی فرمانبردار اور مخلص تھا اور ہر مہینے کی تنخواہ گھر بھیجتا تھا۔ گھر کا ماحول اس طرح کا تھا کہ چار مہینے کے بعد لوٹنے پر بھی وہ اپنے بیٹے کو گلے نہیں لگا سکا۔ اگرچہ بچے نے اپنے باپ کو پہچان بھی لیا تھا لیکن گنگا دھر کہاں سے وہ شکتی لاتا اور اپنے بڑے بھائیوں کے سامنے اپنے بیٹے کو گلے لگاتا لیکن جب وہ شام کو اپنے کمرے میں چلا گیا تو اس نے اپنی بیوی اور بچے کو بہت پیار دیا اور اندر کی جیب میں رکھا ہوا جھنجھنا بھی بیٹے کو دیا اور اپنی بیوی کو چیزوں کے بدلے میں دو روپیہ کے نوٹ سے خوش کیا لیکن اس پر گنگا دھر نے بہت ہی تلقین سے اپنی بیوی کو سمجھایا ان چیزوں کے بارے میں کسی بھی گھر والے کو کانوں کان خبر نہ ہو۔ لیکن مصیبت کب پوچھ کے آتی ہے اسی صبح اپنے بڑے بھائی کے پیروں کے سامنے بیٹھا تھا، کہ اتنے میں گنگا دھر کے بیٹے نے سب کی نظروں سے بچا کر جھنجھنا نیچے لایا اور سب کو دکھایا لیکن اتنی سی بات تھی کہ عورتوں نے سینہ پیٹنا شروع کیا اور سبھی لوگ حیران و پریشان ہوئے اور واسودیو کا غصہ آسمان چڑھنے لگا اور حقہ پیتے پیتے زہریلے لہجے میں کہا کہ لونڈے کو شہر کی ہوا لگ چکی ہے اور اب اس گھر میں اتفاق قائم نہیں رہ سکتا۔ تین دن تک گنگا دھر کے ساتھ کسی نے بات تک نہیں کی اور چوتھے دن وہ صبح سویرے گھر سے نکل کر شہر کی طرف چل دیا اور اسطرح معمولی جھنجھنے نے گنگا دھر کی عزت گھر کے اتحاد و اتفاق اور فرمانبرداری کو مٹی میں ملا دیا۔

افسانے میں کئی واقعات پیش کئے گئے ہیں جن سے سماج کے مختلف طبقوں اور امورات کی واضح نشاندہی ہوتی اور حقیقت کا پتہ چلتا ہے۔ مختصراً یہ کہنا بے جا نہ ہوگا

کہ یہ افسانہ ہماری وادی کے پنڈت طبقے کا بہترین عکاس ہیں۔

بہتے چراغ:

''بہتے چراغ'' پریم ناتھ پردیسی کے آخری افسانوی مجموعہ کے آخری افسانے کا نام ہے۔افسانہ میں جنگ اور امن کی دائمی صورت حال کا جائزہ لیا گیا ہے ۔افسانے میں کشمیر کے سیاحتی ماحول اور سرگرمی کے ساتھ ساتھ دوسری عالمگیر جنگ کے اثرات کی تباہ کاریوں کی تفصیل بھی ملتی ہے۔افسانے کا مرکزی کردار ''پرپھول'' ہے، جوفوج کا کپتان ہوتا ہے۔جس نے فوج میں بہت سے کارنامے انجام دیئے ہیں لیکن اس کے باوجود وہ فوج سے بہت تنگ آچکا ہے کیونکہ اس نے بہت نزدیک سے جنگ کی تباہ کاریوں کو دیکھا ہے کہ کس طرح جنگ سے کھیتوں کے کھیت اور ملکوں کے ملک تباہ ہوتے ہیں اور انسانی جانیں ضائع ہوجاتی ہیں اور اسی لیے ''پرپھول'' جنگ سے لوٹ کر اپنی بیوی نلنی کے ساتھ کشمیر میں چھٹیاں منانے آتا ہے۔اس کے بغل والے ہاؤس بوٹ میں ایک بمبئی کا سیٹھ اپنے درجن بھر بچوں اور بیوی کے ساتھ رہتا ہے۔یہ سیٹھ ہمیشہ چاہتا ہے کہ دنیا میں جنگ جاری رہے۔کیونکہ اس نے پچھلی جنگ میں لاکھوں روپیہ کمائے ہیں۔پرپھول اور سیٹھ کے مابین ہمیشہ اس موضوع پر بحث ہوتی۔افسانے میں ملہ قادر ہانجی پرپھول اور اس کی بیوی نلنی کو کشمیر میں امن اور آپسی بھائی چارے کے قصے سناتا ہے۔جس میں لل دید، شیخ العالم اور حبہ خاتون کی کہانیاں قابل ذکر ہیں۔ ملہ قادر کے برتاؤ نے بنگالی جوڑے پر ایک چھاپ ڈال دی تھی۔اسی اثنا میں ملہ قادر نے نلنی کو دریا میں گھی کے چراغ جلانے کا بھید بھی بتایا کہ جو بھی شخص عقیدت کے ساتھ چراغ جلا کر ڈل میں ڈالتا ہے اس کے من کی مراد پوری ہوجاتی ہے۔اس پر پہلے نلنی کو یقین نہیں ہوا لیکن بعد میں اس نے ملہ قادر کو اپنی

دیرینہ خواہش بتائی کہ شادی کے چھ برس ہونے کے بعد بھی اس کی کوک نہیں بھری۔ جس پر ملہ قادر نے اس کو گھی کے چراغ جلانے کا مشورہ دیا۔ اگر چہ کپتان نے نلنی کے اس کام پر اس کا بہت مذاق اڑایا لیکن اس نے طے کیا کہ وہ بالکل ٹھیک شام کو گھی کے چراغ جلائے گی۔

یہ بات جب سیٹھ نے سنی تو اس نے بھی گھی کے چراغ منگوا کر ڈل میں ڈال دیئے تا کہ دنیا میں جنگ قائم ہو اور امن کبھی نہ قائم ہو سکے۔ لیکن پرپھول کو جب پتہ چلا کہ سیٹھ نے بھی جنگ کی خاطر چراغ جلائے تو اس نے چھت سے ہی اس کے چراغ پر اپنے پستول سے نشانہ سادھا۔ چراغ بجھ گیا اور دریا میں ڈوب گیا۔ جس پر سیٹھ نے پرپھول کو بہت گالیاں دیں اور پرپھول اپنے چھت پر ہنستا رہا۔ اور آخر میں کہہ دیا کہ سیٹھ دنیا کو جنگ کی نہیں امن کی ضرورت ہے اور اب جنگ کے چراغ نہیں جلیں گے۔

جنگ اور امن کے علاوہ یہ افسانہ ہم کو کشمیری تہذیب اور عقیدت کے بارے میں روشناس کراتا ہے۔ مثلاً اس افسانے میں پردیسی بوڑھے ہانجی ملہ قادر کا تعارف کچھ اس طرح سے دیتے ہیں:

> ''اس دوران ملہ قادر پرپھول اور اس کی بیوی کی زندگی کا ایک اہم جز بن گیا۔ وہ انہیں ہر شام کشمیر کے ماضی کی کہانیاں سناتا۔ بڈشاہ اور للتادتیہ کی کہانیاں، لالہ عارف اور شیخ العالم کی کہانیاں، حبہ خاتون اور ارنہ مال کی کہانیاں۔ وہ کہانیاں جن میں محبت ہی محبت اور امن ہی امن ہے چنانچہ ساٹھ سالہ بوڑھا بھی انہیں اوپر سے نیچے تک امن اور محبت کا مجسمہ دکھائی دے رہا تھا۔ جس کے دل میں غریبی کے باوجود لالچ نہیں وہ جو کچھ بوٹ کے

کرائے سے کماتا اس پر قانع تھا۔"۲۶؎

دیگر افسانے (جو افسانوی مجموعوں میں شامل نہیں ہیں)

اس کے علاوہ بہت سے ایسے افسانے ہیں جو کسی بھی مجموعے میں شامل نہیں ہوئے ہیں لیکن بڑی عرق ریزی سے خاکسار نے ان کو مختلف اخبارات ورسائل کی پرانی اور گرد آلود فائلوں سے حاصل کیا ہے۔ جن میں یہ افسانے شامل ہیں۔

1-	کیچڑ کا دیوتا	مئی ۱۹۴۶ء	ماہنامہ ساقی
2-	خون اور سکّے	یکم جولائی ۱۹۴۷ء	ماہنامہ آج کل
3-	ذبح خانہ	مارچ اپریل ۱۹۵۲ء	ششماہی شاہراہ
4-	ڈاک گھر کے پاس	جون ۱۹۴۵ء	ماہ نامہ ہمایوں
5-	آنسو اور چھری	اپریل ۱۹۵۱ء	ماہنامہ شاہراہ
6-	بنفشہ کے پھول	جنوری فروری ۱۹۵۴ء	سالنامہ شاہراہ
7-	سوال	اکتوبر ۱۹۴۵ء	ہمایوں ماہ نامہ
8-	ایک پیسہ	جولائی اگست ۱۹۵۲ء	شاہراہ
9-	پتری جنم	۱۹۸۹	ہفتہ روزہ رنبیر
10-	جواری	۱۹۸۹	ایضاً
11-	ناکام مصور	۱۸ جیٹھ ۱۹۸۹	رنبیر جموں
12-	شاعر کی شادی	۲۶، بیساکھ ۱۹۸۹	ایضاً
13-	جنازے	۱۴/ بھادوں ۲۰۰۰	ایضاً
14-	معمہ	مئی ۱۹۴۴ء	ایضاً
15-	کیا پایا کیا کھویا		ایضاً

16-	آتشین لمحے		ایضاً
17-	دو آنسو	۷ساون ۱۹۸۹	رنبیر۔کرشن نمبر خاص
18-	مدفون خزانہ	۲۸/بیساکھ ۱۹۸۹	ایضاً
19-	بیگار	۸ بھاگن ۱۹۹۵	رنبیر جموں
20-	سچی پرارتھنا	۱۱/اپریل ۱۹۳۹ء	ایضاً
21-	نقاب پوش حسینہ	۲۲ چیت ۱۹۸۹	ایضاً

اس کے علاوہ برج پریمی نے بھی کئی افسانوں کا تذکرہ کیا ہے۔جن میں کئی افسانے بسیار تلاش کے بعد بھی نہیں ملے۔

برج پریمی نے جن افسانوں کا تذکرہ کیا ہے وہ حسب ذیل ہیں:

نمبر	نام افسانہ	تاریخ۔صفحہ	ماہنامہ/روزنامہ/رسالہ
1-	آنسو اور چھری	اپریل ۱۹۵۱۔ص ۶۱	ماہنامہ شاہراہ
2-	بنفشہ کے پھول	سالنامہ جنوری فروری ۱۹۵۴ء	ایضاً
3-	وہ تینوں	ترقی پسند نمبر جلد ۱۹ نمبر ۵۔۶	ماہنامہ شاہکار لاہور
4-	بڑا دل	افسانہ ایڈیشن ۱۹۳۲ء	روزنامہ سیلاب
5-	سچی پرارتھنا	اپریل ۱۹۳۲ء۔ص۔۳۶	ہفتہ روز رنبیر
6-	مدفون خزانہ	۱۹۳۲ء صفحہ ۳۰	ایضاً
7-	ناکام مصور	مئی ۱۹۳۳ء۔ص۔۳۳	ایضاً
8-	کیچڑ کے دیوتا	مئی ۱۹۴۶ء	ساقی
9-	پل	مئی ۱۹۴۶ء	ساقی
10-	پارے کی پوتی	۱۹۴۶ء	ساقی
11-	دیہاتی گیت	جنوری ۱۹۳۶ء	ایضاً

12- تمھارا گھر	جنوری ۱۹۳۶ء	ایضاً
13- حسین موت	ایضاً	ایضاً
14- پوجاری	ستمبر ۱۹۳۶ء	ایضاً
15- تم	جنوری ۱۹۳۶ء	ایضاً
16- ملنے کے دن	اکتوبر ۱۹۳۶ء	ایضاً
17- ایک کشمیری گیت	مئی ۱۹۳۵ء	ایضاً
18- دو آنکھیں	اگست ۱۹۳۵ء	ایضاً
19- برہمن کے گیت	نومبر ۱۹۳۵ء	ایضاً
20- پھول	دسمبر ۱۹۳۵ء	ایضاً
21- سازش	جنوری ۱۹۳۹ء	ماہنامہ شاہکار لاہور
22- ہائے دنیا	فروری ۱۹۳۹ء	ایضاً
23- نابینا گویا	ستمبر ۱۹۳۹ء	ایضاً
24- بن مالا	جون ۱۹۳۶ء	روزنامہ میلاپ
25- اپنے چاند سے	مارچ ۱۹۳۴ء	روزنامہ کرم ویر
26- نیا گیت	ڈسمبر ۱۹۳۴ء	میلاپ لاہور
27- ایک رات	بست نمبر ۱۹۳۷ء	ایضاً
28- بڑا دل	ستمبر ۱۹۳۶ء	ایضاً
29- پہلا تیر	۲۹ ستمبر ۱۹۳۵ء	ایضاً

نمبر	افسانہ	تاریخ	رسالہ / کیفیت
30-	رانی کا مندر	ستمبر ۱۹۳۵ء	ایضاً چار افسانہ نویسوں کا لکھا ہوا افسانہ۔ پردیسی۔ رنبیر۔ امپریشن۔ اور بن بائی کا لکھا ہوا مشترکہ افسانہ
31-	اس پار	اپریل ۱۹۳۶ء	ایضاً
32-	رادھا کا ہار	۱۹۳۷ء	رنبیر جموں۔
33-	بابا جی	مئی ۱۹۳۶ء	میلاپ لاہور
34	سنگم	فروری ۱۹۳۶ء	ایضا
35-	شہید کے مزار پر	دسمبر ۱۹۳۴ء	ایضاً
36-	بغاوت کی سزا	دسمبر ۱۹۳۷ء	روزنامہ مارتنڈ
37-	چند خطوط	جنوری ۱۹۳۸ء	ایضاً
38-	موت کا خواب	جنوری ۱۹۳۸ء	ایضاً
39-	اندر اور باہر	دسمبر ۱۹۳۷ء	ایضاً
40-	آواز	ایضاً	روزنامہ مارتنڈ
41-	جے ہنومان	فروری ۱۹۳۸ء	ایضاً
42-	حسنیٰ	۱۹۳۸ء	ایضاً
43-	مرگھٹ	۱۹۳۸ء	ایضاً
44-	فنا کا رقص	۱۹۳۸ء	ایضاً
45-	سندھیا کا شراپ	اپریل ۱۹۳۸ء	ایضاً
46-	اُجرت	اپریل ۱۹۳۸ء	ایضاً
47-	چتائیں	جنوری فروری ۱۹۴۲ء	ماہنامہ بہار کشمیر لاہور

48-	روندی ہو کلیاں	مارچ ۱۹۴۲ء	ایضاً
49-	روندی ہوئی کلیاں	جولائی ۱۹۴۲ء	ایضاً
50-	افسانہ	ستمبر ۱۹۳۴ء	میلاپ لاہور
51-	یتیم کے آنسو	ستمبر ۱۹۳۶ء	میلاپ لاہور
52-	اُجڑے مندر کے باہر	ستمبر ۱۹۳۶ء	میلاپ کرشن نمبر ا

حوالہ جات:

۱: شام وسحر۔ پریم ناتھ پردیسی، ص ۸۔۷، ۱۹۴۱ء

۲: شام وسحر۔ پریم ناتھ پردیسی، ص ۱۳، ۱۹۴۱ء

۳: پریم ناتھ پردیسی: عہد، شخص اور فنکار۔ برج پریمی۔ ص ۸۴

۴: راجو کی ڈولی (افسانہ)، از شام وسحر، ص ۲۲

۵: چونی (افسانہ)، از شام وسحر، ص ۶۴

۶: انسان ساز (افسانہ)، از شام وسحر، ص ۱۰۷

۷: پیش لفظ...... ''دنیا ہماری''۔ پریم ناتھ پردیسی، ص: ۱۶

۸: اگلے سال (افسانہ)، از ''دنیا ہماری''، ص ۱۴۱

۹: میرا حق (افسانہ)، از ''دنیا ہماری''، ص ۵۱

۱۰: میرا حق (افسانہ)، از ''دنیا ہماری''، ص ۶۴

۱۱: اکتشاف واستدلال، مرتبہ، مصرہ مریم، ص: ۱۸۰

۱۲: کاریگر (افسانہ)، از ''دنیا ہماری''، ص: ۱۰۱

۱۳: سائڈلائین (افسانہ)، از ''دنیا ہماری''، ص: ۱۲۰

۱۴: چٹائیں (افسانہ)، از ''دنیا ہماری''، ص؛ ۱۶۹

۱۵: لباس تلے (افسانہ)، از ''دنیا ہماری''، ص؛ ۱۸۲

۱۶: پردیسی: عہد، شخص اور فنکار، از برج پریمی، ص؛ ۹۷

۱۷: پیش لفظ از احتشام حسین، بہتے چراغ، ص: ۱۴۔۱۳

۱۸: پیش لفظ از احتشام حسین، بہتے چراغ، ص: ۱۴۔۱۳

۱۹: دھول (افسانہ)، از بہتے چراغ، ص: ۳۱

۲۰: دھول (افسانہ)، از بہتے چراغ، ص: ۹۲

۲۱: ان کوٹ (افسانہ)، از بہتے چراغ، ص: ۱۰۴

۲۲: سوغات (افسانہ)، از بہتے چراغ، ص: ۱۱۲

۲۳: سیلز مین (افسانہ)، از بہتے چراغ، ص: ۱۲۳

۲۴: دیوتا کہاں ہے (افسانہ)، از بہتے چراغ، ص: ۲۱۷

۲۵: امام صاحب (افسانہ)، از بہتے چراغ، ص: ۲۳۸

۲۶: بہتے چراغ (افسانہ)، از بہتے چراغ، ص: ۲۹۰

............☆☆☆............

ڈاکٹر محمد افضل میر

راجو کی ڈولی

میں نے تمہارے چرنوں میں سب کچھ رکھا
صرف تمہاری میٹھی سی یاد اپنے ساتھ لے لی
(ٹیگور)

راجو کی ڈولی

سورج ڈوب چکا تھا۔ ناٹک کے پردوں کی طرح گاؤں کے چھوٹے سے سٹیج پر شام دھیرے دھیرے پھیل رہی تھی۔ جس سے درخت۔ پہاڑ ندیاں اور جھرنے سب چھپے جا رہے تھے۔

رمضان نے آہستہ سے آنگن کا دروازہ کھولا۔ اور اندر داخل ہوا۔ کھانسنے کی آواز پہچانتے ہی اُس کی ننھی پوتی نے اُچھل کر کہا ''لالہ''

رمضان نے چپ چاپ دروازہ بند کیا۔ بولا کچھ بھی نہیں، ننھی کی آواز سن کر رمضان کی بیوی ڈوڑتی'' ڈوڑتی آئی۔ آنگن میں پہنچ کر بولی۔ ''کیا ہوا آج''؟

رمضان نے گلے سے ڈوپٹہ اُتارتے ہوئے بے پروائی سے کہا۔ ''خدا اچھا ہی کریگا شاید۔ فیصلہ کل پر رہا'' بیوی نے دونوں ہاتھ اوپر اٹھائے۔ اور تاروں بھرے آسمان کی طرف نظریں جما کر بولی۔ ''یا خدا!''

رمضان اوپر چلا گیا۔ تو ننھی پوتی نے پاس آکر پوچھا۔ '' لالہ ڈولی نہیں لائے''؟ جوان بیٹے کے مرنے کے بعد جس چیز کو دیکھ دیکھ کر رمضان اور اسکی بیوی جیتے تھے وہ ان کے بیٹے کی نشانی یہی ننھی راجو تھی۔

رمضان کا دل اداس تھا۔ پھر بھی ضبط کر کے بولا۔ اگر لائی ہو۔ تو کیا دوگی ہمیں'' راجو نے ندی کے کنارے سے نہ جانے کب ایک سفید اور گول کنکر اٹھایا تھا

جسے وہ پیرہن کی جیب میں سنبھال کر رکھتی تھی۔ اسی کو نکالتے ہوئے بولی ''یہ''

رمضان بے اختیار کھلکھلا کر ہنس پڑا۔ بڑے صندوق کی اوٹ میں رسوئی کے پاس راجو کی بیوہ ماں کھڑی تھی۔ اپنی بیٹی کا تحفہ دیکھ کر وہ بھی مسکرائی۔ لیکن اس کی مسکراہٹ اور رمضان کی ہنسی میں زمین اور آسمان کا فرق تھا۔ ماں کی مسکراہٹ میں ماتا چھپی تھی اور دادا کی ہنسی میں درد!

رمضان تھوڑی دیر کے لئے سارا غم بھول گیا۔ بولا ''اچھا بیٹا۔ یہی سہی!'' راجو نے کہا ''لاؤ ڈولی'' رمضان نے کہا ''ابھی نہیں۔ کل صبح۔ لیکن یہ تو بتاؤ۔ ڈولی میں بیٹھے گا کون؟''

راجو نے معصوم انداز میں کہا ''میری گڑیا'' رمضان نے کہا ''اچھی بات ہے۔ جب صبح ہوگی۔ تو ڈولی آئے گی۔''

اس بات سے راجو کا ننھا سا دل جیسے ایک چٹان دب گیا۔ وہ خاموش ہوگئی اس کی معصوم آنکھوں سے معلوم ہونے لگا۔ جیسے کسی نے اس کا سارا چین چھین لیا۔

اور اسی رات رمضان کی بیوی اور بہو خوش تھیں۔ انہیں یقین تھا۔ مالک صاف بچ جائے گا۔ لیکن دوسری طرف رمضان اور راجو اداس تھے۔ راجو اس لئے کہ اسکی ڈولی نہ آئی تھی۔ اور رمضان اس لئے کہ اس کے ماتھے پر کلنک کا ٹیکہ لگ رہا تھا۔ روٹی کھانے کے بعد اس نے مٹی کا دیا سامنے لاکر رکھا۔ اور قرآن شریف پڑھنے لگا۔ پڑھتے پڑھتے اس کا جسم ایک نامعلوم خوشی اور مسرت سے جھوم رہا تھا۔ جب قرآن شریف پڑھ چکا۔ تو آدھی رات ہوگئی تھی۔ بیوی بہو اور راجو سو گئے تھے!۔

باہر چاندنی گیہوں کے لہلہاتے کھیتوں میں دیوانی ہو رہی تھی۔ آسمان پر کہیں کہیں بادل کے ٹکڑے آدمیت سے خالی لفنگوں کی طرح قدرت کی دوشیزہ کو دیکھ کر ایک ہی جگہ جم سے گئے تھے!

رمضان نے دیا بجھایا دیا۔ اور آہستہ سے نیچے اُترا۔ آج نہ جانے کیوں اسے آباد اجداد کا مکان اور باغیچہ دل کھول کر دیکھنے کی خواہش ہو رہی تھی۔ آلوچہ اور خوبانی کے خوبصورت درخت جو اس کے جواں بیٹے نے باغیچے میں لگائے تھے۔ اس چاندنی میں پھولوں سے سجے شہزادوں کی طرح کھڑے تھے۔ اور اپنے مالک کو دیکھ کر ان کی پنکھڑیوں سے مسکراہٹیں چھن چھن کر فضا میں پھیل رہی تھیں۔ لیکن مالک کی آنکھوں میں حسرت تھی۔ ایسی حسرت جسے چاند کی نورانی کرنیں بھی نہ چھپا سکیں۔

ایک ایک درخت گھوم کر رمضان نے دیکھا۔ دیکھا اور چوما، چوما اور رو دیا۔

۲

رمضان گاؤں کا نائی تھا۔ بال کاٹنے کے علاوہ دوا دارو کا کام بھی کرتا تھا۔ لیکن جس فن میں اسے خاص مہارت تھی وہ دانت نکالنے کا فن تھا۔ دور دور سے مریض آ کر اس کے قدم چومتے۔ لوگ کہتے۔ ''رمضان کے ہاتھ میں جو شفا ہے۔ وہ لنڈن ڈنٹس ڈاکٹروں کی قسمت میں کہاں؟ دن بھر شہر میں دکانوں پر بیٹھ کر مکھیاں مارا کرتے ہیں۔ اور رمضان کو دیکھو۔ دن بھر جمور لئے رہتا ہے۔ کراہتے ہوئے آنے والے بیمار مسکرا مسکرا کر واپس لوٹ جاتے ہیں۔ اور سب سے بڑی بات یہ ہے کہ رمضان کسی سے کچھ مانگتا نہیں۔ جو جسکا جی چاہتا ہے آگے رکھ دیتا ہے!

لیکن پچھلے مہینے جو نہ ہونا تھا۔ وہی ہوا۔ رمضان نے ایک مریض کا دانت نکالا۔ تو جیسے اس کی شہ رگ ٹوٹ گئی۔ خون کے فوارے چھوٹ گئے۔ مریض بے ہوش ہو گیا۔

رمضان اٹی سٹی بھول گیا۔ خون کسی طرح نہ رک سکا۔ مریض کے وارث برہم ہو گئے۔ رمضان کو پکڑ کر بولے۔ ''قصائی۔ خونی!''

آج تک جس رمضان کو پوجا جاتا تھا۔ آج اُسی کو داڑھی سے کھینچ کر گھسیٹا

جارہا تھا۔ کچھ ان میں ایسے بھی جوشیلے جوان تھے۔ جو بھاگ کر پولیس میں رپٹ لکھوانے گئے۔

بیمار کو چارپائی پر اٹھا کر لے گئے۔ تو پولیس آ گئی۔ رمضان کی آنکھوں میں اندھیرا چھا گیا۔ بہو اور اسکی بیوی چھاتیاں پیٹتی رہ گئیں۔ اور پولیس رمضان کو لے گئی۔ کچھ دنوں کے بعد تحقیقات ہونے لگی۔ پولیس نے رمضان کا چالان ضرب شدید میں کر دیا۔ انہوں نے اپنی رپورٹ میں لکھا۔ کہ ''نا تجربہ کار انائی مدت سے بھولے بھالے دیہاتیوں پر چھریاں چلا رہا ہے''؟

۳

عدالت میں رمضان نے صاف صاف کہہ دیا۔ جو ہوا تھا۔ اس سے عدالت کو معاملہ سمجھنے میں دقت نہ آئی۔

رمضان کو یقین تھا۔ کہ جو کام پولیس میں روپے کر سکتے تھے۔ وہ عدالت میں محض سچائی کا اظہار کریگا۔ لیکن اسے معلوم نہ تھا۔ قانون کی باریک نظروں میں جرم جرم ہی ہے۔ اور سچائی سچائی۔ دونوں اپنی اپنی جگہ اور اپنا اپنا مرتبہ رکھتے ہیں۔ نہ سچائی کو ظاہر کرنے سے مجرم بچ سکتا ہے اور نہ مجرم کے انکار سے صداقت چھپ سکتی ہے۔

چالان ہونے کے بعد جب رمضان پہلی پیشی پر حاضر ہونے کے لئے گھر سے نکلا تھا تو دور تک اس کی بیوی اور بہو دیکھتی رہیں۔ اور راجو۔ وہ کہتی رہی۔ لالہ آج مٹی کی ڈولی لانا''۔

کبھی کبھی راستے میں بھی رمضان کو ایک طرف سے ماما اور محبت کھینچ رہی تھی۔ اور دوسری طرف قانون!۔ اور آج مقدمہ کی کاروائی ختم ہو گئی تھی۔ کل کا دن فیصلہ سنانے کے لئے مقرر تھا۔

دوسرے دن صبح جب وہ گھر سے چلا۔ تو دور پہنچ کر اس نے حسرت بھری

نظروں سے اپنے مکان اور باغیچے کو دیکھا۔

بیوی، بہو اور راجو سب اسے جب تک دیکھتے رہے۔ جب تک کچی سڑک سے ہوتے ہوئے وہ نظروں سے اوجھل ہو گیا۔ گاؤں کے بیکار لونڈے اور رمضان کے کچھ قدر دان بھی کچہری میں پہنچ گئے تھے۔ اسوقت تک رمضان کو وشواس تھا۔ کہ بری ہو جائے گا۔ کیونکہ اسے گمان تھا۔ کہ وہ بلا معاوضہ بنی نوع انسان کی خدمت بجالا رہا ہے۔ جس کیلئے اسے نہ قانون کچھ دیتا ہے اور نہ گاؤں کے باسی!

لیکن جب کرسی پر بیٹھے ہوئے منصف نے گھمبیرتا سے رمضان کو مخاطب کر کے کہا۔ ''تم نے بہت بڑا جرم کیا!'' تو رمضان کی آنکھیں کھل گئیں۔ منصف نے پھر کہا۔ ''بڑھاپے کو پیش نظر رکھتے ہوئے تین مہینے کی قید سخت دیتا ہوں۔ شکر کرو بیمار بچ گیا۔ نہیں تو۔۔۔؟''

رمضان کے ہاتھوں کے طوطے اُڑ گئے۔ جس سہارے پر وہ اس وقت تک کھڑا تھا۔ وہ دھڑم سے ٹوٹ کر گر گیا۔ اسے اپنے گاؤں پر۔ اپنے فن پر غصہ آیا۔ لیکن قید کے خوف سے غصہ ابھرا نہیں۔ چہرے کی جھریاں گہری پڑ گئیں۔ آنکھوں کا دائرہ وسیع ہو گیا۔ حیرت سے منصف کی طرف دیکھ کر اس نے کچھ کہنا چاہا۔ لیکن کہہ نہ سکا پولیس کے ایک کانسٹبل نے اسے ہتھکڑیاں پہنا دیں اور لے چلا۔

راستے میں جدھر سے ہتھکڑی پہنے ہوئے رمضان کو لیا گیا۔ کھلونوں کی دکانیں تھیں۔ رمضان کو یاد آ گیا۔ ''لالہ۔ آج مٹی کی ڈولی لانا''۔ ایک بار اس نے کانسٹبل سے کہا۔ ''مجھے ڈولی لینے دو۔ راجو انتظار کر رہی ہوگی''۔

کانسٹیبل ہنس پڑا۔ بولا۔ ''احمق۔ جا رہا ہے جیل کو۔ اور شوق ہے ڈولی کا!''۔ رمضان کی روح رونے لگی۔ سر نیچے کئے ہوئے وہ چلا گیا۔ خیالات کے منجدھار میں اسے ساری دنیا ڈوبتی ہوئی دکھائی دینے لگی۔ ایک بار پھر آہستہ سے اس

نے پوچھا۔ ''بھائی۔ تین مہینے کتنے ہوتے ہیں؟''

کانسٹیبل بدمزاج تھا۔ جھلا کر بولا۔ '' تین ہی مہینے اور کتنے ؟۔ کیا بھولی باتیں کررہے ہو؟ جیسے کچھ جانتے ہی نہیں !''

۴

شام کو رمضان کے گھر میں یہ خبر پہنچی۔ تو کہرام مچ گیا۔ اس کی بیوی نے سر کے سارے بال نوچ لئے۔ بہو کے دل میں خاوند کی موت کا جو زخم تھا۔ آج دوبارہ چھل گیا۔ اور راجو۔ وہ معصوم ننھی لڑکی۔ اسے کیا معلوم۔ 'لالہ'۔ کدھر گیا۔ وہ اس دن دیر تک آنگن میں بیٹھی۔ لالہ کا انتظار کرتی رہی۔ لیکن لالہ نہ آیا۔ اور نہ ڈولی !۔

یہ حالت زیادہ دیر نہ رہی۔ دلاسا دینے والوں نے کہا۔ ''کیا ہوا'' رمضان کہیں گیا تو نہیں۔ تین مہینے کے بعد پھر آئیگا۔ اگر چاہتے ہو تو اپیل کردو''۔ لیکن ان کے پاس روپے نہ تھے۔ اپیل کی خواہش دھری کی دھری رہ گئی۔ بات آئی گئی ہوئی !۔

رمضان کو جیل میں ایک مہینہ گزرا تھا۔ ایک دن ساس نے بہو سے کہا۔ ''کہو تو کل'' مالک سے مل آئیں۔ سنا ہے۔ جیل میں ملاقات ہوسکتی ہے''،

بہو نے کہا۔ ''میں کیسے چلوں۔ جو دیکھے گا وہ کیا نام نہ دھریگا؟''

ساس چپ ہوگئی۔ بہو کی بات میں کافی معقولیت تھی۔

ساس نے تھوڑی دیر کے بعد پھر کہا۔ '' خیر۔ میرے پاس پانچ روپے ہیں خرچ بھی ہوں گے۔ تو کافی ہیں اور دیکھنا میرے بعد ذرا خبرداری سے رہنا میں راجو کو بھی لے جاؤنگی۔ مالک کو مارے اس کی محبت کے ہول ہوتا ہوگا۔ اسے دیکھ کر پیاس تو بجھ جائیگی اس کی''۔

۵

رمضان کی آنکھوں میں آنسو تھے۔ اس کے دل میں محبت کا بے پناہ سمندر

ٹھاٹھیں مار رہا تھا۔ سفید وردی پہنے ہوئے سلاخوں کے پیچھے کھڑی قیدی کی روح کھال سے پھٹ کر باہر نکلنا چاہتی تھی۔ اور سلاخوں کے باہر حیران نظروں سے معصوم بچی اپنے بھیانک 'لالہ' کو دیکھ رہی تھی۔

یہ رمضان نے بھرائی ہوئی آواز میں کہا۔ "راجو!" راجو نے زبان سے نہیں بلکہ آنکھوں کی حیرت سے کہا۔ "ہاں لالہ"۔

رمضان نے پھر کہا۔ "ڈولی لوگی؟"

بچوں کی فطرت بھی کیا پاکیزہ ہوتی ہے۔ راجو سارا خوف بھلا کر بولی۔ "نہیں تو لالہ"۔ لالہ کا لفظ راجو کی زبان سے رمضان نے سنا تو اس کی آنکھوں اپنے آپ ہی تھوڑی دیر کے لئے بند ہو گئیں۔ ایک کی مامتار پر دوسری کا پیار غالب آیا۔ جسے دیکھ کر دور کھڑا پہرے دار بھی رو پڑا!"

رمضان نے کہا "لے جاؤ اسے میں مر جاؤنگا!"

اسکی بیوی کی آنکھوں سے آنسوں کی ندی بہہ رہی تھی۔! رمضان نے پھر کہا۔ "لے جاؤ۔ خدا کے لئے مجھ پر رحم کرو"۔

جب راجو کو دادی واپس لے چلنے لگی۔ تو راجو نے پوچھا۔ "لالہ نہ آئیگا ماں؟" لالہ یہ سنکر جلد جلد اپنی کوٹھری کے اندر چلا گیا۔ اور سنتری نے دروازہ بند کر دیا۔

٦

قید سے چھوٹ کر جب رمضان گھر آیا۔ تو وہاں نہ راجو تھی نہ راجو کی ماں! بیٹی کی طرح پالی ہوئی بہو کی بے اعتنائی سے اسے دھکا سا لگا۔ اسے آج معلوم ہوا کہ بیٹی اور بہو میں کتنا فرق ہوتا ہے۔ بہو چھاتی کا گوشت کھا کر بھی بیٹی نہیں ہو سکتی اور بیٹی دھتکاری جانے پر بھی بیٹی ہی رہتی ہے۔ اس کی بیوی نے اسے کہا۔ کہ بہو کے ماں باپ نے اس کی دوسری شادی کا انتظام کر دیا۔ اور اسے زبردستی لے گئے۔

شروع شروع میں رمضان کو راجو کی جدائی شاق گزری۔ لیکن جلد ہی اس نے من پر قابو پالیا۔ البتہ جب اسے راجو کی ڈولی یاد آتی۔ تو کلیجہ مسل کے رہ جاتا۔ تین پیسے کی چیز وہ راجو کو نہ دے سکا۔ جواب تک بے گناہ تھی۔ اور جسے دادا پر کافی حق تھا۔ باغیچے میں کام کرتے کرتے جب اسے گناہ اور حق کی بات یاد آتی۔ تو وہ بے تاب ہو جاتا۔ اور اُٹھ کر پاس کی مسجد میں جا کر بیٹھ جاتا۔ اس جگہ اسے عجیب کشش اور شانتی سی محسوس ہوتی۔

ہوتے ہوتے گیارہ برس بیت گئے۔ رمضان کی بیوی بھی مر چکی تھی۔ موروثی مکان میں پہاڑ کی چوٹی پر اُگے ہوئے تنہا درخت کیطرح صرف رمضان ہی رہ گیا تھا۔ اب اس نے سب کچھ چھوڑ دیا تھا۔ زیادہ وقت مسجد کی چٹائی پر گزار دیتا شام ہوتی تو اُٹھ کر چلا جاتا!۔

ایک دن وہ مسجد کی ندی پر وضو کر رہا تھا۔ دوسرا آدمی اس کے قریب وضو کرنے بیٹھا۔ اور بولا۔ ''سنا تم نے؟''

رمضان نے پوچھا ''کیا؟'' اُس آدمی نے کہا لڑکیاں خود اپنے لئے شوہر پسند کرتی ہیں۔''

رمضان نے کہا۔ ''لاحول لاقوۃ!'' اس آدمی نے کہا۔ ''اور ان کے والدین بڑے فخر سے کہتے ہیں۔ تعلیم میں روشنی ہے!''

رمضان نے کہا۔ ''یہ کافروں کا کام ہے مسلمان عورتیں پردے کی شہزادیاں ہیں''۔ اس آدمی نے کہا۔ ''بھائی مسلمان یہ کرنے لگے۔ مسلمان! اعتبار نہ ہو۔ تو سرائے پور کے رحیم بٹ کے گھر چل کر دیکھ آؤ۔ اسکی بیٹی نے اپنے لئے خود شوہر پسند کیا ہے!''۔

رمضان وضو کرنا بھول گیا۔ اس نے پوچھا۔ ''ایں۔ سرائے پور کے رحیم

بٹ کی بیٹی؟۔"

اس آدمی نے کہا۔"ہاں۔یہی تو کہہ رہا ہوں"۔

رمضان جلد اُٹھا۔اور نماز پڑھے بغیر ہی اپنے مکان کو چل دیا۔

شام ہو رہی تھی۔وہ باغیچے میں ایک آلوچے کے درخت کے نیچے بیٹھ گیا۔ مسجد سے موذن اذان دے رہا تھا۔لیکن رمضان کے دل میں نہ جانے کون اذان دے رہا تھا۔باغیچے میں لگے ہوئے درخت اب بہت بڑے ہو گئے تھے۔انہیں دیکھ کر اسے آج پھر بارہ برس کے بعد اپنا جوان بیٹا یاد آ گیا۔آج وہ زندہ ہوتا۔"تو کیا ہوتا۔ ہاں، کیا ہوتا۔؟"

۷

سرائے پورے کے رحیم بٹ کے گھر میں دھوم دھام ہے۔شامیانے اور سائبان لگے ہیں۔گیس لیمپوں کی روشنی میوہ دار درختوں کے پتوں سے چھن چھن کر نکل رہی ہے۔آنگن میں ڈھول۔نقارے اور شہنائیاں بج رہی ہیں۔شامیانے کے نیچے برات کو ٹھہرانے کا انتظام کیا گیا ہے۔سائبان کے نیچے عورتیں گیت گا رہی ہیں۔

رحیم بٹ کے دوست اور رشتہ دار انتظام کرنے میں مصروف ہیں۔بچے اور لڑکیاں خوشی سے ادھر ادھر بھاگی جا رہی ہیں۔آج رحیم بٹ کی اکلوتی بیٹی کا بیاہ ہے!

برات سے کچھ دیر پہلے ایک بوڑھا صحن میں داخل ہوا۔اور ادھر ادھر دیکھنے کے بعد دیوار کے سہارے بیٹھ گیا۔معلوم ہوتا ہے۔بہت دور سے آیا ہے اور تھک کر چور ہو گیا ہے۔انتظام کرنے والوں میں سے ایک نے اسے دیکھا۔اور بھویں تان کر کہا۔"باہر بیٹھو۔ابھی برات چڑھی نہیں۔اور تم لوگ آدھمکے!"

بوڑھے نے کہا۔"میں تھک گیا ہوں۔تھوڑی دیر سستا کر چلا جاؤں گا"۔

اس نے بگڑ کر اس کا نحیف ہاتھ پکڑ لیا۔اور اسے گھسیٹ کر باہر نکال دیا۔

لیکن بوڑھا وہاں نہ بیٹھا۔ اس کے چلے جانے کے بعد وہ پھر اندر آیا اور اسی جگہ بیٹھ کر اندر دیکھنے لگا۔ جہاں دلہن سنواری جارہی تھی۔ اس کا دل بلیوں اچھل رہا تھا۔ ہاتھ پاؤں اور ہونٹ کانپ رہے تھے۔

تھوڑی دیر کے بعد دور سے نقاروں کی آواز سنائی دی۔ عورتوں کے گیت اور اونچے ہوگئے۔ بچے اور بوڑھے مچل کر کہنے لگے۔! "آ گیا دولھا"۔

استقبال کے بعد براتی شامیانے کے نیچے بٹھائے گئے۔ روٹی کھلا کر مذہبی رسوم سرانجام دئے گئے۔ اور جب برات لوٹ کر جانے والی تھی۔ ایک بچے نے دلھن کی ماں کے ہاتھ میں رومال دیتے ہوئے کہا۔ "یہ تمہارا ہے"۔؟

اس نے حیران ہوکر رومال کھولا۔ اٹھنیوں سے بھرا ہوا۔ تب پوچھا۔ "یہ کس نے دیا؟" لڑکے نے کہا۔ "آنگن میں بیٹھے ہوئے ایک بوڑھے بابا نے۔ کہا یہ راجو کی ماں کو دے آنا"۔

دلہن کی ماں نے بے اختیار ہو کر کہا۔ "لالہ" اور دوڑتی نیچے آگئی۔ لیکن جہاں اس لڑکے نے بوڑھے کو دیکھا تھا۔ وہاں وہ نہ تھا۔ لڑکے نے کہا۔ "ابھی یہاں تھا۔ دیوار کے سہارے بیٹھا ہوا۔ اس نے مجھے کہا۔ یہ راجو کی ڈولی کے لئے پیسے ہیں۔"

راجو کی ماں کو تمام باتیں یاد آگئیں۔ اور ان کے ساتھ ہی آنسوؤں کے چند قطرے بھی اسکی آنکھوں سے گر گئے۔

راجو کی ڈولی برات کے ساتھ ایک راستے سے نکل گئی۔ اور دوسرے راستے سے ایک بوڑھا مُڑ مڑ کر دیکھتا ہوا جلد جلد جا رہا تھا۔ نقاروں کی آواز میں اسے اپنا جسم آج ہلکا محسوس ہو رہا تھا۔ آج اپنی ساری پونجی دے کر وہ اس حق کو ادا کر چکا۔ جو بارہ برس پہلے تین پیسے خرچ کر کے ادا ہوسکتا تھا۔!!

..........☆☆☆..........

ماں کا اِحسان

رونق بزم بن گئے لب پہ حکایتیں رہیں
دل میں شکایتیں ہیں لب نہ مگر ہلا سکے
(حفیظ جالندھری)

ماں کا احسان

(۱)

محلے میں سب سے بڑا کنبہ امرتی کا تھا۔ کسے خبر تھی۔ ایک بچے کے لئے ترسنے والی ماں کا گھر کسی دن پوتوں اور پوتیوں سے بھر جائے گا۔ پچاس برس پہلے جب امرتی کی عمر بیس سال کی تھی۔ اس کا بیاہ ایک غریب موچی سے ہوا تھا۔ بیاہ کے دس سال بعد خدا نے اسے نتھو دیا۔ جو آج ایک درجن بچوں کا باپ ہے۔ لیکن خدا کا اتنا فضل ہوتے ہوئے بھی امرتی نے اپنی زندگی میں اچھے دن نہیں دیکھے۔ اپنے خاوند کی زندگی میں بھی سوئی اور دھاگا اس کے ہاتھ سے نہ چھوٹا۔ اور آج ستر سال کی عمر میں بھی جب کہ اس کی بصارت جواب دے چکی ہے۔ وہ آہستہ آہستہ تلیوں کے لئے بانس چیرتی ہے۔!

نتھو اس کی بڑی عزت کرتا ہے۔ وہ جانتا ہے۔ امرتی نے اس کے لئے اپنے شباب میں کیا کچھ کیا ہے۔ لیکن نتھو کی بیوی کو وہ ایک آنکھ نہیں بھاتی۔ جب موقع پاتی ہے۔ دو چار کھری منہ پر سنا دیتی ہے۔ اور پیچھے سو سو نام دھرتی ہے۔ بوڑھی امرتی سب کچھ سن کر ہنستی ہے۔ اور ٹال دیتی ہے۔!

نتھو بے چارہ صبح سے شام تک ایک جوتی سی سکتا ہے۔ شام کو چوک میں بیٹھ کر دس بارہ آنے کما لاتا ہے۔ انہی پیسوں سے اتنے بڑے کنبے کی پرورش ہوتی ہے۔

رات کو بھی ہاتھ پر ہاتھ دھرے بیٹھنا نصیب نہیں ہوتا۔ دیئے کی روشنی میں پرانی جوتیوں کی مرمت کرتا ہے۔ اور جب نیند غالب آتی ہے۔ تو وہیں پھٹی جوتیوں کے ڈھیر ہی پر لمبا لمبا لیٹ جاتا ہے۔ خدا نے بچے تو بہت دیئے ہیں لیکن کوئی اس قابل نہیں جو اس کا ہاتھ بٹائے سب سے بڑا بیٹا جیون شریر بچوں کی صحبت سے منہ پھٹ ہوگیا ہے۔ صبح کا ناشتہ کرتے ہی گھر سے غائب ہو جاتا ہے۔ اور بہت رات گئے واپس آتا ہے۔ کس کی مجال ہے۔ جو اس سے پرخاش کرے۔ جیون اسے وہیں ڈھیر نہ کردے۔؟ اس قدر دلیر اور ڈھیٹ ہو کر بھی وہ ماں کا پیارا ہے۔

(۲)

شام ہو چکی تھی۔ جھونپڑی میں ابھی چراغ نہ جلا تھا۔ نھتو کی بیوی فتیلا جلا کر آئی۔ دیکھا تو امرتی اپنے تلوں پر کچھ مَل رہی ہے۔ چونک کر پوچھا۔ کیا ہے یہ" ؟ امرتی نے کہا۔" کچھ نہیں۔ تلووں میں جلن سی محسوس ہو رہی تھی۔ تھوڑا سا موم لے کر مل رہی ہوں۔" نھتو کی بیوی نے طاقچے پر دیکھا۔ تو موم غائب دیکھ کر کوئلے کی طرح جل کر پوچھا۔" موم کہاں سے لیا؟"

امرتی نے کہا۔" نھتو نے طاقچے پر دھرا تھا۔"

نھتو کی بیوی نے آگ بگولا ہو کر پوچھا۔" اب چراغ میں کیا جلے گا۔؟ موم تو تم نے مل لیا۔ میرے ننھے ننھے بچوں کا خیال تک نہ کیا۔ کہ بیچارے کس روشنی میں بیٹھیں گے۔ کس روشنی میں ٹکڑا کھائیں گے۔؟"

امرتی نے کہا۔" گھبراؤ مت مالتی۔ نھتو آئیگا اور منگالوں گی۔ قحط ہے کیا؟"

نھتو کی بیوی نے کہا۔" اور منگالے گی۔ جیسے یہاں کسی کے باپ دادا کی دولت پڑی ہے۔ کھانے کے لئے پیسہ نہیں۔ اور یہ موم منگالیں گی۔ غضب خدا کا۔ حاتم کی قبر پر لات ماردی۔ میں پوچھتی ہوں۔ تمہیں ان ننھی ننھی جانوں پر ترس نہ آیا؟۔ ستر برس

زندہ رہی۔ اور پھر دیکھو زندہ رہنے کی کیا کیا تدبیریں کر رہی ہو!"

اتنے میں نتھو بھی آ گیا۔ آج اس کی جوتی نہ بکی تھی۔ بیچارہ مایوس ہو کر لوٹا تھا۔ گھر میں قدم رکھتے ہی اندھیرا ہی اندھیرا دیکھا۔ تو نا امیدی پر غصہ غالب آ گیا۔ غصے میں بولا۔ "کوئی جیتا بھی ہے کہ سب مر گئے؟"۔

بیوی پہلے ہی بھری بیٹھی تھی۔ تن کر بولی۔ "کیا ہے؟"

نتھو نے کہا۔ " آج ہی مال نہ بکا۔ اور آج ہی گھر میں قبرستان ہے۔ چراغ تک کسی نے نہ جلایا۔"

بیوی نے کہا۔ "اب اس گھر میں ہمارا گزارہ نہ ہو سکے گا۔ چراغ جلانے ہوں۔ تو مندر میں جا کر جلا آؤ۔ یہاں تو اب لوٹ مچ گئی ہے"۔

نتھو حیران رہ گیا۔ کہ معاملہ کیا ہے۔ سہار سہار کر آگے بڑھا۔ سامنے مٹی کا حقہ تھا۔ ٹھوکر کھا کر ٹوٹ گیا۔ اور چٹائی پر پانی پھیل گیا۔

بیوی نے جھلا کر کہا۔ "کیا ٹوٹ گیا؟"

نتھو نے پیروں سے ٹٹول کر کہا۔ "حقہ۔ کس کم بخت نے اسے یہاں رکھا تھا۔ آنکھیں نہ تھیں کیا؟"

بیوی نے کہا۔ "اب کیا معلوم تھا۔ آج ہی گھر میں پوس کی رات ہوگی۔ جو چیز آگے آئے گی۔ ٹوٹ کر ہی رہے گی"۔

نتھو نے پوچھا۔ "اری کچھ بات بھی ہو۔ تو سنوں۔ یہ چبا چبا کر باتیں کرنے سے کیا مطلب؟ کھل کر کیوں نہیں کہتی؟"

امرتی نے ایک کونے سے آہستہ سے کہا۔ "تم نے وہ ذرا سا موم طاقچے میں رکھا تھا نا۔ وہ میں نے تلووں پر مل لیا۔ بس قیامت آ گئی۔ معاملہ یہی ہے"۔

نتھو نے کہا۔ "اوہ۔ اتنی سی بات پر یہ ہنگامہ اور منگا لیا ہوتا!"

اس کی بیوی امرتی کے اس رویہ سے اور جل گئی۔ بولی۔ ''کیوں میاں؟'' ذرا کیوں؟ پاؤ بھر کہتے شرم آتی ہے۔ کہدو نا سارا موم تلووں کی نذر کر دیا۔ کہ جلن نہ رہنے پائے۔ گھر کی تمام چیزیں ٹوٹتی چلیں ۔تو پروا نہیں۔ بچے دیواروں سے ٹکرائیں۔تو غم نہیں۔ اپنے ستر سالہ تلوے اور سوا ایک برس چنگے بھلے رہنے چاہئیں۔''

نتھو جلدی سے اُٹھا اور موم خریدنے کے لئے بازار چلا گیا۔

(۳)

ماگھ کے مہینے میں جس غضب کے جاڑے پڑے۔ کہ خدا کی پناہ! نیچے زمین پر کافی برف موجود تھی۔ اوپر کڑاکے کی سردیوں نے اسے فولاد بنا دیا۔ چلتے دریا منجمد ہو کر رہ گئے۔ سڑکیں بند ہو گئیں۔ کاروبار مدھم ہو گیا۔ بوند بھر بھی کہیں پانی نہ رہا۔ اور انہی سردیوں کا شکار نتھو بھی ہو گیا۔ بے چارے پر جوتی بیچتے بیچتے سرراہ فالج گرا۔!

گھر میں ایک طرف تنگدستی، دوسری طرف بیماری گھس گئی۔ کچھ دن تو بچے کھچے پیسوں سے نکل گئے۔ جب وہ بھی اُٹھتے اُٹھتے ختم ہو گئے۔ تو سب نے محسوس کیا۔ کہ نتھو بیمار ہے۔ حکیم نے بیمار کو دیکھنا چھوڑ دیا۔ امرتی نے یہ حال دیکھا تو اسکی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ آگے بھی اندھیرا تھا۔ اور پیچھے بھی! آجتک اس نے کسی کے آگے ہاتھ نہ پھیلایا تھا۔ لیکن اب کیا کرے۔ اس کے خاوند نے جب وہ جوان تھی۔ اس کے لئے چاندی کی انگشتریاں بنوائی تھیں۔ امرتی نے سب سے چھپا چھپا کر انہیں آج تک رکھا تھا۔ جب کوئی چارہ نہ دیکھا۔ تو انہی کو لیکر سنار کے پاس گئی۔

سنار نے انہیں پرکھ کر کہا۔ ''یہ خالص چاندی کی نہیں ہیں۔ ان میں ملاوٹ ہے۔ چاہو تو پانچ روپے دے سکتا ہوں''۔

امرتی نے کہا۔ ''کچھ رحم تو کرو۔ رحم! بیٹا بیمار ہے۔ نہیں تو جیتے جی خاوند کی اس نشانی کو نہ بیچتی!''

سنار رحم دل تھا۔ اس نے ساڑھے پانچ روپے امرتی کے ہاتھ میں رکھ دئے۔

وہ سیدھی حکیم کے پاس پہنچی۔ اسے ایک روپیہ دے کر بیمار کیلئے دوا لے آئی۔ اور واپس آتے وقت ایک روپیہ کا آٹا خریدا۔

نھو کی بیوی نے جب خاوند کی دوا دیکھی۔ تو اس کی باچھیں کھل گئیں۔ اسے گمان تک نہ تھا۔ امرتی اس کے برتاؤ کے صلے میں اتنی فیاضی کا ثبوت دیگی۔

مالتی نے مسکرا کر پوچھا۔ ''یہ دوا کہاں سے لے آئی؟ روپے کس سے لئے؟''

امرتی نے سنجیدگی سے کہا۔ ''خدا سے۔ آکر ستر سال میں نے گھاس چھیل کر تو نہیں کاٹے ہیں۔ کبھی کبھی خدا میری تمنا پوری ہی کر دیتا ہے''۔

مالتی نے کہا۔ ''تو اپنے بیٹے کے لئے دعا کرو۔ دیکھتی ہو۔ گھر اجاڑ ہو رہا ہے'' امرتی نے کہا۔ ''یہ اب دنوں میں ٹھیک ہو جائیگا۔ میری بات کو گرہ باندھ لو''۔

لیٹے لیٹے ہی نھو نے ماں کی طرف دیکھا۔ تو جیسے اسکی روح ماں کے قدموں پر جھک گئی۔ امرتی نے کہا۔ ''تم خوش رہو نھو۔ داتا نے میری دعا قبول کر لی ہے۔ تم اچھے ہو جاؤ گے''۔

(۴)

تھوڑے دنوں کے بعد نھو بستر سے اُٹھ بیٹھا۔ گو ابھی شکایت دور نہ ہوئی تھی۔ لیکن جسم کے مفلوج حصے میں کچھ طاقت آ گئی تھی۔ البتہ اس کا داہنا ہاتھ نا کارہ ہو گیا تھا۔ دن بھر کمرے میں پڑا آہیں بھرتا۔ اپنے مستقبل کو سوچ کر گھلا جاتا۔!

حکیم نے اس کے لئے گرم اور مقوی غذائیں تجویز کی تھیں۔ لیکن خالی

ہاتھوں یہ چیزیں آتی کہاں سے۔؟ باپ کی بیماری کا کچھ اثر جیون پر ہوا تھا ماں کی منت سے اس نے پرانی جوتیوں کی مرمت کرنی منظور کی تھی۔ اس سے جو پیسے ملتے، آدھے تو وہ سرے ہی سے اپنے خرچ کے لئے اُٹھا رکھتا۔ اور باقی آدھی ماں کے حوالے کرتا۔ وہ ان سے بیمار کے لئے پاؤ بھر دودھ اور کنبے کے لئے آٹا خریدتی لیکن جب سے جیون کی کمائی کا سلسلہ شروع ہوا تھا۔ اس دن سے جیون کا دماغ ساتویں آسمان پر اُڑا جا رہا تھا۔ سیدھے منہ وہ کسی سے بات نہ کرتا۔ اسے محسوس ہو رہا تھا۔ جیسے اتنے بڑے کنبے کا ان داتا وہی ہے۔ گھر میں جب کوئی بچہ شرارت کرتا۔ تو جیون اسکی روٹی بند کرنے کا حکم دیتا۔ اپنے باپ اور اپنی دادی سے کبھی کھل کر بات تک نہ کرتا۔ اس کے نزدیک وہ دونوں فضول اور کنبے پر خواہ مخواہ کا بوجھ تھے۔ جن سے اسے کسی قسم کی توقع نہ تھی۔ اور جیسے انہوں نے کبھی بھی اس کے لئے کچھ نہ کیا تھا۔!۔

جیون کا یہ رویہ دیکھ کر کبھی کبھار نھتو رو دیتا۔ جس مشعل کی طرف دیکھ دیکھ کر وہ اپنی زندگی کی کالی کلوٹی راتیں اجالے کی امید پر کاٹ رہا تھا۔ وہ مشعل اس سے دور چلی جا رہی تھی۔ بعض اوقات اسے محسوس ہو رہا تھا۔ جیسے وہ مشعل بجھائی جا رہی ہے۔ اسکی دنیا ایک سرے سے دوسرے سرے تک تاریکیوں سے بھر جاتی۔ لیکن اس کے برعکس امرتی کے سینے میں محبت سے بھرا ہوا دل تھا۔ وہ جیون کی جوتیاں سیتے دیکھتی تو اسکی روح خوشی سے ناچنے لگتی۔ جیون کا تکبر اور نخوت امرتی کے پیار میں ڈوب کر گم ہو جاتا۔

ایک دن بارش ہو رہی تھی۔ امرتی نھتو کے لئے دودھ لانے کو گھوسیوں کے ہاں گئی تھی۔ جب وہاں سے لوٹی۔ تو ساری بھیگ چکی تھی۔ گھر پہنچ کر سر میں ہلکا ہلکا درد محسوس ہونے لگا۔ اور پھر سارا بدن سردی سے کانپنے لگا۔ نھتو نے سر پر ہاتھ پھیرتے ہوئے کہا۔ ''ماں۔ لیٹ جاؤ۔ میں اپنا کمبل اوپر ڈال دیتا ہوں۔ شاید سردی بہت لگ

گئی ہے۔"

امرتی لیٹ گئی۔ لیکن لمحہ بہ لمحہ اس کا درد بڑھتا گیا۔ گھر میں جتنے بھی کپڑے تھے۔ سب اسکے اوپر ڈال دئے گئے۔ جب بھی امرتی کی کپکپی دور نہ ہوئی۔!

نتھو کی بیوی نے ساس کی یہ حالت دیکھی تو بچوں کو ڈانٹ کر بولی۔۔"ہٹ کر بیٹھو جانے کیا روگ ہے؟"

نتھو کی حقارت بھری نظروں سے اسکی طرف دیکھا۔ اور منہ پھیر لیا۔ تھوڑی دیر بعد بولا۔"دودھ تیار ہو گیا ہو۔ تو ماں کو پلا دو۔ میں آج نہ پیوں گا۔"

بیوی نے قدم روک کر کہا۔"کیوں نہ پیو گے؟ اتنا خیال ہے۔ تو بھینس خرید لاؤ۔ بے چارے جیون کی انگلیاں جوتیاں سی سی کر چھلنی ہو رہی ہیں۔ اور تم کس بے دردی سے کہہ رہے ہو۔ میں آج نہ پیو گا۔"

امرتی کمبل کے نیچے یہ باتیں سن رہی تھی۔ اس نے کانپتے ہوئے کہا۔"نتھو پی لو دودھ! میں تتا پانی پیوں گی!"

اور جب مالتی مٹی کے پیالے میں نتھو کے لئے دودھ لائی۔ تو وہ پی نہ سکا۔ بار بار دودھ کو دیکھتا رہا۔ اپنی عمر میں آج پہلی بار اسے معلوم ہوا کہ اپنی کمائی اور بیٹے کی کمائی میں کتنا فرق ہے۔ اگر وہ تندرست ہوتا۔ تو کس کی مجال تھی۔ جو اسے ماں کو دودھ پلانے سے روکتا۔ لیکن آج وہ خود محتاج ہے۔ کل تک جس گھر میں وہ حکومت کرتا تھا۔ آج اسی گھر میں وہ غلامی اور محکومی کی حالت میں اپنی زندگی کے لمحے کاٹ رہا ہے۔ آج اسکی حکمران نگاہوں میں بے بسی اور عاجزی جھلک رہی ہے۔!

رات گزر گئی۔ امرتی کے درد میں افاقہ نہ ہوا۔ اسکی پسلیاں سوج گئی تھیں۔ بخار بھی کافی چڑھ گیا تھا۔ رات بھر وہ کراہتی رہی۔ بیمار بیٹے کے سوا اس کے پاس بیٹھنے والا کوئی نہ تھا۔ نتھو خود محتاج تھا۔ ماں کی کیا خدمت کرتا؟ حکیم کو کیسے بلاتا؟ ایک دن صبح

سویرے ہی اس نے جیون سے کہا۔ ''پڑوس کے حکیم کو لے آو۔ ماں نے تمہیں پالا پوسا ہے۔''

جیون کی ماں دوسرے کمرے میں بیٹھی دھاگا بٹ رہی تھی۔ اس نے یہ حکم سنا۔ تو پاس آکر بولی۔ ''غریب کو اب دو گھڑی بھی چین سے نہ بیٹھنے دو گے۔ تم لوگ بیمار پڑا کرو۔ اور یہ حکیموں کے پیچھے مارا مارا پھرا کرے!؟

نتھو خاموش ہو رہا۔ امرتی کی حالت زیادہ خراب ہوتی گئی۔ وہ اب بیہوش ہوگئی تھی۔ نتھو کے گلے میں سونے کا تعویذ تھا۔ اس نے جیون کو بلا کر کہا۔ ''یہ تعویذ سنار کے پاس گروی رکھ آو۔ اٹھو۔ اتنی مہربانی تو کرو۔''

نتھو کی بیوی نے چھاتی پیٹ لی۔ اور کہا۔ ''یہ نہیں ہوسکتا۔ یہی تعویذ تو تمہاری زندگی کا محافظ ہے۔ اور اسی کا صفایا کیا چاہتے ہو؟''

نتھو نے کہا۔ ''پھر کیا کیا جائے۔ مجھ سے یہ نہیں دیکھا جاتا۔ کہ ماں درد کے مارے تڑپتی رہے۔'' اور بیٹا دیکھتا رہے۔

مالتی خاموش ہو رہی۔ اور نتھو نے پھر کہا۔ ''تم بھی کسی کی ماں ہو مالتی آج تم میری ماں کی بے عزتی کر کے خوشی محسوس کر رہی ہو۔ کل تمہارا بھی یہی انجام ہوگا۔ جن بچوں کو تم نے سر پر چڑھا رکھا ہے۔ وہی بچے کل تمہیں زندہ گاڑ دیں گے''۔

یہ کہتے کہتے اسکی آنکھیں آنسوؤں سے بھر گئیں۔ اس کا گلا بھر آیا۔ اور بھرائی ہوئی آواز میں اس نے جیون سے کہا۔ ''جاؤ۔ جیون! اپنے رام کے لئے جاؤ۔ ماں کا جو احسان مجھ پر ہے۔ اسے مجھے جیتے جی اُتارنے دو۔''

جیون تعویذ لے کر چلا گیا۔ جب واپس آیا۔ تو کیا دیکھتا ہے۔ امرتی مر چکی ہے۔ اور نتھو کے آنسو اس کے دھمکتے ہوئے گالوں پر پڑ رہے ہیں۔

ماں نے بیٹے کے احسان کو ٹھکرا دیا تھا۔ ....☆☆☆............

پارسل

آخر شب دید کی قابل تھی بسمل کی تڑپ
صبحدم کوئی اگر بالائے بام آیا تو کیا
(اقبالؒ)

پارسل

"..............پوسٹ ماسٹر!"

ایک عجیب آواز! جو درد کے بے پناہ پردوں میں لپٹی ہوئی تھی۔ "پوسٹ ماسٹر......" میں نے سر اُٹھا کر دیکھا۔ ایک نحیف بوڑھا جس کی آنکھوں میں افق کی سی چمک تھی۔ میری طرف دیکھ رہا تھا۔ اس کے ہونٹ پیاز کے چھلکے کی طرح تھرتھرا رہے تھے۔ میں نے پوچھا۔ "کیا ہے؟"

وہ کھڑکی کے قریب آ گیا۔ اور اپنے بدن کا سارا زور لاٹھی پر ڈالتے ہوئے جھک کر بولا۔ "پارسل آ گیا؟"

میں تین مہینوں سے اچّی لام کے ڈاک خانے میں کام کر رہا تھا۔ ان تین مہینوں سے ایک پارسل بھی کسی کے نام نہ آیا تھا۔

میں نے سنجیدگی سے پوچھا۔ "کونسا پارسل بابا؟" بوڑھے نے اور قریب آ کر کہا۔ "میرا پارسل۔ میرے بیٹے کا پارسل!"

میں نے پوچھا۔ "کیا نام ہے تمہارا۔؟"

اس نے آہستہ سے کہا۔ "نِی شا!"

میں نے کہا۔ "آج کی ڈاک میں کوئی پارسل نہیں۔ شاید کل آ جائے!"

سنگاپور کے بڑے ڈاکخانے سے تبادلہ اُچیلام ہوا تھا۔ اس وقت میرے دل

کو بڑا صدمہ ہوا۔ کیونکہ میری شادی سنگاپور کے ایک بڑے رئیس کی حسین لڑکی سے ہونے والی تھی۔ لڑکی مغربی فیشن کی دلدادہ تھی۔ جب اسے معلوم ہوا کہ مجھے اُچی لام بھیجا گیا۔ تو وہ بہت روئی۔ اس نے اپنے نوکروں کے ذریعے مجھے کہلا بھیجا۔ کہ میں نوکری چھوڑ دوں۔ میں انکار کیا۔ میرے ہر وقت انکار کرنے سے اسکی نسوانی خودداری جاگ اُٹھی۔ اور اس نے فیصلہ کیا۔ کہ اب عمر بھر شادی نہ کروں گی۔ اس تکبر نے میرے خوابیدہ جذبات کو بیدار کیا۔ میں نے بھی کہلا بھیجا کہ اگر اب شادی کروں گا بھی۔ تو تم سے نہیں۔ حسینہ کو یقین نہ تھا۔ کہ میرا فیصلہ اس قدر سخت اور اٹل ہے۔ چنانچہ سارے سنگاپور میں میرے خلاف چرچے ہونے لگے۔ کچھ آدمی ایسے بھی تھے۔ جو میرے اس فیصلے کو حقارت کی نظروں سے دیکھتے تھے۔ لیکن کچھ ایسے بھی تھے۔ جو کھلم کھلا کہتے تھے۔ کہ حسن کا غرور، ان بابو، جیسے خودداروں ہی سے چور چور ہو سکتا ہے۔ اس لئے تبادلہ کے وقت میرے دل کو صدمہ تو ضرور ہوا تھا۔ لیکن ساتھ ہی اسکے مجھے اس بات کا اطمینان بھی تھا۔ کہ ان جھگڑوں سے کچھ وقت کے لئے نجات تو ملے گی۔ حالانکہ حقیقت یہ ہے۔ کہ اگر میں چاہتا تو تبادلہ ملتوی ہو جاتا۔ لیکن میں نے ایسا نہیں چاہا۔ کیونکہ اُچی لام ایک تاریخی جگہ تھی۔ سنگاپورے سے سو کوس دور۔ پہاڑیوں کی گود میں۔ بے بس بیوہ کے بچے کی طرح حسین اور معصوم!

....

دوسرے دن جب ہرکارہ ڈاک لیکر آ گیا۔ میں ''نی شا' کا پارسل دیکھنے کے لئے بیتاب تھا۔ لیکن جب ڈاک کا تھیلا کھولا۔ تو اللہ بس باقی ہوس۔ اس میں صرف تین چٹھیاں تھیں۔ میں ابھی چٹھیوں پر مہریں ہی لگا رہا تھا۔ کہ کسی نے کھڑکی کے قریب آ کر آہستہ سے کھانسا۔ یہ بوڑھا، نی شا' تھا۔ مجھے دیکھتے ہی بولا۔ '' آ گیا پارسل؟''

میں نے سر سے اشارہ کرتے ہوئے اور زیر لب مسکرا کر کہا۔ ''نہیں تو''۔

میری مسکراہٹ سے بوڑھے کی ابھری ہوئی نیلی رگوں میں سرخی پھیل گئی اس کا سارا جسم غصے سے کانپنے لگا۔ اس نے لاٹھی ایک طرف رکھدی۔ اور گرج کر بولا۔ ''کیا وہ مجھے بھول گیا۔ وہ جوانی کا پیار۔ جس نے اسے پال پال کر خوبصورت لی پو بنایا تھا۔ کیا اس نے اسے بھی ٹھکرا دیا؟۔ اتنی بے رحمی! اتنا غضب! کیا اسے معلوم نہیں۔ کہ میں بوڑھا ہو گیا ہوں۔ اور آج تک صرف بیجوں کے لئے جی رہا ہوں''۔

بوڑھے کی عجیب گفتگو سے میں سناٹے میں آ گیا۔ میں نے اُٹھ کر دروازہ کھولا۔ اور اسے سہارا دے کر اندر لے آیا۔ بوڑھا گھور گھور کر میری چیزوں کو دیکھنے لگا۔

میں نے پوچھا۔ ''وہ لی پوؔ کون ہے؟ اور کہاں گیا ہے؟''

'نی شا' نے کہا۔ ''میرا بیٹا ہے وہ۔ آج بیس سال بیت گئے۔ جب وہ سنگاپور چلا گیا تھا۔ بڑے راجا کے شہر میں۔ لیکن آج تک اس نے مہندی کے بیج اور جوہی کے پھول نہیں بھیجے!''

میں نے ظاہرا طور پر کہا۔ ''ٹھیک ہے۔ میں نے اسے سنگاپور میں دیکھا ہے۔ اس کے سنہرے بال ہیں۔ گول آنکھیں۔ سڈول جسم۔ اور نفیس ریشمی پوشاک پہنتا ہے۔

نی شا خوشی سے اچھل پڑا۔ بولا۔ ''وہی ہاں وہی۔ لی پو! میں نے اپنے خون کے قطرے قطرے سے اس کے بال سنہرے بنائے ہیں۔ اپنا سارا پیار اسکی آنکھوں میں بھر کر انہیں گول بنا دیا ہے۔ اور اسے اپنی چھاتی کا گوشت کھلا کھلا کر سڈول بنا دیا ہے۔ وہی میرا لی پوؔ!''

میں نے پوچھا۔ ''لیکن وہ گیا کس لئے؟''

نی شانے کہا۔ ''کس لئے؟ کیا تم چاہتے ہو۔ کہ میری قبر پر صرف خشخاش ہی کے پھول ہوں۔ مہندی کی جھاڑیاں نہ ہوں۔ جوہی کے پھول نہ ہوں۔ آہ پوسٹ ماسٹر! کیا لی پواب پھولوں کے بیج بھی نہ بھیج سکے گا۔ جن کی خوشبو میں کھو کر میں آرام سے قبر میں لیٹ سکوں۔''

میں نے سوچا۔ بوڑھے کا دماغ ضرور خراب ہو گیا ہے۔ نہ جانے اسکی باتوں میں کہاں تک صداقت ہے۔

پھر میں نے کہا۔ ''اچھا جاؤ۔ جب پارسل آئے گا۔ میں خود تمہارے پاس پہنچا دوں گا۔ البتہ اتنا بتا دو۔ تم رہتے کہاں ہو؟ اور پارسل کس کے نام آنیوالا ہے''

بوڑھے نے کہا۔ ''ہاں پارسل آسا ہی نی شا۔ میرے نام آئے گا۔ اور میں وہاں (ہاتھ سے اشارہ کرتے ہوئے) ترمینا کے کنارے پختہ مکان میں رہتا ہوں''۔

....

دوسرے دن شام کو میں سیر کرتے ہوئے ترمینا کی طرف نکل گیا۔ ترمینا اپچی لام کی دوشیزہ ندی۔ جو پہاڑوں سے نکل کر سیدھی سمندر کے ساتھ ملتی ہے۔

آسمان پر بادل تھے۔ مینہ کے قطرے بھی برس رہے تھے۔ اس ماحول میں ترمینا شرماتی ہوئی حسینہ کی طرح جیسے جھک جھک کر چلی جا رہی تھی۔ اور بارش کے قطرے اسے گدگدا رہے تھے۔

میں نے دیکھا۔ بوڑھا نی شا لاٹھی ٹیکے آ رہا ہے۔ اور اس کے ہاتھ میں کوئی چیز لپٹی ہوئی ہے۔ قریب آکر اس نے مجھے پہچانا نہیں۔ میں نے خود ہی کہا ''نی شا۔''

نی شا کے قدم رک گئے۔ مڑ کر بولا۔ ''پوسٹ ماسٹر۔!''

میں نے زور سے کہا۔ ''سلام بابا''!

نی شا نے پوچھا۔ ''پارسل آ گیا؟''

میں نے کہاں۔ ’’نہیں ابھی نہیں۔ جب آئے گا۔ میں لے کر آؤں گا۔ ہاں اگر تم اجازت دو۔ تو لی پو کو ایک خط لکھوں‘‘۔

بوڑھے کو جیسے قاروں کا خزانہ مل گیا۔ بولا۔ ہاں لکھو۔ بیس سال گزر گئے تم نے ابھی تک مہندی اور جوہی کے بیج نہیں بھیجے۔ قبر کھدی پڑی ہے۔ اور نی شا صرف بیجوں کے لئے ہی جی رہا ہے۔‘‘ سلسلہ کو جاری رکھتے ہوئے اس نے کہا۔ اور اسے لکھو۔ میرے لئے ایک نظم لکھے۔ نہایت نفیس۔ تاروں کی روشنی سے ہلکی۔ اور ترمینا کی طرح اچھوتی۔‘‘

میں نے حیرت سے پوچھا۔ ’’نظم؟ وہ لکھ سکتا ہے کیا؟‘‘

نی شا نے اپنا ہاتھ زور سے پیشانی پر مارا۔ اور بول۔ ’’آہ پوسٹ ماسٹر! شاعری اور شراب ہی نے تو میرے لی پو کو مجھ سے چھین لیا۔ ہاں انہی دو چڑیلوں نے ۔دیکھو تو۔‘‘

بوڑھے نے لپٹی ہوئی چیز میرے ہاتھ میں دے دی۔ ایک باریک کاغذ کا پر زہ جس پر ایک عمدہ نظم لکھی ہوئی تھی۔ اور نیچے ایک کونے میں لکھا تھا۔ ’لی پو‘

بوڑھے نے کہا۔ یہ لی پو کی پہلی نظم ہے۔ اس رات ہم دونوں اسے گا گا کر دیوانے ہو گئے تھے۔ پڑھو تو۔‘‘

میں آہستہ سے پڑھنا شروع کیا۔

’’ترمینا......قدرت کے میکدہ کی حسین رقاصہ!

آج کی رات......ہاں ترمینا!‘‘

بوڑھے نے کہا۔ ’’اس طرح نہیں ماسٹر۔ ہاں گا گا کر۔ جیسے لی پو گا رہا تھا‘‘۔

میں نے پھر گا گا کر اسے پڑھا۔ جس کا مفہوم یہ ہے:۔

’’ترمینا..............قدرت کے میکدہ کی حسین رقاصہ!

آج کی رات.........ہاں آج کی رات!

اتنا ناچ.....کہ ساری کائنات تیرے گھنگھروں کی میٹھی آواز میں کھو جائے! اور میکدہ میں بیٹھے ہوئے رند.......... وہ آنسو بھری آنکھوں سے تمہیں دیکھیں.........اور او ساقی!..........ان کی پیاس بجھانا مت.....بجھانا مت!؟

میں نے دیکھا۔ بوڑھا دور کی پہاڑیوں کو دیکھ رہا ہے۔ جن کے اوپر سے سنگاپور کو راستہ جاتا ہے۔ اور اسکی آنکھوں میں آنسوؤں کے قطرے ہیں۔ اپنے بیٹے لی پو کا گیت سن کر اس نے کہا۔ ''آؤ ماسٹر! تمہیں اپنا مکان دکھادوں اپنی قبر دکھادوں۔ اور دکھادوں کہ مہندی اور جوہی کے پھول کہاں اُگ سکتے ہیں''۔

ہم آستہ آہستہ چلے گئے۔ ترمینا کے کنارے پتھروں کا بنا ہوا بوسیدہ مکان تھا۔ جس کی دیواروں میں کائی اگ آئی تھی۔ نی شا نے دور سے کہا۔ ''وہ دیکھو لیکن آہستہ آہستہ شور نہ ہو۔ مبادا میرے لی پو کے خیالات شور سے منتشر ہو جائیں''۔

میں نے جھٹلا کر پوچھا۔ ''کہاں ہے لی پو۔؟''

بوڑھے نے میری طرف دیکھ کر سنجیدگی سے کہا۔ ''کیا تم سمجھ رہے ہو۔ لی پو یہاں اس مکان میں پیدا نہیں ہوا تھا؟ وہ یہاں سے شاعر بن کر نہیں گیا؟ اس کا تخیل ابھی تک یہاں نہیں گونج رہا ہے''۔ پوسٹ ماسٹر..........خدا کے لئے شور نہ کرو۔ وہ شاعر یہیں ہے۔ اسی مکان کے اندر۔ لیکن مجھ سے روٹھا ہوا......''

میں نے اس پر توجہ نہ دی۔ اور کہا۔ ''اچھی بات بابا۔ چپ ہی رہوں گا''۔ نی شا نے مجھے مکان کے سب کمرے دکھادئے۔ اور پھر باغیچہ۔ جس میں چیڑ کا ایک درخت تھا۔ اور اسی کے نیچے ایک کھدی ہوئی قبر۔''

نی شا نے کہا۔ ''دیکھا۔ اب بیج آئیں گے۔ تو قبر گلزار بن جائے گی۔ لی پو یہاں آکر بیٹھا کرے گا۔ گیت لکھا کرے گا۔ اور میں قبر کے اندر ہی دیوانوں کی طرح

ناچا کروں گا''۔

دوسرے دن ایک آدمی نے مجھ سے کہا۔''اسکی بیوی شادی کے تین ہی سال بعد ایک بچہ چھوڑ کر مرگئی۔لیکن نی شا نے جو اس وقت جوان اور حسین تھا۔دوسری شادی نہ کی۔حالانکہ اس کے پاس کافی دولت تھی۔اس نے بچے کی محبت میں اپنی جوانی تباہ کردی۔اور بچے کو محسوس نہ ہونے دیا کہ اسکی ماں نہیں۔یہ بچہ لی پو تھا۔

اس آدمی نے کہا۔''اور سنئے۔جب لی پو بیس برس کا ہوا۔تو وہ بہت اچھا شاعر تھا۔قدرت نے اسے پیدا ہی اسی لئے کیا تھا۔کہ وہ شاعر بنے اور چین کی روح کو جگائے۔چنانچہ یہی ہوا۔جب اس کے گیت لوگ سنتے۔تو جھومتے تھے۔لیکن انہیں دنوں اسے گاؤں کی ایک حسین لڑکی حنائی سے محبت ہوگئی۔مگر حنائی نے اس سے شادی نہ کی۔کیونکہ حنائی کا باپ امیر تھا۔اور لی پو گمنام نی شا کا اکلوتا بیٹا۔!''

میرے دل کو اس واقعہ سے ایک دھکا سا لگا۔

مجھے یاد آگیا۔نسوانی تکبر انسان کو کیا بنا سکتا ہے۔میں نے پوچھا۔''پھر کیا ہوا۔؟''اس نے کہا۔''لی پو ایک رات نہ جانے کہاں بھاگ گیا۔لیکن بعد میں دو تین سال گزر کر معلوم ہوا۔کہ وہ سنگاپور کی ایک سرائے میں ٹھہرا ہوا ہے۔اور نت نئی چیزیں لکھ کر لوگوں کو دیوانہ بنا رہا ہے۔''

میں نے پوچھا۔''تو بھی کیا ہوا۔؟ بوڑھا سنگاپور جا سکتا تھا۔''

اس نے کہاں۔''جا تو سکتا تھا۔لیکن گیا نہیں۔کیونکہ اکلوتے بیٹے کی جدائی نے اسکا دماغ خراب کردیا۔اس نے اپنے لئے قبر کھودی۔اور کئی آدمیوں سے کہا۔کہ اگر لی پو ملے۔تو اسے کہہ دینا۔کہ میری قبر کے لئے مہندی اور جوہی کے بیج پارسل میں بھیج دے۔شاید اس لئے کہ یہ سن کر لی پو کی محبت جاگ اٹھے۔اور وہ اپنے بوڑھے باپ کے بے پناہ محبت کا اندازہ کر کے واپس چلا آئے۔لیکن آج بیس برس بیت

گئے۔ لی پو نہیں آیا۔ اور نہ بوڑھے کا پارسل............''

نی شا کا یہ قصہ سن کر میں کھویا سا گیا۔ میری آنکھوں میں اندھیرا چھا گیا سوچنے لگا۔ محبت بھی کتنا میٹھا زہر ہے۔ اور باپ کی محبت............''

....

اڑھائی سال گذر گئے۔ اب مجھے صرف چھ مہینے کے بعد سنگاپور واپس جانا تھا۔ اس اڑھائی سال کے عرصے میں پارسل آیا۔ اور نہ لی پو۔ البتہ نی شا کبھی کبھی کھڑکی کے قریب آکر پوچھتا۔ ''آ گیا پارسل؟''

کبھی کبھی جب میں سیر کو جاتا۔ تو نی شا کے پاس ضرور جاتا۔ ہم دونوں تریینا کنارے گھنٹوں بیٹھے رہتے۔!

جون کا مہینہ تھا۔ دوپہر کو کافی گرمی تھی۔ پکی سڑکیں سنسان دکھائی دے رہی تھی۔ درختوں کے پتے گرمی سے سکڑ گئے تھے۔ ہرکارہ آیا۔ میں تھیلا کھولا۔ اس میں ایک پارسل تھا۔ جس پر باریک باریک لکھا تھا۔

''آساہی نی شا..........'اُچی لام' اور دور کونے میں..........'لی پو'

میں خوشی سے اچھل پڑا۔ میرے منہ سے بے اختیار نکل گیا۔ ''نی شا اسی وقت کسی نے کھڑکی کے پاس کہا۔ ''مسٹر!''

میں نے جلد جلد کہا۔ ''بابا۔ پارسل آ گیا۔ لی پو نے بھیجا ہے''۔

نیشا ناچنے لگا۔ بجھی ہوئی محبت کی راکھ میں آگ لگ گئی۔ اور دیکھتے دیکھتے جوالا بن گئی۔ وہ دفتر کے اندر آ گیا۔ اور پارسل کو ہاتھ میں لیتے ہوئے غور سے دیکھنے لگا۔ اور جہاں کونے میں لی پو لکھا تھا۔ اسے بار بار چومنے لگا اسکی آنکھوں سے آنسو کی جھڑی لگ گئی۔

تھوڑی دیر بعد اس نے کہا۔ ''دیکھا ماسٹر! میں نہ کہتا تھا پارسل آئے گا۔ لی پو

میرا بیٹھا ہے۔اور وہ مجھے نہ بھول سکے گا۔''

میری آنکھوں میں آنسو تھے۔ میں نے کہا۔''سچ ہے نی شا''! وہ پارسل کو لے کر کودتا پھاندتا چلا گیا۔ میں دفتر کے دروازے پر کھڑا آنسو بھری آنکھوں سے اسے تب تک دیکھتا رہا۔ جب تک وہ کچی سڑک سے ہوتا ہوا اوجھل ہو گیا۔

تیسرے دن شام کو میں نی شا کو دیکھنے گیا۔ میرے دماغ میں نی شا کا بچپن جوانی اور بڑھاپا تینوں پھر رہے تھے۔ اور ان سب چیزوں کے اوپر۔ اس کا لی پو۔ محبوب اور شاید خدا سے بھی پیارا بیٹا۔ جو اپنی شاعری کی وجہ سے امیر ہو گیا تھا۔ جس کے قدموں پر دولت ہاتھ باندھے کھڑی تھی اور جس کے آگے آسمان تک جھکتا تھا۔

میں نے دروازے پر دستک دی۔ آج حسب معمول نی شا اپنی قبر کے پاس نہ تھا۔ آہستہ آہستہ دروازہ کھلا۔ ایک عجیب سا آدمی۔ جس کے سر کے بال پریشان اور بے ترتیب تھے۔ باہر آیا۔

وہ خاموش رہا۔ اس نے مجھے اندر آنے کا اشارہ کیا۔ آپ آگے آگے چلتا گیا۔ اور میں اس کے پیچھے پیچھے۔ اندر کے کمرے میں، میں نے دیکھا۔ نی شا کے سر سے پاؤں تک ایک سیاہ چادر پڑی ہے۔ اور وہ ابدی نیند سو رہا ہے میرے منہ سے ایک چیخ نکل گئی۔ ایک حسرت ناک انجام! ایک محبت بھرے دل کا۔ آہستہ سے میں نے اس آدمی سے پوچھا۔''بابا مر گیا ہے کیا''؟ اس نے میری طرف دیکھا اور سر سے اشارہ کرتے ہوئے کہا۔''جی''!

اس آدمی کے آنسو کبھی کبھی کالی چادر پر پڑ رہے تھے۔ اور اس میں تحلیل ہو رہے تھے۔!

پھر میں نے آہستہ سے کہا۔''آہ! اگر آج لی پو یہاں ہوتا۔ تو......'' اس آدمی نے کوئی غیر معمولی حرکت نہ کی۔ صرف مکان کی چھت کی طرف دیکھتا رہا۔ اور پھر اسی

کالی چادر پر اپنی مخموری سی آنکھیں گاڑ دیں۔

میں نے پھر کہا۔ ''چین کے محبوب شاعر کا گمنام باپ۔ اس بے کسی کی حالت میں مر جائے اور اس کے سرہانے بیٹھ کر رونے والا کوئی نہ ہو۔ کتنی عجیب دنیا ہے۔ کیا بھید ہے اس ساری کائنات کا۔''

میں نے دیکھا۔ وہ آدمی رو رہا ہے۔ اور ضبط کرتے ہوئے بھی اس کے آنسو نہیں تھمتے۔

پھر میں نے آہستہ سے کہا'' آؤ ہم تم اسے اسکی بنائی ہوئی قبر میں لٹا دیں۔''

اس نے اس بار مضبوطی سے کہا۔ ''نہیں ابھی نہیں''۔

میں حیران رہ گیا۔ آج تک نی شا کا کوئی ہمدرد نہ تھا۔ یہ کہاں سے آ گیا۔؟

میں نے کہا۔ ''لیکن............''

جلد سے جلد اس نے کہا۔ ''ابھی نہیں صاحب۔ کچھ دن بعد!'' میں اُٹھتے ہوئے چمک کر پوچھا۔ آپ کون ہیں اس کے؟ زندہ تھا تو صورت نہ دکھائی۔ مر گیا تو کہتے ہیں ابھی کچھ دن بعد دفنائیں گے۔ لاش خراب نہ ہو گی۔؟''

اس نے آنسو بھری پلکوں سے میری طرف دیکھا۔ اور کانپتے کانپتے آہستہ سے کہا............ ''میں لی پو ہوں''۔

میرے قدم رک گئے۔ اور سارا جسم پسینے سے شرابور ہو گیا۔

............☆☆☆............

چَوَنی

دورگردون گردو روزے بر مراد مانگشت
وائما یکساں نہ ماند حالِ دوران غم مخور
(حافظؒ)

چوِنی

اس پر غم کا پہاڑ ٹوٹ پڑا۔ جب بیٹے نے رونی صورت بنا کر کہا۔ ''انّا۔ چوِنی کھوگئی''۔ یہ پہلا واقعہ ہے۔ جب انّا نے اپنی عمر میں ایسی منحوس خبر سنی اور وہ بھی اسوقت جب اس کا خاوند پچھلے سال ہی ۳ بچے چھوڑ کر مر گیا۔ اور اس کے گھر میں شب وروز، خاک اڑنے لگی۔

اس نے چھاتی پیٹ کر پوچھا۔ ''............ کہاں؟''

چھوٹے جوّاد نے اور رونی صورت بنا کر جواب دیا۔ ''وہاں قبرستان کے پاس!''

انا کے منہّ سے بے اختیار نکل گیا۔ ''میرے اللہ اب تو انتہا ہوگئی''۔

جواد کے دو بھائی ماں کی بے قراری کو بھانپ کر سہم گئے۔ ان کی آنکھو میں بھی آنسو آ گئے۔ اور ماں نے کہا۔ ''مجھے دکھا دو وہ جگہ!''

جواد نے کہا۔ ''میں نے بہت تلاش کی۔ نہ ملی۔ وہاں محلے کے کئی لڑکے کھیلتے تھے۔ جانے کون اُٹھا کر لے گیا۔'' ماں کی ممتا غریبی اور افلاس کے پردوں میں چھپ گئی۔ اس نے اس زور کا طمانچہ جواد کے منہ پر مارا۔ کہ اسکی نکسیر پھوٹی لٹھے کا میلا کُرتہ خون سے بھر گیا۔ اور روتے روتے اس کی ہچکی بندھ گئی۔

پیچھے سہمی ہوئی دو ننھی جانیں دب گئیں۔ اور جواد کے ساتھ وہ بھی رونے

لگیں۔

آج کئی دنوں کے بعد انا کی شبانہ محنت ٹھکانے لگی تھی۔ اور ابھی تک اسکی انگلیوں میں چرخ کے دستے کا نشان تھا۔ چونی کے ساتھ اسکی کتنی ہی امیدیں لپٹی ہوئی تھیں۔ ستو۔ سرسوں کا میٹھا تیل۔ بمبئ کی چائے۔ نمک۔ اور کچا پشمینہ یہ سارا سامان چونی کے سولہ پیسوں کے عوض لانا تھا۔

اس نے پھر گرج کر لیکن ناامیدی کے لہجے میں کہا۔ ''مجھے دکھا دو وہ جگہ میں ڈھونڈ ھونگی۔''

روتا ہوا جواد آگے آگے چلا۔ اور ناامید ماں پیچھے پیچھے۔

کتنی ہی دیر اس نے اجڑے قبرستان کی خاک چھانی۔ لیکن چونی نہ ملتی تھی نہ ملی۔ اسکی آنکھوں کی ساری بصارت قبرستان کے ذروں پر خرچ ہوگئی اور داغدار انگلیوں کی رہی سہی طاقت خاک کے ڈھیروں کو الٹنے پلٹنے پر اندھیرا چھا جانے تک وہ تلاش کرتی رہی۔ جب مایوس ہوگئی۔ تو اپنی قسمت کو روتی ہوئی اور جواد کو دھکے پر دھکا دیتی ہوئی گھر لوٹی۔ راستے میں ایک بوڑھی عورت نے پوچھا۔ ''خیر ہے انا۔ چھوکرا کیوں رو رہا ہے۔''؟۔

انا آگے ہی آگ بگولا تھی۔ بڑھیا کی مزاج پرسی نے اس کا رہا سہا بھی جلا دیا۔ بے پروائی سے بولی۔ ''خیر ہے!''

لیکن بوڑھوں کے دل میں جو شفقت اور محبت کی تری ہوتی ہے۔ وہ جوان دلوں میں کہاں۔؟

بڑھیا نے قدم روک کر پوچھا۔ ''خیر ہے۔ تو روتا کیوں ہے؟'' انّا نے ڈوپٹے کے آنچل سے آنسو پونچھتے ہوئے کہا۔ ''سودا خریدنے گیا تھا۔ راستے میں چونی کھو دی''۔

بڑھیا نے حیرت سے پوچھا۔ ''تو اسی بات پر اسے مارا ہے۔ بے چارے کی نکسیر پھوٹ گئی ہے۔ لعنت ہے تم پر۔ خدا سے تندرستی مانگو۔ چونی کیا۔ اشرفیوں سے مالا مال کردے گا''۔

انّا اپنی قسمت سے واقف تھی۔ جل بھن کر بولی۔ '' مالا مال کرے گا اب دوسری دنیا میں۔'' انا کی اس مایوس حالت کو دیکھ کر بڑھیا کا دل موم بن کر پگھل گیا۔ اس نے پیرہن کی جیب سے چونی نکال کر ان کو دی اور کہا۔ '' یہ لو۔ لیکن لڑکے کو مارو مت۔ بے چارہ سردی سے ٹھٹھر رہا ہے۔ اور ہاں سر پر ٹھنڈا پانی ڈالو۔ خون جم جائیگا۔''

انا کی خودداری جوش میں آگئی۔ اس نے تیوریاں چڑھا کر کہا۔ '' میں بھکارن نہیں۔ مزدوری کا ساگ بھتہ کھاتی ہوں۔ لیکن کسی کے آگے ہاتھ نہیں پھیلاتی''۔

بُڑھیا نے مسکرا کر کہا۔ '' اوہ۔ بڑی پارسا بنی پھرتی ہے۔ میں کہتی ہوں۔ جب چونی ملے۔ تو لوٹا دینا۔ خیرات کیا ہے۔ اُدھار ہے''۔

چونی دیکھ کر جواد کے سینے کے اندر ننھا سا دل مینڈک کی طرح اچھلنے لگا۔ اور انا نے آہستہ سے ہاتھ بڑھا کر چونی لے لی۔ لیکن اسے محسوس ہوا۔ اس چونی اور کھوئی ہوئی چونی میں فرق ہے۔ ورنہ چونی مل کر جو تسکین اسے ہونی چاہئے تھی۔ وہ نہ ہوئی۔ سوچتی رہی۔ وہ چونی کتنی خوبصورت تھی خالص چاندی کی۔ گول۔ اُبھرے ہوئے ہندسے والی۔ اور بڑھیا کی چونی ہلکی۔ میلی۔ بدصورت۔ کون جانے کھوٹی نہ ہو''۔

رات کو اُس نے نہ خود کچھ کھایا۔ نہ بچوں کو کچھ کھلایا۔ وہاں تھا ہی کیا......؟ چھوٹے بچوں کو روتے روتے نیند آ گئی تھی۔ اور وہ ایک دوسرے کی گود میں سو گئے تھے۔ جوادؔ کی ناک سے اب تک خون بہ رہا تھا۔ سردی کی وجہ سے اس کا دانت سے

دانت بجتا تھا۔

۲

دوسرے دن پو پھٹتے ہی انا پھر قبرستان کی طرف گئی۔ کافی دیر تلاش کرنے کے باوجود بھی جب چونی نہ ملی۔ تو لوٹ آئی۔ گھر میں جواد بخار سے کراہ رہا تھا۔ اس کا چہرہ شعلے کی طرح سرخ تھا۔

اس نے آہستہ سے کہا۔ ''انّا!''

انا اس کے پاس آ گئی۔ پھٹی ہوئی چادر اُٹھا کر اس نے دیکھا۔ جواد تپ رہا ہے۔ پسلیوں پر ہاتھ پھیرا۔ تو جیسے اندر تنور جل رہا ہو۔

انّا نے پوچھا۔ ''درد ہے کیا۔؟

جواد نے کہا۔ ''ہاں اندر سے جل رہا ہوں۔ اور پسلیوں میں کانٹے چبھ رہے ہیں''۔

انّا نے کہا۔ ''کوئی پروا نہیں۔ ابھی گرم پانی کی ایک پیالی سے ٹھیک ہو جاؤ گے۔ چونی نہ کھوئی ہوتی۔ سردی بھی نہ لگتی۔ مار بھی نہ پڑتی۔ میں نہ کہتی تھی۔ راہ چلتے ادھر ادھر مت دیکھا کرو۔ لیکن تم میری بات مانتے ہی کب تھے۔''

جواد نے ناک کے سرے سے منجمد خون کو اپنی انگلی سے اٹھاتے ہوئے پوچھا۔ ''چونی مل گئی؟''

انّا نے کہا۔ ''نہیں۔ جائے گی کہیں نہیں۔ مجھے پورا بھروسہ ہے!'' گرم پانی پلا پلا کر نہ جواد کا بخار اترا۔ اور نہ اس کے اضطراب میں کمی ہوئی۔ انّا اس کی حالت دیکھ کر انگاروں پر لوٹنے لگی۔ لیکن خالی ہاتھوں کیا کرتی۔ محلے میں پرانی وضع کا ایک حکیم تھا۔ وہ بیمار کو دیکھتا تو انّا اسے گھر میں بلا کر کیا دیتی۔ دوا دارو کہاں سے خریدتی۔؟

تیسرے دن جواد کو گود میں اٹھا کر حکیم کے پاس لے گئی۔ حکیم نے سیخ پا ہو کر

کہا۔" ایسے بیمار کو تم یہاں لائی کیسے؟۔نہیں دیکھتی دوسو سے اوپر بخار ہوگا۔ اگر راستے میں سردی لگ جائے تو۔"

انّا نے کوئی جواب نہ دیا۔حکیم نے اسکی نبض دیکھی۔ زبان کا ملاحظہ کیا اور پھر کاغذ پر نسخہ لکھکر دیا۔ اور کہا۔" بیمار کو ڈھک کر لے جاؤ۔ اور گھر کمرے میں رکھو۔ خبردار! سردی نہ لگنے پائے۔ خدا کو منظور ہوگا۔ اس جوشاندہ سے دو دن ہی میں اُٹھ بیٹھے گا۔ دراصل اسے نزلہ ہے۔

انّا کی ہمت بندھ گئی۔ وہ بیمار کو لے کر گھر آئی۔ تو اسے نسخہ کی فکر ہوئی۔ پنساری اتنا بدمزاج تھا۔ کہ اُس سے ادھار مانگنے کی اس کی جرأت نہ ہوئی۔

ناچار اسے خاوند کے تعویذ کا خیال آیا۔ جو اس کے خاوند نے اپنے شادی میں ہاتھی پور کی چاندی کا بنوایا تھا۔ اس پر ایسے نقش ونگار تھے۔ کہ آج تمام سنار دیکھ کر واہ واہ کہہ اُٹھتے تھے۔ مٹی کی ہانڈی سے جب اس تعویذ کو نکالا۔ تو اسے گذرا ہوا زمانہ یاد آ گیا۔ وہ شام یاد آ گئی۔ جب اسکے خاوند نے اسے پہن کر مسجد میں نماز پڑھی تھی۔ اور گھر میں انّا نے ساری رات پیر صاحب کے کہنے کے مطابق چراغ جلا رکھا تھا۔

بھیگی ہوئی آنکھوں سے اس نے کئی بار خاوند کی آخری نشانی کو دیکھا اور پھر بازار چلی گئی۔

تعویذ بیچ کر اور جوشاندہ پلا کر بھی جواد کا بخار نہ ٹوٹا۔ روز بروز اسکی حالت بد سے بدتر ہوتی گئی۔ حتیٰ کہ چھٹے دن اسے سدھ بدھ نہ رہی اور وہ بہکی بہکی باتیں کرنے لگا۔ کبھی کہنے لگا۔" انا مل گئی چونی؟"

اس وقت انّا کے دل پر آرے چلتے۔ اور دل کے کسی چھپے کونے میں افلاس اور ممتا کی جنگ چھڑ جاتی۔ کبھی افلاس ممتا پر غالب آتا۔ اور کبھی ممتا افلاس پر چھا جاتی۔ وہ رات جواد نے بہت اضطراب میں بسر کی ہر بار آنکھیں کھول کر اوران کے

چہرے پر نظریں گاڑ کر پوچھتا۔ ''امّا ملِ گئی چونی؟''

اور امّا آنسوؤں پر پورے زور سے قابو پا کر کہتی۔ ''مل گئی میرے لال۔''

اسی دن صبح جب مسجد سے موذن نے بانگ دی۔ جواد نے زور سے کہا۔ ''امّا''۔ اور پھر ابدی نیند سو گیا۔ موذن کی بانگ نے ننھے جواد کی روح کو خدا کی دعوت دی۔!''

امّا دیوانی سی ہوگئی۔ مامتا کے سمندر میں طوفان آ گیا۔ جس میں اسے دنیا کی دولت۔ شہرت۔ اور عزت گھاس کے تنکوں کی طرح بہتی دکھائی دی۔

خاوند کی دو نشانیاں ہمیشہ کے لئے ہاتھ سے نکل گئیں۔ انگلیوں کے داغ ابھر گئے۔ اور دل میں ایک نا قابل بیان درد اٹھا۔ اس کا گھر اب تاریک سے تاریک تر ہوگیا۔ آنکھوں کی بصارت قبرستان کی خاک کیساتھ مل گئی۔ اور نا امیدی کا کاجل ان سے بہنے لگا۔

۳

ہر جمعہ کو پچھلے پہر امّا قبرستان جاتی۔ خاوند اور بیٹے کی قبروں کے درمیان بیٹھ کر روتی۔ اُن قبروں کی خاک آنکھوں اور گلے پر ملتی۔ اسے اب بھی محسوس ہوتا۔ جیسے چھوٹی قبر کے اندر سے جواد زور زور سے پوچھ رہا ہے۔ ''انا۔ چونی مل گئی''؟ اور نہ آس پاس بکھری ہوئی خاک اسکی قسمت پر ہنستی اور ادھر ادھر اڑتی ہوئی اس سے پوچھتی۔ ''مل گئی چونی؟''

امّا آنسو پونچھ کر فوراً اٹھ کھڑی ہوتی۔ چلتے چلتے اسکی نظریں اسی جگہ پڑی جہاں چونی کھو گئی تھی۔ تھوڑی دیر کے لئے تلاش میں آوارہ بھٹکتی۔ صرف اس امید پر کہ شاید مل جائے۔ شاید یہیں کہیں پڑی ملے۔

اور ایک جمعہ کو سچ مچ اسے قبرستان میں چونی ملی۔ جس پر مٹی کی تہہ جم گئی

تھی۔ وہ اسے پاکر دیوانی ہوگئی۔ اس نے چونی پہچانی۔ یہ وہی تھی۔ جو کچھ عرصہ پہلے جواد سے کھوگئی تھی۔ وہ دوڑ کر جواد کی قبر پر گئی۔ اور اپنا منہ قبر سے لگا کر بولی۔ ''جواد۔ چونی مل گئی۔ میرے لال اب نکلو باہر''۔ لیکن وہاں کون تھا۔ جو جواب دیتا۔ البتہ اسے محسوس ہوا۔ جیسے کسی نے اندر سے لمبی سانس لی۔ اور کروٹ بدل کر لیٹ گیا۔

۴

کئی سال بیت گئے۔ انّا کے گھر کی حالت دگرگوں ہوگئی۔ اس کے دونوں لڑکے جوان ہوگئے تھے۔ ایک کی شادی بھی ہوچکی تھی۔ گھر میں فارغ البالی اور آسودہ حالی کے دن آگئے تھے۔ دونوں لڑکوں نے گھر ہی میں قالین بافی کا کارخانہ کھولا تھا۔ جس میں ایک درجن کے قریب محلے کے لڑکے کام کرتے تھے۔ انّا بصارت کھوچکی تھی۔ ایک صاف اور پاک کمرے کے کونے میں وہ نمدے پر بیٹھی رہتی۔ بہو گھر کا کام کاج چلاتی۔ شام کو کارخانہ بند ہوتا۔ تو دونوں لڑکے ماں کے قدموں میں آکر بیٹھتے۔ رسول کریم صلعم کی صفات ان کے کارنامے اور اسلام کی برکتوں کے قصے سناتے۔ کارخانے میں جنگ کے متعلق جو کچھ سنتے۔ وہ ماں کو بھی سناتے۔ اور انّا راج رانی کی طرح گاؤ تکیئے کے سہارے بیٹھی سنتی۔ ایک دن شام کو دونوں لڑکے ماں کے پاس بیٹھے تھے۔ کارخانے کا ایک شاگرد روتا روتا آیا۔ انا کے کنوارے بیٹے نے پوچھا۔ ''کیا ہے سلطانا؟'' روکیوں رہے ہو؟''

شاگرد کچھ نہ بول سکا۔ روتے روتے اسکی ہچکی بندھ گئی۔

انّا کے بیٹے نے پھر پوچھا۔ ''ارے کیا ہوا؟ کہو بھی؟''

شاگرد نے روتے روتے کہا۔ ''جو چونی آپ نے سودا خریدنے کے لئے دی تھی وہ کھوگئی''۔ دونوں بھائیوں نے زور سے ہنس دیا۔ دوسرے کمرے میں بڑے بھائی کی بیوی یہ سن رہی تھی۔ وہ بھی اپنی ہنسی کو نہ روک سکی۔

تب چھوٹے بھائی نے کہا۔ ''تو کیا ہوا۔ کھوگئی تمہاری بلا سے۔ روتے کیوں ہو؟'' یہ کہکر اس نے جیب سے دوسری چونی نکالی۔ اور اسکی طرح پھینکتے ہوئے کہا۔ ''جاؤ۔ اب سنبھال کر لے جانا''۔

پھر بڑے بھائی سے کہا۔ ''بچوں کی فطرت بھی کیا عجیب چیز ہے۔ ذرا سی بات پر کس قدر رو دیتے ہیں''۔

سامنے انّا منہ کھول کر یہ سن رہی تھی۔ اسکی نابیانہ آنکھوں سے آنسو پھوٹ گئے تھے۔ جانے اسے آج سے کتنے سال پہلے کا دلگداز واقعہ یاد آ گیا تھا۔

............☆☆☆............

میرا بُوڑھا دُوست

ہر نیک وبدی کہ از من آمد بو جُودِ
تُو برسرِ من نوشتۂ ، من چہ کُنم
(عمر خیامؒ)

میرا بوڑھا دوست

سُجانا میرا دوست ہے۔ یوں تو اس کی عمر ستر سے اوپر ہے۔ اور میری تیس سے کم۔ لیکن ہم دونوں دوست ہیں۔ عمر کے اس تفاوت نے ہماری دوستی میں کسی قسم کی پیچیدگی پیدا نہ کی۔

روز شام کے وقت وہ میری جھونپڑی کے آگے اپنی پرانی سی کشتی باندھتا ہے اسوقت اندھیرا سا ہوتا ہے۔ میں اس کے چپو کی آواز سنتے ہی کہتا ہوں۔ ''سُجانا!''

وہ آہستہ آہستہ کھانس کر کہتا ہے۔ ''ہاں جی''!

''آ ئے ہو؟''

''جی۔ کشتی باندھ رہا ہوں!''

''ارے کچھ کمایا بھی کہ نہیں۔؟''

''ہاں بابو جو کچھ تقدیر میں لکھا تھا............مِلا۔!''

''کتنا کچھ............آج تو تم نے سواریاں بھی کافی بٹھائیں''۔

''سواریوں کی بات نہیں بابُو۔ دینے والا خدا ہے۔ اور مجھے زیادہ ضرورت بھی کیا ہے؟ صبح اور شام روٹی چاہیئے اور بس! اس کے لئے تو پیسے بنا ہی لیتا ہوں۔!''

۲

سُجانا کا کوئی بھی نہیں۔ ماں باپ بچپن ہی میں اُٹھ گئے تھے۔ بھائی بہن

کوئی نہ تھی۔ماں باپ کے اُٹھنے سے ایک عظیم ذمہ داری۔صرف اپنے آپ کی اس کے اوپر عائد ہوگئی تھی۔پہلے وہ بے فکر تھا۔اتنا بھی اسے معلوم نہ تھا۔روپے آتے کہاں سے ہیں۔جاتے کہاں ہیں۔روٹی، کپڑا، گھر کا سامان، کشتیوں کی مرمت کون کراتا ہے۔؟ کب کراتا ہے؟ کیسے کراتا ہے؟ ماں باپ کی موجودگی میں وہ چین کی بنسی بجاتا تھا۔لیکن جب وہ اُٹھ گئے۔تو اسے معلوم ہوا۔کسی چیز کا نام دنیا بھی ہے۔کوئی میٹھا ساروگ، کوئی پوشیدہ سی بیماری فکر کہلاتی ہے۔اسی لئے اپنا ساتھ بنانے کے لئے اس نے شادی کی۔کئی برس بیوی کے ساتھ بتا دیئے۔اولاد نہ ہوئی۔اور بیوی بھی مرگئی۔جہاں سے سُجانا چلا تھا۔اسے معلوم ہوا۔کہ بیوی کے مرجانے سے وہ پھر وہیں پہنچ گیا ہے۔اس نے دوسری شادی بھی کی۔اور پھر تیسری بھی۔لیکن کسی نے بھی یاوری نہ کی۔

جب میں اس جھونپڑی میں رہنے کے لئے آیا۔تو سب سے پہلے وہی میرے پاس آگیا۔بولا۔"تم کتنے اچھے ہو۔؟ لیکن تم نے عینک لگائی ہے۔یہ اچھی بات نہیں"۔

میں نے مسکرا کر پوچھا۔۔۔۔"کیوں"؟

بولا۔"مجھے دیکھو۔ستر برس کھا چکا ہوں۔نظر اتنی صاف ہے۔کہ کتنا ہی اندھیرا کیوں نہ ہو۔سوئی میں دھاگا پرو دیتا ہوں۔اور تم تو ابھی کل کے بچے ہو۔"

میں نے کہا۔"یہ ٹھیک ہے سُجانا۔بجلی کی روشنی اور شام کو دیر تک کتابیں پڑھنے سے میری نظر خراب ہوگئی ہے"۔

سُجانا نے کہا۔"پڑھنا کیا ضروری ہے؟ آگے نہیں پڑھا ہے؟"

میں نے زور سے ہنس کر کہا۔ارے پاگل! کتابیں نہ پڑھوں۔تو اور کیا کروں۔؟ تمہاری طرح کشتی چلاؤں؟"

سُجانا چپ ہو رہا۔ پھر غور سے میری طرف دیکھ کر بولا۔ ''کتنی کتابیں پڑھ لی ہیں آج تک؟'' ......میں نے کہا۔ ''بہت......تعداد کسے یاد رہے؟''

سُجانا نے کہا۔ ''میں نے بھی تو کئی کتابیں پڑھی ہیں۔گلستان بوستان۔ پنج گنج۔لیکن اب اُن کتابوں کو پڑھتا ہی کون ہے۔مدرسے میں بھی اب اُن کتابوں کو کوئی پڑھاتا نہیں۔''

میں نے کہا۔ ''تمہارے دیکھتے دیکھتے زمانہ کتنا بدل گیا ہے۔دنیا میں کیا کیا ہو رہا ہے۔مرد کیا کرتے ہیں۔عورتیں کیا کرتی ہیں۔بچے کیا کرتے ہیں؟''

سُجانا نے کہا۔ ''ہاں بدل گیا ہے زمانہ...... بدل گیا ہے سب کچھ وہ حیا وہ شرم اُٹھ گئی ہے دنیا سے......لیکن کیا ایسے کام چلے گا؟ میں تو کہتا ہوں۔نہیں چلے گا۔ ایک سال چلا۔ دس سال چلا۔ چالیس سال چلا۔ اُگے نہیں چلے گا۔پھر چراغ لیکر ہمیں ڈھونڈھنا پڑھے گا وہ گزرا ہوا زمانہ......؟

سُجانا کی بات بہت گہری تھی۔تین چار کتابیں پڑھکر ہی اس نے زمانے کو ناپا تھا۔ ہماری موجودہ تہذیب۔ ہمارا تمدن۔سب کچھ پرکھ لیا تھا۔تھوڑی دیر بعد میں نے پوچھا۔ ''تم تب زندہ ہو گے۔؟''

ایک آہ بھر کر سُجانا نے کہا۔ ''کون جانے!''

۳

آسمان پر کسی دوشیزہ کی طرح چاند مسکرا رہا تھا۔ساری دنیا خاموش تھی۔ صرف نالے کے کناروں پر مینڈک ٹراتے تھے۔نالے کا گدلا پانی دن بھر کشتیاں چلنے کی وجہ سے جیسے تھک کر سو رہا تھا۔اور چاندنی جیسے اسے لوری سنا رہی تھی۔میں اُسوقت جھونپڑی کے برآمدے میں بیٹھا سوچ رہا تھا۔ ''یہ دنیا کیا ان بے شمار لوگوں پر رونق بازاروں اونچے اونچے مکانوں بے پناہ شور وشر اور ان ندی نالوں کا نام ہے۔؟ کیا

ان ہی چیزوں کا ملا ہوا نام دنیا ہے۔؟ یہ چاندنی یہ خوبصورتی یہ خاموشی یہ پھولوں سے لدے ہوئے پودے کیا دنیا کے رنگ ہیں؟ کیا یہ سب فانی ہیں؟ انسان جو اتنا متکبر ہے۔ اتنا کاریگر ہے۔ موجد ہے۔ کیا یہ بھی فانی ہے؟ کیا کچھ عرصہ بعد یہاں کسی کا نام ونشان تک نہ رہے گا۔؟ کیا ہمیں پھر گزرا زمانہ ڈھونڈھنا پڑے گا''۔ اسی وقت میں نے سنا۔ کہ کسی کے رونے کی آواز آرہی ہے۔ بہت آہستہ آہستہ۔ میں نے ادھر اُدھر دیکھا۔ سُبحانا کی کشتی میری جھونپڑی کے آگے بندھی تھی۔ اس کے نزدیک اور کوئی کشتی نہ تھی۔ البتہ نالے کی دوسری طرف ایک ڈونگہ تھا۔

میں اُٹھ کھڑا ہوا۔ اور آہستہ سے بولا۔ ''سُبحانا۔!''

کسی نے جواب نہ دیا۔ لیکن ایک بات ضرور ہوئی۔ رونے کی آواز بند ہوگئی۔ میں سمجھا۔ سُبحانا رو رہا ہے۔ ''لیکن وہ آج کیوں رو رہا ہے۔ کیا اسے آج کچھ نہیں ملا؟ کیا اسے کوئی تکلیف ہے۔؟ کیا وہ شام کا بھوکا ہے۔؟ لیکن اگر ایسی بات ہوتی۔ تو وہ مجھ سے ضرور کہہ دیتا۔ اس نے کہا کیوں نہیں؟''

میں نے پھر پکارا۔ ''سُبحانا!''

سُبحانا نے آہستہ سے کہا۔ ''ہاں!''

میں نے کہا۔ جاگتے ہو؟''

اس نے کہا۔ ''آج نیند نہیں آتی۔ یوں تو پپوٹے بھاری ہوگئے ہیں۔ لیکن نہ جانے کیا ہوگیا۔ نیند ہی اُڑ گئی ہے۔!''

میں نے پوچھا۔ ''تم نے شام کو روٹی کھائی تھی۔؟''

سُبحانا نے کہا۔ ''جی!''

میں نے پوچھا۔ ''پھر تم کیوں رو رہے ہو؟ اچھے تو ہونا؟''

سُبحانا نے کہا۔ ''بہت اچھا ہوں!''

میں نے پھر پوچھا۔ ''لیکن روتے کیوں تھے؟''

سُبحانا نے کوئی جواب نہ دیا۔ میں چراغ جلایا۔ اور برآمدے سے نیچے اُتر کر سُبحانا کی کشتی میں چلا گیا۔ ایک پھٹے پرانے تکیہ کے سہارے بیٹھا تھا۔ اسکی آنکھوں میں اب بھی آنسو تھے۔

میں نے پاس آکر پوچھا۔ ''سُبحانا''۔ سُبحانا نے میری طرف دیکھا۔ اپنے کمزور بائیں ہاتھ سے آنکھیں پونچھیں۔ اور مسکرا کر پوچھا۔ ''حُقہ پیوگے؟''

میں نے جیب سے سگریٹ نکالا۔ اسے سلگایا۔ اور کہا۔ ''شکریہ تم کتنے اچھے میزبان ہو۔''

سُبحانا کے سینے میں میزبان کا لفظ سن کر جیسے گولی لگی۔ اس نے اپنا سر اونچا کیا۔ اور مضبوطی سے پوچھا۔ ''کیا کہا...... میزبان......؟''

میں اس کا مطلب تاڑ گیا۔ جلدی سے بولا۔ ''ارے نہیں۔ دوست!'' وہ مسکرایا۔ اسکی روح جھومنے لگی۔ شاید اس لئے کہ جس کا دنیا میں کوئی نہ تھا۔ میں نے اسکو اپنا دوست بنالیا تھا۔

میں نے دوبارہ پوچھا۔ ''اب تو بتاؤ۔ روتے کیوں تھے؟''

سُبحانا نے کہا۔ ''آج بہت پُرانا زمانہ یاد آگیا۔ جب میرے سینے میں جوانی تھی۔ جب میری آواز میں موسیقی تھی۔''

میں نے اس کی داڑھی کو کھینچتے ہوئے کہا۔ ''یہ بات ہے!''

اور سُبحانا نے کہا۔ ''آج وہی میں ہوں۔ وہی کشتی ہے۔ وہی نالہ ہے۔ وہی سب کچھ ہے۔ لیکن سُبحانا وہ سُبحانا نہیں۔ جو تب تھا۔!''

میں نے کہا۔ ''پاگل۔ اب تمہیں بھی جوانی یاد آتی ہے۔ جب جوانی تھی تب اسکے مزے نہیں لوٹے۔ اب بڑھاپے میں لوٹنے کی خواہش ہو رہی ہے لیکن آج

چاندنی میں پُرانا زمانہ کیسے یاد آگیا؟ اسوقت تو بارہ بجے ہیں۔تم دس ہی بجے سو جاتے ہو!''

سُجانا نے کہا۔''آج بے مطلب نہیں رویا بابو۔بہت پرانا زمانہ آنکھوں کے سامنے پھر گیا''۔

میں نے چونک کر پوچھا۔''کونسا؟''

سُجانا نے کہا۔''وہ جو پارڈونگہ ہے۔تم نے دیکھ لیا۔؟''

میں نے کہا۔''ہاں تو۔!''

سُجانا نے کہا۔''کیا دیکھا اس میں؟''

میں نے کہا۔''یہ تو آج شام کو وہاں ٹھہرا۔ایک عورت اسے چلاتی تھی۔اس کے بچے تھے۔اور ڈونگہ خالی تھا۔''

سُجانا نے آہستہ سے کہا۔''یہ عورت جس کی گود میں آج اننتے بچے کھیلتے ہیں۔میری بیٹی ہے''۔

میں حیرت کے سمندر میں ڈوب گیا۔ میں نے غور سے سُجانا کی طرف دیکھا۔اسکی آنکھوں سے آنسو گرنے لگے۔میں نے پوچھا۔''تمہاری بیٹی؟''

سُجانا نے کہا۔''ہاں! میری بیٹی!''

میں نے پوچھا۔''لیکن تم نے تو مجھ سے کہا ہے۔میری کوئی اولاد ہی نہیں ہوئی۔پھر یہ بیٹی کیسی؟''

سُجانا نے کہا''ٹھیک ہے۔لیکن اسے بھی معلوم نہیں۔ میں اس کا باپ ہوں۔ان دنوں یہ بہت چھوٹی تھی۔جب اسکی ماں..........''

میں نے اور حیران ہو کر پوچھا۔''ارے تم کیسی باتیں کرتے ہو۔یہ تمہاری بیٹی ہے۔اور اسے معلوم نہیں کہ تم اس کے باپ ہو۔!''

سُجانا نے کہا۔ ''سچ ہے۔ اگر آج اسکی ماں زندہ ہوتی۔ تو شاید وہ مجھے پہچانتی۔ شاید کہہ بھی دیتی اسے۔ سُجانا تمہارا حقیقی باپ ہے۔ لیکن وہ مرگئی ہے۔ مرگئی ہے ہمیشہ کے لئے۔ اس راز کو ساتھ لے کر۔ جیسے میرے سوائے کوئی جانتا ہی نہیں۔''

میں نے پوچھا۔ ''کونسا راز؟ دیکھو۔ تم مجھ سے اپنی باتیں چھپاتے ہو دوستی کا یہ طریقہ نہیں۔''

سُجانا نے کہا۔ ''چلو جانے دو ان باتوں کو۔ آؤ میں حقہ بھرتا ہوں پھر پی کر سو جائیں دونو''۔

میں نے کہا۔ ''لیکن میں تو اب سنے بغیر اُٹھونگا نہیں۔ سُجانا اگر تم مجھ سے نہیں کہو گے تو میں اس کٹیا سے چلا جاؤں گا۔''

سُجانا نے چلم میں آگ رکھتے ہوئے کہا۔ ''چلے جاؤ گے؟ تمہیں اب جانے کون دے گا۔ سُجانا تو جیتے جی نہیں جانے دے گا''۔

میں نے کہا۔ ''تو پھر کہو نا مجھ سے یہ کہانی!''

سُجانا نے کہا۔ ''کہہ دونگا بابا۔ لیکن ابھی جلدی کیا ہے۔ نہ تم کہیں گئے۔ نہ میں کہیں گیا۔ آج نہ سہی۔ کل کہہ دوں گا۔''

میں نے کہا۔ ''نہیں...... آج ہی...... ابھی!''

سُجانا نے کہا۔ ''تم ہنسو گے۔ کہانی کیا ہے۔ شیطانی ہے۔ کمینگی ہے۔ جو بوڑھے سُجانا کے شباب کی ہے۔''

میں نے کہا۔ ''کہو بھی۔!''

سُجانا نے کہا۔ ''بہت برس گزر گئے۔ میں ان دنوں جوان تھا۔ ایک صبح میں کشتی لیکر گھاٹ پر آگیا۔ ایک سواری آگئی۔ اُس نے کہا۔ ''مجھے شالیمار باغ لے جاؤ۔ اور واپسی پر اسی گھاٹ پر چھوڑ دو۔'' میں نے کافی اجرت طلب کی۔ جو اس نے

منظور کی۔ لیکن انسان کا دل گناہوں سے بھرا پڑا ہے۔

جسکی نظروں میں سانپ ہیں۔ اور سینے میں شراب کا سمندر۔ جب سواری کشتی میں بیٹھ گئی۔ میں نے اسے دیکھا۔ وہ ایک لڑکی تھی۔ بہت حسین۔ اسکی کالی کالی آنکھوں میں پھولوں کے کھیت تھے۔ اس کے چہرے پر شفق کی سرخی تھی۔ اس کے سینے میں برساتی ندی کا زور تھا۔ میں نے اسے دیکھا تو میرے دل نے آہستہ سے کہا۔ ''سُجانا!'' اور سُجانا کا لفظ سنتے ہی میری نظریں ان کے آگے جھک گئیں۔ میرا شباب اس کے آگے بھکاری کی طرح ہاتھ پھیلا کر کھڑا ہو گیا میں نے پہلے مانا نہیں۔ میری گناہ بھری نظروں اور اس کے پاکیزہ دل میں ایک جنگ چھڑ گئی۔ اور تب گناہ نے پاکیزہ گی پر حملہ کیا پستی نے ارتفاع کو گرادیا۔ عشق نے حسن کو جیت لیا۔ اور پھر اس کے بعد اسی لڑکی نے کہا۔ ''سُجانا! کیا دنیا میں ایسا بھی ہوتا ہے۔ کیا ایسے بھی آدمی دنیا میں بستے ہیں۔ جو وشواس کا گھات کرتے ہوں''۔ میں بہت شرمندہ ہو گیا۔ لیکن گناہ بھی کتنا حسین اور میٹھا ہوتا ہے۔ میں نے اسے آہستہ سے کہا۔ ''تم مجھے معاف کرنا۔ میرے دل میں کمزوری آ گئی۔ میں اسے قابو میں نہ رکھ سکا''۔ اُس نے کہا۔ ''معاف کرنے کی بات نہیں۔ لیکن اگر۔''

میں اس کا مطلب سمجھ گیا۔ میں نے کہا۔ ''مجھے وہ بھی منظور ہے۔ میں اسی گھاٹ پر رہتا ہوں۔ تم مجھے اسوقت بلا لینا۔ اسے ہلاک مت کرنا میں آکر اسے چپکے سے اُٹھا لاؤں گا۔ کسی کو خبر تک نہ ہو گی''۔

اور پھر ہوا بھی ایسا ہی۔ نو مہینے کے بعد یہ لڑکی پیدا ہو گئی۔ جو آج ماں بنکر ڈونگہ چلا رہی ہے''۔

یہ کہہ کر اسکی آواز رک گئی۔ اس کی آنکھوں سے پھر آنسو بہنے لگے۔ میں نے پوچھا۔ ''پھر کیا ہوا؟''

سُجانا نے کہا۔ ''دوست تم مجھے ذلیل نہ سمجھنا۔ مجھ سے نفرت نہ کرنا یہ کام میں شباب میں کیا ہے۔ آج سے کئی برس پہلے''۔

میں نے کہا۔ ''ارے جانے دو اس بات کو۔ شباب میں تو کیا ہی جاتا ہے سب کچھ۔ لیکن یہ تو بتاؤ۔ اس کے بعد کیا ہوا۔؟''

سُجانا نے کہا۔ ''میں اس لڑکی کو لے آیا۔ لیکن گھر میں اسے کیا کرتا۔ میں نے اسے ایک دوست کے حوالے کیا۔ اس کے ہاں کوئی اولاد نہ تھی۔ اس نے اسے بیٹی سمجھ کر پالا پوسا۔ اسکی شادی کی۔ لیکن اس لڑکی کو معلوم نہیں۔ میرا باپ کون ہے۔ ماں کون ہے؟''

میں نے پوچھا۔ ''اسکی ماں کا کیا ہوا۔ کیا دنیا میں ایسی بھی عورتیں ہیں۔ جو اپنی لخت جگر کو پھینک دیتی ہیں۔ کسی غیر کے حوالے کرتی ہیں۔''

سُجانا نے کہا۔ ''نہیں ایسی تو نہیں ہیں۔ لڑکی پیدا ہوتے ہی اس نے شرم کے مارے زہر کھا کر اپنے آپ کو ختم کر دیا۔ اور یہ سب کچھ میری بدولت ہوا۔ میری بدولت!''

میں نے پوچھا۔ ''اس نے زہر کیوں کھایا۔؟''

سُجانا نے کہا۔ ''وہ کنواری تھی۔ اس کا باپ نہیں تھا۔ ماں تھی بوڑھی۔ جس نے چند مہینے بعد ہی سب کچھ بھانپ لیا۔ کہ برادری میں ان کی ناک کٹ گئی۔ لڑکی کو بہت کچھ کرنے پر اکسایا گیا۔ لیکن وہ نہ مانی۔ اور جب یہ لڑکی پیدا ہوئی۔ اُس نے مجھے بلا بھیجا۔ میں لڑکی لے آیا۔ اور پھر دسویں دن مجھے معلوم ہوا۔ وہ مر گئی۔''

میں نے کہا۔ ''اوہ سُجانا! کتنی غلطی؟ کتنا بڑا گناہ؟ لیکن میں اس کو بلا کر کہوں گا۔ سُجانا تیرا باپ ہے''۔

سُجانا نے گھبرا کر کہا۔ ''نہیں ایسا نہ کرنا۔ اسے دکھ ہوگا۔ شاید اسے معلوم

نہیں۔سُجانا میری ماں کا قاتل ہے۔یہ جان کر وہ مجھ سے نفرت کرے گی۔اس کا ضمیر مجھے لعنت بھیجے گا۔ایسانہ کرنا بابو۔تم میرے دوست ہونا!''میں خاموش ہو گیا۔

صبح ہوئی۔میں نے دیکھا۔نالے کی دوسری طرف ٹھہرا ہوا ڈونگہ وہاں نہیں ہے۔شاید علی الصباح چلا گیا ہے۔میں نے اُٹھ کر آہستہ سے پکارا۔

''سُجانا''!سُجانا نے اپنا سر لحاف سے نکال کر آہستہ سے کہا۔''ہاں!''

میں نے کہا۔''ڈونگہ چلا گیا ہے!''

سُجانا نے لیٹے لیٹے ہی اسطرف دیکھا۔جہاں ڈونگہ ٹھہرا تھا۔اور آہستہ سے کہا۔''ہاں بابو''۔

اب بھی جب شام کو سُجانا اپنی کشتی لے کر آہستہ آہستہ آجاتا ہے میں سوچتا ہوں۔کبھی اس بوڑھے کے سینے میں کتنی پرزور جوانی تھی۔اسکی آنکھوں میں خواہشات کا کتنا طوفان تھا۔لیکن اب۔

اب وہ سب کچھ ختم ہو گیا ہے۔ایک یاد رہ گئی ہے۔خالی!
میٹھی.........لیکن گناہوں سے بھری!!

............☆☆☆............

اَپُنا سَب کُچھ

درانجمنِ خوِ دبار مدِہ ہمچُو مَنے را
اَفسُر دہ دِل اَفسردہ کُند انجمنے را
(غنیؔ)

اُپنا سَب کچھ

پرساد بٹ کے مرنے پر لچھمن کی دنیا تاریک ہوگئی۔ جھونپڑی میں یا تو لچھمن رہ گیا۔ یا لچھمن کی سیاہ بختی! باپ کی اولا سے اسکی صرف ایک بہن تھی رادھا۔ جو پرساد بٹ کے جیتے جی ہی لار میں بیاہی گئی تھی۔ لچھمن رادھا سے چھوٹا تھا۔ اور رادھا۔ بہت تجربہ کار بہن!

ماتم داری کے دن ختم ہو کر راودھا نے کہا۔ "اب یہاں پڑے کیا کرو گے؟" لچھمن کو اسوقت اپنا ماضی جسے وہ کبھی شاندار سمجھتا تھا۔ یاد آ گیا۔ اور اس یاد کے ساتھ ہی اس کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ سامنے بیٹھی ہوئی بہن کے دل میں بھی پیار کے خون نے جوش مارا۔ اس نے لچھمن کو سمجھاتے ہوئے کہا۔ "تم روتے کیوں ہو۔؟ جب تک میں زندہ ہوں۔ تمہیں کوئی یتیم کہہ نہ سکے گا"۔

مصیبت زدہ انسان کے لئے کسی وقت ہمدردی کا ایک آدھ لفظ ہی قارون کے خزانے کا کام دیتا ہے۔ لچھمن کو محسوس ہوا۔ رادھا کے بیتر پیار کا ایک بے پناہ ساگر ہے۔ جس کا نہ کہیں ساحل ہے نہ دہانہ، اور اسی ساگر میں ڈوبتے ہوئے لچھمن کو کوئی محبت سے کہہ رہا ہے۔ "جب تک میں زندہ ہوں تمہیں کوئی یتیم نہ کہے گا۔" رادھا تھوڑی دیر سر جھکا کر لچھمن کے سامنے اپنے آنسوؤں کو پی پی کر بولی۔ "کہو۔ تو کل ہی لار چلیں۔ بچوں کے ساتھ تم بھی ایک بچہ بن جاؤ۔"

۲

لار میں جو خوشی لچھمن کو ہونی چاہئے تھی۔ اسے وہ محسوس نہ ہوئی۔ ایک پردیسی کی طرح وہ صبح کی روٹی کھا کر کھیتوں کی طرف نکل جاتا۔ اور کسی ندی کے کنارے یا چنار کے گھنے سائے میں بیٹھا رہتا۔ لار کی ہر چیز میں اُسے بیگانگی سی دکھائی دیتی۔ وہاں کے باشندوں میں بے مروتی حتیٰ کہ درختوں پرندوں اور چوپایوں میں بھی اسے اجنبی پن نظر آتا۔ بیٹھے بیٹھے ہی اسکی آنکھوں میں سرینگر کا بارونق شہر پھر جاتا۔ وہ چہل پہل۔ لوگوں کی وہ خوش خلقی۔ کارخانوں کا بے پناہ شور۔ دریائے جہلم کی روانی۔ صبح اور شام کی دلکشی۔ شفق اور افق کی ملاحت۔ جانوروں کا اُنس۔ سب کچھ سینما کے پردے پر پھرتی ہوئی تصویروں کی طرح اسکے سامنے نظر آتا۔ بعض اوقات دیوانوں کی طرح جھٹ سے اُٹھ کھڑا ہوتا۔ اور بعض اوقات آنسوؤں سے بھرے پپوٹوں اور ناامیدی سے بھری نظروں سے آسمان کی طرف دیکھتا۔ شالی کے کھیتوں میں کام کرنے والے کسان اکثر اسے اس حالت میں دیکھ کر مسکراتے۔

رادھا کے گھر میں اگرچہ لچھمن کو کافی سکھ تھا۔ لیکن بیگانگی کا جو کانٹا اس کے دل میں چُبھ گیا تھا۔ وہ اسے ہر وقت بے چین کئے دیتا تھا۔ ہاں اسوقت اسکی روح کو تسلی سی ہوتی۔ جب رادھا کا سب سے چھوٹا بچہ موہن آنکھوں اور ہونٹوں دونوں سے مسکرا کر اس کی گود میں آ کر بیٹھتا اور کہتا۔ ''ماما''۔

'ماما' کے اس پیارے لفظ سے لچھمن اپنا سب کچھ بھول جاتا۔ اسے موہن کے معصوم دل میں رادھا سے بڑھ کر پیار دکھائی دیتا۔ اور اسے محسوس ہوتا جیسے وہ بہت پہلے موہن کو جانتا تھا۔ اور موہن بھی اسے جانتا تھا۔ اسوقت جب نہ لچھمن تھا نہ موہن!

۳

لچھمن گھر کی روٹی کھائے اور دن بھر کھیتوں میں وقت ضائع کرے۔ یہ رادھا برداشت کرسکتی تھی۔ لیکن رادھا کا خاوند نہیں۔ لچھمن کو گھر میں آتے دیکھ کر ہی اس کا ماتھا ٹھنکا تھا۔ پرانی وضع کا انسان سب کچھ برداشت کرسکتا ہے۔ لیکن ایک ہٹے کٹے سالے کی ناز برداریاں اور وہ بھی اپنی کمائی پر کبھی برداشت نہیں کرسکتا۔

ایک دن صبح اس نے اپنی بیوی کو بلایا اور پوچھا۔ ''لچھمن کیا یونہی وقت ضائع کرتا پھریگا؟''

رادھا کے پاس اس کا کوئی جواب نہ تھا۔ وُہ خاموش ہوگئی۔

اور سدرشن نے پھر کہا۔ ''مصیبت ہاتھ پر ہاتھ دھرے تو نہیں ٹلتی کچھ کرنا ہی پڑتا ہے''۔

اب رادھا سے نہ رہا گیا۔ بولی۔ ''مصیبت اس کے دشمنوں کو۔ اسے کیا غم ہے؟ باپ کا جوڑا ہوا پیسہ ہی کھانے لگے۔ تو بھی عمر بھر کے لئے کافی ہے''۔

سُدرشن کے ماتھے پر تیوریاں چڑھ گئیں۔ بولا۔ ''خوب درد ہے تمہیں بھائی کا۔ اتنا پیسہ ہے۔ تو شہر ہی کے کسی ہوٹل میں کیوں نہ ٹھہرا؟''

رادھا کو خاوند کے ان الفاظ سے بہت رنج ہوا۔ اس نے آنسو پونچھتے ہوئے کہا۔ ''نہ بیچارے پر مصیبت کا پہاڑ ٹوٹتا۔ نہ ایسی پھبتیاں سنتا''۔

اُسی وقت موہن کو گود میں لئے لچھمن آگیا۔ موہن نے ماں کو دیکھ کر کہا۔ '' ماں۔! آج ماما مجھے بہت دور لے گیا۔ ندی کے کنارے جو مکی کے کھیت ہیں۔ وہاں۔ اور ایک بات بتاؤں۔ ہم نے مکی کے اتنے بھٹے کاٹ لئے۔ کہ واہ واہ''۔

سدرشن پہلے ہی بھرا بیٹھا تھا۔ گرج کر بولا۔ ''کس نے کاٹے۔''؟

موہن نے مسکرا کر لچھمن کی طرف دیکھا اور کہا۔ ''ماما نے۔!''

رادھا سدرشن کا غصہ تاڑ گئی۔ وہ بیچ ہی میں بول اُٹھی۔ ''ایسا نہ کرنا چاہئے۔ کاٹے تو تم ہی نے ہوں گے۔ نام ماما کا لے رہے ہو!''

موہن نے کہا۔ ''نہیں۔ ماما ہی نے کاٹے''۔

سدرشن نے بے دردی سے موہن کے گال پر طمانچہ دے مارا۔ اور بیوی کو مخاطب کر کے بولا۔ ''دیکھ رہی ہو اپنے بھائی کے کارنامے؟ جسکی مکی پر ہاتھ صاف کیا۔ جانتی ہو کون ہے وہ؟ اگر اسے پتہ لگے تو راتوں رات ہی سارے گاؤں کو جلا کر خاک کر دے؟''

پھر لچھمن سے مخاطب ہوتے ہوئے کہا۔ ''یہ کام تمہیں کرنے ہیں۔ تو میرے گھر میں تمہارے لئے گنجائش نہیں۔ تم بھلے ہی سرینگر میں لوٹ مچاتے پھرو۔ گاؤں میں یہ نہیں چلے گا۔ بے وقوف! پاپی! میرے بیٹوں کو بھی برباد کرنے پر تلا ہوا ہے۔ آج تک گاؤں میں کوئی میرا نام نہ جانتا تھا۔ آ گیا بھکاری کا شہزادہ!؟''

اس رات لچھمن کو نیند نہ آئی۔ بے چارہ سوچتا رہا۔ موہن کیلئے کھیت سے بھٹے کاٹے۔ وہ بھی رادھا ہی کے گھر لایا۔ اور پھر بھی یہ بے عزتی اسے خیال تھا۔ بھٹے دیکھ کر موہن کے والدین انعام دیں گے۔ لیکن اُلٹا کیا ملا۔ فضیحت!'' اس نے مصمم ارادہ کیا۔ کہ وہ سرینگر واپس چلا جائے۔ لیکن جب اسے موہن کا خیال آیا۔ تو ارادہ دھرا کا دھرا رہ گیا۔

دوسرے دن اس نے رادھا سے کہا۔ ''میں شہر جاؤں گا رادھا۔ تم لوگوں کو میری بدولت بہت تکلیف ہے۔''

رادھا نے سینہ پیٹ کر کہا۔ ''کیسی باتیں کرتے ہو؟ وہاں کون ہے جو تمہاری دیکھ بھال کرے گا؟''

لچھمن نے ناخن سے چٹائی کو کھرچتے ہوئے کہا۔ ''جن کا کوئی نہیں ہوتا۔ وہ

مرجاتے ہیں کیا''؟

رادھا نے کہا۔''مرتے نہیں۔لیکن ان کی زندگی موت سے بدتر ہوتی ہے!''

لچھمن نے کہا۔''بس یہی میں بھی چاہتا ہوں۔سچ پوچھو رادھا۔جب سے ''لالہ'' مرگیا۔مجھے یہ سارا سنسار شمشان بھومی دکھائی دے رہا ہے۔''

رادھا کی محبت کا سمندر موجزن ہوا۔اس نے لچھمن کو گلے لگاتے ہوئے اور آنکھوں سے آنسو بہاتے ہوئے کہا۔''میں نہ جانے دوں گی۔میرا موہن! میرے بچے تمہاری جدائی میں پاگل ہو جائیں گے۔!''

اسی وقت موہن آیا۔اور لچھمن کی گود میں بیٹھ کر اسے حیرت کی نگاہوں سے دیکھنے لگا۔کبھی وہ لچھمن کو دیکھتا تھا۔اور کبھی ماں کو!

ماں نے ظاہر طور پر مسکرا کر کہا۔''ماما کہتا ہے میں شہر جاؤنگا''۔موہن نے لچھمن کی طرف دیکھ کر پوچھا۔''کیوں ماما۔جاؤ گے؟ میں تو نہ جانے دوں گا''۔لچھمن نے موہن کے کرتے سے آنسو پونچھتے ہوئے کہا۔''ہاں جاؤنگا''،موہن نے معصومانہ انداز میں پوچھا۔''پھر بھٹے کون لائے گا میرے لئے؟''

لچھمن نے اس کا کوئی جواب نہ دیا۔اور اُٹھ کر آہستہ آہستہ باہر نکل گیا۔

شام کو بھی جب وہ واپس نہ آیا۔تو رادھا اور موہن کے سوا کسی نے اسکی جدائی محسوس نہ کی۔سدرشن نے ایسا محسوس کیا۔جیسے اسکے سر سے ایک بھاری چٹان کسی مشفق نے اُٹھالی ہو!۔

تیسرے دن جب رادھا نے کپڑے دھوپ میں ڈالے۔تو لچھمن کا ایک میلا کرتا بھی ان میں آگیا تھا۔اس نے اسے سوٹی سے اُٹھا کر دور پھینک دیا۔اوپر سدرشن یہ منظر دیکھ رہا تھا۔وہ کھلکھلا کر ہنس پڑا۔اور دل ہی دل میں کہنے لگا۔لفنگا۔بے ایمان۔اُچکا۔!

۴

لچھمن کے جانے کے بعد رادھا کبھی کبھی اسکی یاد سے بے چین ہو جاتی اور خصوصاً اسوقت وہ زیادہ بے تاب ہو جاتی۔ جب موہن معصومانہ انداز میں اس سے پوچھتا۔ ''ماں۔ ماما کب آئے گا؟''

ماں آنگن میں اُگے ہوئے ایک چھوٹے سے اخروٹ کے درخت کی طرف اشارہ کر کے کہتی۔ ''جب اس میں اخروٹ لگیں گے۔ تب۔''

موہن حیرت بھری نظروں سے چھوٹے درخت کو دیکھ کر پوچھتا۔ ''کب اخروٹ لگیں گے۔ کل؟ پرسوں؟''

رادھا اسے ٹالنے کے لئے کہتی۔ ''نہیں۔ جب یہ بڑا ہو گا۔''

اس دن سے موہن کو جو کچھ ملتا۔ اس میں سے وہ ضرور کچھ حصہ درخت کے نیچے کھودے ہوئے بل میں ڈال دیتا۔ شاید اس لئے کہ درخت یہ چیزیں کھا کر جلد جلد بڑا ہو۔ اس میں اخروٹ لگیں۔ اور ماما واپس آئے۔

معصوم فطرت کا یہ کارنامہ صرف قدرت دیکھتی تھی۔ سمجھتی تھی اور ہنستی تھی۔!

دن، مہینے اور سال بیت گئے۔ نہ لچھمن آیا اور نہ رادھا شہر گئی۔ گھر کے جنجال میں وہ ریشم کے کیڑے کی طرح پھنس گئی تھی۔ جس نے اس سے سب کچھ چھین لیا تھا۔ لیکن موہن کو لچھمن برابر یاد تھا۔ وہ کبھی کبھی ماں سے پوچھتا۔ ''ماما کب آئے گا۔''؟ باپ اسے ٹالنے کے لئے کہ اُٹھتا۔ ''تمہاری شادی پر!'' موہن خاموش ہو جاتا!

اس طرح لچھمن کی یاد سب کے دل سے بھول گئی۔ ہاں رادھا اسے نہ بھول سکی۔

۵

ہوسٹل کے چوکیدار نے کھیل کے میدان سے آئے ہوئے لڑکوں سے

پوچھا۔''بابو۔آپ لوگوں کا کوئی رشتہ دار ہے؟''

لڑکوں قہقہہ لگا کر کہا۔'' کیوں نہیں؟ سینکڑوں ، ہزاروں لیکن بات کیا ہے؟''

چوکیدار نے کہا۔''ایک ادھیڑ عمر کا آدمی کسی لڑکے سے ملنا چاہتا تھا''۔!ایک لڑکے نے پوچھا۔''کس سے بابا؟ کسی کا نام تو لو۔''

چوکیدار بوڑھا تھا۔اس نے کہا۔''ہم اتنی باتیں کیا جانیں! اسے وہ ملا نہیں اور لوٹ گیا۔''

لڑکوں نے قہقہہ لگایا۔اور اندر داخل ہوتے ہوئے کہا۔''راسکل ہمیں بنا رہے ہو۔''

بوڑھا چوکیدار ڈیوڑھی کے پھاٹک والے کمرے میں چلا گیا۔اور لڑکے اپنے کمروں میں۔لیکن دوسرے دن شام کو چوکیدار نے دوبارہ ایک لڑکے سے کہا۔'' بابو۔آپ کا رشتہ دار آیا تھا۔''

لڑکے نے بوڑھے کی لمبی داڑھی کو شرارت سے کھینچ کر کہا۔''ہمارا۔''؟

چوکیدار نے کہا۔''جی آپکا۔آپ کا نام موہن لال نہیں؟''

موہن لال کے پیروں تلے زمین نکل گئی۔حیرت سے چوکیدار کو دیکھ کر بولا۔''کون رشتہ دار۔؟''

چوکیدار نے کہا۔''بھلا ہم کیا جانیں! یہ پانچ روپے کا نوٹ آپ کے لئے دے گیا ہے۔!''

موہن لال نے دیکھا۔سچ مچ بوڑھا چوکیدار اندر کی جیب سے پانچ روپے کا میلا نوٹ نکال رہا ہے۔اور جب اس نے وہ نکالا۔اور اسے دیا۔تو موہن کی حیرانی اور بڑھ گئی۔نوٹ لینے سے وہ جھجکا۔دو قدم پیچھے ہٹ کر بولا۔''بابا! میرا کوئی رشتہ دار

نہیں۔ میں روپے کیسے لوں؟''

چوکیدار نے کہا۔''واہ بھئی ! اُس نے مجھے کہہ رکھا ہے۔''یہ موہن لال کو دے دینا۔ جو لارکار ہنے والا ہے۔ اور تم کہتے ہو۔ میرا کوئی رشتہ دار نہیں۔''

موہن لال نے اپنی یاداشت پر بہت زور ڈالا۔ لیکن کچھ یاد نہ آیا۔ نوٹ لوٹاتے ہوئے اس نے کہا۔''میں نہ لوں گا بابا۔ آئے گا تو اسے لوٹا دینا۔ یا نام پوچھ لینا''۔

چوکیدار نے نوٹ لیا اور کہا۔''مرضی آپ کی ۔ مت لو۔ ہم اسے واپس کر دیں گے۔''

جب ہوسٹل میں اس نے یہ بات اپنے دوستوں سے کہدی۔ تو انہوں نے اسے خوب جھاڑا۔ بولے۔''کتنے احمق ہو۔ مفت میں پانچ روپے ملے تھے۔ اور واپس کئے۔ اگلے اتوار کا جلسہ خوب رہتا''۔ موہن نے انہیں سمجھایا کہ ایسے روپے لینا ٹھیک نہیں۔ جانے کس کے ہوں؟''

لیکن کالج کے لڑکے اس مٹی سے نہیں بنے تھے۔ جس مٹی سے عام لوگ بنے ہیں۔ ان کی مٹی میں آگ زیادہ اور پانی کم ہوتا ہے۔

موہن ان کی باتوں میں آ گیا۔

دوسرے دن اس نے چوکیدار سے کہا۔''لاؤ بابا نوٹ۔ وہ میرا رشتہ دار ہے۔ لیکن جب دوبارہ آئے۔ تو مجھے خبر کر دینا۔ سمجھے۔؟''

چوکیدار نے نوٹ نکال کر دیا۔ اور موہن اپنے زعم میں اسے الو بنا کر بھاندتا کودتا چلا گیا۔

٦

کچھ دنوں بعد ایک آدمی نے چوکیدار سے کہا۔''بھائی۔ نوٹ دے دیا تھا

اسے؟"

چوکیدار نے اسے پہچانا اور کہا۔ "دیا تھا۔ لیکن اس نے پہلے لینے سے انکار کر دیا تھا۔ کہتا تھا۔ ہمارا کوئی رشتہ دار نہیں۔"

اجنبی کا منہ حیرت سے کھل گیا۔ لیکن جلد ہی بولا۔ "ٹھیک کہا اس نے۔"

چوکیدار نے پوچھا۔ "بھلا نام تو بتاؤ کیا ہے تمہارا؟ ہم اسے آج کہہ دیں گے!"

اجنبی نے کہا۔ "نام۔؟ میرے نام سے اسے نفرت ہوگی۔ ہاں آج اس کے لئے دس روپے دیتا ہوں۔ اسے دے دینا۔ بڑا احسان ہوگا۔"

چوکیدار نے کہا۔ "نا بابا۔ ہم نہیں لیں گے۔ کچھ دینا ہو تو خود دے آؤ۔ اس وقت وہ کالج میں ہے۔ کہو تو اسے بلا لاؤں۔"

اجنبی مضطرب ہو گیا۔ اس نے جلد جلد کہا۔ "نہیں۔ بلانا نہیں خدا کے لئے نہیں! صرف دس روپے اسے دے دینا۔!"

یہ کہہ کر اس نے دس روپے کا نوٹ اسے دیدیا۔ اور جلد جلد قدم اُٹھاتا ہو اوجھل ہو گیا۔

اسی شام جب چوکیدار نے موہن کو دس روپے کا نوٹ دیا۔ تو اس نے حیران ہو کر پوچھا۔ "آج وہ پھر آیا تھا۔؟"

چوکیدار نے کہا۔ "جی بابو۔ بولا۔ اسے میرے نام سے نفرت ہوگی۔ اسی لئے نام نہ بتاؤں گا"۔

موہن لال کی نظریں فرطِ عقیدت سے جھک گئیں۔

اس نے پوچھا۔ "کب آیا تھا؟"

چوکیدار نے کہا۔ "آج دو بجے! تم لوگ سبق پڑھ رہے تھے"۔

موہن لال نے کہا۔ "مجھے کیوں نہ بلایا۔؟"

چوکیدار نے کہا۔" بابو وہ تو عجیب آدمی ہے۔نوٹ دیا اور بھاگ گیا۔"

موہن لال نے پوچھا۔" پھر آنے کو کہہ گیا ہے؟"

چوکیدار نے کہا۔" نہیں تو۔ جانے پھر کب آئے گا!"

۷

سوامی امر ناتھ کے یاترا کے دن آنے والے تھے۔ کالجوں اور سکولوں میں کچھ دنوں بعد چھٹیاں ہونے والی تھیں۔ گاؤں کے لڑکے چھٹیوں میں گھر جانے کی تیاریاں کر رہے تھے۔ ایک دن شام کو چوکیدار نے موہن لال کو اپنے کمرے میں بلایا۔ اور کاغذوں کا ایک بنڈل دیتے ہوئے کہا" یہ لو بابو۔ آج وہ پھر آیا تھا۔ آتے ہی یہ بنڈل چھوڑ گیا۔ اور چلا گیا۔ اب شاید وہ کبھی نہ آئے گا۔"

موہن نے بنڈل کھولا۔ اس میں ایک پاس بک، ایک اشٹامپ اور کچھ کاغذ تھے۔ 'پاس بک' کے سرورق پر 'لچھمن'' کا نام لکھا تھا۔ جسے کاٹ کر ڈاک خانہ سے موہن لال لکھا گیا تھا۔ اسٹامپ پر فارسی میں کچھ لکھا تھا۔ اور دوسرے کاغذوں پر بھی رسیدیں اور ضروری نوٹ تھے۔ موہن نے جلد جلد پاس بک کھولی۔ تو اس میں ۵۷۳ روپے درج تھا۔ اور اسی ورق میں ایک پرچہ تھا۔ جس میں لکھا تھا۔" ماما لچھمن کی طرف سے اپنے بیٹے موہنؔ کو آخری پیار کے ساتھ اپنا سب کچھ موہن حیران رہ گیا۔ اسے یاد نہ تھا۔ کہ لچھمن کون ہے؟"

۸

رادھاؔ کی آنکھوں میں آنسو تھے۔ اور سدرشن کی نظریں فرطِ عقیدت سے جھکی ہوئی۔

آج موہن کی کہانی سن کر انہیں لچھمن کا کریکٹر (character) دیوتاؤں سے زیادہ پاکیزہ دکھائی دے رہا تھا۔ جب ان ہی کے گھر میں اتنی مصیبت اُٹھا کر بھی

وہ ان کے لخت جگر کو نہ بھلا سکا۔اور آخری بار۔آخری پیار کے ساتھ اپنا سب کچھ موہن کی بھینٹ کر دیا۔

آج لگ بھگ پندرہ برس کے بعد رادھا اور سدرشن لچھمن ماما کے گن اپنے بچوں کے سامنے گا رہے تھے۔اور انہیں اس جیسا تحمل اور تدبر حاصل کرنے کی نصیحت کر رہے تھے۔

اسی وقت موہن نے ماں سے کہا۔"ماں بھوک لگی ہے۔ نئے اخروٹ ہوں۔تو مزا آئے۔"

ماں نے آنگن میں لگے ہوئے درخت کی طرف دیکھا۔جس کی شاخیں اخروٹ سے جھکی پڑی تھیں۔آج اسے پندرہ برس کی بات یاد آ گئی۔جب موہن نے اسے پوچھا تھا۔"ماں۔کب آئے گا ماما۔"اور ماں نے اسی درخت کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا تھا۔"جب یہ بڑا ہوگا۔اور اس میں اخروٹ لگیں گے۔"

آج آنگن کے درخت میں اخروٹ بھی لگے تھے اور ماما کا سارا پیار بھی واپس آ گیا تھا!!

............☆☆☆............

اِنسانُ ساز

درکار خانۂ کہ رہ علم و عقل نیست
وہم ضعیف رائے ِ فضول چرا کندر
(حافظؒ)

اِنسان ساز

غار میں داخل ہوتے ہی رفیق نے کہا۔ ''یہاں کتنی تاریکی ہے حسینؔ؟''

حُسینی نے اس کے شانے پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا۔ ''کیا ہوا۔ غاروں میں تاریکی نہ ہو۔ تو اور کہاں ہو۔ میدانوں میں؟''

رفیق نے کہا۔ ''نہیں لیکن اتنی تاریکی میں نے آج تک کہیں بھی نہیں دیکھی!'' حسینی نے مسکرا کر کہا۔ ''آج تو دیکھ رہے ہو نا۔ لیکن جانتے بھی ہو۔ اس سے ہم کو کیا سبق ملتا ہے۔؟''

رفیق نے آہستہ سے کہا۔ ''نہیں تو۔!''

غار کے اندر تھوڑے فاصلے پر ایک بڑی چٹان تھی۔ حسینی اسی پر بیٹھ گیا اور کہنے لگا۔ ''ہمیں اس تاریکی کو فنا کر دینا ہے۔ ہمیں ہر طرف اجالا ہی اُجالا کرنا ہے!''

۲

رفیق اس کے قریب آ گیا۔ اور حسینی نے پھر کہا۔ ''یہی تاریکی گناہوں کی پردہ دار ہے۔ اسی میں لرزہ خیز گناہ کیئے جاتے ہیں!''

رفیق نے کہا۔ ''میں یہ سمجھ نہیں سکتا حسینی!''

حسینی نے اُٹھتے ہوئے کہا۔ ''میرے ساتھ آؤ!''

غار کے اندر ایک بڑی چٹان پر چراغ جل رہا تھا۔ حسینی نے دور ہی سے

اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ ''رفیق! وہ چراغ کس خاموشی سے تاریکی کو فنا کر دیتا ہے۔ خود جلتا ہے۔ لیکن اف تک نہیں کرتا۔ اسکی وجہ معلوم ہے تمہیں؟''

رفیق نے حیرت میں ڈوب کر سر سے اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ ''نہیں!''

حسینی نے زور سے ہنسکر کہا۔ ''نادان! اس کی زندگی ہی قدرت نے روشنی پھیلانے کے لئے بنادی ہے۔!''

رفیق نے چراغ کی طرف حیرت سے دیکھ کر پوچھا۔ ''لیکن اس کو جلا کس نے رکھا ہے؟''

حسینی نے سر اونچا کر کے کہا۔ ''میں نے! لیکن اگر یہ بجھ گیا تو......''

رفیق نے گھبرا کر پوچھا۔ ''تو کیا ہوگا؟''

حسینی نے کہا۔ ''یہ نہ پوچھو رفیق! ہمیں اس قسم کے خیالات کو دل میں جگہ ہی نہیں دینی چاہیئے۔!''

رفیق نے کہا۔ ''تو بھی کیا ہوگا؟''

حسینی نے کہا۔ ''اگر یہ بُجھ گیا۔ تو ہمارا کام نامکمل رہ جائے گا۔ ہمارا انجام بہت برا ہوگا۔ بہت برا ہوگا رفیق! جس کے تصور ہی سے میری روح کانپنے لگتی ہے!''

رفیق نے خوف بھری نظروں سے حسینی کی طرف دیکھا۔ اور حسینی نے مسکرا کر پوچھا۔ ''تم ڈرتے ہو؟ زندگی کیا ہے؟ ابھی ہے ابھی نہیں۔ لیکن جو کام ہم شروع کریں گے۔ وہ تو رہتی دنیا تک یادگار رہے گا''۔

رفیق نے تعجب آمیز نگاہوں سے چراغ کو دیکھا جو دھیمے دھیمے جل رہا تھا۔ بغیر کسی مداخلت کے اور تب اُس نے پوچھا۔ ''اور وہ کیا ہے؟''

حسینی نے نزدیک آکر اُس کے کان میں کچھ کہہ دیا۔

رفیق نے بات سنتے ہی خوف سے کہا۔ ''نہیں حسینی! ایسا نہیں ہوگا! مجھے سے

ایسا نہیں ہوگا"۔

حسینی نے حیرت سے اسکی طرف دیکھا۔ اور گرج کر کہا۔ "رفیق!" رفیق کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ اس نے آنسو بھری نظروں سے حسینی کی طرف دیکھا اور کہا۔ "حسینی! مجھے جانے دو۔ ایسا کام مجھ سے نہیں ہوگا"۔ اور پھر اسکے قدموں پر جھک گیا۔

حسینی نے اُسے اوپر اٹھایا۔ اور کہا۔ "تم جا نہیں سکتے۔ میں نے تمہیں اپنا راز بتا دیا۔ ایسی حالت میں تم زندہ باہر جا سکتے ہو؟ ناممکن!

رفیق یہ ناممکن ہے۔"

رفیق نے رو کر کہا۔ "میں تمہارا راز کسی پر ظاہر نہیں ہونے دوں گا حسینی مجھ پر اعتبار کرو!"

حُسینی نے کہا۔ "تم کتنا بھی روؤ۔ میرا دل نہیں پگھلے گا۔"

رفیق نے پھر کہا۔ "مجھے معلوم نہ تھا۔ تمہارا کام اتنا مشکل ہے۔ حسینی اگر مجھے یہ معلوم ہوتا۔ تو میں آتا ہی نہیں۔"

حسینی نے کہا۔ "مشکل کیا ہے؟ اس الفاظ نے تو دنیا والوں کو پریشان کر رکھا ہے۔ میں دکھا دوں گا۔ جس کام کو دنیا مشکل کہتی ہے۔ وہ کتنا آسان ہے۔! تم نادان ہو۔ سوچ لو۔ تمہارے سامنے دونوں چیزیں ہیں۔ عمر جاوِدان بھی اور ذلت کی موت بھی۔ جو چیز تمہیں پسند ہے۔ وہ تمہیں میری بدولت مل سکتی ہے!"

رفیق نے کہا۔ "میں نے سوچ لیا ہے۔ میں تمہارا ہاتھ نہیں بٹا سکونگا مجھے یہاں سے جانا ہی ہوگا۔"

حسینی نے دوڑ کر اس کی گردن پکڑ لی۔ اور کہا۔ "راز کی بات جان کر غار سے زندہ نکلنے کے خواب دیکھ رہے ہو۔؟ میں نے تم پر بھروسہ کیا۔ اور تم اب دھوکا دینا چاہتے ہو؟ دیکھتا ہوں۔ اب تم یہاں سے کیونکر نکل سکتے ہو؟"

اس کے بعد اس نے اپنے پاس ہی پڑا ہوا ایک بہت بڑا پتھر اُٹھایا جس کے نیچے ایک اور غار دکھائی دیا۔ بالکل تاریک! کوئیں کی طرح گہرا خندق کی طرح خاموش! اور پھر رفیق کو اس کے نزدیک دھکیل کر کہا۔ ''تم نے مجھے ناامید کر دیا۔ میں تجھے ناامید کرتا ہوں''۔

رفیق خوف کے پسینوں سے شرابور ہو گیا۔ اس نے کہا۔ ''حسینی! مجھے معاف کر دو۔ گھبراہٹ میں نہ جانے میں نے کیا کچھ کہا۔ میں تمہارا ساتھ دینے کا وعدہ کرتا ہوں۔''

حسینی نے اوچھل کر کہا۔ ''وعدہ؟ اب تو تمہیں اس کے لئے عملی ثبوت دینا ہوگا۔''

رفیق نے کہا۔ ''میں وہ بھی دے دوں گا۔''

حسینی نے کہا۔ ''میرے ساتھ آؤ۔!''

حسینی اور رفیق چراغ کے نزدیک آ گئے۔ حسینی نے اپنی جیب سے چھرا نکال کر رفیق کو دے دیا۔ اور کہا۔ ''اپنے بازو کے خون سے اس چراغ کو بھر دو۔ اس کا تیل ختم ہو گیا ہے۔ لیکن خبردار! زبان سے اُف تک نہ کرنا''

رفیق نے بے پروائی سے کہا۔ ''تم خود ہی میرے بازو پر گھاؤ لگا دو۔''

حسینی نے زور سے ہنسکر کہا۔ ''میں لگا دوں؟''

رفیق نے کہا۔ ''دیدو چھرا''۔ اسکے بعد رفیق نے خود ہی اپنے بازو پر زخم لگا دیا اور خون ٹپ ٹپ کر چراغ میں بہنے لگا۔ جب چراغ بھر گیا تو حسینی نے کہا۔ ''رہنے دو۔ لیکن اگر تمہاری نیت میں کسی قسم کا فرق آ گیا۔ تو جانتے ہو۔ اس چراغ میں خون جلنے سے اس کا تم پر کیا اثر پڑے گا؟''

رفیق نے سر سے اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ ''نہیں!''

حسینی نے اس کے کان میں کچھ کہہ دیا۔ اور پھر زور سے کہا۔ ''یہ ہوگا۔!''

رفیق نے دھیمی آواز میں پوچھا۔ ''اور یہ چراغ؟''

حسینی نے کہا۔ ''اس میں انسانی خون بھی تیل کی طرح جلتا ہے۔ اسی خون سے پاکیزہ روحیں بنتی ہیں!''

رفیق نے غار کا جائزہ لیا۔ دیکھا کچھ مٹی کے برتن ہیں۔ ٹوٹے ہوئے کچھ چراغ ہیں۔ کچھ تلواریں ہیں۔ اور غار کے ایک طرف ایک گڑھا کھودا گیا ہے۔ جس کے چاروں طرف سیمنٹ کا لیپ کیا گیا ہے۔ اور دوسری طرف چکنی مٹی کا ایک انبار ہے۔ غار سے نکلتے ہوئے حسینی نے کہا۔ ''کل شام کو ہم پھر ملیں گے۔ خبردار! جو کام تم کرو۔ نہایت ہوشیاری سے کرو اور بوتل کی دوا کا استعمال جانچ پڑتال کے بعد کرو۔''
رفیق نے کہا۔ ''اسکی تم پروانہ کرو۔ حسینی!'' دوسرے دن رفیق غار میں پہلے پہنچا۔ چراغ کے پاس پہنچتے ہی اس نے آواز دی۔ ''حسینی!'' اور کندھے سے بوجھ اتار کر ایک طرف رکھ دیا۔ پھر چراغ کے نزدیک جا کر دیکھا۔ چراغ جل رہا ہے۔ لیکن خون نصف ختم ہو چکا ہے۔ اور نصف جلا رہا ہے۔ اس نے سوچا حسینی نے مجھے کتنے برے کام پر لگا دیا ہے۔ دنیا میں شاید برے سے برا انسان بھی ایسے کام کو پسند نہیں کرے گا۔ اسی وقت حسینی آ گیا۔ رفیق نے اسے دیکھتے ہی کہا۔ ''حسینی!'' حسینی نے پوچھا۔ ''آج کچھ لے آیئے ہو؟'' رفیق نے ایک طرف دھرے ہوئے تھیلے کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ ''وہ دیکھو''۔

حسینی نے تھیلا کھولا۔ اور اس میں سے ایک نوجوان کو نکالا۔ جو بیہوش تھا۔

رفیق نے قریب آکر پوچھا کیسا ہے؟''

حسینی نے اس کی طرف دیکھا۔ اور مسکرا کر کہا۔ ''اچھا ہے۔'' اور پھر وہ غار کے ایک کونے سے تلوار اٹھا لایا۔ رفیق کی آنکھوں میں خوف چھا گیا۔ اس نے خوف

بھری آواز میں پوچھا۔ ''حسینی !''

حسینی نے تلوار گھڑے کے پاس رکھتے ہوئے کہا۔ '' آؤ۔ اس نوجوان کو گھڑے کے نزدیک لانے میں میری مدد کرو۔ اُٹھو!''

رفیق پہلے ہچکچایا۔ پھر حُسینی کے خوف سے اُٹھا۔ حسینی نے تلوار سے اسکی گردن کاٹ لی۔ خون گھڑے میں بہنے لگا۔ سارا خون بہنے کے بعد حسینی نے کہا۔ '' لاش کو کوئیں میں پھینک دو۔ اور اُوپر چٹان رکھدو''۔

رفیق نے لاش کو کنویں میں پھینک دیا۔ اور پھر آکر پوچھا۔ ''حسینی نہ جانے کون تھا۔ اسکے گھر میں نہ جانے کیا ہوا ہوگا۔؟ کتنے دل اس کے لئے بے قرار ہوا ٹھیں گے۔

حسینی نے کہا۔ '' یہ ٹھیک ہے رفیق۔ لیکن ایسے ہی نوجوانوں کے خون سے تو ہمارے نئے انسان بنیں گے۔''

رفیق چپ ہو رہا۔ اس نے دیکھا۔ گھڑے میں پڑے ہوئے خون سے بھاپ اُٹھ رہی ہے۔ اور اس کے کنارے خون آہستہ آہستہ منجمد ہو رہا ہے۔

حُسینی نے کہا۔ '' کیا دیکھتے ہو رفیق؟ جب یہ گڑھا بھر جائے گا۔ تو سمجھ لو۔ ہمارا کام پورا ہو گیا۔ لیکن اس کام کے ساتھ ہی ہمیں دوسرا کام بھی کرنا ہے''۔

رفیق نے پوچھا۔ '' وہ کیا......؟ اس قسم کی غارتگری؟'' حُسینی کے ماتھے پر تیوریاں چڑھ گئیں۔ اس نے غصہ میں آکر کہا۔ '' تم اسے غارتگری سمجھتے ہو۔ میں اپنے لئے تو کچھ نہیں کر رہا۔ اور جب تک کسی کام کے پیچھے قربانی کا ہاتھ نہ ہو۔ تم سمجھ رہے ہو۔ وہ کام پایۂ تکمیل تک کبھی پہنچ سکتا ہے؟

رفیق نے کہا۔ '' ٹھیک ہے۔ میں بھولا جا رہا تھا۔ لیکن وہ دوسرا کام کیا ہے؟''

حُسینی نے کہا۔ ''اس چکنی مٹی سے ہمیں انسان بنانے ہیں۔ خوبصورت جوان۔ دراز قد اور طاقت ور!''

رفیق نے حیران ہوکر پوچھا۔ ''اور؟''

حُسینی نے کہا۔ ''اور وہ مٹی دودھ سے گُندھنی ہے۔ اس میں شکر ڈالنی ہے۔ اس میں مشک۔ نافہ اور کافور ڈالنا ہے''۔

رفیق نے کہا۔ ''یہ کیوں؟''

حُسینی نے کہا۔ '' دنیا میں جو فسادات رونما ہوتے ہیں۔ جو آئے دن جھگڑے ہوتے ہیں۔ دماغ سے اُٹھتے ہیں۔ دودھ اور شکر سے ہمارے انسانوں کے دل برے خیالات سے بچے رہیں گے۔ اور خوشبو ڈالنے سے ان کا دماغ ہمیشہ معطر رہے گا۔ وہ سب کا بھلا چاہیں گے۔ سب کو دوست سمجھیں گے سب کے ساتھ یکسان برتاؤ کریں گے۔ اسی لئے!''

رفیق نے حیران ہو کر پوچھا۔ ''اور جب وہ ڈھانچے تیار ہونگے پھر؟''

حُسینی نے کہا۔ ''ہمارے پاس یہ گڑھا خون سے بھرا ہوگا۔ ان میں مساوی حصص میں خون ڈال دیا جائے گا۔''

رفیق نے پُوچھا۔ ''اور روح۔ وہ کہاں سے آئے گی؟''

حُسینی نے چراغ کی طرف اشارہ کر کے کہا۔ '' اس سے ! اسکی لو سے ! جو انسان بنانے سے پہلے ہی میں نے جلا رکھا ہے!''

رفیق نے اس کی طرف غور سے دیکھ کر کہا۔ ''حسینی! تم بڑے جادوگر ہو!''

حسینی نے مسکرا کر کہا۔ '' آجکل کی دنیا میں پھیلے ہوئے دکھوں کو دیکھ کر اگر ہر ایک انسان مجھ جیسا جادوگر بن جائے۔ تو اچھا ہے''۔

۳

جس شہر سے رفیق اور حُسینی نو جوانوں کو بیہوش کر کے چرا لاتے تھے۔ اس شہر میں دھائی مچ گئی۔

ہر رات انسانوں کے گم ہو جانے کی اطلاعات کوتوال کو پہنچ جاتی تھیں۔ وہ بھی پریشان ہو رہا تھا۔ یہ عجیب قسم کی چوری تھی۔ چور سونے اور چاندی کو ہاتھ نہیں لگا تے تھے۔ وہ صرف کسی نوجوان کو اُٹھا لیجاتے تھے۔ ان میں کوئی بھی ایسا نہ تھا۔ جو گم ہو کر واپس آ گیا ہو۔ سلطان نے جب یہ خبر سنی۔ تو وہ ہراساں ہو گیا۔ اس نے کوتوال کو بلا کر پوچھا۔ ''یہ کیا بات ہے؟''

کوتوال نے کہا۔ ''عالیجاہ۔ میں خود حیران ہوں۔ آج تک جو اطلاعات مجھے پہنچی ہیں۔ ان سے معلوم ہوتا ہے۔ کہ چور نوجوانوں کو چرا لیتے ہیں۔ نہ جانے چرا کر کیا کرتے ہیں؟''

سلطان نے مایوسانہ انداز میں کہا۔ ''یہ عجیب بات ہے۔ تم جانتے ہو۔ کہ ہمارے شہر کے ارد گرد پہاڑوں کی فصیل ہے۔ چور نوجوانوں کو لے کر آسانی کے ساتھ پہاڑوں کو عبور نہیں کر سکتے!''

کوتوال نے کہا۔ ''عالیجاہ! میں نے دروں میں سپاہی بٹھا رکھے ہیں وہاں سے اسوقت تک ایک شخص بھی بغیر میری راہداری کے نہیں گزرا۔''

سُلطان نے غصّہ میں آخر کہا۔ ''لیکن میں چاہتا ہوں کہ چوروں کا پتہ جلد لگایا جائے۔''

کوتوال نے کہا ''میرے آقا۔ ملک کے بہترین جاسوس چوروں کے پتہ لگانے پر مامور کئے گئے ہیں۔ خدا نے چاہا تو عنقریب ہی چور عالیجاہ کی درگاہ پیش ہوں گے۔''

سلطان نے کہا۔ ''مجھے ڈر ہے۔ اگر چوروں کی سرگرمیاں اسی رفتار سے جاری ہیں۔ تو چند مہینوں ہی میں ہمارا شہر اُجاڑ ہو جائے گا۔ نوجوانوں کی زندگی ہی پر میری حکومت کو ناز ہے۔ اور دارو مدار بھی۔ تمہیں اس بات کا پورا پورا خیال رکھنا چاہیئے''۔

کوتوال سر جھکا کر خاموش کھڑا رہا۔ اور اسی دن شام کو رفیق نے ایک بے ہوش نوجوان کو حسینی کے آگے رکھتے ہوئے کہا۔ ''حُسینی! شہر میں شورش مچ گئی ہے۔ ہر طرف فوج ہماری گرفتاری کے لئے دوڑ دھوپ کر رہی ہے۔'' حسینی نے تلوار کو تیز کرتے ہوئے کہا۔ ''کوئی پروا نہیں۔ ہمارا گھڑا ابھر گیا ہے۔ اس نوجوان کے خون کے بعد ایک اور کی ہمیں ضرورت ہے۔ اور بس!''

رفیق نے پوچھا۔ ''اگر کسی کو پتہ لگ گیا تو۔؟''

حُسینی نے تحکمانہ انداز میں کہا۔۔۔۔۔۔ تم ڈرو مت رفیق! اگر ایسا ہو بھی گیا تو ہم اس غار میں چُھپ سکتے ہیں''۔

رفیق نے پوچھا۔۔۔۔ ''وہ کیوں کر''؟

حُسینی نے کہا۔ ''غار کے منہ کے پاس جو پتھر ہے۔ وہ غار کے آگے رکھا جاسکتا ہے۔ اور اندر سے دوسرا پتھر اسے اندر کی طرف کھینچے رہتا ہے۔ دنیا کی کوئی بھی طاقت پھر غار کے منہ سے اس پتھر کو نہیں ہٹا سکتی''۔

رفیق نے پوچھا۔ ''تم نے پہلے دن مجھ سے یہ بات کیوں نہ کہہ دی تھی''۔

حُسینی نے کہا۔ ''اس بات کی ضرورت ہی کیا تھی۔ اب بھی ضرورت نہیں۔ صرف اسلیئے کہ تم ڈر گئے۔ تم سے کہدی۔ اور ہاں جس خون کی اب ہمیں ضرورت ہے۔ وہ نسوانی خون ہونا چاہیئے۔ کسی دوشیزہ کا۔ جو گناہ سے ناواقف ہو۔''

رفیق نے چونک کر پوچھا۔ ''وہ کیوں؟''

حُسینی نے کہا۔ ''میں نے انسان تیار کئے ہیں۔ نسوانی خون ڈال کر ان کے دل نرم اور نازک ہوں گے۔ ان میں برداشت کرنے کی قوت پیدا ہوگی۔ ان میں اس سے ساحل کا سا قرار آ جائے گا۔ وہ دکھ برداشت کریں گے۔ اور زبان سے اف تک نہ کریں گے۔''

رفیق نے کہا۔ ''وہ انسان کہاں ہیں۔؟''

حُسینی نے کہا۔ ''آؤ تمہیں بھی دکھا دوں۔'' غار کے دوسرے کمرے میں حسینی نے پہنچ کر کہا۔ ''یہ دیکھو۔''

رفیق نے دیکھا۔ ''مٹی کے لاتعداد انسان کھڑے ہیں۔ جو خوبصورت ہیں۔ جوان ہیں۔ دراز قد ہیں۔ اور طاقت ور ہیں۔ ایسے دکھائی دیتے ہیں۔ جیسے ان کے ہونٹوں پر مسکراہٹ کہیں سے لاکر رکھدی گئی ہے۔ جیسے وہ باتیں کیا ہی چاہتے ہیں۔ جیسے وہ اپنی اپنی جگہ سے ہلنے کے لئے بے قرار ہیں۔

حُسینی نے مسکرا کر رفیق کی طرف دیکھا۔ اور پوچھا۔ ''اب تو یہ کام اتنا برا نہیں ہے رفیق۔؟''

رفیق نے کہا۔ ''نہیں حُسینی ! مجھے معلوم نہ تھا۔ تمہارے کام کے پیچھے اتنا حسن ہے۔ اتنی نازک خیالی ہے''۔

حُسینی نے زور سے ہنس کر کہا۔ ''واہ میرے رفیق !''

رفیق اگلے دن نہ جانے کہاں سے ایک دوشیزہ کو اُٹھا کر لے آیا غار میں پہنچتے ہی اس نے اسے ایک طرف رکھا۔ اور خود حُسینی کو ڈھونڈھنے لگا حُسینی وہاں نہ تھا۔ وہ پھر دوشیزہ کے پاس آ گیا۔ وہ بے ہوش تھی۔ اس نے دیکھا۔ چاند کی کرنوں کا سا اس کا بدن ہے۔ اسکی آنکھوں میں پھول ہیں۔ اسکے ہونٹوں پر آبشار کا ترنم ہے۔ اس کے بھرے ہوئے سینے میں گیتوں کی ایک خاموش دنیا ہے۔ اس نے سوچا۔ کتنی

خوبصورت لڑکی ہے۔ لیکن اس تلوار کے آگے خوبصورتی اور بدصورتی کا امتیاز نہیں۔ اس نے پھر دوشیزہ کے ہاتھوں کو چھوا۔ اسے معلوم ہوا۔ جیسے وہ پھولوں کے ایک ڈھیر کو چھو رہا ہو۔

اس نے پھر دیوانوں کی طرح ہنس کر کہا۔ ''پھولوں کا ڈھیر۔ چند لمحوں کے بعد ہڈیوں کا ڈھیر ہوگا۔''

پھر اس نے زور زور سے کہنا شروع کیا۔ ''نہیں نہیں۔ حُسینی! اس کا گلا تمہیں کاٹنے نہیں دوں گا۔ یہ میری ہے میرے ہو کر رہے گی۔''

وہ اُٹھا اور دوڑ کر غار کا منہ پتھروں سے بند کر آیا۔ اتنی دیر میں دوشیزہ ہوش میں آگئی تھی۔ رفیق نے واپس آکر دیکھا۔ لڑکی خوف سے کانپ رہی ہے۔ رفیق نے کہا۔ ''ڈرو مت۔ تم کو آدم خوروں نے پکڑ لیا تھا۔ میں نے تمہیں ان سے بچالیا ہے''۔

دوشیزہ کی آنکھوں میں آنسو آگئے۔ اس نے رو کر کہا۔ ''مجھے چھوڑ دو مجھے چھوڑ دو!''

رفیق نے کہا۔ ''ابھی نہیں۔ رات گذر جائے تب!''

دوشیزہ نے پوچھا۔ ''تم کون ہو؟''

رفیق نے کہا۔ ''مجھے رفیق کہتے ہیں۔ اس شہر کا ایک شہری!'' دوشیزہ نے ادھر اُدھر دیکھا اور پوچھا۔ ''وہ کیا ہے؟''

رفیق نے کہا۔ ''وہ کچھ نہیں۔ میں نے چراغ جلا دیا ہے۔''

دوشیزہ نے پوچھا۔ ''اتنا بڑا چراغ؟''

رفیق نے کہا۔ ''غار میں چھوٹے چراغ سے کتنی روشنی ہو سکتی ہے؟''

دوشیزہ نے کہا۔ ''اور ہاں اس گڑھے میں کیا ہے؟''

رفیق نے کہا۔ ''خون۔ انسانی خون۔!''

رفیق نے کہا۔ ''شہر کے سینکڑوں نوجوانوں کا۔ لیکن تم ڈرو مت!''

اسی وقت غار کے منہ کے نزدیک کسی نے زور سے کہا۔ ''رفیق!''

دوشیزہ نے چونک کر پوچھا۔ ''یہ کون ہے؟''

رفیق نے آواز پہچان کر دوشیزہ کے کان میں کہا۔ ''خاموش!''

دوشیزہ خوف سے کانپنے لگی۔ اور غار کے منہ پر بدستور آوازیں آنے لگیں۔ '' رفیق! رفیق!'' اس کے بعد غار کی چٹان پر زبردست چوٹیں لگنی شروع ہوئیں۔

دوشیزہ نے دبی آواز میں پوچھا۔ ''کون ہے رفیق؟''

رفیق نے اس کے کان سے منہ لگا کر کہا۔ ''حسینی! آدم خوروں کا سردار۔''

دوشیزہ اور بھی لرزنے لگی۔ رفیق نے کہا۔ ''تم چپ رہو۔ یہ یہاں نہیں آسکتا۔ میں نے غار کا منہ ہی بند کر دیا ہے۔'' حسینی نے پھر زور زور سے چلا کر کہا۔ '' رفیق! رفیق! مجھے صرف ایک بار تجربہ کر لینے دو۔ میرے دل میں یہ حسرت مت رہنے دو۔ میں تم سے ناراض نہیں ہونگا۔'' رفیق نے کوئی جواب نہیں دیا۔ تب حُسینی نے غصہ میں کہا۔ ''رفیق تم سب کچھ لے لو۔ لیکن جلتا ہوا چراغ مجھے دے دو''۔ رفیق نے پھر کوئی جواب نہیں دیا۔ حُسینی نے پھر زور سے کہا۔ ''رفیق تم نے مجھے دھوکا دیا۔ لیکن اس کا انجام کتنا برا ہوگا۔ یہ تمہیں شاید معلوم نہیں''۔

۴

کوتوال نے اس کی طرف حیرت بھری نظروں سے دیکھا۔ اس کے کپڑے پھٹے ہوئے تھے۔ سر پر لمبے اور گھناؤنے اور بے ترتیب بال تھے۔ پیشانی بہت چوڑی تھی۔ اور اعضا میں کافی چستی تھی۔ لیکن آنکھوں میں مسلسل اور موہوم حیرت اور حسرت!

کوتوال نے کہا۔ ''اگر تمہاری خبر سچی ہے تو تمہیں کافی انعام دیا جائیگا''۔

اس آدمی نے کہا۔ ''آپ میرے ساتھ تشریف لے آئیں۔ میں آپکو سب کچھ بتا دوں گا۔ قاتل اسوقت اپنے پوشیدہ غار میں ہے۔ اس نے غار کا منہ بند کر دیا ہے۔ لیکن اب آپ جلدی کریں۔ ایسا نہ ہو۔ کہ وہ بھاگ جائے''۔ کوتوال نے کہا۔ ''اب تو صبح ہو چکی ہے۔ اگر فوج کا ایک دستہ بھی ساتھ لیا جائے۔ تو کیا ہرج ہے؟''

اس آدمی نے کہا۔ ''ہرج تو کوئی نہیں۔ لیکن جلدی کیجئے۔ دیر ہو رہی ہے۔''

یہ خبر آگ کی طرح پھیل گئی۔ لوگ ہزاروں کی تعداد میں کوتوالی کے باہر جمع ہو گئے۔ کوتوال نے اُن کو مخاطب کرتے ہوئے کہا۔ ''ہمیں چوروں کا سراغ مل گیا ہے۔ خدا کو منظور ہوگا۔ تو جلد ہی چور آپ کے سامنے ہوگا''۔ پھر وہ سب اس آدمی کے ساتھ چلے آئے۔ آگے آگے وہ آدمی تھا۔ اسکے پیچھے کوتوال۔ پھر فوج اور پھر لوگوں کا ایک بے پناہ سمندر۔

دور سے اشارہ کرتے ہوئے اس نے کہا۔ ''وہ دیکھئے۔ وہ غار جو پہاڑی کے اندر چلا گیا ہے۔ یہی اس کی پوشیدہ جگہ ہے۔''

کوتوال تیز تیز قدم اُٹھاتا ہوا وہاں آپہنچا۔ دیکھا تو غار کا منہ کھلا پڑا ہے۔ اس آدمی نے غار کا منہ کھلا دیکھا۔ تو بیساختہ بول اُٹھا۔ ''اُف! قاتل بھاگ گیا ہے۔''

اندر پہنچکر کوتوال نے دیکھا۔ تاریکی ہی تاریکی ہے۔ جا بجا مٹی کے برتن پڑے ہوئے ہیں۔ کوتوال نے حکم دیا۔ ''چراغ جلا دو''۔ وہ آدمی دوڑتا دوڑتا ہجوم کو چیر کر اس بڑی چٹان کے پاس آگیا۔ جس پر خون کے نشان تھے۔ وہاں چراغ نہ دیکھ کر وہ آپے سے باہر ہو گیا۔ اس نے حیرت میں اپنے دامن سے اپنا نصف چہرہ چھپا لیا۔ اس کی آنکھوں سے غصے میں چنگاریاں نکلنے لگیں۔

کوتوال نے اس کی طرف دیکھا۔ اور پوچھا۔ ''یہ کیا؟'' وہ آدمی دوڑ کر دوسرے کمرے میں چلا گیا۔ کوتوال اس کے پیچھے دوڑا۔ مٹی کے انسان دیکھ کر اس نے

کہا۔''یہ کیا؟''اُس آدمی نے کہا۔''یہ میرے بنائے ہوئے انسان ہیں۔چور دراصل میں ہوں۔میں ہی نے نوجوانوں کے خون سے گڑھا بھر دیا ہے۔''

خون کا لفظ سن کر ہجوم کانپ اُٹھا۔مُخبر نے غصے میں دانت پیس کر پوچھا۔''رفیق کہاں ہے۔؟''اس نے دوڑ کر غار میں چراغ والے کمرے سے تلوار اُٹھالی۔ اور قریب تھا۔کہ اپنے آپ کا خاتمہ کردے۔کوتوال نے اس کا ہاتھ روک کر تلوار چھین لی۔وہ آدمی لمحہ بہ لمحہ پاگل ہونے لگا۔اسکے حرکات وسکنات سے پاگل پن دکھائی دینے لگا۔ایک فوجی نے اس کے ہاتھوں میں ہتھکڑیاں پہنادیں۔

کوتوال نے اس سے پوچھا۔''تمہارا نام کیا ہے؟''

وہ ہنس پڑا۔مٹی کے ایک انسان کو لات مارتے ہوئے اس نے کہا۔

''حسینی!''

............☆☆☆............

بچّوں کا ختنہ

گر آمدم بکوئے تو چنداں غریب نیست
چوں من دریں دِیار ہزاراں غریب ہست
(حافظؒ)

بچوں کا ختنہ

مہری کی آنکھوں میں آنسو تھے۔ اور اس کا بھائی خلیل اس کے سامنے گردن لٹکائے بیٹھا تھا۔

مہری نے میلے ڈوپٹے سے آنسو پونچھ کر کہا۔ ''اگلے مہینے بھی بچوں کا ختنہ نہ ہوا۔ تو منہ دکھانے کے قابل نہ رہوں گی۔ اور تو اور شرعاً بھی اتنے بڑے بچے ختنے کے بغیر رہنے جائز نہیں۔''

خلیل نے سرد آہ کھینچ کر کہا۔ ''کیا کروں۔ ساہوکار کے پاس کس منہ سے جاؤں۔ اس کا اگلا ہی حساب ابھی صاف نہ ہوا''۔

مہری کی آنکھوں میں اندھیرا چھا گیا۔ جس سہارے پر وہ آج تک جی رہی تھی۔ وہ آہستہ آہستہ مٹتا جا رہا تھا۔

مہری نے پھر پوچھا ''تو کیا بچوں کا ختنہ نہ ہوگا خلیل؟''

خلیل نے گردن اوپر اُٹھائی۔ اور مہری کی طرف دیکھ کر بولا۔ ''ہوگا کیوں نہیں۔ لیکن جب خدا چاہے گا''۔

مہری اُٹھی۔ اور خلیل کی جھونپڑی سے نکل کر اپنے گھر چلی گئی۔

شام ہو چکی تھی۔ آسمان پر تارے ٹمٹما رہے تھے۔ ہارون کا پہاڑ اوپر سے نیچے تک سیاہ ہو چکا تھا۔ ہر طرف ایک مکمل سکوت تھا۔ صرف کہیں کہیں چھوٹی چھوٹی ندیوں کا پانی پتھروں اور کنکروں سے ٹکرا کر گھر گھر کرتا جا رہا تھا۔

مہری کو ایسا محسوس ہو رہا تھا۔ جیسے اس کے پاؤں من من بھر کے ہو گئے ہیں۔ وہ بار بار آسمان کی طرف دیکھ رہی تھی۔ اور دل ہی دل میں خدا سے پوچھ رہی تھی۔ ''تم کب چاہو گے؟ تم کب چاہو گے؟''

تارے اسکی دیوانگی پر ہنس رہے تھے۔ اسی تصور میں وہ درباغ سے چندہ پورہ پہنچی۔ گھر میں بچے سو چکے تھے۔ طاقچے پر مٹی کا چراغ ابھی ابھی بجھ گیا تھا۔ بتی سے اب تک دھواں اُٹھ رہا تھا۔!

۲

خاوند کے مرنے کے بعد مہری نے آج تک دوسری شادی نہ کی۔ اس کے حسن اور اسکی جوانی پر آس پاس کے گاؤں میں کتنے ہی زمیندار مچل اُٹھے تھے۔ لیکن مہری اپنے ارادے پر اس چٹان کی طرح مضبوط رہی۔ جو کسی پر شور نالے کے بیچ میں لڑکھڑا کر کہیں سے آ کر اٹک گیا ہو۔ خلیل نے بہنوئی کے مرنے پر کبھی اشارتاً اور کبھی کنایتاً بہن کو دوسری شادی کرنے پر اپنی رضامندی ظاہر کی تھی۔ لیکن جب مہری نے بے رخی سے اسے جواب دیا۔ ''میرے بچے میری دنیا ہیں''۔ تو خلیل کے ہونٹ خود بخود بند ہو گئے۔ اس دن کے بعد خلیل نے کبھی اس سے شادی کے متعلق بات چیت نہ کی۔

لیکن جو غم خلیل کو اندر ہی اندر کھائے جا رہا تھا۔ وہ مہری کی تنگدستی اور بے کسی تھی۔ ایک جھونپڑی چھوٹے سے باغیچے اور ایک کھیت کے سوا گاؤں بھر میں اسکی کوئی جائداد نہ تھی۔ خلیل ہی ہر سال فصل کاٹنے کے موقعہ پر سب سے پہلے اسے چھ خروار شالی بھیجتا۔ پھر جو کچھ بچتا اس میں سے کچھ اپنے گزارے کے لئے رکھتا۔ اور باقی ساہوکار کو دے دیتا۔ لیکن اسے معلوم تھا۔ میری شادی پر یہ فیاضیاں ختم ہو جائیں گی۔ بیوی کتنی بھی اچھی کیوں نہ ہو۔ گھر کی چیز وہ کسی قیمت پر پرائے کو دینا پسند نہیں

کرتی۔ اس نیت سے خلیل بھی اپنی شادی کیلئے کہیں بندوبست نہ کرتا تھا۔ وہ اس دن کا انتظار کرتا تھا۔ جب مہری کے بچے دو چار آنے کمانے کے قابل ہو جائیں۔ اور اس کے سر سے بوجھ اُتر جائے وہ اپنی جھونپڑی میں اکیلا تھا۔ دن بھر کھیت پر جاتا۔ اور شام کو لوٹ کر چولھا جلاتا۔ روٹی پکاتا۔ گرمیوں کے دنوں میں باہر اخروٹ کے درخت کے نیچے لیٹ جاتا۔ اور سردیوں میں اندر...... کبھی کبھار جی ہلکان کرنے کے لئے مہری بھی رات بھر آجاتی۔ اس شام خلیل ساگ کے علاوہ سوکھی مچھلیاں بھی پکاتا۔ بھائی بہن ساری رات آنکھوں میں کاٹتے۔ اپنے اس ماضی کی باتیں کرتے۔ جس میں انہوں نے بزرگوں کے سائے تلے فراغت اور بے فکری کے کچھ دن گزار دئے تھے۔

۳

مہری کے جانے کے بعد خلیل کو نیند نہ آئی۔ اس کی بھوک بھی مر گئی۔ اس نے آج دیا تک نہ جلایا۔ بہن کی آنکھوں سے گرے ہوئے آنسو اب تک فرش پر پھیل کر سوکھ نہیں گئے تھے۔ خلیل چاند کی کرنوں میں انہیں کو دیکھ رہا تھا۔ اسے ان میں ماں کے دودھ کی بو آرہی تھی۔ اور اسے محسوس ہو رہا تھا۔ جیسے ماں کا دودھ اسے اپنا فرض پورا کرنے کے لئے للکار رہا ہے۔ معاً اس کے دل میں نہ جانے کون سا خیال آیا۔ اس کا چہرہ چمک اُٹھا۔ ہونٹ تھرتھرانے لگے۔ پیشانی پسینوں سے تر ہو گئی۔

وہ اُٹھا لوئی کندھے پر ڈال دی۔ جھونپڑی کے دروازے پر تالا لگایا اور باہر نکلا۔ رات کی تاریکی میں درختوں کی چھاؤں تلے وہ گاؤں سے باہر چلا گیا۔ اس کے کانوں میں مہری کے الفاظ گونج رہے تھے۔ ''تو کیا بچوں کا ختنہ نہ ہوگا۔ خلیل؟'' بہن کی آواز سن کر وہ دل ہی دل میں کہتا تھا۔ ''ہوگا۔ مہری بچوں کا ختنہ ہوگا۔ جب تک خلیل کے دم میں دم ہے۔ تم کسی چیز کی محتاج نہ ہوگی۔''

چند پورہ پہنچ کر وہ تھوڑی دیر مہری کے آنگن میں کھڑا رہا۔ اس نے چاہا۔ کہ

ابھی بہن کو جگا کر اس سے کہے۔ ''مہری بچوں کا ختنہ ہوگا۔'' لیکن نہ جانے کیوں اس نے دروازے پر دستک نہ دی۔ مہری کے آنگن میں ایک چھوٹی سی ندی بہتی جا رہی تھی۔ خلیل اسی کے کنارے بیٹھ گیا۔ اس کی زبان پیاس سے سوکھ گئی تھی۔ وہ ندی پر پیاس بجھانے کے لئے جھکا۔ لیکن پانی پیئے بغیر ہی اٹھ کھڑا ہوا۔ اس نے دل میں سوچا۔ بڑی بہن کے ہاں خالی ہاتھوں کیونکر پانی پی سکوں گا۔ کیا ہوا۔ اگر یہاں دیکھنے والا نہیں۔ خدا تو کرنوں اور تاروں کے بھیس میں سب کچھ دیکھ رہا ہے۔

وہ آنگن سے نکلا۔ اور پکی سڑک پر پہنچ کر شہر کی طرف چلا گیا۔

۴

سورج نکلنے سے پہلے پنڈت زنار دھن آنگن میں نلکے پر نہا رہے تھے انہوں نے خلیل کو دروازے پر دیکھا۔ تو ان کی باچھیں کھل گئیں۔ دونوں ہاتھوں سے لنگوٹی نچوڑتے ہوئے حیرانی سے بولے۔ ''ارے خلیل ہے؟''

خلیل نے کہا۔ ''ہاں مہاراج!''

''منہ اندھیرے کیسے آئے۔ خیر تو ہے۔؟''

''خیر ہے مہاراج!''

''پھر بھی۔ حساب چکانے آئے ہونا۔؟''

خلیل خاموش رہا۔ دو قدم آگے بڑھ کر آہستہ سے بولا۔ ''مہری کے بچوں کا ختنہ کرانا ہے۔ اسی لئے آگیا ہوں۔''

پنڈت زنار دھن خلیل کی وہ بات جان گئے۔ جو ابھی اس کی پیٹ ہی میں تھی۔ بے رخی سے بولے۔ ''کاروبار اس قدر ماند پڑ گیا ہے۔ کہ اب ہم لوگوں کا جینا دوبھر ہو گیا ہے۔ جہاں کہیں روپیہ پیسہ تھا۔ وہ تم جیسے بے ایمانوں نے لٹکا رکھا ہے۔ اُدھر سمندر پار جنگ چھڑ گئی ہے۔ اِدھر ہر چیز سونے کے بھاؤ بک رہی ہے۔''

خلیل کی ٹانگوں پر جیسے کسی نے ہتھوڑا مارا۔ اُس کا منہ حیرت سے کھل گیا۔ آئی ہوئی بات حلق میں اٹک گئی!۔

زنا ردھن نے کپڑے پہنے۔ پاٹھ کیا۔ اور پھر بولے۔ ''چلو۔ چائے تو پیئو۔ آج پچیس روپے سے کم کی قسط نہ لوں گا۔ دیکھ رہے ہو۔ زمانہ کتنا نازک ہوتا جارہا ہے۔''

خلیل نے سیڑھیاں چڑھتے ہوئے مضبوطی سے کہا۔ ''میں تو اور مانگنے کے لئے آگیا ہوں مہاراج! اور آپ ناامید کیئے دیتے ہیں۔''

پنڈت زنا ردھن نے مُڑ کر حیرانی سے پوچھا۔ ''اور......؟'' پھر زور سے ہنس پڑے۔ اور بولے۔ ''بے وقوف! آج کل روپوں کی بات کرنا جرم ہے روپے کہاں جو تمہیں کوئی دیتا پھرے۔ پانچ روپے سینکڑہ بیاج بھی دو گے۔ تب بھی کہیں سے نہ ملیں گے۔''

خلیل نے کہا ''گروی پر بھی نہ ملیں گے۔؟''

گروی کا لفظ سن کر زنا ردھن لالچ کے دلدل میں پھنس گیا۔ انہیں معلوم تھا۔ جو مقروض ایک بار کوئی چیز گروی رکھ دیتا ہے۔ پھر دوبارہ اسے چھڑا نہیں سکتا۔ یہ ایسا کانٹا ہے۔ جس سے پھنسی ہوئی مچھلی عمر بھر چھٹکارا نہیں پا سکتی۔

انہوں نے منتر آدھا ہی پڑھکر کہا۔ ''کیا رکھو گے گروی میں۔؟''

خلیل نے کہا۔ ''اپنا باغیچہ۔ تین کنال سے کم نہ ہوگا۔ آپ کو معلوم ہی ہے۔''

پنڈت زنا ردھن بہت مدت سے خلیل کے باغیچے کی تاک میں تھے۔ لیکن بزرگوں کی رہی سہی وراثت کا صفایا کرنا خلیل نے کبھی گوارا نہ کیا تھا۔ آج وہی خلیل ہے۔ وہی ساہوکار ہے۔ اور خلیل خود ہی اسے ہاتھ اُٹھا کر دے رہا ہے۔ عام سود

خواروں کی طرح مقروض پر یہ ظاہر کرنے کے لئے کہ وہ گروی کی چیزوں کا طلبگار نہیں۔زنار دھن نے کہا۔"بھائی۔اب زمین میں کیا دھرا ہے۔وہ دن لد گئے۔جب زمینوں سے سونا اگلتا تھا۔اب زمین پر پہلے بیس روپیہ خرچ کرو۔تب کہیں پندرہ روپے کی فصل کی امیدواری ہو جاتی ہے۔"

خلیل نے کہا۔"تو پھر بچوں کا ختنہ نہ ہوگا۔؟ عمر بھر آپ کے ہاں سے روپیہ پیسہ لیا ہے۔اب آج کس کے آگے ہاتھ پھیلاؤں۔آج "کاک' زندہ ہوتا۔تو مجھے یہ دردسری کرنے کی کیا ضرورت تھی۔؟ جو مناسب سمجھتا۔کرتا۔لیکن بڑی بہن کا جو فرض مجھ پر ہے۔اسے پورا کرنا میرا ایمان ہے۔چاہے اس میں میرا سب کچھ ہی کیوں نہ چلا جائے۔"

خلیل کی باتوں سے زنار دھن کی رال ٹپک گئی۔بولے۔"کتنے روپے درکار ہیں؟"

خلیل نے کہا۔"صرف ایک ۱۰۰ سو روپے۔"

"ہو۔پہن کر دیکھو تو۔کیا خوب سجتی ہے۔؟"

خلیل نے میلی ٹوپی اُتاری۔اور مخملی ٹوپی پہن لی۔دکاندار نے ہنس کر کہا۔"ٹوپی کیا سجتی ہے؟ دولھا دکھائی دے رہے ہو!"

دکاندار نے کہا۔"صرف ڈیڑھ روپیہ۔یہ بھی صرف تمہارے لئے سیدھے سادھے دکھائی دے رہے ہو۔کوئی دوسرا ہوتا۔تو اڈھائی روپے سے کم نہ کہتا"۔

خلیل نے اندر کی جیب سے ڈیڑھ روپیہ نکالا۔اور دکاندار کو دے کر آگے بڑھا۔اب اس کے پاس تین کنال زمین کی قیمت لوئی میں بندھی ہوئی چیزوں اور جیب میں چھ روپے کے سوا کچھ نہ تھا۔لیکن پھر بھی وہ خوش تھا۔کہ وہ اپنا مقدس فرض ادا کر رہا ہے۔یہ صحیح ہے۔کہ جس پیمانے پر وہ مہری کے بچوں کا ختنہ کرانا چاہتا تھا۔وہ

پورا نہیں ہوسکتا تھا۔

۵

آسمان پر بادل چھا گئے تھے۔ اور آہستہ آہستہ شام ہو رہی تھی خلیل پوٹلی پیٹھ پر اُٹھائے شالامار باغ سے ذرا اوپر پہنچا تھا۔ کہ بادل گرجنے شروع ہوئے۔ اور آن کی آن میں موسلا دھار بارش ہونے لگی آس پاس کوئی درخت نہ تھا۔ جس کے نیچے وہ تھوڑی دیر سر چھپا سکتا۔ بھوک۔ پیاس اور تکان سے اس کا بدن چور چور ہو گیا تھا۔ اسکی نگاہیں ہر بار ہارون کی پہاڑی کی طرف اٹھتی تھیں۔

وہ تھوڑی دور چل کر ایک درخت کے نیچے بیٹھ گیا۔ زمین بھیگ چکی تھی۔ پوٹلی اس نے اپنے سینے سے لگالی۔ ہاتھ سے ٹٹولا۔ تو مصری اور مسالہ مینہ کے پانی سے بھیگ کر ایک ہو گئے تھے۔ اب پوٹلی کھولنے کا بھی موقع نہ تھا۔ چیزوں پر لپٹا ہوا کاغذ پھٹ گیا تھا۔ مخملی ٹوپی اور لال گمٹی کا رنگ پوٹلی سے باہر ٹپک رہا تھا۔ آج اسے محسوس ہو گیا۔ بدقسمتوں کو ستانے میں انسانوں ہی کو نہیں قدرت کو بھی بڑا لطف آتا ہے۔ وہ بارے بار آسمان کی طرف دیکھ رہا تھا۔ کہ کہیں بادلوں میں سوئی کے برابر سوراخ ہو۔ تو شاید پانی برسنا تھم جائے۔ لیکن بادل سیاہ اور ڈراوٗنے تھے۔ اور بہت جلد پانی کے تھمنے کی کوئی امید نہ تھی۔

اس نے اپنا کرتہ اتار لیا۔ پوٹلی کے اوپر اسے لپیٹا۔ اور جلد جلد قدم اُٹھاتا ہوا چلا گیا۔ مہری کے بچے آنگن میں جمع ہوئے پانی کے بلبلے دیکھ دیکھ کر اچھل رہے تھے۔ خلیل ان کے سامنے کھڑا ہو گیا۔ اسکی پیٹھ اور اس کے سارے بدن پر رنگ پھیل گیا تھا۔ اور پہچانا نہ جاتا تھا۔ اس نے لڑکھڑائی ہوئی آواز میں کہا۔ ’’مہری!‘‘

جھروکے سے سر نکال کر مہری نے خلیل کو دیکھا۔ تو چھاتی پیٹ کر نیچے اُتری۔ خلیل نے اپنی پیٹھ کا بوجھ اسے دیتے ہوئے کہا۔ ’’کرلو بچوں کا ختنہ!‘‘

............☆☆☆............

اُجرت

الا یا ایها الساقی ادر کاساً وناولها
کہ عشق آساں نمود اول ولے افتاد مشکلہا
(حافظؒ)

اُجرت

گھر کا مالک اندھا تھا۔

گھر کی مالکن خوبصورت تھی۔!

اور دونوں تھے بے حد غریب!

ایک دن مالک نے آہستہ سے کہا۔ ''رجنی!''

رجنی نے اس کے پاس آ کر کہا۔ ''ہاں''۔

مالک نے کہا۔ ''میں نے کتنا بڑا گناہ کیا ہے۔ اپنی دنیا تاریک ہو کر میں نے تمہاری دنیا بھی تاریکیوں سے بھر دی۔ کتنا دکھ!''

رجنی نے ایسے الفاظ اپنے مالک کی زبان سے آج تک نہیں سنے تھے۔ اس نے حیران ہو کر پوچھا۔ ''آپ یہ کیسی باتیں کر رہے ہیں آج ؟ کونسا گناہ ؟ کونسی تاریکی؟''

مالک نے کہا۔ ''تم خوبصورت ہو۔ یہ میں نے سنا ہے۔ تمہیں دیکھا نہیں۔ لیکن تمہاری خوبصورتی کو جس پیار کی جس محبت کی ضرورت تھی۔ وہ میں تمہیں نہ دے سکا رجنی! کیا یہ گناہ نہیں؟''

رجنی نے کہا۔ ''نہیں۔ میں ہندو عورت ہوں۔ آپ جیسے بھی ہیں میرے نزدیک بھگوان ہیں۔ میرے نزدیک ساری دنیا سے حسین ہیں!''

مالک نے آہستہ سے کہا۔ ''ٹھیک ہے۔لیکن سوچ رہا ہوں۔ میں نے ایسا کیا ہی کیوں۔؟ میرے سر پر عشق کا بھوت سوار کیوں ہو گیا۔ کیوں میں نے نہ سوچا ۔''مجھے شادی کرنے کا حق نہیں۔''

رجنی نے اُس کے بالوں پر ہاتھ پھیرتے ہوئے کہا۔ ''ایسا سوچنے کی آج ضرورت ہی کیا تھی۔ چھوڑ دو ان خیالوں کو سوچ سوچ کر آدمی غم کے سمندر ہی میں ڈوبتا ہے۔کنارہ کہیں بھی نہیں پاتا۔''

مالک نے کہا۔''بڑا غم ہے رجنی......عمر بھر مجھے یہ غم ستاتا رہیگا۔میری زندگی شاید اسی غم میں ختم ہوگی۔لیکن تمہیں مجھے معاف کرنا پڑے گا میں نے بڑا پاپ کیا ہے۔اسی لئے۔!''

رجنی نے کہا۔''غم کس بات کا ہے؟''

اگر میں ایسا نہ ہوتا۔تو شاید آج یہ حالت نہ ہوتی۔ وہ مجھ پر بھروسہ کر کے ایک خوبصورت کلی کو ایک بدصورت خار کے حوالے نہ کرتے ......رجنی......! میں نے تمہیں سچ مچ ایک چہچہانے والے جانور کی طرح پنجرے میں قید کر ڈالا۔ جہاں تمہیں نہ خوراک ملتی ہے نہ پیار۔''

رجنی نے کہا۔''یہ بھول ہے آپکی۔ مجھے آپ کو دیکھ کر سب کچھ مل جاتا ہے۔ میں آپ کو دیکھتی ہوں۔تو جیسے ساری دنیا کی محبت میرے دل میں بھر جاتی ہے۔''

مالک نے آہستہ سے کہا۔''خالی باتیں......؟''

اور پھر رجنؔی نے دیکھا۔ مالک کا گریبان آنسوؤں سے بھیگ رہا ہے۔رجنؔی نے حیرت سے پوچھا۔''سوامی!''

اندھے نے کہا۔''ہاں رجنی! روتا ہوں، مجھے رونا ہی چاہئے میں نے گناہ کیا ہے۔شاید یہی آنسو میرے گناہ کے دھبے کو دھو سکیں۔''

اسی وقت دروازے پر کسی نے آکر پوچھا۔ ''رات کو ٹھہرنے کی جگہ دو گے مالک؟''

رجنی نے دیکھا ایک بوڑھا ہے۔ سر پر لمبے لمبے سفید بال ہیں۔ چہرہ کشادہ ہے۔ اور پیشانی سے نور سا ٹپکتا ہے۔!

مالک نے پوچھا۔ ''کون ہے رجنی؟'' رجنی خاموش رہی۔

اور بوڑھے نے کہا۔ ''میں ہوں، ایک مسافر! رات کو ٹھہرنے کا............

اندھے مالک نے آنکھیں پونچھ کر کہا۔ ''آؤ بھگوان۔ جگہ کس کی ہے؟ گھر کس کا ہے؟ آؤ......اندر آؤ بیٹھو!''

بوڑھا اندر چلا آیا۔ اندھے نے کہا۔ ''اسے ساتھ والے کمرے میں بٹھا دو رجنی۔ وہاں چارپائی بھی ہے۔ سب کچھ ہے!''

اور پھر مالک نے کہا...... ''رجنی!''

رجنی نے کہا۔ ''ہاں مالک! سمجھ گئی۔''

بوڑھے نے عجیب بات دیکھ لی۔ مالک اندھا اور مالکن خوبصورت اس نے دل میں سوچا۔ کتنی عجیب بات ہے۔ اس نے شادی کیوں کی؟ کب کی؟ کس نے کرائی؟ ایک طرف بدصورتی ہے۔ ڈراؤنی تاریکی ہے۔ خاموشیاں ہیں۔ محبت کی بجھی ہوئی آگ ہے اور دوسری طرف حسن ہے فرحت بخش نور ہے۔ محبت کی اُبھرتی ہوئی دنیا ہے۔ نغمے ہیں۔ کتنی عجیب بات! مالک اندھا اور مالکن خوبصورت!''

رجنی نے آگ جلائی۔ چائے بنائی اور جب چائے کی پیالی لیکر بوڑھے کے پاس گئی۔ تو بوڑھے نے آہستہ سے کہا۔ ''یہ تمہارا خاوند ہے کیا؟

رجنی نے زمین کی طرف دیکھ کر اور چائے کی پیالی تپائی پر رکھتے ہوئے کہا۔

''جی''۔!

بوڑھے نے کہا۔ ''اسکی آنکھیں کب خراب ہوگئی تھیں؟''

رجنی نے آہستہ سے کہا۔ ''رام جانے!''

تب بوڑھے نے کہا۔ ''میں ڈاکٹر ہوں۔ جڑی بوٹیوں کا ماہر اگر مجھے یہ معلوم ہو۔ کہ اسکی آنکھیں کب اور کیسے خراب ہوگئی ہیں۔ تو شاید......''

رجنی نے چونک کر پوچھا۔ ''تو کیا......ٹھیک کرسکیں گے آپ؟''

بوڑھے نے مسکرا کر کہا۔ ''ہاں......شاید کرسکوں گا۔''

رجنی نے کہا۔ ''میں اُن سے پوچھتی ہوں۔''

۲

اندھے نے کہا۔ ''یہ بات نہ پوچھو رجنی۔ سنو گی تو دکھ ہوگا''۔ رجنی نے بے تابی سے کہا۔ ''نہیں کہہ دو مجھ سے! وہ آپ کی آنکھیں ٹھیک کردیں گے۔''

اندھے نے اچھل کر کہا۔ ''سچ؟''

رجنی نے کہا۔ ''ہاں۔ کہو نا''۔

اندھے نے کہا۔ ''میں جنم سے اندھا نہیں تھا۔ بعد میں اندھا ہوگیا۔ میں ان دنوں جوان تھا۔ شباب میری نس نس میں گھس گیا تھا۔ میرے عادات خراب ہوگئے تھے۔ شراب خوری۔ بدکاری۔ جوا۔ رجنی! اس سے آگے نہ پوچھو!'' رجنی نے حیران ہوکر پوچھا۔ ''پھر؟''

اندھے نے کہا۔ ''دُکھ ہوگا تمہیں۔ تم مجھ سے نفرت کروگی۔ مجھے دھتکاروگی۔ اس لئے مت پوچھو!''

رجنی نے کہا۔ ''نہیں سوامی! میں ہندو عورت ہوں۔ آپ شاید یہ بھول گئے۔ جوانی میں سب کچھ کیا جاتا ہے۔'' اندھے نے خاموشی سے اپنی نابیان آنکھوں سے اسکی طرف دیکھا۔ صرف دیکھا۔ کہا کچھ نہیں۔

رجنی نے کہا۔ ''کہونا۔ سوامی!''

اندھے نے کہا۔ ''ان دنوں میں ایک عورت سے پیار کرتا تھا وہ بہت حسین تھی۔ میں نے اس پر اپنا سب کچھ نثار کر دیا۔ لیکن رجنی! عورت بھی کتنی ذلیل ہو سکتی ہے۔ وہ جسے میں اپنا سمجھ رہا تھا۔ میری نہیں تھی۔ کسی اور کی تھی۔ کسی اور کی۔ جسے وہ چاہتی تھی۔''

رجنی نے پوچھا۔ ''پھر۔؟''

اندھے نے کہا۔ ''پھر کیا۔ ایک دن اس نے میرا اثاثہ ختم ہوتے دیکھ کر مجھے خوب شراب پلائی۔ میں نے محبت میں جھوم کر وہ پی لی۔ لیکن جب گھر پہنچا۔ تو مجھے محسوس ہوا۔ جیسے میری آنکھوں کا نور لمحہ لمحہ چلا جا رہا ہے۔ ہمیشہ کے لئے۔ اور پھر آج تم دیکھتی ہو۔ میں اندھا ہوں۔!''

رجنی نے سرد آہ بھر کر کہا۔ ''اوہ۔ کتنی ذلیل تھی وہ عورت؟ سب کچھ چھین کر بھی اسے آپ کی آنکھیں چھینتے رحم نہیں آیا۔ کتنا دھوکا؟ کتنی کمینگی؟ کتنی شیطنت؟''

اندھے نے کہا۔ ''اس میں اس کا قصور نہیں تھا رجنی! میرا ہی تھا۔ ایک غیر عورت پر پیار کی نگاہوں سے دیکھنا کیا تم جرم نہیں سمجھتی؟''

رجنی نے کہا۔ ''ہاں۔ لیکن مردوں کے لئے نہیں۔ مرد آزاد ہیں۔ جو چاہیں۔ کر سکتے ہیں۔''

اندھے نے گرج کر کہا۔ ''غلط ......رجنی غلط!''

۳

بوڑھے ڈاکٹر نے روٹی کا لقمہ منہ میں ڈالتے ہوئے کہا۔ ''اچھی بات ہے۔ میں کوشش کروں گا۔''

رجنی نے کہا۔ ''آپ کا شکریہ! عمر بھر آپ کا احسان مانوں گی''۔

ڈاکٹر نے اس کے چہرے کی طرف دیکھ کر آہستہ سے کہا۔ "ٹھیک کرنے کی قیمت بہت زیادہ ہے......رجنی......تم دے سکوگی؟"

رجنی نے کہا۔ "میرے پاس جو کچھ ہے۔ وہ آپ لے لیں۔ یہ مکان۔ یہ باغیچہ ۔ یہ سامان۔ سب کچھ آپ کا ہوگا۔ صرف مالک کی آنکھیں بنادو۔ تاکہ وہ مجھے دیکھ سکے۔ اور میں اسے دیکھ سکوں۔"

ڈاکٹر نے کہا۔ "مجھے مکان کی ضرورت نہیں۔ باغیچے کی بھی نہیں۔ سامان کی بھی نہیں۔ روپے پیسے کی بھی نہیں۔ سمجھ گئی......؟"

رجنی نے اسکی طرف دیکھا۔ ڈاکٹر للچائی ہوئی نظروں سے رجنی کو دیکھ رہا تھا۔ دیکھ رہا تھا۔ اس کا گلابی چہرہ، دیکھ رہا تھا۔ اس کے ہونٹوں کی ملاحت۔ دیکھ رہا تھا اس کا اُبھرا ہوا سینہ دیکھ رہا تھا۔ اسکے شباب کا حسن اور اس حسن کو اچھوتی مستی! اور پھر اُس نے آہستہ سے کہا۔ "رجنی!"

رجنی نے آنسو بھری آنکھوں سے اسکی طرف دیکھ کر کہا۔ "ہاں ڈاکٹر۔"!

ڈاکٹر نے پوچھا۔ "دے سکوگی قیمت؟"

رجنی نے آہستہ سے کہا۔ "ہاں"۔

ڈاکٹر نے ہاتھ دھوتے ہوئے کہا۔ "تب میں ایک ہفتہ کے بعد پھر آؤں گا۔ سارا سامان لے کر......اور پھر ٹھیک کردوں گا۔ تمہارے مالک کی آنکھیں......"

رجنی نے اسی طرح آہستہ سے کہا۔ "اچھا۔"

ڈاکٹر نے اُٹھ کر اپنے بیگ سے سفید رنگ کا ایک چھوٹا سا پھول نکالا۔ اور اسے رجنی کو پیش کرتے ہوئے کہا۔ "یہ لو۔"

رجنی نے اپنا منہ دوسری طرف پھیرتے ہوئے داہنے ہاتھ سے پھول لے لیا۔ اور باہر چلی آئی۔

دوسرے دن مالک نے پوچھا۔ ''رجنی! مجھے معلوم ہوتا ہے۔ تم غمگین ہو کل سے۔ ٹھیک ہے یہ بات؟''

رجنی نے مضبوطی سے کہا۔ ''نہیں۔ کیسے معلوم ہو! آپ کو یونہی؟''

اندھے نے کہا۔ ''میری آنکھیں نہیں ہیں۔ لیکن رجنی میں دیکھ سکتا ہوں۔! جو کچھ میرے اردگرد ہو رہا ہے۔ وہ سب!''

رجنی خاموش رہی۔ اندھا مالک دیوار کے سہارے سہارے اس کے پاس آ گیا۔ اس کے چہرے پر ہاتھ پھیرتے ہوئے اس نے کہا۔ ''رجنی! تمہارا چہرہ اترا ہوا ہے۔ تم غمگین ہو۔ لیکن کیوں؟ کہو!''

رجنی نے ہنس کر کہا۔ ''کچھ بھی نہیں۔ آپ یہ کیسی باتیں کر رہے ہیں؟''

اندھے نے کہا۔ ''تمہیں میری قسم! آج تم مسکراتی کیوں نہیں؟! گنگناتی کیوں نہیں؟ وہ پیار کی باتیں، وہ ہندو عورت کا حسن عقیدت وہ چہل پہل آج کہاں گئی؟''

رجنی پھر بھی نہیں بولی۔ اندھے نے پھر کہا۔ ''کہہ دو رجنی! تمہیں میری قسم کہہ دو مجھے!''

رجنی نے کہا۔ ''کل وہ ڈاکٹر آیا تھا نا............''

اندھے نے چونک کر اپنا سر اوپر اٹھایا اور کہا۔ ''ہاں تو......''

رجنی نے کہا۔ ''وہ آپ کی آنکھیں ٹھیک کر دے گا۔ لیکن......''

اندھے نے پوچھا۔ ''لیکن کیا؟ تم نہیں چاہتی۔ میری آنکھیں ٹھیک ہو جائیں۔؟''

رجنی نے تنگ ہو کر کہا۔ ''یہ بات نہیں مالک! وہ اجرت بہت مانگتا ہے۔''

اندھے نے کہا۔ ''اُجرت؟ کتنی ایک......؟

رجنی نے کہا۔ ’’بہت۔ بہت زیادہ!‘‘

اندھے نے کہا۔ ’’تو فکر ہی کیا ہے؟ میری آنکھیں ٹھیک ہو جائیں گی تو چکا دوں گا۔‘‘

رجنی جیسے کوئی بات کہنا چاہتی تھی۔ لیکن کہی نہیں۔ آہستہ سے بولی۔ ’’وہ روپیہ پیسہ نہیں مانگتا۔!‘‘

اندھے نے حیران ہو کر پوچھا۔ ’’روپے پیسے نہیں۔ تو کیا مکان؟

رجنی نے کہا۔ ’’نہیں! مکان بھی نہیں!‘‘

اندھے نے اور حیران ہو کر پوچھا۔ ’’مکان بھی نہیں۔ تو کیا باغیچہ؟‘‘

رجنی نے کہا۔ ’’نہیں سوامی۔ باغیچہ بھی نہیں شاید!‘‘

اندھے نے اپنا سر اور اونچا اٹھایا۔ اور کہا۔ ’’پھر کیا؟‘‘

رجنی نے آہستہ سے کہا۔ ’’نہ جانے کیا؟ میں خود بھی حیران ہوں۔‘‘

اندھے نے دھیمی آواز میں پوچھا۔ ’’اس نے کچھ مانگا بھی۔ زبان سے کچھ کہا بھی۔؟‘‘

رجنی پہلے خاموش ہو رہی۔ تب بولی۔ ’’نہیں۔‘‘

اندھے نے دیوار کا سہارا لے کر اٹھتے ہوئے کہا۔ ’’سمجھا! اور کمرے میں پہنچ کر اس نے اپنے دل میں سوچا۔ ’’رجنی! ڈاکٹر نے جو کچھ تم سے مانگ لیا۔ کیا تم اسے دو گی۔؟ کیا تم وہ اسے دینے کو تیار ہو۔؟ میری آنکھوں کے لئے۔ میری بصارت کے لئے۔ رجنی! تم میرے گناہ کو دوگنا کیوں کرنے لگی ہو۔؟ کیوں تم ...... لیکن میں اندھا ہوں میں کیا کر سکتا ہوں؟ آنکھیں ہوتے ہوئے میں اپنا گناہ نہیں روک سکا۔ اندھا ہو کر تمہارا پاپ کیسے روک سکوں گا۔ لیکن رجنی! سوچ لو۔ بھول نہ جانا۔ مجھے ایسی بصارت کی ضرورت نہیں۔ جو تمہاری انمول قیمت دینے پر مجھے مل سکے۔ تمہاری سب

سے بڑی قربانی دینے پر۔ سب سے بڑا بلیدان کرنے پر۔ آہ! رجنی......غریبی بھی کتنا بڑا گناہ ہے۔ اور غریب ہوتے ہوئے حسین ہونا بھی کتنا بڑا گناہ ہے۔ حسین ہو کر کمزور ہونا کتنا بڑا گناہ......!

اور ادھر رجنی نے اپنے دل میں سوچ لیا۔ میں نے مالک سے یہ بات کہہ ہی کیوں دی؟ وہ سمجھ گئے ہوں گے۔ ان کی آنکھیں نہیں ہیں تو کیا ہوا؟ ان کی محبت تو میرے ساتھ ہے۔ میں کتنی ذلیل عورت ہوں۔ اپنے مرد سے دھوکا کرتی ہوں۔ وہ چیز جس پر ان کا صرف انہیں کا حق ہے۔ دوسرے ایک غیر شخص کے ہاتھ میں دیتی ہوں۔ یہ کتنا بڑا گناہ ہے۔ اس طرح سے ملی ہوئی آنکھوں سے کیا مجھے پیار ملے گا۔؟ کیا میں ان میں پھر آج سا محبت کا سمندر رقصاں دیکھ سکوں گی۔ کیا وہ راحت......وہ کیفیت......وہ محبت جو ان کی بند آنکھوں سے مجھے مل رہی ہے۔ کھلنے پر ملے گی۔ نہیں......نہیں ملے گی! یقیناً نہیں ملے گی۔ اور ملنی بھی نہیں چاہئے۔ میرا ضمیر مجھے وہ بہار لوٹنے نہیں دے گا۔ ہمیشہ ہی نفرت کرتا رہے گا۔ لیکن کیا میں سوامی کیلئے ان کی راحت کے لئے قربانی نہ دے سکوں گی۔ اتنی بھی جو عورت نہ کر سکے۔ کیا وہ عورت کہلا سکتی ہے؟''

۴

ڈاکٹر نے مغموم حالات میں کہا۔ ''مجھے معلوم نہ تھا۔ کُسم......!''

بیوی نے سر جھکا کر کہا۔ ''برادری میں ہم منہ دکھانے کے قابل نہ رہے کُسم نے ہماری ناک کٹوا دی......''

ڈاکٹر چُپ ہو گئے۔ اور بیوی نے پھر کہا۔ ''میں نے نہ کہا تھا۔ کہ انگریزی تعلیم سے لڑکیاں خراب ہو جاتی ہیں۔ وہ شرم وہ حیا وہ سبھیتا سب کچھ چلا جاتا ہے۔''

ڈاکٹر نے آہستہ سے کہا۔ ''اگر مجھے یہ بات معلوم ہوتی۔ تو میں پہلے۔۔دن

ایک معمولی دوا سے کُسم کا خاتمہ کر دیتا۔ تا کہ آج یہ دیکھنا نصیب نہ ہوتا''۔

بیوی نے چونک کر کہا۔ ''......اُوہ''

ڈاکٹر نے کہا۔ ''ہاں ...... جولڑکی خاندان کی لاج کو قربان کر کے پرائے شخص سے محبت کرنے لگے۔ اسے ختم ہی کرنا چاہئے۔ اس کا زندہ رہنا بدنامی کی اُبلتی آگ کو زندہ رکھنا ہے۔''

بیوی نے کہا۔ ''لیکن اس میں کُسم کا کیا قصور؟ قصور تو اسی کالجیئٹ کا ہے۔''

ڈاکٹر نے گرج کر کہا۔ ''غلط! غلط! کُسم راغب نہ ہوتی۔ تو کالجیئٹ میں اس سے محبت کی بات کرنے کی ہمت نہ پڑتی......''

بیوی نے کہا۔ ''اب ہمیں یہ مکان چھوڑنا پڑے گا۔ کہیں اور جانا پڑے گا۔ کسی اور دیس میں۔''

ڈاکٹر نے کہا۔ ''لیکن کب تک؟''

بیوی نے کہا۔ ''جب تک یہ آگ بجھ جائے ...... بدنامی کی دھکائی ہوئی آگ بجھ جائے......''

اور جب دوسرے دن سامان اکوں پر بندھنے لگا۔ تو ڈاکٹر اپنا بیگ لے کر باہر نکلے۔ نوکر چاکر اور بیوی سامان ٹھیک طرح سے بندھوانے میں مصروف تھے۔ ڈاکٹر اکہ کی دوسری طرف سڑک کے کنارے بیٹھ گئے۔ سوچنے لگے۔ ''کیسی عجیب دنیا ہے۔ مرد کو کوئی پوچھتا نہیں۔ عورتوں پر ہی سب گرجتے ہیں۔ مرد بھی کتنے ذلیل ہیں۔ کتنے بدمعاش! کتنے کودغرض! اوروں کی لاج کے لٹیرے! چندروزہ حسن کے پرستار۔ پوست کی سفیدی کے عاشق...... ذلیل کتے''! اور اسی وقت انہیں رجنی یاد آ گئی۔

اُنکی آنکھوں سے آنسو بہنے لگے۔ سوچنے لگے۔ ''میں بھی کتنا ذلیل ہوں۔ جوانی کو پھاند کر بڑھاپے میں آ گیا ہوں۔ پھر بھی کتنا ذلیل ہوں...... کتنا کمینہ! اس

نے رات کو ٹھہرنے کی جگہ دی۔ پریم سے کھانا کھلایا اور میں...... میں نے اس سے کہا۔
''تم میری اُجرت دے سکو گی۔ آہ! ذلیل ڈاکٹر...... لیکن رجنی...... رجنی تم دیوی ہو۔
میں نے گناہ کیا ہے۔ تم معاف کرنا! ایک بار کہہ دینا۔ میں تمہیں معاف کرتی ہوں۔
میں نے تمہارے خاوند کا پریم سے بھرا ہوا دل ایک ہی لفظ سے توڑ دیا۔ تم مجھے معاف
کرنا۔ بھول جانا میری بات کو...... ہاں بھول جانا!''

اور معاً اس کے ہاتھ...... آپ ہی آپ جڑ گئے...... اور جھک گیا اس کا
سر زمین کی طرف! اکہ کے نزدیک اس کی بیوی کھڑی یہ سارا منظر دیکھ رہی تھی۔

ڈاکٹر نے چونک کر پوچھا۔ ''اکہ تیار ہو گیا؟''

بیوی نے آہستہ سے جواب دیا۔ ''ہاں۔ لیکن آپ کس کے آگے ہاتھ
جوڑتے تھے؟''

ڈاکٹر نے اُٹھتے ہوئے کہا۔ ''رجنی دیوی کے!''

۵

اندھے نے کہا۔ ''دروازے پر کوئی دستک دے رہا ہے۔ کون ہے...... ذرا
دیکھو تو......''

رجنی اُٹھی...... دروازہ کھولا۔ کانپ کر ایک قدم پیچھے ہٹی۔ ڈاکٹر نے زمین
کی طرف دیکھ کر پوچھا۔ ''سوامی اندر ہیں۔؟''

اور اندر سے اندھے نے زور سے کہا۔ ''کون ہے رجنی؟''

ڈاکٹر نے اندر داخل ہوتے ہوئے کہا۔ ''سوامی نمسکار!''

اندھے نے پوچھا۔ ''کون...... کون ہو؟''

ڈاکٹر نے کہا۔ ''ڈاکٹر!''

اندھا بھی جیسے تھرتھرا اُٹھا۔ اور ڈاکٹر نے کہا۔ ''میں سامان لے آیا ہوں۔

آج ہی آپ کی آنکھیں ٹھیک کردوں گا"۔

اندھا خاموش رہا۔

ڈاکٹر نے پوچھا۔"آپ خاموش کیوں ہیں؟ آپ کو تو خوش ہونا چاہئے!"

اندھے نے کہا۔"لیکن میں آنکھیں نہیں بنوادوں گا۔ ڈاکٹر آپ کو تکلیف ہوئی ہے۔ مجھے اس کا افسوس ہے۔"

ڈاکٹر کے ہاتھ سے بیگ گر گیا۔ اس نے چونک کر پوچھا۔"آنکھیں نہیں بنوائیں گے۔ کیوں؟"

اندھے نے کہا۔"مرضی ہماری!"

ڈاکٹر اس کے پاس بیٹھ گیا۔ اور زور سے پکارا۔"رجنی بیٹی!"

اندھے نے اپنا سر اوپر اُٹھایا۔ اسکی نابینا آنکھوں میں جیسے حیرانی بھر گئی۔ اور ڈاکٹر نے پھر پکارا۔"رجنی بیٹی!"

اندھے نے دل ہی دل میں کہا۔"بیٹی!"

رجنی آہستہ آہستہ وہاں آگئی۔

ڈاکٹر نے اسے دیکھتے ہی کہا۔"بیٹی! سوامی کہتے ہیں میں آنکھیں نہیں بنوادوں گا۔ اس کا سبب؟"

رجنی خاموش ہو رہی......اور اندھے نے کہا۔ بنوادوں گا۔ اب بنوادوں گا ڈاکٹر!"

ڈاکٹر نے دیکھا......رجنی کے ہاتھ میں وہی سفید پھول ہے۔ جو اس نے ایک ہفتے پہلے رجنی کو پیش کیا تھا۔ پھول کو دیکھتے ہی ڈاکٹر نے کہا۔"دیدو مجھے بیٹی!"

رجنی نے آہستہ سے وہ پھول اسکی طرف پھینک دیا۔

اندھے نے پوچھا۔"کیا ہے؟"

رجنی نے کہا......"پتا کی اُجرت سوامی۔ جو غریب بیٹی انہیں دے سکتی تھی!"

۶

اور جب اندھے کی آنکھیں بنا کر ڈاکٹر باہر جانے لگا۔ تو دروازے پر اس نے کہا۔ "بیٹی! تم مجھے معاف کرنا!"

رجنی کی آنکھوں میں آنسو تھے۔ اُس نے آہستہ سے کہا۔ "یہ کیا کہہ رہے ہیں آپ؟"

ڈاکٹر نے کہا۔ "ہاں ایک بار کہدو۔" میں نے تمہیں معاف کر دیا۔ نہیں تو عمر بھر میرا ضمیر مجھ سے نفرت کرتا رہیگا۔ مجھے قرار نہیں ملے گا۔ زندگی کی راحت نہیں ملے گی۔ کہدو ایک بار......"

رجنی نے آنسو بھری آنکھوں سے اسکی طرف دیکھا اور آہستہ سے کہا۔" میں نے معاف کر دیا۔ پتا......جاؤ......"

اور پھر ڈاکٹر چلا گیا......!!

............☆☆☆............

چور

زخم ہنستے ہیں دیکھکر تجھ کو
شرم اے چارہ گر نہیں آتی ؟
(مسّت کاشمیری)

چور

چور انسان ہی ہوا کرتے ہیں۔ اُن کے سینے میں بھی دل ہوتے ہیں۔ وہ بھی سوچ سکتے ہیں۔ وہ بھی ریجھ جاتے ہیں صورت اور سیرت پر، وہ بھی محسوس کر سکتے ہیں گناہ کی تلخی اور ثواب کی لذت کو...... اتنی باتیں مجھے معلوم نہ تھیں۔ میں سمجھتا تھا۔ چور 'چور' ہی ہوتے ہیں۔ انسان نہیں ہوتے۔ نہ جانے کیا ہوتے ہیں۔؟

لیکن میں حیرت کے سمندر میں ڈوب گیا۔ جب اُس نے کافی دیر گفتگو کے بعد آہستہ سے کہا۔ ''میں چور ہوں۔''

میں نے غور سے اسکی طرف دیکھا۔ اُس کے دو کان تھے۔ دو آنکھیں تھیں۔ دو ہونٹ تھے۔ میری طرح ناک تھی۔ اچھا خاصہ ادھیڑ عمر کا آدمی تھا۔

میں نے پوچھا۔ ''تم چور ہو؟''

اُس نے کہا۔ ''ہاں! لیکن اب نہیں۔ آپ ڈر گئے کیا؟''

''میں نے کہا ڈرا تو نہیں۔ البتہ............''

اُس نے مسکرا کر پوچھا ''البتہ کیا''؟

میں نے کہا۔ ''آج اپنی عمر میں پہلی مرتبہ سُنا اور وہ بھی تمہاری زبان سے!''

چور زور سے ہنس پڑا۔ بولا۔ ''آپ نے اس سے پہلے چور نہ دیکھا تھا۔؟''

میں نے سر سے اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ ''نہ!''

وہ دوبارہ زور سے ہنس پڑا۔ میرے نوکر سے بولا۔ ''تمہارا آقا بھی ایک عجیب ہستی ہے۔!''

نوکر نے میری طرف دیکھا۔ اور پھر چور کی طرف جو زور زور سے ہنس رہا تھا۔ میں ان دونوں کی مسکراہٹ کے درمیان سوچ رہا تھا۔ یہ میرے سامنے بیٹھا ہوا انسان چور ہے کیا؟ کیا اس نے چوریاں کی ہیں؟۔ لوگوں کو لُوٹا ہے؟ نادار اور مفلس آدمیوں کا گلا گھونٹا ہے؟ اور اس قدر شاد ہے۔ زور زور سے میرے سامنے ہنس رہا ہے۔ اور فخر یہ کہہ رہا ہے۔ ''میں چور ہوں''۔

تھوڑی دیر کے بعد اس نے میرے سکون کو توڑ کر کہا۔ ''آپ ڈریئے مت۔ میں اب چور نہیں ہوں۔''

ارے میں ڈرتا نہیں ہوں۔ صرف سوچ رہا ہوں۔ تم چور کیوں تھے؟ کیا گناہ نے کبھی بھی تمہارے ضمیر کو گُد گُدا کر حقیقت سے روشناس نہیں کیا؟'' میں نے کہا۔

چور نے کہا۔ ''آپ قسمت کو مانتے ہیں؟''

سوال عجیب تھا۔ اور اتفاق سے میں قسمت کا قائل نہیں ہوں۔ میرا عقیدہ ہے۔ انسان خود قسمت ساز ہے۔ جیسے چاہئے اپنی قسمت بنا سکتا ہے۔ افعال اور تربیت کے جس ڈھانچے میں وہ اپنی زندگی کو ڈھالے ویسی ہی اسکی قسمت بن کر رہے گی۔ لوگوں کی یہ دلیل کہ قسمت نے ایسا کیا یوں کر دیا۔ مجھے اچھی نہیں لگتی۔ میں سمجھتا ہوں۔ کہ یہ لوگ دنیا میں جی کر کچھ کرنا نہیں جانتے۔ قوتِ خیال اور حُسن افعال سے یہ غیر واقف ہوتے ہیں۔

میں نے کہا۔ ''میں قسمت کو نہیں مانتا۔!''

چور نے پوچھا۔ ''آپ نہیں مانتے؟''

میں نے مضبوطی سے کہا۔ ’’نہیں۔ چراغ!‘‘

چراغ نے اپنی انگلی دانتوں تلے دبائی۔ حیرت سے میری طرف دیکھ کر بولا۔ ’’توبہ‘‘!

میں نے مسکرا کر کہا۔ ’’قسمت کیا ہے؟ ڈھکوسلا۔ ڈھونگ ۔ جہالت اور نادانی کی دلفریب تصویر!‘‘

چراغ نے کہا۔ ’’آپ غلطی پر ہیں۔! قسمت ہی سب کچھ ہے۔ انسان کے پیدا ہونے سے پہلے صاحب اسکی قسمت لکھ دیتا ہے۔ پھر انسان دنیا میں آ کر اسی کے سائے تلے سب کام انجام دیتا ہے۔ اپنے آپ کچھ بھی نہیں کرسکتا۔‘‘

میں نے کہا۔ ’’چراغ! یہ تمہارا وہم ہے۔ اگر تم مجھ سے کہو گے۔ مجھے قسمت نے چور بنا دیا۔ تو میں یہ مانوں گا نہیں۔‘‘

چراغ نے میری ٹوپی کو دوسری طرف رکھ کر ہنستے ہوئے پوچھا۔ وہ کیوں؟‘‘

میں نے کہا۔ ’’دیکھو! اگر تم پہلے چوری نہ کرتے۔ کسی کے مکان میں نہ گھستے ۔ لالچ کو اپنے دل میں جگہ دے کر وسعت نہ دیتے۔ تمہارا نام چور نہ پڑتا!‘‘

چراغ نے کہا۔ ’’یہ تو تب ہی ممکن تھا۔ جب قسمت مجھے ایسا نہ کرنے دیتی۔‘‘

میں نے غصے سے کہا۔ ’’پھر وہی قسمت‘‘ میں پوچھتا ہوں۔ تم اپنی قسمت آپ نہیں بنا سکتے تھے۔؟ طمع کسے نہیں۔ میں بھی روپے پیسے سے محبت کرتا ہوں۔ میرے دل میں بھی لالچ ہے۔ لیکن میں اسے اُبھرنے نہیں دیتا۔ دبائے رکھتا ہوں۔ اگر ایسا نہ کروں۔ تو شاید ایک دن مجھے بھی کسی کے سامنے کہنا پڑے گا۔ ’میں چور ہوں‘ ۔ لیکن دیکھو۔ میں مزدوری کرتا ہوں صبح بازار میں کچھ چیزیں لے کر بیٹھتا ہوں۔ شام ہوتی ہے۔ کھانے لایق پیسے بنا لیتا ہوں۔ گو قسمت نے دونوں راستے میرے لئے کھلے رکھ کر چھوڑے تھے۔ گناہ کا بھی اور ثواب کا بھی! لیکن میں نے گناہ کے راستے

کی طرف کبھی نگاہ تک نہ اُٹھائی ۔ جانتا تھا۔ یہ دیکھنے میں آرام دہ ہے۔ لیکن سراسر فریب ۔ دھوکا، سراب ۔"

چراغ میری فلسفیانہ بحث سے کچھ پگھل گیا۔ اس نے پوچھا۔ "پھر دنیا میں جتنے بھی لوگ قسمت قسمت پکارتے ہیں۔ کیا وہ سب بیوقوف ہیں؟"

میں نے کہا۔ "یہ اپنا اپنا عقیدہ ہے۔ اپنا اپنا خیال ۔"

چراغ نے رک رک کر آہستہ سے کہا۔ "ٹھیک ہے۔" !

میں نے دوبارہ پوچھا۔ "آپ تو بتاؤ" تم نے چوری کی ہی کیوں؟"

چراغ نے کہا۔ "آپ تو قسمت کے قائل ہی نہیں ۔ آگے کیا بتاؤں گا لیکن ہاں دوسری بات بھی ہے! قسمت سے پرے ۔ جس پوشیدہ چیز نے مجھے اس راستے پر دھکیل دیا۔ وہ میرا افلاس تھا۔ وہ میری غریبی تھی ۔"

میں نے چونک کر کہا۔ "اُوہ۔ افلاس کے کتنے غلط معنی ؟ کتنی غلط تشریح ؟ چراغ ! اگرچہ افلاس بذات خود گناہ ہے۔ لیکن یہی وہ چیز ہے۔ جو انسان کو فرشتے کا درجہ دلا سکتی ہے۔ جو پتھر کو ہیرا بنا سکتی ہے۔ جو تاریکی کو پھاڑ کر اُجالا ہی اُجالا پھیلا سکتی ہے۔ تم سمجھ گئے میرا مطلب؟"

چراغ نے آہستہ سے کہا۔ "ہاں سمجھ گیا۔ لیکن کاش یہ خیال میں اسوقت سمجھ جاتا۔ جس وقت گناہ مجھے اپنی طرف کھینچ رہا تھا۔ اپنے آپکو حسین پردوں کے نیچے چھپا چھپا کر۔" مجھے محسوس ہوا جیسے میں پسینے سے شرابور ہو رہا ہوں۔ جیسے میرا بال بال سارنگ کے تار کی طرح ہل رہا ہو۔

میں نے پوچھا۔ "آگے کہو۔"

چراغ نے کہا۔ "ایک دن میرے پاس کچھ نہ تھا۔ صبح بھی فاقہ سے رہا۔ اور شام بھی۔ رات کو مجھے نیند نہ آئی۔ اس جسم پر جوانی کا رنگ چڑھ گیا تھا۔ جوانی اُٹھ اُٹھ

کر خوراک مانگ رہی تھی۔ اور میرے آگے پیچھے پھیلا ہوا افلاس اسے دبا دبا کر کہہ رہا تھا۔ ''کم بخت! میرے ہوتے ہوئے تم کیا چمکو گی؟'' اور جوانی کہہ رہی تھی۔'' میں کلی کی طرح پھوٹ گئی ہوں۔ مجھے کھلنے دے''۔ لیکن بابو۔ کیا یہ گناہ نہیں۔ کہ کچھ لوگ بڑھاپے میں بھی جوانی کا سا آرام اُٹھائیں۔ جوانی کے نشے میں جھومتے رہیں اور کچھ لوگ......شباب ہی میں بڑھاپا دیکھیں۔ کسی طرح بھی جوانی کو اُبھرنے نہ دیں۔''

میں نے اپنے دل میں سوچا۔'' افلاس انتہا پر پہنچ کر کیا کیا سوچ سکتا ہے۔؟''

چراغ نے دوبارہ کہا۔'' یہ دنیا سراسر مکاری ہے۔ یہاں جتنے بھی لوگ رہتے ہیں۔ سب مکار اور عیار ہیں۔ کمزوروں کی ہڈیوں پر ہی سب عالیشان محلات بنانا جانتے ہیں۔''

میں نے آہستہ سے کہا۔'' تم ان باتوں کو کیا جانو چراغ! تم اپنی کہو۔''

چراغ نے مضبوطی کے ساتھ جس میں غصہ اور مایوسی ملی ہوئی تھی کہا۔'' میں ان باتوں کو جانتا ہوں۔ افلاس نے مجھے وہ سکھایا۔ جو دانا سے دانا امیر بھی ساری عمر نہ سیکھ سکے گا۔ لیکن کیا کروں۔ سوچ سوچ کر گھلا جاتا ہوں۔''

میں نے پھر پوچھا۔ پھر؟''

چراغ نے آنسو پونچھ کر کہا۔'' جب رات آ گئی۔ میں جاگتا تھا میرے پڑوس سے قہقہے بلند ہو رہے تھے۔ اونچے اونچے مکانوں میں قمقمے مسکرا رہے تھے۔ سونے چاندی کو جھنکار سے دلکش نغمے سنائی دیتے تھے۔ مسرت دیوانہ وار ناچ رہی تھی۔ میں نے اس وقت دیکھا۔ اگر کہیں تاریکی ہے۔ تو میرے گھر میں۔ اگر کہیں مایوسی چھپ کر بیٹھ گئی ہے۔ تو میرے گھر میں! اگر کہیں بھی مُستقبل کا خوف ہے۔ تو میرے گھر میں۔ میرے گناہوں نے کروٹ بدلی۔ خوف نے زور سے مسکرایا۔ جوانی

نے اُٹھ کر کہا۔ ''چراغ! کتنی دیر مجھے دبا رکھو گے۔ جاگتے کیوں نہیں! افلاس بارود ہے۔ جوانی چنگاری؟۔ دونوں کو ملا کر طوفان کیوں نہیں اُٹھاتے؟''

میرے رونگٹے کھڑے ہو گئے۔ میرا جسم تھر تھرانے لگا۔ میں نے اپنے بالوں میں ہاتھ پھیرتے ہوئے پوچھا۔ ''اس کے بعد''!

چراغ نے کہا۔ ''زمین پر خاموشی تھی۔ اور میرے دل میں طوفان۔ افلاس اور جوانی بے خوفی کی مشعل لے کر آگے آگے جا رہے تھے۔ اور میں اُن کے پیچھے پیچھے۔ جوانی ایک مکان میں داخل ہوئی۔ افلاس نے مایہ لوٹا۔ اور چراغ کی ان پیاسی آنکھوں نے بے پناہ دولت دیکھ کر پیاس بجھائی۔ جس کا نہ صرف غلط استعمال ہو رہا تھا۔ بلکہ بے کار پڑی سی اور اس رات دولت حاصل کر کے جتنی خوشی مجھے حاصل ہوئی۔ جتنی تسکین اس غریب روح کو ہوئی۔ اتنی شاید دنیا بھر میں کسی کو نہ ہوئی ہیں۔ لیکن آج محسوس کر رہا ہوں۔ وہ خوشی نہیں تھی۔ میرے مستقبل کی ناامیدی تھی۔''

میں نے چونک کر پوچھا۔ ''دولت لے کر تم نے کیا کیا؟''

چراغ نے آہ سرد بھر کر کہا۔ ''دو تین دن تو میں اسی خوشی میں جھومتا رہا۔ لیکن آخر کار وہی ہوا۔ جو گناہ کا انجام ہوتا ہے۔ پولیس نے پکڑ لیا۔ عدالت میں مقدمہ چلا۔ دو سال کی سزا ہوئی۔ میں نے ان سے کہا۔ ''میں گناہگار نہیں ہوں۔'' لیکن انہوں نے مانا نہیں۔! انہیں جن کا احترام ہے۔ لیکن افلاس کی پروا نہیں۔

میں نے کہا۔ ''چراغ! تمہارے ہاتھ بھی کچھ لگا کہ نہیں؟''

چراغ نے کہا۔ ہاں ہمیشہ کے لئے کلنک۔ ہمیشہ کے لئے ایک چھوت! سو روپے کے سوا کچھ بھی نہیں۔ اور وہ بھی مقدمہ ہی میں نے سگریٹ سلگا کر پوچھا۔'' کتنا برا انجام؟ چراغ دیکھ لیا تم نے گناہ کا انجام؟''

چراغ نے کہا۔ ''آج ہی نہیں تب بہت برس بیت گئے۔''

میں نے پوچھا۔ ''وہ بھی تو کہو۔''

چراغ نے چلم میں آگ رکھ لی۔ اور حقہ پینے لگا

رات تھی تاریک

دھرتی تھی خاموش۔

برآمدے میں، میں اور چراغ بیٹھے تھے۔ نوکر کونے میں سویا پڑا تھا۔ سننے والا اگرچہ کوئی بھی نہ تھا۔ لیکن مجھے محسوس ہو رہا تھا۔ جیسے چور کی کہانی سب سن رہے ہیں۔

چراغ نے کہا۔ ''جب میں جیل سے رہا ہو کر آیا۔ تو میں نے سوچا اتنا عظیم گناہ کر کے میرے ہاتھ لگا کیا؟ کیا اس سے میرا افلاس دور ہو گیا۔ کیا اس سے میری جوانی رنگ لائی۔ نہیں۔ ! افلاس اب بھی تھا۔ صرف جوانی نہ تھی۔ وہ جیل کی تنگ و تاریک کوٹھڑیوں میں ختم ہو گئی تھی۔ اور اگر کچھ نہیں تو کم از کم گناہ سے ایک فائدہ ہوا۔ وہ جوانی ہی چلی گئی۔ جس نے مجھے گناہ پر آمادہ کیا تھا۔ جب جوانی ہی نہ رہی تو گناہ کرنے کی اب ضرورت تھی نہ حاجت! میں گھر پہنچا۔ دروازے میں قفل لگا تھا۔ اسے کھولا۔ اندر چلا گیا۔ وہاں بھیانک اندھیرا تھا۔ ہر طرف خوف ہی خوف نظر آ رہا تھا میں اندر چلا گیا اور میں نے دیا جلایا۔ دیکھا کونوں میں جا بجا جالے لگے ہوئے ہیں۔ فرش پر مٹی کی تہہ سی جم گئی ہے۔ اس رات بھی مجھے نیند نہ آئی۔ فرق صرف اتنا تھا۔ کہ آج گناہ میرے دل کو گدگدا نہیں رہا تھا۔ البتہ کفارہ کا خیال انگڑائیاں لے رہا تھا۔''

اس کے بعد دن گزرتے گئے۔ میں مزدوری کرنے لگا۔ دن کو لکڑیاں جنگل سے کاٹ لاتا۔ اور بازار میں ہاتھوں ہاتھ بیچ ڈالتا۔ اور پیسے ملتے تھے۔ ان سے اچھی گزر ہو جاتی تھی۔ جو چیز کھاتا تھا۔ لذیذ معلوم ہوتی تھی۔ اعضا میں طاقت کی بجلی سی دوڑتی تھی۔ ایک کیفیت سی سارے جسم میں چھا جاتی تھی۔ اس وجہ سے شاید کہ یہ

مزدوری کے پیسے تھے گناہ کے نہیں۔"

میں نے مسکرا کر پوچھا۔"اب مان گئے۔ کہ قسمت انسان کے اپنے ہاتھ میں ہے کہ نہیں"۔

چراغ نے کہا۔"آپ سنتے جائیں۔ انہیں دنوں میں نے شادی بھی کی۔ بیوی بھی میرا ہاتھ بٹانے لگی۔ لیکن جو دھبا چوری کرنے سے میری پیشانی پر ایک بار لگ گیا تھا۔ میں نے بہتیری کوشش کی۔ کہ دھل جائے۔ لیکن نہ"دھل سکا۔"

میں نے چونک کر پوچھا۔"دھبا دور نہیں کر سکتے۔ چراغ یہ تو تمہارے اختیار میں ہے۔ کیا تم سمجھتے ہو کہ ایک بار کا کیا ہوا گناہ انسان کو زندگی بھرا بھرنے نہ دے گا؟"

چراغ نے کہا۔"میں تو نہیں سمجھتا۔ لیکن پولیس سمجھتی ہے۔ میں انہیں لاکھ بار کہا۔ میں اب چوری نہیں کرتا۔ لیکن وہ مانتے نہیں۔ کہتے ہیں۔ جسے ایک بار اس کا چسکا لگ گیا۔ وہ مرتے دم تک چین سے نہ بیٹھے گا۔ جب موقع ملے گا۔ کسی نہ کسی کا گلا گھونٹ دے گا۔"

میں نے پوچھا۔"کیا اب بھی پولیس تمہاری نگرانی کرتی ہے؟"

ہاں۔ یہی تو کہہ رہا ہوں۔ گیارہ برس سے میری نگرانی کرتی چلی آئی ہے۔ رات کو دو بار پولیس کے سپاہی میرے مکان میں آکر مجھے بلاتے ہیں۔ اگر جواب نہ دوں۔ تو وہ مقدمہ چلا سکتے ہیں۔ مجھے پھر جیل بھیج سکتے ہیں۔ سب کچھ کر سکتے ہیں۔" چراغ نے کہا۔

میں نے لمبی آہ کھینچ کر کہا۔"یہ تو بڑا ظلم ہے۔ چراغ!"

چراغ نے کہا۔"اور سنئے۔ جب شہر میں کہیں چوری ہوتی ہے۔ مجھے بلایا جاتا ہے۔ مجھ سے پوچھا جاتا ہے۔ چوری کسی نے کی۔؟ لیکن میں انہیں کیسے کہہ دوں

۔ایک بار چوری کرنے سے کیا تم مجھے زندگی بھر ذلیل سمجھتے رہوگے۔؟ کیا انسان کا گراہوا اخلاق بلند نہیں ہوسکتا؟ کیا اس کے چال چلن میں اصلاح نہیں ہوسکتی۔؟ یہ پولیس والے نہیں جانتے ۔اگر جانتے بھی ہوں گے۔تو شاید اس پر عمل کرنا وہ غیر ضروری سمجھتے ہیں۔ان کے نزدیک ایک بار کا گناہ گار شاید ابدی گنہگار ہے جس کی اصلاح نہ ثواب کا ہاتھ کرسکتا ہے۔اور نہ جس کی درستی کفارہ کا خیال! لیکن آپ سوچئے۔اب میں چوری کیسے کروں ۔قدرت نے میرے پاؤں میں جو زنجیریں پہنادی ہیں۔وہ جیل کی زنجیروں سے زیادہ وزنی اور مضبوط ہیں۔امید نہیں۔کہ جیتے جی ان سے فراغت حاصل ہو۔''

''کون سی زنجیریں؟''میں چونک کر پوچھا۔

چراغ نے کہا۔''میرے ننھے ننھے بچوں کے پیار کی زنجیریں!''اس کے بعد وہ رونے لگا۔''بابو اب میں چوری نہیں کرسکتا۔گناہ کی سزا جس حسین طریقے سے مجھے قدرت نے دی۔میں حیران ہوں یہ کیسے ہوا۔لیکن اگر پولیس مجھے تنگ کرے گی۔تو آپ ہی بتائیں۔میں کیا کروں۔؟ فرشتہ تو نہیں ہوں۔سب کچھ سہہ جاؤں۔ کسی کسی وقت تلملا اُٹھتا ہوں۔سوچتا ہوں۔گیارہ برس پہلے چراغ تھا۔کیا آج بھی وہی چراغ ہے؟ یہ پولیس والے کیوں نہیں سوچتے کیوں وہ اپنا اطمینان نہیں کرتے۔ کیوں مجھے اپنے کھلونوں کیساتھ کھیلنے نہیں دیتے۔جو توبہ کرنے کے بعد مجھے قدرت نے عطا کئے ہیں۔!''

میں نے مضبوطی سے کہا۔''تم فکر مت کرو چراغ! پولیس تمہاری نگرانی کرتی ہے۔تو کرنے دو۔''

چراغ نے کہا۔''یہ ٹھیک ہے۔لیکن نیند اُچاٹ ہوجاتی ہے۔جب پولیس والے گشت پر آتے ہیں۔اور مجھے بلاتے ہیں۔تو پھر وہی دنیا یاد آتی ہے۔جس میں

پل کر میں نے گناہ کا ارتکاب کیا تھا۔ اور آپ دانا ہیں۔ جانتے ہیں۔ کہ انسان کا دل کمزوریوں سے بھرا ہے۔ کسی وقت تنگ آ جاؤں گا۔ تو نہ جانے کیا کر بیٹھوں۔؟"

میں نے حیرت سے پوچھا۔ "کیا کرو گے؟ پھر چوری۔؟"

چراغ چپ ہو رہا۔ اسی وقت اس کا ننھا سا لڑکا آ گیا۔ اس نے آتے ہی کہا۔ "ب۔ با۔" چراغ نے اپنا غم بھلا کر اسے اُٹھایا۔ اور بوسہ دے کر کہا۔ "ہاں میرے لال!"

اور میری طرف دیکھ کر بولا۔ "اس ننھے کی موجودگی میں کیا آپ خیال تک کر سکتے ہیں۔ کہ چراغ کبھی بھی ایسا گناہ کر سکے گا۔؟ جو اسے اسکے پیار بھرے 'ببا' کہنے کی آواز سے عمر بھر کے لئے محروم کر دے؟"

میری آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ میں نے سر ہلا کر کہا۔ "نہیں؟" چراغ بچے کو لے کر چلا گیا۔ اور میں دیر تک سوچتا رہا۔ چور انسان ہی ہوا کرتے ہیں۔ ان کے سینے میں بھی دل ہوتے ہیں۔ وہ بھی سوچ سکتے ہیں۔ وہ بھی ریجھ جاتے ہیں صورت اور سیرت پر۔ وہ بھی محسوس کر سکتے ہیں گناہ کی تلخی کو اور ثواب کی شیرینی کو!!

............☆☆☆............

طُوفان

دب گئی بار ندامت سے گنہگاری مری
شرم سے تا منزل عقبےٰ جھکا کر سر گئے
(طالب کاشمیری)

طوفان

شام کا وقت ہے۔ سورج ڈوب چکا ہے۔ تپتی ہوئی زمین جیسے تھک کر لیٹ گئی ہے۔ پرتاب پارک میں جم غفیر ہے۔ ہری ہری لیکن گرمی کے مارے پژمردہ گھاس پر مرد اور عورتیں لوٹ رہی ہیں۔ بچے پھولوں کی پنکھڑیوں پر ناچتی ہوئی تتلیوں کے پیچھے بھاگے جا رہے ہیں۔ کہیں بےفکروں کی ٹولی ہے۔ ایک جگہ چار بےفکرے تاش کھیل رہے ہیں۔ اور نہ جانے کس دھن میں محو ہیں۔ ان سے پرے کالج کے بانکوں کی ایک ٹولی ہے۔ خوش پوش، خوش وضع، مانگ نکالے ہوئے۔ بغل کی جیبوں سے رنگ رنگ کے رومال لٹکائے ہوئے۔ کوئی سگریٹ پی رہا ہے۔ کوئی تازہ فلم کا ایک آدھ گیت ترنم میں گا رہا ہے۔ کوئی لالچ اور حرص بھری نظروں سے دھوتی میں لپٹے ہوئے حسن کو دیکھ کر مچل رہا ہے۔ کوئی اپنے ساتھی کو یورپ کی جنگ کا پس منظر سمجھا رہا ہے۔ اور اُن سے پرے ایک سوکھے ہوئے کیکر کے نیچے بوڑھوں کی مجلس ہے۔ کوئی کوئی کھانس رہا ہے۔ کوئی سبزے پر تھوک رہا ہے۔ کوئی آدھا بیٹھا، آدھا لیٹا ہے۔ کوئی چلم سے حقہ پی رہا ہے۔ زمین کی چھاتی کا سارا بوجھ جیسے آج کچھ دیکھنے کیلئے آجمع ہوا ہے۔ بوڑھے، پھٹی پھٹی آنکھوں سے حسین جوانیوں کا امڈتا ہوا سمندر دیکھ رہے ہیں۔ اور ان کے دوش بدوش شراب اور موسیقی شعریت اور نزاکت سے بنائی ہوئی نئی روشنی کی نئی لڑکیاں!

ایک بوڑھے نے بے چین ہوکر پوچھا۔ ''پرساد جو! دیکھ رہے ہو؟''

پرساد جو خاموش رہا۔ صرف ہلکی سی مسکراہٹ اس کے سکڑے ہوئے زرد ہونٹوں سے چھن گئی۔

جمال بٹ نے پہلے کھانس کر پھر نسوار کی ڈبیا جیب سے نکالتے ہوئے آہستہ سے کہا۔ '' انتہا ہوگئی بے شرمی کی۔ ہم نے جو وقت دیکھے ہیں۔ وہ اب کہاں۔؟''

پرساد جو کے بارود پر چنگاری پڑ گئی۔ بولا۔ '' زمانہ ہی بدل گیا۔ صاحبو! جوان بیٹے پر گھر میں اختیار نہیں۔ دنیا کو کوئی کیا سمجھائے؟''

جمال بٹ نے آہستہ سے کہا۔ ''راز دان! یاد ہے۔ کتنے بھلے وقت تھے۔ نہ جھگڑے۔ نہ قضیئے۔ نہ ہندوؤں کا تنازعہ، نہ مسلمانوں کے فتنے۔ نہ لوٹ مار، نہ مقدمے بازیاں۔ بھائی بھائی کی طرح رہتے تھے۔ ہر چیز حیا اور شرم میں لپٹی ہوئی تھی۔ پروردگار کی قسم! آج وہ دن یاد آتے ہیں۔ تو دل میں بھالے چُبھ جاتے ہیں۔''

پرساد جو نے اس کے ہاتھ سے نسوار کی ڈبیا لیتے ہوئے کہا۔ ''سچ پوچھو استاد: اُاب یہاں سے اُٹھنے ہی کو جی چاہتا ہے۔ جن آنکھوں نے شرافت اور حیا کا دور دیکھا ہے۔ حیران ہوں وہ یہ زمانہ دیکھ کر بند کیوں نہیں ہوتیں۔''

استاد جمال نے کہا۔ ''ابھی کون جانے؟ مالک کیا کچھ دکھانیوالا ہے۔''

اتنے میں کوئی دور سے گا اُٹھا:

''سرک نہ جائے ڈوپٹہ تیرا''۔

پرساد جو نے جمال کی طرف اور جمال نے پرساد جو کی طرف دیکھا۔ آنکھوں ہی آنکھوں میں دنیا کی بڑھتی ہوئی بے شرمی پر تنقید ہوئی۔ نہ جانے کتنی دیر یہ تنقید جاری رہتی۔ اگر ایک بوڑھا درمیان میں گرج کر نہ کہہ اُٹھتا۔ ''اندھا ہے۔ دیکھتا

نہیں۔لوگ بیٹھے ہیں۔اور بڑھا چلا آرہا ہے۔''

''معاف رکھو بابا......اندھا ہی ہوں۔'' ایک اندھے نے کہا۔سب بوڑھے اُس طرف متوجہ ہوئے۔غصہ سے کسی کی آنکھیں لال ہو گئیں۔اور رحم سے کسی کا دل مسل گیا۔پرساد جو نے تھوڑی دیر بعد کہا۔''بابا! تم لوگوں کا کیا کام؟ اگر روندے گئے۔تو تڑپ تڑپ کر جان دو گے۔

اندھے نے کہا۔''سچ ہے۔کون یہاں آتا۔پیٹ کھینچ لاتا ہے''۔

جمال استاد نے کہا۔''تو ادھر جاؤ۔جہاں صاحب لوگ بیٹھے چاندی کے ساتھ کھیل رہے ہیں۔ہمارے یہاں کیا ملے گا۔؟''

اندھے نے قدم روک لئے۔اور کہا۔''وہ پٹارے بھی ٹٹول چکا ہوں صاحب! باہر رنگ و روغن اندر خدا کا نام! ہاں دینے والا کوئی ملتا ہے۔تو پرانی ہڈی والا ہی۔جس میں اب بھی رحم کی تھوڑی تری باقی ہے۔''

ایک اور بوڑھے نے بیچ میں طرح دے کر کہا۔''ارے۔انہیں روپیہ سوا روپیہ کا خرچ اپنے سنگار ہی پر دن بھر اٹھتا ہوگا۔اس کے علاوہ سگریٹ کا خرچ الگ۔پان الگ۔پالش الگ۔سنیما کی مد الگ۔پھر بھی وہ نہیں دیتے کیا؟''

اندھا تجربہ کار تھا۔اور ساتھ ہی ظریف بھی۔ہنسکر بولا۔''صاحب یہ سب کچھ ماں باپ کی کمائی ہے۔اپنی ہڈیوں پر زور دینا پڑے تو سارا سنگار دھواں بن کر اڑ جائے۔زمانے کی بے غیرتی دیکھو۔یہ بھی ہاتھ پھیلاتے ہیں۔وہ بھی جھولی بھر دیتے ہیں۔دونوں اپنی اپنی جگہ شادان یہ اپنے آپ کو آراستہ و پیراستہ کر کے اور وہ گھر کے بھکاریوں کو خوبصورت دیکھ کر:'' سب بوڑھے کھکھلا کر ہنس پڑے۔دور جدید کی عورت نما مخلوق پر چست تنقید ہوئی تھی۔اور وہ بھی اس کی زبان سے۔جو بصارت سے محروم تھا۔جس نے صرف سنا تھا۔دیکھا نہیں۔محسوس کیا تھا۔آزمایا نہیں۔استاد جمال نے

اس کے ہاتھ میں پیسہ رکھ دیا۔اور اندھا آگے بڑھا

شام پھیل چکی تھی۔بجلی کے قمقمے آسمان پر چمکتے ہوئے تاروں کی طرح مسکرا رہے تھے۔شنکر آچاریہ کی پہاڑی کے قمقمے ایسے دکھائی دیتے تھے۔جیسے بادلوں کی گود میں پلی ہوئی بجلی فنا کے دیوتا کو سجدہ کرنیکے لئے آہستہ آہستہ سیڑھیاں چڑھ رہی ہو۔

اندھا پھر پھر کر بہت تھک گیا تھا۔ایک جگہ ستانے کے لئے بیٹھ گیا۔پاس ہی اس نے سنا۔کوئی آہستہ سے کہہ رہا ہے۔''تم میری جوانی کا خواب ہو۔'' جواب میں ایک دلفریب ہنسی شام کے دھندلکے میں تحلیل ہوگئی۔اور پھر کسی نے نخرے سے کہا۔''ایسی باتیں نہ کیا کرو۔''

جواب میں کسی نے کہا۔''تم سے نہ کروں۔تو کس سے کروں؟''

اندھا سمجھا۔ایک مرد شاید جوان ایک عورت شاید حسین سے چھیڑ چھاڑ اور محبت کی باتیں کر رہا ہے۔جوان حسینہ کو چاہتا ہے۔اور حسینہ اسکی محبت کو ابھی قدر کی نگاہوں سے نہیں دیکھتی۔''

جوان نے آہستہ سے کہا۔''اب کہاں تک ہلاہل چکھاؤ گی؟
کبھی امرت بھی نصیب ہوگا کہ نہیں؟''

بولی۔''کی تھی ایک بار۔''

اندھے نے حیرت سے کہا۔''اوہ۔پھر بھیک کیوں مانگ رہی ہو؟''

اندھی نے آہ کھینچکر کہا۔''وہ ذلیل تھا۔جنگلی سوور سے زیادہ مکروہ! اس نے مجھے تباہ کر دیا۔''

اندھا حیران ہوا۔اور اندھی نے پھر کہا۔''تم بھی تو مرد ہو۔اُسی کی ذات کا ۔! میری کہانی سننے کا تمھیں کیا حق ہے۔؟''

اندھے نے مسکرا کر پوچھا۔ ''کوئی حق نہیں مجھے؟ آنکھیں گنوا کر بھی حق نہیں۔؟ بی بی! تم ایک ہی لاٹھی سے سب مردوں کو ہانکنے کی کوشش کر رہی ہو۔ اور خود ہی ہانکی جا رہی ہو۔''

اندھی نے لمبی سانس لی۔ اور پوچھا۔ ''تمہارے پاس نسوار ہے؟''

اندھے نے کہا۔ ''نسوار نہیں۔ ایک سیب ہے۔ کھاؤ گی؟'' یہ کہکر اُس نے جھولی سے سیب نکالا۔ اور اندھی کو دے دیا۔ ایک ٹکڑے کو دانت سے کاٹ کر چباتی ہوئی بولی۔ ''میری بطن سے ایک بچہ پیدا کر کے وہ چلا گیا اور میری زندگی کو ٹھکرا دیا۔ آج میرا بیٹا ہوتا۔ تو ماں یوں ٹھوکریں کھاتی؟''

اندھے نے اچھل کر کہا۔ ''اچھا! تمہارا بچہ بھی ہوا تھا۔ آہ!

کتنا ظلم کیا اس نے......لیکن اُن دنوں بھی تو اندھی ہی تھی۔؟''

اندھی نے کہا۔ ''ہاں۔ اندھی نہ ہوتی۔ تو کون بچہ لیکر بھاگ جاتا؟ کس کی تھی مجال؟'' اندھے کو محسوس ہوا۔ اندھی کا بڑھتا ہوا جوش جیسے اردگرد کے ماحول میں سمایا جا رہا ہے۔

اندھے نے پھر پوچھا۔ ''کتنے برس ہوئے ہوں گے۔''

اندھی نے کہا۔ ''حساب کون جانے؟ لیکن ہوئے ہوں گے پندرہ برس کے قریب! اب تو وہ بچہ جوان ہوگا۔''

اندھے نے پھر پوچھا۔ ''دودھ پیتا بچہ ہی لے گیا ہوگا باجی!''

اندھی نے کہا۔ ''نہیں تین برس کی عمر کا۔ وہ مجھے میٹھے سروں میں 'ماں' کہتا تھا۔''

اندھا گردن جھکا کر چپ ہو رہا۔ نہ جانے کیا سوچ رہا تھا۔ اس کے بال بال میں بے چینی ناچ رہی تھی۔

اندھی نے کہا۔ ”چلو چلیں! اب تو باغ سونا پڑ گیا ہے۔“

اندھے نے اس کا ہاتھ پکڑا اور کہا۔ ”بیٹھو بھی! ۔ خدا کی قسم ۔ دل میں ہول ہو رہا ہے آج۔“ اندھے کو محسوس ہوا۔ اندھی کا ہاتھ نرم ۔ سڈول اور کومل ہے۔ اس نے دل ہی دل میں اندھی کے حسن کا اندازہ لگایا۔ اونچا قد ہوگا۔ گول چہرہ ہوگا۔ باریک اور لمبی ناک ہوگی۔ چھوٹا سا منہ اور تپلے تپلے ہونٹ ہوں گے۔ بال کالے اور لمبے ہوں گے۔ اور چھاتی...... وہ بھی ہوگی۔“

معاً اندھا قریب تر آ گیا۔ اس نے اپنا ہاتھ آہستہ آہستہ اندھی کے منہ پر پھیر دیا۔ اندھی چونکی۔ بولی۔ ”ارے“۔

اندھے نے کہا۔ ”اُف ۔ معاف کرنا۔ غلطی سے ہاتھ اُٹھا۔ تم نے برا تو نہیں مانا۔“

اندھا بے قرار ہو گیا۔ اسے محسوس ہوا۔ جیسے آج ہری ہری گھاس پر رینگتا ہوا اسے اپنا شباب لوٹ آیا۔ اور اس کے تاریک سینے میں جا چھپا اسکا دل اچھلنے لگا۔ خون کی گرمی سے چہرہ کانوں تک جل اُٹھا۔ شباب میں اس نے بھی کسی سے محبت کی تھی۔ جس کی دھندلی سی شیرینی اب تک اس کے سینے میں باقی تھی۔ وہ جلد جلد اُٹھا۔ لاٹھی سے ٹٹولتا ہوا آگے بڑھا۔ اسے دیکھ کر باتیں کرنے والا جوڑا ہنس پڑا۔ اور عورت نے ہنسی میں کہا۔ ”اندھا۔“

اندھے نے اس طرف گردن پھیر کر نابینا آنکھوں سے دیکھا۔ لیکن رکا نہیں۔

۲

اندھے نے حیرت میں کہا۔ ”تم بھی اندھی ہو۔؟“

اندھی نے جواب دیا۔ ”ہاں!“

اندھے نے کہا۔ ”کوئی بات نہیں۔ کسی آنکھوں والے سے لگتی تو برا مانتی“۔

اندھی نے کہا۔ "شکر ہے چوٹ نہ لگی"۔

اندھے نے کہا۔ "کیا عجب تماشہ! کیونکر ہم ملے!"

اندھی نے مسکرا کر کہا۔ "مجھے ٹھوکر دے کر!

اندھے نے پھر پوچھا۔ "تم کب چلی آئی تھی باغ میں؟"

اندھی نے کہا۔ "اسوقت خوب دھوپ تھی۔ میں کتنی ہی دیر کنارے لیٹی رہی۔ اب گھنٹہ دو گھنٹہ سے گھوم رہی ہوں"۔

اندھے نے پوچھا۔ "اوہ! مجھ سے پہلے آئی ہو۔ تب تو خوب کمایا ہوگا۔"

اندھی زور سے ہنسی اور کہا۔ "صرف ساڑھے تین آنے۔ یہی خوب ہے!"

اندھے نے کہا۔ "کیوں نہیں؟ آج کل کے زمانے میں پیسہ کہاں۔ سنا نہیں۔ جنگ چھڑ گئی ہے۔ سارا پیسہ وہاں گیا ہے۔"

اندھی نے پوچھا۔ "اور تم نے......؟

اندھے نے کہا۔ "ایک اور ایک دو پیسے۔ وہ بھی بوڑھوں سے لیکن آؤ۔ ذرا بیٹھیں تو۔"

اندھی نے کہا۔ "مسجد میں نہ چلیں......؟"

اندھے نے کہا۔ "کیا جلدی ہے۔ چل کر کونسا گھر بار بسانا ہے"۔

اندھی چپ ہو رہی۔ اندھے نے پھر کہا۔ "تم بھی میری طرح بوڑھی ہو۔"

اندھی نے اپنی گردن اُوپر اُٹھائی۔ اور کہا۔ "اب کے عُرس نبیؐ پر.... پورے پینتیس برس کی ہوں گی۔ یا شاید چالیس بتالیس کی۔ پانچ کم یا پانچ زیادہ!"

اندھا رینگتا رینگتا اس کے قریب تر آ گیا۔ اُس نے پھر پوچھا۔ "شادی کی تھی؟"

اندھی پہلے خاموش رہی۔ پھر آہستہ سے ایک لمبی آہ کھینچ کر اندھی نے مسکرا

کر کہا۔ ''نہیں تو!''

اندھے کے دل میں طوفان اُٹھا تھا۔ درخت کے اوٹ میں جو باتیں اس نے سنی تھیں وہ اسکے کانوں میں گونج رہی تھیں۔ وہ عجیب تذبذب میں پڑ گیا۔ اس کے دل کا پیالہ محبت کی شراب سے چھلک رہا تھا۔ عین اسطرح جس طرح بہت سال پہلے چھلکا تھا۔ لیکن چھلک کر ہی ٹوٹ گیا تھا۔ اس نے پھر آہستہ سے اپنا ہاتھ اُٹھا کر اندھی کے سر پر رکھا۔ اور اس کے بالوں سے کھیلنے لگا۔ اندھی نے پھر تیز لہجے میں کہا۔ ''کیا کر رہے ہو؟ آنکھیں لٹا کر بھی شیطنت نہیں گئی۔؟'' اور وہ پھر اُٹھ کھڑی ہوئی اپنی سوٹی لیکر۔ اور بولی۔ ''یہاں وہ بیٹھے۔ جو شیطان کی خالہ ہو''۔

اندھا بھی اُٹھا۔ اُٹھتے اُٹھتے اس نے کہا۔ ''ٹھہرو تو......''

اندھی ٹھہری۔ اور قدم روک کر بولی۔ ''تم بھی کوئی بچہ چھین کر لو گے؟ جبھی روک رہے ہو!''

اندھے نے کہا۔ ''چھین نہیں لوں گا۔ دان دوں گا۔''

اندھی نے گرج کر جاتے ہوئے کہا۔ ''دان! ذلیل مردو! دان تم دیتے ہو یا عورتیں دیتی ہیں۔''

اندھا اس کے پیچھے پیچھے ہولیا۔ ایک بار پھاٹک کے پاس اس نے پھر اندھی کے سر پر ہاتھ رکھا۔ اور آہستہ سے بولا۔ ''دے دو دان! میں تمہارا دان لوں گا۔''

اندھی نے مُڑ کر دیکھا۔ اور آہستہ مسکرائی۔ اتنے میں اندھے نے اس کے سینے پر ہاتھ رکھا۔ اسکی اُبھری ہوئی چھاتیوں کو ٹٹولتے ہوئے اس نے پھر پوچھا۔ ''دو گی دان؟''

اندھی اسے جھٹکا دے کر چلی گئی۔ اور بولی۔ ''ذلیل مردوں کو نہیں۔ جو دان لے کر بھی احسان فراموش ہوتے ہیں۔''

اندھے کو محسوس ہوا۔ کہ اس کے دل میں اُٹھا ہوا طوفان اب باہر بھی اُمڈنے لگا۔ وہ اس کے قدموں پر گر پڑا اور بولا۔ ''خدا اور خدا کے رسولؐ کے لئے۔ آج آنکھیں گنوا کر پہلی بار میں نے عورت کے نازک جسم کو چھوا ہے۔ میرے اندر جو آگ لگ گئی ہے۔ اس کا کچھ اندازہ کرلو۔ اسکی کچھ تپش۔ کچھ جلن تو محسوس کر کے چلی جاؤ۔ میرے سینے کی آگ کا حصہ لے لو۔ اس اُٹھی ہوئی آندھی میں اپنے دامن سے مجھے ڈھک لو۔''

اندھی نے کچھ نہیں کہا۔ ایک لمبی آہ کھینچی اور چلی گئی۔ تھوڑی دیر بعد اندھا سنبھلا۔ وہ اسے پکارتا ہوا پیچھے پیچھے ہولیا۔ ''اندھی مجھے ڈھک لو۔ میری آگ کا حصہ لو۔'' لیکن اندھی چلی گئی تھی۔ سڑکوں پر سیاہ موت کا سایہ تھا۔ اور اسی سایہ کے طوفان میں بہتا ہوا اندھا ایک ان دیکھی۔ ان جانی اندھی کا پیچھا کر رہا تھا۔

معاً کسی نے اسے روکا۔ اور غصے میں کہا۔ '' آنکھیں لٹا کر اب ایمان بھی لٹانے پر تلا ہوا ہے مردود!'' اندھے نے آواز پہچان لی۔ باغ میں جن بوڑھوں کے ساتھ ہنسی ٹھٹھے میں اس نے نوجوانوں پر تنقید کی تھی۔ انہیں میں سے ایک تھا۔

اندھے نے کہا۔ ''معاف کرو۔ سچ مچ میں سب کچھ لُٹانے پر تلا ہوا تھا''۔

اُس بوڑھے نے کہا۔ ''جا۔ کہیں مسجد میں توبہ کر۔ ! عجب نہیں۔ جو خدا قبول کرے۔''

اندھا پسینے سے شرابور تھا۔ آنکھوں والوں کی بے حیائی پر بزرگوں نے صرف دبے ہونٹوں تنقید کی تھی۔ لیکن اندھے کے جوش محبت کو روکنے کا سب کو حق تھا۔ اس نے سر جھکایا اور آہستہ آہستہ مسجد کی طرف چلا گیا۔ اُس کے دل میں اُٹھا ہوا طوفان آہستہ آہستہ ختم ہو رہا تھا۔

............☆☆☆............

پنچایت کا فیصلہ

اور بھی دور فلک ہیں ابھی آنے والے
نازاتنا نہ کریں ہم کو مٹانے والے
(اکبرالہ آبادی)

پنچایت کا فیصلہ

لڑکی نے آکر کہا۔ ''دادا۔ دادا؟ کسی کے ڈھور ڈنگر کھیت میں گھس گئے ہیں!'' ٹھاکر دادا حواس باختہ ہوگئے ۔ دن کا تھکا ہوا مزے سے حقہ پی رہا تھا۔ سراسیمگی میں بولا۔ ''کہاں...... کہاں ہیں وہ؟''

معصوم بچی نے مسکرا کر کہا۔ ''اس کھیت میں جو پہاڑ کی ترائی میں ہے۔ وہیں۔''

ٹھاکر دادا کے ہاتھ میں ڈانڈا لے کر بھا گا کھیتوں کی طرف چل پڑا۔ دور سے دیکھا تو سچ مچ پانچ چھ بیل بے فکری سے مکی کے پودے کھا رہے ہیں جیسے وہ کھیت کے راجہ ہیں۔ اور اس بے ضابطہ گی پر انہیں ٹوکنے والا کوئی نہ ہو۔

ٹھاکر دادا کی آنکھوں میں خون اُتر آیا۔ ہاتھ کانپنے لگے۔ دور ہی سے للکار کر گرجا۔ ''ہش ۔ ہا۔ ہو!''

لیکن ڈنگر کسی کے نوکر تو نہ تھے۔ جو حکم سنکر کھیت سے نکل جاتے دو ایک بیلوں نے گردن اُٹھا کر دادا کی طرف دیکھا۔ اور پھر مزے سے مکی کھانے لگے۔ جیسے ٹھاکر دادا کی دھمکی انہیں خاطر میں نہ آئی ہو۔ ان کی موٹی موٹی آنکھوں پر اس وقت کی مکی کی مٹھاس کا نشہ تھا۔ پتہ نہیں۔ ان کے بھاگ کب سے کھل گئے تھے۔ جبھی تو تمام کے تمام توند نکالے چر رہے تھے۔ اور دور سے ایسے دکھائی دے رہے تھے۔ جیسے ربڑ

کی بڑی بڑی متحرک بوتلیں ہوا سے بھر دی گئی ہوں۔

ٹھاکر دادا ہانکتا ہوا قریب پہنچ گیا۔ اور ایک بیل کی پیٹھ پر اپنا ڈنڈا اس زور سے مارا۔ کہ وہ دُم دبا کر بھاگ گیا۔ اور باقی مویشی بھی اپنے ساتھی کو بے طرح بھاگتے دیکھ کر فرار ہو گئے۔ ان کے بھاگ جانے کے بعد ٹھاکر دادا نے دیکھا۔ مکی کا نصف کھیت تلپٹ ہو گیا ہے۔ سال بھر کی کمائی کا چند گھنٹوں میں فیصلہ ہو چکا تھا۔ اس سال فصل بھی اچھی تھی۔ ایک کنال زمین سے چار کنال کی پیداوار اُٹھنے کی امید تھی۔ غصے میں کانپتا ہوا ٹھاکر دادا گاؤں کی طرف لوٹ آیا۔ اس کے بوڑھے اور سوکھے ہوئے ہونٹ کانپنے لگے۔ اسکی دھنسی ہوئی آنکھیں دو شعلے ہو گئیں۔ اور منہ سے جھاگ نکلنے لگی۔ اس کے بس کی بات ہوتی۔ تو تمام ڈنگروں کی کھال کھنچوا دیتا۔ ان کے مالکوں کے کھیتوں میں آگ لگواتا۔ جب بھی اس کا کلیجہ ٹھنڈا نہ ہوتا۔ فصل کے موقع پر مویشی کھلے چھوڑ دینا کہاں کی دانشمندی ہے۔؟ اوروں کے کھیت کی فصل کھلا کھلا کر جانور موٹے بنانا اسکے اصول کے خلاف تھا۔ اس کے اپنے بھی دو چار جانور تھے۔ لیکن بے چارے قیدیوں کی طرح دن بھر صحن میں بندھے رہتے تھے۔ سرسبز پگ ڈنڈیاں اور نیلے کھیت دیکھ کر ان کے منہ سے رال ٹپکتی تھی۔ لیکن ٹھاکر دادا تھا کہ انہیں گز بھر بھی کھلا چھوڑنے کا روادار نہ تھا۔ ڈرتا تھا کہیں ایسا نہ ہو۔ چار پائے کسی کے کھیت میں منہ ڈال دیں۔ اور پھر مفت میں قضیہ کھڑا ہو جائے۔ گاؤں میں جس جس نے اُسے آتے دیکھا۔ ششدر رہ گیا۔ ٹھاکر دادا ایسا دیوتا اندھی کی طرح برابر بڑھتا چلا جا رہا تھا۔ سب پوچھنے لگے۔ ''کیوں دادا خیریت تو ہے''۔ لیکن وہ موت کی طرح بہرہ بن کر آگے بڑھتا جا رہا تھا۔ انتقام کی آگ سے جلا ہوا۔ جیسے کوئی خونی سپاہی لشکر کو تہ و بالا کرتے جا رہا ہو!

جے رام کے صحن میں رک کر اس نے گرجتے ہوئے کہا۔ ''لعنت ہے تم پر اور

تمہارے مویشیوں پر۔ کھیت کا کھیت تباہ کر ڈالا۔ اتنا بھی خیال نہیں۔ کہ فصل کے موقع پر ڈنگر باندھ چھوڑتے"۔

جے رام دو چار کسانوں کے ساتھ صحن میں زخمی بیل کو دیکھ کر سوچتا تھا۔ کہ بے زبان مویشی کو کس نے ڈنڈا مارا کہ کمر ہی توڑ ڈالی۔ ٹھاکر دادا کی لرزتی ہوئی آواز سن کر پیچھے مُڑا۔ دیکھا تو ٹھاکر دادا ہاتھ میں ڈنڈا لئے ہوئے سوکھے پتے کی طرح تھر تھرا رہا ہے۔ بیل کے زخمی ہونے کا تو غصہ تھا ہی ٹھاکر دادا کا غصہ دیکھ کر اور بھی جل گیا۔ کہنے لگا۔ "تم نے میرے بیل کی کمر توڑ ڈالی؟"

ٹھاکر دادا نے کہا۔ "ہاں میں نے توڑ ڈالی۔ ڈنکے کی چوٹ پر کہتا ہوں میں نے توڑ ڈالی۔"

جے رام کا غصہ اور بھی تیز ہو گیا۔ اُس نے پاس آ کر کہا۔ "مکی کے چند پودوں کے لئے تم نے میرا سو روپے کا بیل زخمی کر دیا۔ بوڑھے بندر بے حیا۔! بیل آخر بیل ہی ہے۔ انسان تو نہیں۔ خیر اس کا مزہ نہ چکھایا ہو۔ تو میرا نام جے رام نہیں!"

ٹھاکر دادا نے بگڑ کر پوچھا۔ "کیا کرو گے میرا؟ ایک تو شرمندہ نہیں ہوتا اور پھر اُلٹا مجھے ہی آنکھیں دکھاتا ہے۔ ناش نہ داغ نہ دوں۔ تو یاد رکھنا۔ عمر بھر یاد کرو گے۔ کہ کس کے کھیت کی مکی بیلوں نے چکھی تھی۔"

جے رام نے آؤ دیکھا نہ تاؤ۔ دو چار طمانچے ٹھاکر دادا کے لگا دئے۔ جس سے وہ گر پڑا۔ گاؤں میں اس معاملہ سے کہرام مچ گیا۔ ٹھاکر دادا کا کھیت خالی ہو گیا تھا۔ اور جے رام کے بے نظیر بیل زخمی ہو کر ناکارہ ہو چکا تھا۔ گاؤں میں کچھ ایسے بھی لوگ تھے۔ جو دونوں کو ایک دوسرے کے خلاف بھکانے لگے۔ جو چنگاری کو آگ کا ایک بہت بڑا ڈھیر بنانے میں کامیاب ہو گئے۔

معاملہ پنچایت کے سامنے پیش ہوا۔ دونوں نے اپنے اپنے عذرات پنچ کے

سامنے پیش کیئے۔

گاؤں میں ہری جنوں کی آبادی زیادہ نہ تھی۔ مشکل سے دس بارہ گھر تھے۔ اور وہ بھی ایسے جنہیں آئے دن ایک دوسرے سے لڑائی جھگڑا رہتا تھا۔ ٹھاکر دادا کی ساری برادری یہی چاہتی تھی۔ کہ ٹھاکر دادا کسی طرح سے پچھاڑا جائے۔ اور دادا۔ وہ بے چارہ بوڑھا ناتواں اور بے کس سوچ رہا تھا۔ میں کیا کروں گا۔ کون میرے حق میں گواہی دے گا۔''

اس کا نوجوان بیٹا عین بڑھاپے میں اسے داغ مفارقت دے گیا تھا۔ وہ اسی کے بال بچوں کو دیکھ کر جی رہا تھا۔ ان ہی کے لئے صبح سے شام تک کام کرتا تھا۔ جس سے اس کی امیدیں وابستہ تھیں۔ اب اسی کی امیدوں پر یہ جان چھڑک رہا تھا۔ آج اس کا بیٹا زندہ ہوتا تو کس کی مجال تھی جو ٹھاکر دادا کے کھیت کی طرف آنکھ اُٹھا کر دیکھ سکتا۔ اس کا بیٹا اس کی آنکھیں نہ نکال لیتا۔ لیکن اب بے چارہ کیا کر سکتا تھا۔ موت نے اس کی ساری طاقت اپنے ظالم ہاتھوں سے چھین لی تھی۔

پنچایت کا اجلاس ایک بوسیدہ چنار کے نیچے لگ گیا۔ گاؤں کے تمام کسان سبزے پر بیٹھ گئے۔ اور ٹھاکر دادا ایک کونے میں بیٹھ گیا۔

سرپنچ نے تمام واقعات سن لئے۔ کھیت اور بیل کا ملاحظہ کیا۔ اور پھر فیصلہ کیا۔ کہ جے رام، ٹھاکر دادا کو دس من مکی دے۔ اور ٹھاکر دادا اپنا بیل جے رام کے حوالے کر دے۔ اس کے عوض وہ جے رام کا زخمی بیل رکھ لے۔

ٹھاکر دادا کے سوا حاضرین نے فیصلہ پر واہ واہ کا نعرہ بلند کیا۔ سب کہنے لگے۔ ''سرپنچ معاملے کی تہ کو پہنچ گیا ہے۔'' لیکن بوڑھا دادا سوچ رہا تھا۔ کہ سال بھر کی امیدوں پر پانی پھر کر بھی معاوضہ دینا پڑا۔ اس نے نہایت عاجزی سے واقعات کا اعادہ کیا۔ اس کی آنکھوں میں آنسو بھر آئے۔ لیکن وہاں کون تھا۔ جس کا دل اس کے

آنسوؤں سے پگھل جاتا۔ سب کہنے لگے۔ ''بوڑھا بڑا لالچی ہے۔ قبر میں پاؤں لٹکائے ہوئے ہیں۔ تو بھی آنکھوں میں لالچ ناچ رہی ہے''۔

دوسرے دن صبح جے رام نے دس من مکی بھیج دی۔ اور ٹھاکر دادا نے بھی بادل ناخواستہ اپنا بیل بھیج دیا۔

....

ٹھاکر دادا کے پوتوں اور پوتیوں کو بیل کے چلے جانے کا بہت رنج ہوا۔ وہ روز پوچھتے۔ ''دادا ناگوری کہاں گیا۔؟'' اور دادا اشک آلود نگاہوں سے دیکھ کر کہتا۔ ''وہ جنگل میں چر رہا ہے۔ فصل اٹھے گی تب اسے منگا لیں گے۔''

بچے اس جواب سے مطمئن ہو جاتے!

لیکن ایک دن عجیب بات ہو گئی۔ دادا کھیت سے مکی اٹھا رہا تھا بچے پاس ہی خوشوں سے کھیل رہے تھے۔ ایک بچے نے دوڑتے دوڑتے آ کر کہا۔ ''دادا ناگوری!''

ٹھاکر دادا نے دیکھا۔ تو سچ مچ جے رام بیل لئے کہیں جا رہا تھا۔ اس نے کہا۔ ''چپ رہو۔ نادان۔ یہ ہمارا ناگوری نہیں۔ کسی اور کا ہے!''

لیکن بچہ مان جاتا کیسے؟ اس نے اپنے ساتھیوں کو بلا لیا۔ اور سب اسی طرف دوڑ پڑے۔ جدھر سے جے رام بیل لئے جا رہا تھا۔ انہوں نے کہا۔ ''یہ ہمارا ناگوری ہے۔ ہمارا!''

بیل بچوں کی آواز پہچان کر دم ہلانے لگا۔ جے رام نے غصے میں کہا۔ ''بھاگ جاؤ۔ نہیں تو پیٹوں گا۔

اتنے میں ٹھاکر دادا بھی وہاں ہانپتے کانپتے پہنچ گیا۔ اس نے بچوں کو ڈانٹ کر کہا۔ ''یہ ہمارا ناگوری نہیں۔ دیکھتے نہیں!''

بچوں نے کہا۔ ''نہیں دادا۔ یہ ہمارا ہے۔'' وہ اپنے ناگوری کی ٹانگوں سے

لپٹ گئے۔اور بولے۔"یہ ہمارا ہے۔ہم نہ جانے دینگے"۔

بچوں کی محبت اور معصوم باتیں جے رام کے دل میں سوئیوں کی طرح چبھ گئیں۔وہ پرے ہٹ گیا۔اور بچوں کے ہاتھ میں رسی دے کر کہنے لگا۔"لے لو یہی ہے تمہارا ناگوری!"

بچے خوشی سے اُچھل پڑے اور ٹھاکر دادا حیرت کا مجسمہ بنے جے رام کو دیکھنے لگا۔بچوں کی معصوم باتوں نے پنچایت کا وہ فیصلہ مسترد کر دیا۔جسے مسترد کر دینے کی کسی میں ہمت نہ تھی۔!!

............☆☆☆............

فرشتہ رحمت

سبق اچھا پڑھا دیا تو نے
دل سے سب کچھ بھلا دیا تو نے
(داغؔ)

"فرشتہ رحمت"

رحیم بیگ نے گرج کر کہا۔ "وہ پہلے میرے کھیتوں میں پانی جائے گا۔ بعد میں کسان باری باری سے لیں گے۔"

کسانوں نے ایک دوسرے کی طرف دیکھا۔ کسی میں اتنی ہمت نہ ہوئی کہ منہ سے کچھ بھی جواب دے سکے۔ جیسے اُن کے پاس جواب ہی نہ تھا!

رحیم بیگ پھر ذرا تیزی سے بول اُٹھا۔ "ابے۔ چپ کیوں ہو گئے؟ بولتے نہیں! آدمی نہیں ہو کیا......؟"

کسانوں نے آہستہ سے کہا۔ "جو حُکم ہو نمبر دار صاحب!"

نمبر دا گھوڑے پر سوار ہو کر چل دیا۔ اور کسان اسکے کھیتوں میں پانی دینے کی فکر کرنے لگے۔ غلام محمد کسانوں میں ذرا سیانا تھا۔ اس نے سب کو اپنے پاس بلا کر بیٹھا یا اور کہا۔ "بھائی! اب یہ نہیں ہوسکتا۔ آج سب سے پہلے کسانوں کے کھیتوں میں پانی دیا جائیگا۔ بعد میں نمبر دار صاحب کے کھیتوں میں۔"

اس پر کسان نے بگڑ کر کہا۔ "اس کے سامنے کیا تمہارے زبان نہ تھی جواب ڈینگیں مار رہے ہو۔؟"

غلام محمد نے غصے سے جواب دیا۔ "ظلم کی حد ہوگئی۔ اب نمبر دار کا ظلم سہنے کے لئے کوئی کسان تیار نہیں۔ چاہے اس میں کسی کی جان ہی کیوں نہ چلی جائے۔"

ایک کونے سے دو تین کسانوں نے کہا۔ ''غلام محمد! ابھی تم بچے ہو رحیم بیگ سے ٹکر لینا آگ سے کھیلنا ہے۔ اگر ایسا ہو جائے تو وہ تمہاری کھال ہی کھنچوا لے!''

غلام محمد نے جواب دیا''۔ کھال کھچوانے کے لئے تو میں آگے بڑھا ہی ہوں۔ جیسے میں کہوں۔ ویسے کرتے چلو۔ تو عمر بھر چین کی بنسی بجاؤ گے۔ نہیں تو زندگی بھر تمہارے سر پر لاٹھی اور تمہارے نام کے ساتھ گالی لگی رہے گی۔ سو چو کیا چاہتے ہو؟ عزت یا............؟''

سارے کسان ایک زبان ہو کر بولے۔ ''بیٹا۔ عزت کون نہیں چاہتا؟ لیکن جو بات ہے سو ہے!''

غلام محمد نے کہا۔ ''تم اس کی فکر نہ کرو۔ میں اپنے سر پر سب مصیبتیں اُٹھانے کو تیار ہوں۔ رحیم بیگ زیادہ دنوں تک ہماری چھاتی پر مونگ نہیں دل سکتا۔''

۲

رحیم بیگ کی نمبرداری سارے ضلعے میں مشہور تھی۔ اس کا نام سن کر ہر ایک کسان کے چھکے چھوٹ جاتے تھے۔ گاؤں کا ایک بھی کسان ایسا نہ تھا۔ جس کو اس نے مارا پیٹا نہ ہو۔ اور نہ کوئی عورت ایسی تھی۔ جسے اس نے نہ چھیڑا ہو۔ تب بھی کسی میں اتنی ہمت نہ تھی۔ کہ وہ اس کی شکایت بڑے افسروں سے کرتا۔ نہیں تو رحیم بیگ راتوں رات اسکا گھر جلوا کر خاک کر دیتا۔

رحیم بیگ کی ان کھلم کھلا زیادتیوں کی صرف ایک ہی وجہ تھی۔ اور وہ یہ کہ وہ ہر بڑے افسر کو ہر طرح سے خوش رکھتا تھا۔ کسی کو ڈالی بھیجتا۔ کسی کو شکار کھلاتا اور روپوں کی تھیلیاں کسی کی نذر کر دیتا۔ تحصیل کا سارا عملہ اس سے بہت خوش رہتا تھا۔ چپڑاسی خوشامد کر کر کے اس کے گاؤں میں سمن لے جاتے تھے۔ کیونکہ ہمیشہ وہ ان کی مٹھی گرم کروا دیتا تھا۔ مگر کون جانتا تھا۔ کہ یہ گُل چھرے بے گناہ کسانوں کے خون پر اڑائے

جاتے ہیں۔؟

۳

شام کو غلام محمد اپنے گھر سے نکل کر گاؤں کے کسانوں کے پاس گیا اور ان سے کہا۔ ''میرے ساتھ ہولو۔ اور اپنے کھیتیوں کو پانی سے بھر دو''۔ مگر کسی نے اس کا ساتھ نہ دیا۔ اور سب کہنے لگے۔ ''کل صبح جب نمبر دار اپنے کھیتوں میں پانی نہیں پائیگا۔ تو کیا ہوگا؟'' کون اپنی ہی کلہاڑی سے اپنے پیر کٹوائے؟'' مگر غلام محمد نے ہمت نہ ہاری۔ وہ اندھیری رات میں کھیتوں میں جا نکلا۔ اور بمبے کے بہاؤ کو کسانوں کے کھیتوں کی طرف ایک ایک کر کے موڑنے لگا۔ جب ایک کھیت پانی سے بھر جاتا۔ تو پانی کا رخ دوسرے کھیت کی طرف کر دیتا۔ اس طرح اس نے رات بھر سب کھیتوں کو پانی سے بھر دیا۔

صبح جب کسان اپنے اپنے کھیتوں میں آ گئے۔ اور انہیں پانی سے بھرا ہوا پایا۔ تو بہت خوش ہوئے۔ مگر گھبرائے بھی بہت! غلام محمد نے ان کی یہ حالت دیکھی تو مسکرا کر بولا۔ ''ارے گبھراتے کیوں ہو؟ کل شام کو تو یہ طے کر چکے ہیں کہ اب اور ظلم نہ سہیں گے۔ اب جو ہوگا۔ دیکھا جائے گا۔''

اس پر ایک بوڑھے کسان نے کہا۔ ''بیٹا۔ تم نے یہ اچھا نہیں کیا۔ رحیم بیگ کو خبر ہوگی تو نہ معلوم کیا کر بیٹھے گا۔ کہیں کچی فصل ہی اُکھڑوا کر پھینکوا دے۔ میں اسکی رگ رگ کو پہچانتا ہوں۔ نمبر دار کیا ہے آگ کا انگارہ ہے۔''

غلام محمد نے آہستہ سے جواب دیا۔'' دیکھیں گے ہم بھی وہ کیا کرتا ہے؟'' یہ باتیں ہی ہو رہی تھیں۔ کہ رحیم بیگ ایک اونچے گھوڑے پر سوار آ پہنچا۔ کسان اسکی شکل دیکھتے ہی جہاں کے تہاں کھڑے رہ گئے۔

گھوڑے سے اُتر کر اس نے پوچھا۔ ''اچھا! کھیت پانی سے بھر لئے گئے ہیں

؟رات بھر پانی سینچتے رہے ہو؟''

اور پھر وہ آہستہ آہستہ اپنے کھیتوں کی طرف چلا۔کسان اس کے پیچھے پیچھے چل رہے تھے۔اسے شاید یہ پتہ نہ تھا۔کہ اس کے کھیت اب تک پانی کیلئے ترس رہے تھے۔انہیں سوکھا دیکھ کر وہ حیران رہ گیا۔آنکھوں میں خون اُتر آیا۔اس نے گرج کر کہا۔''یہ کس کی شرارت ہے۔؟تم لوگوں کے کھیت پانی سے بھرے پڑے ہیں۔اور میرے سوکھے پڑے ہیں۔؟ میں نے کل صاف صاف نہیں کہہ دیا تھا۔کہ پہلے میرے کھیت سینچو۔بعد میں اپنے؟''

غلام محمد نے آگے بڑھ کر کہا۔''اب آپ کے کھیت سینچیں گے نمبردار صاحب!ذرا ہم غریبوں کے کھیت بھر جانے دیجئے!''

رحیم بیگ نے بگڑ کر کہا۔''اچھا۔!یہ بات ہے!میرے سامنے میری ہی بے عزتی!اتنی ہمت؟ابھی مزا چکھائے دیتا ہوں۔بچے!''

غلام محمد نے آہستہ سے کہا۔''کیا ہمیں اتنا بھی حق نہیں۔کہ ہم اپنے کھیتوں کو ٹھیک طرح سے پانی دے سکیں۔؟ہم نہ ہوتے تو آپ۔''

رحیم بیگ بات کاٹ کر بیچ ہی میں بول اُٹھا۔''مجھے معلوم ہے۔تم نے دو چار حرف اُلٹے سیدھے پڑھ لئے ہیں۔جبھی تمہارا دماغ آسمان پر ہے مگر دیکھنا۔میرا نام رحیم بیگ ہے''۔

اتنا کہہ کر جوش میں آکر اس نے اپنا نہر نکالا۔اور غلام محمد کو اس طرح مارنے لگا۔کہ اسکی ہڈی پسلی ایک کر دی۔وہ بے ہوش ہو کر گر پڑا۔گاؤں بھر کے کسان یہ تماشا دیکھ رہے تھے۔اور ایک دوسرے سے اشاروں ہی اشاروں میں کہہ رہے تھے۔''دیکھا۔ہم پہلے ہی اسے منع کر رہے تھے۔کہ رحیم بیگ کو ناراض کرنا آگ سے کھیلنا ہے''۔

رحیم بیگ نے غلام محمد کو آدھ موا کر کے حکم دیا۔ کہ اسکی ساری فصل اکھاڑ کر پھینک دو۔ جب کسانوں نے اس کا کہا پورا کر دیا۔ تو اس کا کلیجہ ٹھنڈا ہوا۔

۴

مگر غلام محمد کی قربانی سے ایک عجیب بات پیدا ہوگئی۔ گاؤں کے سب کسان اسکی بڑی عزت کرنے لگے۔ اور بوڑھے، عورتیں اور بچے رحیم بیگ کے خلاف بھڑک اُٹھے۔ اور اس کے خلاف جہاد کرنے کے لئے آگ سلگائی گئی۔

غلام محمد دوسرے دن ہوش میں آیا۔ اس نے دیکھا کہ سارا گاؤں اسے گھیرے کھڑا ہے۔ اور سب اس کے اشارے پر کچھ بھی کرنے کو تیار ہیں۔ اس جوش کو دیکھ کر اسے بڑی خوشی ہوئی۔ وہ پھولے نہ سمایا۔ اس نے مسکرا کر کہا۔ "جیسے میں کہوں۔ اگر ویسا کرتو عزت تمہارے ہاتھوں میں رہے گی" سارے کسانوں نے اس کے کہنے پر چلنے کی قسم کھائی۔ انہوں نے کہا۔ "تم گاؤں کے سردار ہو۔ جس طرح بھی ہو۔ رحیم بیگ کی نمبرداری سے چھڑاؤ!" انہوں نے ایسا محسوس کیا۔ کہ غلام محمد اب سب کچھ کرا سکتا ہے۔

۵

دوسرے ہی دن گاؤں ایک اچھی خاصی چھاونی بن گیا۔ میدان میں ایک طرف افسروں کے تنبو تنے ہوئے تھے۔ اور دوسری طرف بڑے جوش کے ساتھ ننگے دھڑنگے کسان جمع تھے۔! رحیم بیگ یہ سب تماشا دیکھ کر دانتوں تلے انگلیاں دبانے لگا۔ مگر اسے یہ امید تھی۔ کہ تحصیل کا عملہ اور سارے افسر تو اسکے پروردہ غلام ہیں۔ اسلئے اس کا کیا بگڑے گا؟ بگڑے گا تو غلام محمد اور اس کے ساتھیوں ہی کا بگڑے گا"۔ جو افسر اس سے کچھ پوچھتا۔ رحیم بیگ غرور کیساتھ کہہ دیتا۔ "کہ یہ چھوکرے کی شرارت ہے۔ جس نے گاؤں کے بھولے بھالے کسانوں کو بھڑکا دیا ہے۔!"

مگر جب تحقیقات ہونے لگی۔ تو کسی نے نمبردار کے حق میں ایک بات تک نہ کہی۔ سب کسانوں نے یک زبان ہو کر یہی کہا۔ کہ جب تک رحیم بیگ کی نمبرداری رہے گی۔ ہم ایک پیسہ بھی لگان نہ دیں گے۔ چاہے ہمیں جلتی آگ میں ہی کیوں نہ جھونک دیا جائے۔

جن لوگوں نے رحیم بیگ کا نمک کھایا تھا۔ اسلئے وہ بار بار کسانوں کو دھمکاتے اور پھسلاتے تھے۔ اور معاملے کو رفع دفع کرنا چاہتے تھے۔ مگر جب ایک بھی کسان راضی نہ ہوا۔ تو انہوں نے بھی اپنا رخ بدل دیا۔ وہ بھی رحیم بیگ کے خلاف ہو گئے۔ اب وہی رحیم بیگ نمبردار جو پہلے ان کا دوست تھا۔ ملزم بنا ہوا ان کے سامنے کھڑا تھا۔ رحیم بیگ کو یہ پتہ نہ تھا۔ کہ اسکی رشوتیں اور ڈالیاں کسانوں کی طاقت کے آگے نہ ٹھہر سکیں گی۔ رحیم بیگ اسی وقت نمبرداری سے علیٰحدہ کر دیا گیا۔ اور اسکی جگہ غلام محمد تمام گاؤں والوں کی مرضی سے نمبردار بنا دیا گیا۔

۶

غلام محمد کی نمبرداری میں گاؤں خوب پھولنے پھلنے لگا۔ گاؤں کا بچہ بچہ اس پر جان نچھاور کرنے کو تیار تھا۔ اس کے یہاں نہ تو کسانوں سے بیگار لی جاتی تھی۔ اور نہ وہ اس کے گھر کا پانی بھرتے تھے۔ نہ وہ اسکے جانوروں کو مفت میں چرانے جاتے تھے۔ نہ بچے کھلانے کا کام کرتے تھے۔ نہ وہ اس کے کھیتوں کی ترائی ہی کرتے تھے۔ وہ خود کسانوں کے ساتھ مل کر کام کرتا تھا۔ انکا ہاتھ بٹاتا تھا۔ ان کے بچوں سے پیار کرتا تھا۔ انہیں کھلاتا پلاتا تھا۔ اور گاؤں کی بہو بیٹیوں کی ماں بہنوں کی طرح عزت کرتا تھا۔ اس نے گاؤں میں ایک سکول کھلوا دیا۔ ایک ہسپتال بنوا دیا۔ اور پنچایت قائم کرا دی۔ شام کے وقت وہ کسانوں کو جمع کرتا۔ اور کھیتی باڑی کے بارے میں روز نئی باتیں بتاتا۔ اور اخبار پڑھ کر سناتا۔ اس طرح وہ گاؤں کا صرف نمبردار ہی نہ تھا بلکہ

ان کا ہر دلعزیز لیڈر بھی۔

۷

ایک رات کو غلام محمد کھیتوں سے دیر میں لوٹ رہا تھا۔ راستے میں اسے ایک آدمی ملا۔ جو چپکے چپکے جا رہا تھا۔ غلام محمد نے اسے آواز دی اور کہا۔ ''بھائی۔ ذرا ٹھہرا۔ اکٹھے چلیں گے۔''

اس آدمی نے پوچھا۔ ''تم کون ہو؟''

غلام محمد نے کہا۔ ''نہیں پہچانتے؟ میں غلام محمد ہوں۔''

یہ سنکر وہ آدمی رک گیا۔ اور غصے سے کانپنے لگا۔ اور بولا۔ ''تم غلام محمد ہو نمبردار؟''

غلام محمد نے کہا۔ ''ہاں۔! کیا بات ہے؟ میرے لایق کوئی حکم!''

وہ آدمی یہ سنکر چپ ہو گیا۔ اور ایک قرولی نکال کر کہنے لگا۔

''اب زندہ نہیں چھوڑوں گا۔ سات سال ہوئے۔ تم نے مجھے اس گاؤں سے نکلوا دیا تھا۔ یاد ہے؟''

غلام محمد حیران رہ گیا۔ اس نے پوچھا۔ ''تم کون ہو؟ رحیم تو نہیں۔''

رحیم بیگ نے کہا۔ ''ہاں! وہی ہوں۔ لیکن اب انتقام لئے بغیر نہ چھوڑوں گا۔''

غلام محمد نے اپنی گردن جھکا لی۔ اور کہا۔ ''رحیم بیگ! اُٹھاؤ اپنی قرولی۔ اور جلدی سے بھاگ جاؤ۔ تا کہ کوئی تمہیں دیکھ نہ لے۔''

یہ سنتے ہی رحیم بیگ کا ہاتھ رک گیا۔ گویا اس پر سکتے کی سی حالت طاری ہو گئی۔

تھوڑی دیر میں غلام محمد نے سر اوپر اُٹھا کر دیکھا۔ تو رحیم بیگ حیرت کا مجسمہ

بنکر کھڑا ہے۔

قرولی

غلام محمد نے کہا۔ ''نہیں ۔ بلکہ میں تمہاری چھینی ہوئی نمبرداری کے دام چکادوں گا۔''

رحیم بیگ نے اُسے گلے سے لگالیا۔ پھراس کے قدموں پر گر پڑا۔ روتے روتے کہنے لگا۔ ''تم فرشتہ رحمت ہو۔ جس نے میری آنکھوں سے جہالت اور تکبر کا پردہ اُٹھادیا۔''

............☆☆☆............

جنت اور جہنم

دفتر کی پریشانیوں سے فارغ ہوکر میں اکثر شام کوتوی کے پل پر آنکلتا تھا۔ شہر سے دور ہونے کے سبب یہاں بہت کم شور ہوتا تھا۔ اور پھیلی ہوئی تاریکی میں سب ایک جیسے دکھائی دیتے تھے کبھی کبھی سیالکوٹ سے آنے والی لاری بھوں بھوں کرتی ہوئی پل کو عبور کرتی تھی یا دور شنٹنگ انجن کی کرخت سیٹی سے فضا کی خاموشی ٹوٹ جاتی تھی۔ اور مجھے محسوس ہوتا تھا کہ دنیا کا ہنگامہ تاریکی میں بھی خاموش نہیں پڑتا۔ مہا جنی دور کا نظام پوری آب وتاب کے ساتھ رات اور دن، صبح اور شام چل رہا ہے۔ اور شاید چلتا رہے گا۔

کبھی کبھی سنیما سے واپس آتے ہوئے فوجی سپاہی پہاڑی گیت گاتے گاتے، جھڑیاں گھماتے گھماتے، سگریٹ پیتے پیتے یا ایک دوسرے کو گالیاں دیتے دیتے پُل پر سے گزر جاتے۔ اُنہیں میرے وجود کا احساس تک نہ ہوتا کہ کوئی اپنے وطن سے دوسو میل دور آہنی جنگلے سے اُلجھا ہوا ریت اور پتھر کے بے پناہ میدان میں اپنے ملک کے غیر مرئی حسن کے نقوش تلاش کررہا ہے۔ اور اسی جدوجہد میں اپنے فریب خوردہ تاثرات کو بہلا رہا ہے۔ وہ گزر جاتے اور چھائی ہوئی تاریکی کا سناٹا پھیلے ہوئے دریا کا نشیب وفراز، دور دور کی بے رونق سی پہاڑیوں کا غیر شاعرانہ تسلسل میری نگاہوں کا مرکز بن جاتے۔

آہ! اس نظام میں، میں کس قدر مجبور اور بے حقیقت تھا۔ ریت کے ذروں سے زیادہ بے مایہ اور ان میں دبے ہوئے گول گول پتھروں سے زیادہ بے حقیقت! آخر پیٹ ہی تو تھا۔ جس نے مجھے اپنی دلکش وادی سے نکال کر بہت دور پھینک دیا تھا۔ جہاں ہند سے تیار کرنا، محصول وصول کرنا، تلاشیاں لینا اور کبھی کبھی اپنے ضمیر کا گلا گھونٹ کر رشوت لینا بھی میرا معمول تھا۔ میرا جسم گٹھا ہوا تھا، اعضا میں کافی تنومندی تھی۔ لیکن روح کم بخت رشوت کے پیسوں سے دودھ پی پی کر بھی چمک نہ اُٹھتی تھی۔

نانوائی پل کے قریب سڑک کے بائیں طرف چونے کی بھٹی تھی۔ اور ایک نانوائی کی دُکان! کے آگے شکستہ بنچ ہمیشہ خالی پڑی رہتی تھی۔ نانبائی بہت رات گئے تک چولھے کے قریب بیٹھا رہتا تھا۔ شاید اسے خریداروں کا انتظار رہتا تھا۔ میلے اور کالے برتنوں کو کبھی ایک طرف سے اُٹھا کر دوسری طرف رکھ دیتا تھا۔ اور کبھی کھانسنے کے بعد موٹا سا بلغمی تھوک سڑک کے عین وسط میں پھینک دیتا تھا۔

شکستہ بنچ کے نیچے سے کالا ضعیف کتا نانبائی کی کھانسی پہچان کر ہی سڑک کے وسط میں کود کر پہنچتا تھا۔ شاید اسے معلوم تھا کہ کھانسنے کے بعد نانبائی ہمیشہ بلغمی تھوک پھینک دیتا ہے۔ نانبائی کتے کو اپنی تھوک چاٹتے اور سونگھتے دیکھ کر دل ہی دل میں مسرت سی محسوس کرتا تھا۔ لیکن کتے کے متعلق اسکی آنکھوں میں ہمیشہ حقارت جھلکتی رہتی۔ ''ذلیل جانور...... جو صرف تھوک چاٹنے کے لئے پیدا کیا گیا ہے!'' اسے فخر تھا کہ اُس کی دکان کی کوئی چیز، ہڈی، جلی ہوئی روٹی، باسی سالن رائیگان نہ جاتی تھی۔ حتیٰ کہ بلغمی تھوک بھی۔ جس کے لئے قدرت نے بہترین امیدوار شکستہ بنچ کے نیچے منتظر رہنے کے لئے پیدا کیا تھا۔

چونے کی بھٹی آہستہ آہستہ ٹھنڈی پڑی ہوتی تھی۔ گول گول بے حقیقت پتھر دہکتی ہوئی آگ میں جلنے کے بعد چونے کی ڈلیاں بنے ہوتے تھے۔ اب وہ بے

حقیقت نہ تھے۔ عالیشان عمارتوں، درشاہی محلات کے کارخانوں میں اُن کیلئے مخصوص جگہ تھی۔ وہ بے جان ملبے اور اونچی اونچی عمارتوں میں مضبوطی کیلئے استعمال ہونے والے تھے۔ اور بھٹی کا مسلمان مالک اپنی خوفنما داڑھی پر ہاتھ پھیر کر مستقبل کے حسین خواب دیکھا کرتا تھا۔ کبھی کبھی اُسے میں بھی شام کو سرمئی سڑک پر چہل قدمی کرتے یا دمہ کے مریض نانبائی کو چونے کے فوائد سمجھاتے ہوئے دیکھتا تھا۔ کالا کتا بدستور نیم دائرہ بنا کر بنچ کے نیچے لیٹا رہتا تھا۔ جنگلے کے پاس میری آہٹ سن کر وہ دم کو پیٹ سے دبائے میرے پاس پہنچ جاتا۔ اور پھر دم ہلا ہلا کر مجھے یقین دلاتا کہ میں ذلیل نہیں۔ وفادار جانور ہوں۔ اُس کی نگاہوں میں اس وقت عجیب چمک پیدا ہو جاتی۔ جو تاریکی میں مجھے نمایاں طور پر دکھائی دیتی۔ جتنی دیر وہ میرے لمس سے محفوظ رہتا اس کی بشاشت میں کوئی فرق نہ آتا۔ اور نہ آنکھوں کی چمک میں کمی ہوتی۔ شاید وہ محسوس کرتا تھا کہ ہم دونوں اس نظام میں ایک ہی سطح پر کھڑے ہیں۔ بظاہر مطمئن اور شاد لیکن اندر سے کریدے ہوئے۔ چھیلے ہوئے! وہ نانبائی کے بلغمی تھوک چاٹنے کے لئے شکستہ بنچ کے نیچے اور میں شرفا اور غربا دونوں کی رشتوں کی تھوکیں کھانے کیلئے! جو وہ محصول خانے کے پاس سڑک کے وسط میں پھینک کر چلے جاتے تھے۔

مجھے کتے سے پیار تھا...... یہ ذات وفادار رہے اور اس کی طبیعت حساس! بھٹی کے مالک کو دیکھ کر اس کی بشاشت ظاہر نہیں ہوتی حالانکہ وہ بے حقیقت پتھروں کو کندن بنا کر سیم وزر میں کھیلتا رہتا ہے۔ لیکن مجھے جو اسی نظام میں مجبور اور بے حقیقت ہے۔ جو جلا نہیں، چونا نہیں بنا۔ دیکھ کر وہ مچل اُٹھتا ہے بے وقوف کتا! لیکن میری شام کو جدوجہد کسی حد تک کامیاب ہو گئی تھی۔ مجھے اپنا مونس ملا تھا۔ جو میری طرح ابھی چونا نہیں بنا تھا۔

ریت اور پتھر کا بے پناہ میدان جس کے ایک طرف اداس تو تی لیٹی ہوئی سی

تھی۔ میرے سامنے تھا۔ اور دور دور کی بے رونق سی پہاڑیوں کے غیر شاعرانہ تسلسل......!"

آپ یہ نہ سمجھیں کہ دن کو بھی یہ میدان اسی طرح سنسان رہتا تھا۔ نہیں! یہاں دن کو خوب چہل پہل اور گہما گہمی رہتی تھی۔ بیکانیر کے سینکڑوں مزدور، اُن کی بدصورت بیویاں، اور ننگے بچے اس میدان سے پتھر اور ریت نکالا کرتے تھے۔ اور ٹوکریوں میں بھر کر، سر پر اُٹھائے سٹیشن پر کھڑی بے شمار ویگنوں میں لادتے تھے۔ ایک عجیب ترتیب میں اور ایک عجیب نظام کے تحت یہ سارا کام ہوتا تھا۔ ٹھیکہ دار کے معتبر کام کی نگرانی پر مامور تھے اور جونہی ان کی نگاہ کسی مزدور یا عورت کو ستاتے دیکھتی تو جھٹ اُس کے سر پر کھڑے ہوتے تھے۔

"حرامزادہ..........سور کا بچہ۔ بیٹھ گیا...........؟"

"بابوجی..........ذرا کمر سیدھی کر رہا ہوں......"

"اور تو...... چڑیل...... مالزادی! صبح سے ایک ٹن ریت بھی تم سے نہ ڈھوئی گئی۔ شام کو سب سے پہلے ہاتھ پھیلاتی آئے گی۔ اُٹھ ری! (لات مار کر) اُٹھ!"

"آج دس ویگن بھی بھرے نہیں گئے۔......توبہ کس قسم کے مزدوروں سے پالا پڑا ہے۔ بالکل کام چور ہیں۔ کام چور! اور نیو ویلی کی سڑک جو وایسرے گُل لاج کو جاتی ہے۔ سارا کام پتھر اور ریت، ریت اور مزدوروں کے لئے رُکا پڑا ہوگا۔ اگلے مہینے حضور وائسرائے کو شملے سے آنا ہے اور ابھی تک...... گاڑیاں پٹڑی پر کھڑی ہیں۔ ڈیمرتج چڑھ رہا ہے۔ توبہ..........توبہ! واہگورو!......"

سارا میدان دن بھر اسی دور سے گزرتا ہے۔ ننگے، سوکھے ہوئے بدصورت مردوں عورتوں اور بچوں کا تانتا پل سے سٹیشن تک لگا رہتا ہے اور اُن کے پیچھے مہاجنی دور کے محافظوں کی چمکیلی لیکن بے مہر آنکھیں اُن کا تعاقب کرتی رہتی ہیں کہ کہیں نیو

دہلی کی سڑک اگلے مہینے تک ادھوری نہ رہ جائے۔ یا گاڑیوں پر بے ضرورت ڈیمرتج نہ چڑھ جائے۔

چونے کی بھٹی سے کالا کالا دھواں عجیب سے نقوش بنایا ہوا اُڑتا جاتا ہے۔ اور نانبائی ہلکی آنچ پر میلے برتنوں میں باسی سالن کو اُبالتا ہے شاید شام کو کوئی خریدار آٹپکے۔ اور کتا دن بھر میدان میں ننگے انسانوں کے سیلاب میں گھومتا پھرتا ہے۔ بہتا رہتا ہے۔

سٹیشن سے چھن چھن کی آواز آتی ہے۔ سیٹیاں بجتی ہیں۔ جھنڈیاں لہراتی ہیں۔ ایک گاڑی آتی ہے، ایک جاتی ہے۔ ہزاروں لوگ جوان، بچے، بوڑھے، عورتیں آتی جاتی رہتی ہے۔ تانگے چلتے ہیں۔ موٹریں پُوں پُوں کرنے لگتی ہیں۔ تلاشیاں ہوتی ہیں۔ محصول وصول ہوتا ہے۔ رشوتیں ملتی ہیں۔

سر پرٹوکریاں اُٹھائے ہوئے مزدوروں اور بچوں کو دیکھ کر کبھی کبھی کسی سے رہا نہیں جاتا۔ ہنس ہی دیتا ہے۔ ''گندے انسان! بچوں تک کو کام پر لگا دیتے ہیں۔ جیب کترے......''

کبھی کبھی ٹھیکیدار کا معتبر میرے ہاتھ میں چونی رکھ کر کہتا ہے۔ لکھے جناب!

دس ویگن ریت ۲۸۸ ٹن نیو دھلی

چار ویگن بجری ۱۰۰ ٹن جوگندر نگر

دو ویگن پتھر ۵۰ ٹن لالہ موسیٰ شکریہ! ست سری اکال''

میں چپکے سے چونی جیب میں ڈال دیتا ہوں۔ اور پھر شام کو میزان لگانے کے بعد ہند سے تیار کرتا ہوں۔

پتھر ۸۴۰۰ من

ریت ۸۰۶۴ من

بجری (سامانِ عمارتی) ۲۸۰۰ من...... علےٰ ہذالقیاس......!

اس کے بعد توی کا پُل......چُونے کی بھٹی......اور کالا کتا!

۲

ایک شام کو گاڑیاں چلی گئی تھیں۔ شنٹنگ انجن رُخ پھیر کر ٹیڈ کے نیچے کھڑا ہو گیا تھا۔ سٹیشن پر خاموشی سی چھا گئی تھی۔ میری جیب میں چھ آنے تھے۔ جو شام کا دودھ پی کر بچ گئے تھے۔

محصول خانے کے سب اہلکار اپنے اپنے کوارٹروں میں چلے گئے تھے۔ صرف تین چپڑاسی سڑک پر کھڑے کھڑے آنے والے نئے افسر کے متعلق باتیں کرتے تھے۔ جسے آج رات کی گاڑی سے آنا تھا اور ساتھ ہی ساتھ کمر بندوں کے بلوں پر براسو مل رہے تھے۔

''پورے پندرہ سولے گا......''

''پھر بھی سر پر قرض ہوگا......'' دوسرے نے کہا۔

قرض؟ بلے بلے ......اتنی تنخواہ پر بھی قرض؟ نشہ پیتا ہوگا!''

''اور کیا......''

''حرامی! نشہ نہیں پیتے۔ جوا کھیلتے ہیں۔ بڑے افسر سبھی کھیلتے ہیں۔ کلب نہیں دیکھائے۔ تو تو کنویں کا مینڈک ہے......مینڈک!''

''سنا ہئے ماتحتوں کو خوب پالتے ہیں......''

''ہی......ہی......ہی! خدا سلامت رکھے۔ سخت ہوگا تو سب کچھ دھرا رہ جائے گا......''

تینوں نے زور سے قہقہہ لگایا۔

''کون ہوتا ہے بھلا؟'' ایک نے بیڑی سلگا کر پوچھا۔

"ہوگا کہیں بنگال کا...... آسام کا...... وہاں سے (پنسن) ملی ہوگی یہاں منگائے گئے ہوں گے......" دوسرے نے سنجیدگی سے کہا۔

"ہُش...... پنجاب کا ہے پنجاب کا......اور پنجابی زیادہ بُرے نہیں ہوتے......" تیسرے نے براسو ملتے ہوئے اطمینان سے کہا۔

"آج پتھر کی کئے گاڑیاں گئیں؟"

"ستراہ!"

"بس......؟"

"بے چاری لاجونتی کی کمر ٹوٹ گئی تھی......"

"کیوں بھلا؟"

"وہ معتبر ہے نا...... وہ سکھ سالا۔ اسی نے پیٹا تھا۔ کہتا تھا دو دن کی مزدوری میں سے میرا حصہ نہیں دیا۔"

"رام رام کتنا ظُلم ہے"

"دیکھو! میری پیٹی کیسے چمک آرہی ہے۔ زور سے پالش ملو۔ آج کئی افسر سٹیشن پر آئیں گے۔"

مجھے دیکھتے ہی تینوں چپ ہوگئے۔ میں منزل مقصود کی طرف بڑھا۔ میرا دل ملول تھا۔ ہندسوں میں غلطی ہوگئی تھی۔ اور افسر نے مجھے "کام چور" کہا تھا۔

شکستہ بنچ کے نیچے میرا مونس نہ تھا۔ نانبائی حسب عادت چولھے کے نزدیک بیٹھا موٹے موٹے تھوک سڑک پر پھینک رہا تھا۔ شاید اسے آج دمہ کا شدید دورہ پڑا تھا۔

میں جنگلے کے پاس پہنچا۔ سیٹی بجائی۔ کچھ گنگنایا۔ لیکن، کتا غائب تھا۔ پتھریلے اور ریتلے میدان کے وسط میں آگ جل رہی تھی۔

میں فٹ پاتھ سے ہوتا ہوا عین اُس جگہ کھڑا ہو گیا جہاں نیچے آگ جل رہی تھی۔ میں حیران رہ گیا۔ میرا مونس پچھلی ٹانگوں پر بیٹھا چوٹھے کی طرف للچائی ہوئی نظروں سے دیکھ رہا تھا۔ آٹھ دس کشمیری مسلمان آگ کے ارد گرد بیٹھے تھے۔ مٹی کی ہانڈی چڑھی ہوئی تھی۔ ہلکے ہلکے بوجھوں کا ڈھیر ایک طرف تھا۔ شاید یہ لوگ مزدوری کرنے کے لئے باہر جا رہے تھے۔

اُن کی باتوں سے معلوم ہوتا تھا۔ جیسے اُن میں صرف چائے پکانے والا ہی کئی بار کشمیر سے باہر گیا ہوا ہے۔ باقی پہلی مرتبہ جا رہے ہیں۔ جبھی وہ بار بار سوکھے دریا کے پاٹ کی وسعت کو، بھاری بھر کم آہنی پُل کو اور دور دور کی بے رونق سی پہاڑیوں کو دیکھ رہے تھے۔

''اب جموں سے نکل کر شال کوٹ (سیالکوٹ) آئیگا۔'' چائے پکانے والے نے پر مسرت لہجے میں کہا۔

''او پھر امرسر (امرت سر) وزیر آباد۔ سملہ۔ لوفر (لاہور) اور پھر دلی......''

پہلی بار جانے والے مزدور اتنے نام سن کر حیران رہ گئے۔ اُن کی آنکھیں آگ کی روشنی میں بہت بڑی ہو گئیں۔ شاید انہیں دہلی جانا تھا۔

''کشمیر کچھ بھی نہیں۔ دلی دساور ہے۔ ریل گاڑی۔ ٹرام۔ چاند کا چوک۔ واس رائے کا گھر...... گرمی...... پیسہ! ہا ہا ہا'' چائے پکانے والے نے دوبارہ کہا۔

غیر واقف ششدر رہ جاتے تھے۔ اور ہندوستان کا واقف بار بار ہانڈی کا ڈھکنا اُٹھاتا تھا۔ اُسی نے پھر کہا ''دو من بوجھ اٹھاؤ۔ تو آنہ دس سیر اٹھاؤ تو آنہ۔ سارا دن سڑک کے کام پر رہو۔ تو چودہ آنے۔ بس دن میں روپیہ سے کم نہیں بنتا۔ خدا کی قسم!''

غیر واقفوں میں سے ایک نے جو سب سے عمر میں کم تھا۔ پوچھا ''چاچا!

چاول ملتے ہیں وہاں......!''

''ہت تیری احمق! وہاں آٹا کھاتے ہیں۔ اور گھی چار پیسے کے کوئلے خریدے۔ روٹی پکائی۔ گوشت پکایا۔ چائے تیار کی۔ نہ پھونکنے کی ضرورت۔ نہ سلگانے حاجت۔ نہ کپڑے کالے نہ وقت ضائع۔ اللہ اللہ خیر صلاح......!''

غیر واقفوں کے چہروں پر مسکراہٹ کے ساتھ ساتھ گھی کی چمک بھی پھیل گئی۔

واقف مزدور نے دور کی پہاڑیوں کی طرف جو تاریکی سے سیاہ دکھائی دے رہی تھیں دیکھ کر کہا۔ ''بخدا کشمیر دوزخ ہے۔ دوزخ۔ اب دیکھو گے دلی کیا ہے۔ کتنا بڑا شہر ہے۔ ہر طرف دولت ہی دولت ہے۔'' اتنے میں چائے تیار ہوگئی۔

سب نے اپنے اپنے سامان سے مٹی کے پیالے اور روٹیاں نکالیں اور چائے پینے لگے۔ گلابی رنگ کی پتلی چائے۔ جس میں بہت تھوڑا دودھ تھا۔

کتا چولھے کے اور نزدیک آ گیا۔

واقف مزدور نے چائے کا ایک گھونٹ پیتے ہوئے کہا۔ ''صبح کی روٹی شال کوٹ (سیالکوٹ) ٹھیک ہے نا۔ رات کا سفر اچھا رہتا ہے۔''

سب نے اثبات میں سر ہلا دئے۔ بات پکی ہوگئی کہ صبح کی روٹی شال کوٹ اور رات کا سفر اچھا رہتا ہے۔

پیالیوں میں چائے ختم ہوگئی۔ واقف مزدور نے ہانڈی سے اور چائے خالی پیالیوں میں انڈیلتے ہوئے کہا۔ ''آگے کشٹم (کسٹم) ہے لیکن بڑے اصیل لوگ ہیں۔ واپسی پر تنگ نہیں کرتے۔ ایک دو روپے...... چپکے سے اور پھر چل میرے بھائی۔ سرکار کا گھر کس نے بھر دیا......؟ ہاہا...... ہا......''

سب نے زور سے قہقہہ لگایا۔ واپسی کا سارا سماں واقف نے ایک ہی

سانس میں باندھ کر رکھا...... اور میرے وجود سے بے چینی اور بے مائگی کا ملمع آہستہ آہستہ اُترنے لگا۔ اُس کے عوض بے بسی اور بے چارگی کا خول چڑھنے لگا۔

مہاجنی نظام میں بظاہر سب اپنی اپنی جگہ مطمئن اور شاد ہیں۔ اور اس کی کامیابی کا سب سے بڑا سبب یہی ہے۔ حتیٰ کہ کالا ضعیف کتا بھی۔ جو روٹی کے ایک ٹکڑے کو اگلے پنجوں میں دبا کر بظاہر اطمینان سے کھا رہا تھا۔ لیکن نگاہوں میں خوف اور غیر اعتباری سی تھی۔ مزدور سامان باندھ کر اُٹھے۔ اور سڑک کی طرف آنے لگے۔ میں بھی اُن کے ساتھ ساتھ پل کے فٹ پاتھ سے واپس مُڑا۔

سگنل ہو گیا تھا۔ نیلے رنگ کی بتی کھمبے پر چمک رہی تھی۔ شاید گاڑی کنٹونمنٹ کے سٹیشن پر پہنچ گئی تھی۔

کتا بھٹی کے مالک کی طرح سڑک پر چہل قدمی کرنے لگا۔ اس نے بجلی کی روشنی میں سڑک کے وسط میں اپنے محسن کے کتنے ہی بلغمی تھوک چمکتے ہوئے دیکھے۔ لیکن وہ اُن کو چاٹنے یا سونگھنے کے لئے کودا نہیں پیٹ بھرا تھا...... شاید اسی لئے!

اور نانبائی نے حیرت سے اُس کی حرکت دیکھ کر اپنے آپ سے کہا۔ ''آج مست ہے سالا۔ کچھ نظر نہیں آتا...... ٹہل رہا ہے پاجی!''

آگے آگے کشمیری مزدور مسرت میں جھومتے جھومتے اور حیرت میں ریلوے سٹیشن کو دیکھتے دیکھتے سیالکوٹ کی سڑک پر جا رہا ہے تھے۔ اور اُن کے پیچھے پیچھے دن کا ''کام چور'' بے ترتیبی میں، بادل نخواستہ سٹیشن کی طرف جا رہا تھا۔

گاڑی پلیٹ فارم میں داخل ہوگئی۔

فسٹ کلاس ڈبے سے ایک ادھیڑ عمر کا آدمی لاٹھی ٹیکتا ہوا نکلا۔ محصول خانے کے افسر نے اسے سلام کیا۔ اور اس کے ساتھ ہی درجن بھر وادی پوش چپڑاسیوں نے سلیوٹ کیا۔

نئے افسر نے آہستہ سے مسکرا دیا۔ اور ادھر اُدھر دیکھ کر محصول خانے کے افسر سے کہا۔ ''کشمیر واقعی جنت ہے۔''

وہ پہلی مرتبہ پندرہ سو روپے ماہانہ پر ریاست میں آرہے تھے۔ وہ ریل کے راستے سے ''جنت کشمیر'' میں داخل ہو گئے۔ اور پیدل راستے سے درجن بھر کشمیری مزدور پیٹھ پر بوجھ اُٹھائے دوزخ سے نکل گئے۔

۳

دہلی میں نئی سڑک بن رہی تھی۔ اگلے مہینے حضور وائسرائے کو شملے سے آنا تھا۔

بیکانیر کے سینکڑوں مزدور، عورتیں، اور بچے ہر روز پتھر، ریت اور بجری سے بھری ہوئی گاڑیاں ریل کے ذریعے سے وہاں بھیج دیتے تھے۔ اور سیالکوٹ کی سڑک ہر شام سینکڑوں انسانوں کو وہاں کام کرنے کے لئے سفر کرتی ہوئی دیکھتی تھی۔

مہاجنی دور کا نظام ایسے ہی چلتا ہے۔ ایسے ہی چلتا رہیگا۔ یہاں بظاہر کوئی بھی غیر مطمئن نہیں۔ ناشاد نہیں۔ شاکی نہیں۔

............☆☆☆............

اگلے سال

(۱)

ابراہیم منشی بدرالدین کی عزت بلاوجہ نہ کرتا تھا۔ وہ جانتا تھا کہ منشی بدرالدین وہ شخص ہے۔ جو گزشتہ پندرہ برس سے اُس کا مستقل خریدار ہی نہیں بلکہ جانا پہچانا بیوپاری ہے۔ یوں تو منڈی میں حاجی بدرالدین کی ٹکر کے سینکڑوں بیوپاری تھے۔ لیکن سب کے دل کھوٹ سے بھرے ہوئے۔ وہ مال خریدنا تو جانتے تھے۔ لیکن دل خریدنا نہیں جانتے تھے۔ ایک سال کسی سے سودا کیا۔ دوسرے سال اُس سے آنکھیں پھیر کر کسی دوسرے کو پھسلایا۔ جہاں پیسے دو پیسے کے نفع کی امید ہو۔

لیکن حاجی بدرالدین میں یہ عیب نہ تھا۔ وہ ایک ہی نظر سے آدمی کی انتڑیاں گن لیتا تھا۔ اپنے کام میں پورا ماہر اور ہوشیار تھا۔ لیکن جہاں کسی کی خصلت میں آشتی، صُلح صفائی یا سادگی کی تھوڑی بہت تری دیکھتا تھا۔ وہیں کا ہو جاتا تھا۔ نہ مال پرکھتا نہ تول ناپ لیتا۔ صرف زبان پر اعتبار اور اکتفا کرتا تھا۔ شاید یہی وجہ تھی کہ اس کا ہر سودا منفعت بخش ہوتا تھا۔ ''وڈ'' لینے والا زمیندار بھی راضی اور خود ''وڈ'' دینے والا بھی ۔ اِسی سبب سے اُس کے زامیندار اُس پر جان چھڑکتے تھے جو کچھ اُن کے کھیتوں سے نکلتا تھا۔ سب اُس کے آگے رکھتے تھے۔ فصل پھولوں ہی میں ہوتی تھی۔ اور منشی بدرالدین اپنے کسانوں کے ہاں یا تو خود آنا جانا شروع کرتا تھا یا اپنے کارندے بھیجتا تھا۔

اُن سے قیمتیں طے ہوتی تھیں۔ سودے ہوتے تھے۔ شادی بیاہ کے موقعے پر بھی جب کسان ہر طرف سے نا امید ہوتے۔ تو اُن کی حاجت روائی بدرالدین کے سوا دوسرا نہ کرتا تھا۔ بعض اوقات ایسے موقعوں پر وہ اگلے برس کی فصلوں تک کا سودا کر لیتا تھا۔ حاجت مند زمیندار کو اُس وقت بدرالدین فرشتے سے کم نہ دکھائی دیتا تھا۔ اُس کے نزدیک شاید فرشتے کی یہ پہچان تھی۔ جو وقت پر حاجت روائی کرے۔ اور ہونے والی فصلوں کی ''وڈ'' خدا کے توکل پر دے آئے۔

ابراہیم کو وہ دن یاد تھا۔ جب بدرالدین دیسی لٹھے کا کرتہ اور سر پر پانچ آنے والی ٹوپی پہنے اُس کے پاس آیا۔ ابراہیم اپنی بیوی اور بچوں سمیت کھیت سے آلو نکال رہا تھا۔ بدرالدین کھیت کے کنارے پر کھڑا ہو گیا۔ اور حرص بھری نگاہوں سے آلوؤں کو دیکھنے لگا۔ اُس سال فصل بھی خدا کے فضل سے اچھی تھی۔ ابراہیم مسرت کی پینگوں میں جُھول رہا تھا۔ ایک نوجوان، سفید پوش کو کھیت کے کنارے کھڑا دیکھ کر اس کا دل بھر آیا۔ بیٹے سے بولا۔ ''سیر بھر آلو اسے بھی دے دو۔ جانے کس خانقاہ کا دربان ہے۔''

اُس کی بیوی نے ٹوک کر کہا۔ ''کیا ساری فصل اب ان درویشوں ہی کی نزر کر دو گے؟''

ابراہیم نے مسکرا کر کہا۔ ''سوالی ہمیشہ خدا کی طرف سے آتا ہے۔ اسے بھرے کھیت سے نا امید لوٹا دینا اچھا نہیں۔''

بیوی نے اپنے بیٹے کے ہاتھ سے آلوؤں کی ٹوکری لیتے ہوئے خاوند سے کہا۔ ''گھر بار تو نہیں لٹانا ہے۔ جن کے پاس دولت ہے۔ وہ کسی پر تھوکتے بھی نہیں۔ رہنے دو یہ فیاضیاں!''

ابراہیم نے گرج کر کہا۔ ''کیا کرتی ہو؟ اگر زمیندار ہی کی نظر پست اور

ظرف تنگ ہو۔ تو دنیا میں خیراتیں کون کرے؟ خدا دولت اس لئے نہیں دیتا کہ اس کے بندوں پر دروازہ بند کردیا جائے۔"

بدرالدین اب کھیت کے کنارے کھڑا میاں بیوی کی بحث سن رہا تھا۔ وہ ٹہلتے ٹہلتے اُن کے نزدیک آگیا۔ اور بولا۔ "تم نے مجھے بھی سوالی ہی سمجھ لیا۔ اس لئے کہ میرے بدن پر نفیس کپڑے نہیں۔"

ابراہیم نے مسکرا کر بے پروائی سے کہا۔ بابا فصل کاٹنے کے موقع پر جو بھی میرے کھیت میں آیا۔ سوالی ہی تھا۔ شہنشاہ نہ تھا۔ تم ناراض کیوں ہوگئے۔ یہ قسمت کا کھیل ہے۔"

بدرالدین کی آنکھیں چمک اُٹھیں۔ اس نے کہا۔ "دراصل کسان بے وقوف ہوتا ہے........."

ابراہیم نے دوبارہ مسکرا کر کہا۔ "سچ ہے بے وقوف نہ ہوتا۔ تو شہر میں بڑی بڑی توندیں نکالے بیوپاری نہ ہوتے۔ یہ ہم لوگ ہی بے وقوف ہیں۔ جو اپنی بستی اُجاڑ کر اوروں کی بستیاں آباد کرتے ہیں۔ سچ ہے بابا۔ کسان دراصل بے وقوف ہوتا ہے"۔

بدرالدین نے کہا۔ "تم لوگوں کو آدمی پہچاننے کا شعور نہیں۔ کسی کے بدن پر موٹا لباس دیکھا۔ جھٹ اس کی آبرو سے کھیلنے لگے۔"

ابراہیم نے درانتی کو ہاتھ میں اُٹھاتے ہوئے کہا۔ "تم میرے والد جنتی کی طرح بڑے تیز مزاج معلوم ہوتے ہو۔ سچی بات کہہ دی۔ اور تم آپے سے باہر ہونے لگے۔"

بدرالدین نے کہا۔ "خدا خیر کرے۔ بہت اترائے ہوئے معلوم ہوتے ہو۔ آنکھوں پر اس قدر مستی چھائی ہوئی ہے کہ بیوپاری اور سوالی میں فرق ہی نہیں کر

سکتے۔"

ابراہیم نے قہقہہ لگا کر پوچھا۔"تم بھی بیوپاری ہو؟"

بدرالدین نے کہا۔"بیوپاری کے سر پر سینگ ہوتے ہیں کیا؟"

ابراہیم اپنا کام لئے جارہا تھا۔ بے پروائی سے بولا۔"سینگ نہیں ہوتے۔ اُس کے پاس روپوں کی تھیلیاں ہوتی ہیں۔ وہ خود نہیں بولتا۔ تھیلیاں بولتی ہیں۔"

بدرالدین ہونٹ چبانے لگا۔ ابراہیم نے اُس پر ایسی چوٹ کی تھی۔ جس کا اُس کے پاس جواب نہ تھا۔

تھوڑی دیر کے بعد ایک آلو اُلٹ پلٹ کر دیکھنے کے بعد بدرالدین نے پوچھا۔"سودا کرو گے؟" ابراہیم نے حیران ہو کر پوچھا۔"کیا بھاؤ لو گے؟"

اب تک ابراہیم کو یقین تھا۔ کہ بدرالدین مذاق کر رہا ہے۔ اسی لئے اس نے اینٹ کا جواب پتھر سے دیا۔

بدرالدین نے پوچھا۔"کتنے آلو نکلیں گے تمہارے کھیت سے؟"

ابراہیم کو اب پورا یقین ہو گیا۔ کہ بدرالدین مخول کر رہا ہے۔

اس نے دوبارہ طنزاً کہا۔"کھیت تمہارے سامنے ہیں۔ اور یہ سوال تم بیوپاری ہو کر مجھ سے پوچھ رہے ہو؟"

بدرالدین نے سرسری نگاہوں سے کھیت کا جائزہ لیا۔ اور کہا"یہ سب کھیت تمہارے ہی ہیں۔"

ابراہیم نے کہا۔"شکر ہے مالک کا!"

بدرالدین نے کہا۔"سو من سے زیادہ نہ نکلیں گے۔ جی چاہئے تو ابھی سودا کرلو۔"

ابراہیم نے مسکرا کر کہا۔"بڑے بیوپاری نکلے۔ تم ایسے دو چار بیوپاری اور

ہوں۔تو کسانوں کا خدا ہی حافظ ہے۔''

بدرالدین نے سر کھجلاتے ہوئے کہا۔''خیر جتنے بھی نکلیں۔تین روپے من کے حساب سے لوں گا۔کہو منظور ہے؟'' وہ کھیتوں میں جاتا۔اور اپنی نگرانی میں آلو نکلواتا۔

وہ کسان جو اس کے ساتھ سودے کرتے تھے۔جہاں تھے وہی رہے۔لیکن بدرالدین چند سالوں ہی میں منشی بدرالدین بن گیا۔پھر حاجی بدرالدین۔پھر سیٹھ بدر الدین۔نکڑ کی دکان اور سے اور ہوگئی۔ایک طرف ایرانی قالین بچھا تھا۔اس پر ایک گاؤ تکیہ رکھا گیا۔جس کا غلاف سبز مخمل کا تھا۔کچھ کارندے رکھ لئے گئے۔دن بھر حاجی بدرالدین اپنی دکان پر بیٹھتے لاریاں سامنے کھڑی ہو جاتیں۔وہ اپنی نگرانی میں آلو بھرواتے۔

کبھی کبھی کسان دُکان پر آتے۔تو پاؤں صاف کر کے دور کونے میں بیٹھ جاتے۔جب حاجی صاحب کو موقعہ ملتا۔ان سے بھی دو چار باتیں کر لیتے۔اب نہ وہ دیسی لٹھے کا کرتہ تھا۔اور نہ پانچ آنے والی ٹوپی۔ان کی جگہ ریشمی پیرہن چھپیس نمبر کی ململ اور دوشالے نے لے لی تھی۔

ابراہیم کبھی کبھار دکان پر آتا۔تو حیران رہ جاتا۔اپنی اُس غلطی پر جو اس نے پہلے دن بدرالدین کو دیکھ کر کی تھی۔اکثر نادم ہوتا۔اس کے دل میں صرف ایک ہی مسرت تھی۔کہ بدرالدین انسان نہیں فرشتہ ہے اور وہ خود کس قدر خوش نصیب جس کا کاروبار ایسے نیک خصلت انسان سے ہو۔

(۳)

پندرہ برس بیت چکے تھے۔آلوؤں کی قیمت اس سال خلاف توقع بڑھ گئی تھی۔بدرالدین کا کارندہ سودا کرنے کے لئے ابراہیم کے ہاں آگیا۔چائے وغیرہ پلا

کر ابراہیم نے مسکرا کر کہا۔ ''اس سال آپ کو ''وڈ'' میں اضافہ پڑے گا۔ منشی جی!''

کارندے نے بے پروائی سے پوچھا۔ ''کیوں بھلا؟''

ابراہیم نے اسی طرح مسکراتے ہوئے کہا۔ ''آپ نہیں جانتے؟ کتنے بھولے بنتے ہیں۔''

کارندے نے پوچھا۔ ''پھر بھی۔''

ابراہیم نے کہا۔ ''آلوؤں کی قیمت جو بڑھ گئی ہے۔''

کارندہ زور سے ہنسا اور کہا۔ ''خوب! جب قیمت گھٹ گئی تھی۔ اس وقت بھی کچھ کہا تھا۔؟''

ابراہیم نے چلم پر آگ رکھتے ہوئے کہا۔ ''خدا کی قسم آج تک ایسا سودا ہمارے ساتھ نہیں ہوا۔ جس میں نرخ بازار سے آپ نے ہمیں زیادہ دیا ہو۔''

کارندے نے پوچھا۔ ''پھر سودا نہ کرو گے؟''

ابراہیم نے جلد جلد کہا۔ ''ان شاء اللہ کروں گا۔ لیکن ظلم نہ ہو۔ حاجی صاحب میرا پندرہ برس کا جانا پہچانا بیوپاری ہے۔''

کارندے نے پوچھا۔ ''کس بھاؤ پر دو گے اس سال؟''

ابراہیم نے کہا۔ ''حضرت اس سال آلو سولہ روپے خروار بکتے ہیں۔ آگے آپ مالک ہیں۔ جو چاہیں دے دیں۔''

کارندے نے کہا۔ ''معلوم ہوتا ہے۔ منڈی کی ہوا لگ گئی ہے۔ جبھی قیمتیں یاد رکھی ہیں۔''

ابراہیم نے کہا۔ ''خدا کی قسم! یہ بات نہیں۔''

کارندہ سنجیدگی سے مسکرایا اور کہا۔ ''بے وقوف! حاجی صاحب جیسا بیوپاری خواب میں بھی نہ ملے گا۔ جو فصل بونے سے پیشتر ہی تمہاری باتوں پر اعتبار کرتے

ہیں۔اور تھیلیاں تمہارے حوالے کرتے ہیں۔پھر بھی تم احسان فراموش بنتے ہو۔''

ابراہیم نے کہا۔''لاحول ولاقوۃ! ہم اُن کا نمک پندرہ سال سے کھا رہے ہیں۔کس منہ سے اُن کی ناشکر گزاری کریں''۔

کارندے نے پچاس روپے کے نوٹ اُس کے سامنے رکھے۔اور کہا۔یہ ہونے والی فصل پر پیشگی ہے۔ہوسکا تو میں بھی حاجی صاحب سے اس سال قیمتوں میں دو چار آنوں کا اضافہ کرنے کے لئے کہونگا۔لیکن اس پر زیادہ بھروسہ نہ رکھنا۔سمجھے !''

ابراہیم نے حیرت بھری نگاہوں سے سامنے پڑے ہوئے نوٹوں کو دیکھا۔ اور پھر پوچھا۔''آپ نے کیا بھاؤ مقرر کیا منشی جی؟''

کارندے نے مسکرا کر کہا۔''آج نئے بھاؤ مقرر کرنے ہیں نادان جو بھاؤ پچھلے سال تھے۔وہی ملیں گے۔ہاں حاجی صاحب کچھ اضافہ کریں تو الگ بات ہے۔''

ابراہیم نے بے دلی سے کہا۔''نہیں منشی صاحب! یہ ظلم ہے۔میں چھ رروپے میں خروار نہیں دے سکتا۔اتنا خسارہ برداشت کرنے کی مجھ میں نہ طاقت ہے نہ توفیق۔''

لیکن کارندے نے کچھ نہ مانا۔اس نے نوٹ وہیں رکھے۔اور چلا گیا۔

(۴)

رات کو ابراہیم سو نہ سکا۔سوچتا رہا۔''کتنا ظلم ہے۔بازار میں آلو سولہ روپے کے حساب سے بکتے ہیں۔اور مجھے چھ روپے کے حساب سے دینے ضروری ہیں۔ صرف اس لئے کہ بیوپاری نے مجھے فصل بونے سے پیشتر قیمت ادا کی۔اس طرح سے وہ مجھے اپنی محنت کا اندازہ ہی لگانے نہیں دیتا۔آخر اتنی محنت جو کرتا ہوں۔کس لئے؟

اس لئے کہ اپنے خون سے بیوپاری کا پیٹ بھروں۔ اور خود سوکھ کر کانٹا ہو جاؤں پندرہ سال پہلے کرتہ پہننے والا بدرالدین آج حاجی بن کر میرے ساتھ سودا کرنے کے لئے اپنے کارندے بھیجتا ہے۔ اور میں جہاں تھا۔ وہیں ہوں۔ نہ محمد ابراہیم بنا۔ نہ ابراہیم خان! نہ بدن سے میلا کرتہ گیا۔ اور نہ کبھی نئی ٹوپی خریدنے کی توفیق ہوئی۔ اس نے میری محنت سے لاکھوں روپے بنائے صرف اسلئے کہ اپنی محنت کی قیمت دنیا سے طلب کرنے کا مجھے شعور نہیں۔ اور بیوپاری میری نا اہلیت سے فائدہ اُٹھا کر اپنے لئے دونوں دنیا حسین بنا رہا ہے۔ صبح وہ اُٹھا۔ بیوی سے بولا۔ ''کل والے روپے کہاں ہیں؟'' بیوی نے پوچھا۔ ''کیا کرو گے؟''

ابراہیم نے کہا۔ ''میں بدرالدین سے سودا نہ کروں گا۔''

بیوی نے حیران ہو کر پوچھا۔ ''کیوں؟''

ابراہیم نے دانت پیستے ہوئے کہا۔ ''وہ قصائی ہے۔ مردار خور ہے۔ اس کی سانس سے نعش کی بو آ رہی ہے۔''

بیوی خاوند کا غصہ دیکھ کر ششدر رہ گئی۔ بولی۔ ''تم کو ہوش بھی ہے کہ نہیں۔''

ابراہیم نے مصنوعی ہنسی ہنس کر کہا۔ ''جب ہوش میں آؤں گا۔ پھر تم ہی کیا ساری دنیا مجھے دیوانہ کہے گی! لا روپے!''

بیوی نے چھاتی پیٹتے ہوئے کہا۔ ''تم کو کیا ہو گیا۔ کیسی بہکی بہکی باتیں کرتے ہو۔''

ابراہیم غصے سے کانپ رہا تھا۔ اُس نے گرج کر کہا۔ ''میں محنت کروں گا۔ اور دنیا مجھے اس کی واجب قیمت ادا نہ کرے گی۔ تو اس کی چھاتی پر مونگ دلوں گا۔ پسلیوں میں بھالے چھبو دوں گا۔ سمجھی! لا روپے!''

بیوی نے آہستہ سے کہا۔ ''اُس جیسا بیو پاری نہ ملے گا۔ نہ لوٹاؤ روپے پچھتاؤ گے۔ آخر اُس کا کیا قصور ہے۔ اپنی تقدیر کو نہیں روتے۔ جس نے اُبھرنے نہ دیا۔''

ابراہیم کے سینے پر جیسے کسی نے ہتھوڑا مارا۔ گرج کر کہا۔ ''تقدیر! اُس نے مجھے چند چمکتے ہوئے سکے دیئے اور مبہوت کر دیا۔ مجھے کبھی بھی اُبھرنے نہ دیا۔ پھر بھی وہ بیوپاری ہے فرشتہ ہے۔ اور میں شیطان۔ جو اپنی محنت کے دام مانگ رہا ہے۔ جو خیرات نہیں مانگتا۔ قیمت طلب کرتا رہے۔''

بیوی نے اُس کا مصمم ارادہ دیکھ کر مٹی کی ہانڈی سے نوٹ نکالے۔ اور اس کے سامنے رکھ دیئے۔ ابراہیم نے نوٹ جیب میں ڈالے اور جاتے جاتے کہا۔ ''ہمیں بھی بدرالدین کی طرح آلو بیچنے کا ڈھنگ آتا۔ تو ہمارے گھر پر بھی ہن برستا ہم بھی حج کر آتے۔ انسان کہلاتے بھائیں بھائیں کھلانے والی یہ ناداری یہاں ڈیرا ڈالے نہ رہتی۔ خون پسینہ ہم بہائیں اور ہاتھ رنگے وہ قصائی۔ اور پھر واجب دام طلب کرنے پر نخرے کرے۔''

(۵)

حاجی بدرالدین دکان پر تکیئے کے سہارے قالین پر بیٹھے تھے۔ اُن کے سامنے دکان کارندے گذشتہ سال کا حساب کر رہے تھے۔ صرف آلوؤں کی تجارت میں انہیں ساڑھے گیارہ ہزار روپے کا منافع رہا تھا۔

اُسی وقت ابراہیم آ گیا۔ رتبے کے مطابق ایک کونے میں بیٹھ گیا۔

حاجی بدرالدین نے پچوان کش لگاتے ہوئے کہا۔ ''ساڑھے گیاہزار روپے کا منافع کوئی بڑا منافع نہیں۔ مجھے پندرہ ہزار سے زیادہ کی توقع تھی۔''

کارندے ایک دوسرے کو حیرت بھری نظروں سے دیکھنے لگے۔ جیسے یہ سارا

منافع انہیں میں بانٹنے کے لئے تھا۔

تھوڑی دیر کے بعد بدرالدین نے ابراہیم سے پوچھا۔ ''آج کیسے ہوا؟'' سنا ہے تم نرخوں کے اضافہ پر بہت زور دے رہے ہو؟''

ابراہیم نے سر جھکا کر کہا۔ ''سچ ہے حضرت! اس سال میر پیٹ بہت بڑا ہو گیا۔''

بدرالدین نے مسکرا کر طنزاً کہا۔ ''تو علاج کراؤ اس کا! آج کل ڈاکٹر عام ہو گئے ہیں۔''

ابراہیم نے زہر خندہ کیا اور اپنا غصہ آپ پی کر بولا۔ ''جب آپ ایسے بزرگ ہم غریبوں کا یہی چاہیں۔ تو ہمارے حق میں دعا کون کرے۔''

بدرالدین نے قہقہہ لگا کر دوسرا کش لگایا۔ اور پھر ایک کارندے سے بولا۔ '' بڑے حضرت ہے۔ جب تک ہم سے پورے دام نہیں لیتا پیچھا نہیں چھوڑتا۔''

ابراہیم نے آہستہ سے کہا۔ ''جبھی آج بھی آیا ہوں کہ پیٹ بھر کر روٹی کھانے کی اُمید تو ہو جائے۔''

بدرالدین نے آہستہ سے اور سنجیدگی اختیار کر کے کہا۔ ''ابراہیم اس سال قیمت میں اضافہ نہ ہوگا۔ خدا نے چاہا۔ اگلے سال اس پر سوچیں گے۔''

ابراہیم کے پاؤں تلے زمین نکل گئی۔

تھوڑی دیر بعد اس نے پچاس روپے کے نوٹ نکالے۔ اور بدرالدین کے سامنے رکھے۔ اور خود اُٹھتے ہوئے کہا۔ ''اس سال سودا بھی نہ ہوگا حضرت! خدا نے چاہا اگلے سال کریں گے۔''

حاجی بدرالدین اور ان کے کارندے اسے حیرت بھری نظروں سے دیکھتے رہے۔ اور وہ چلا گیا۔

............☆☆☆............

میرا حق

(۱)

جس دن شنکر داس لاہور سے پریس لے آئے۔ عبدُل بازار میں مزدوری کی تلاش میں کھڑا تھا۔ ہمسائگی میں رہنے کی وجہ سے اُسے معلوم ہو گیا تھا کہ شنکر داس کوئی کارخانہ کھولنے والا ہے لیکن اسے یہ وہم و گمان تک نہ تھا کہ شنکر داس اس کی مردم شناس نظر اُسے ہی کارخانہ کے اہتمام کے لئے منتخب کرے گی۔ چنانچہ جب پہلی بار شنکر داس نے اُس سے کہا۔ ''مزدُوری کرو گے''؟ تو عُبدل ششدر رہ گیا تھا، وہ گھاٹ سے لکڑیاں، پتھر اور دھان جیسی چیزیں ڈھونے کا عادی تھا۔ اُس نے جواب میں کہا۔ ''زمستان کے لئے سامان لے آئے کیا؟''

شنکر داس نے ہنس کر کہا۔ ''بے وقوف! سامان نہیں پریس لے آیا ہوں۔''

عبدل نے اُس وقت تک پریس کا نام نہ سنا تھا۔ اُس نے حیرانی سے پوچھا ۔''پریس۔ پرس کیا؟''

شنکر داس نے کہا۔ ''ارے چھاپہ خانہ۔ نہیں جانتے کیا۔؟''

عبدُل نے یونہی کہہ دیا۔ ''سمجھ گیا۔ لیکن کام کیا ہوگا؟''

شنکر داس نے اطمینان دلاتے ہوئے کہا۔ ''میں سب کچھ سمجھا دونگا۔ دنوں میں ماہر بنا دوں گا۔ پورا انجینئر!''

عبدل زیرِ لب مُسکرایا۔ اور تھوڑی دیر بعد سوچ کر پوچھا۔ "مزدوری کیا ملے گی؟"

شنکر داس اُس کی خاموشی تاڑ گیا تھا۔ سنجیدگی سے بولا۔ "وہ تم مجھ پر چھوڑ و۔ خدا نے چاہا۔ تو راحت ہی پاؤ گے۔ نہ دن بھر کی در بدری ہوگی۔ نہ پُل پر نیندیں ہی کرو گے۔ کہو منظور ہے؟"

عبدل نے کہا۔ "آپ پرائے تو نہیں۔ گھر کا سارا حال آپ کے سامنے ہے۔ ذرا ذرا سے بچے ہیں۔ ایسا نہ ہو کہ دھوبی کا کتا بن جاؤں۔"

شنکر داس نے اُس کے شانے پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا۔ "پرایا ہوتا۔ تو کیا مجھے مزدور ہی نہ ملتے۔ تمہاری تنگدستی دیکھ کر میں نے سوچا۔ کیوں نہ تمہیں ہی کام پر لگا دوں۔ حق ہمسائیگی بھی ادا ہوگا۔ اور تم بھی پریشانیوں سے نجات پاؤ گے۔"

عبدل نے کاندھے پر لٹکتے ہوئے لمبے سے تھیلے کو ٹھیک کرتے ہوئے کہا۔ "تو گھر والی سے نہ پوچھوں؟"

شنکر داس نے کہا۔ "پوچھ لو۔ لیکن ضرورت ہی کیا ہے۔ اسے بچوں کے لئے روٹی چاہئے۔ وہ تم مزے سے پیدا کرو گے"۔

عبدُل کو شنکر داس کی بات صحیح معلوم ہوئی۔ اُس نے کہا۔ "چلئے۔ آج سے میں آپ کا ہو گیا۔"

(۲)

شنکر داس تجربہ کار آدمی تھا۔ اسے عبدل کی دیانت داری پر پورا بھروسہ تھا۔ جبھی اس نے عبدل کو منتخب کیا۔ یہ صحیح تھا کہ عبدل مزدوری زیادہ مانگتا تھا۔ لیکن اُس کے دل میں کھوٹ نہ تھا۔ محلے کی بہو بیٹیاں اپنا ضروری سامان اُسی کے ذریعے سے منگا لیتی تھیں۔ کیا مجال جو اُس نے کسی کا پیسہ مارا ہو۔ یا اُن کی بات کسی پر ظاہر کی ہو۔

وہ سب کو اپنی بیٹیوں کی طرح دیکھتا تھا۔ اگرچہ افلاس میں یہ چیزیں عنقا ہوتی ہیں۔ لیکن عبدل نے ابتدا ہی میں اپنے من کو مار لیا تھا۔ وہ اپنے زور بازو سے حلال کی روزی کماتا تھا۔ اور اپنے کنبے میں سکون کی زندگی بسر کرتا تھا۔

شنکر داس نے اُسے پریس کا کام دنوں میں سکھا دیا۔ مشین کو چلانا پتھر کو گرم کرنا۔ کاپی جمانا۔ مشین کے باریک پرزوں کی صفائی کرنا اس کے بائیں ہاتھ کا کام بن گیا۔ کارخانے میں جتنے مزدور کام کرتے تھے۔ سب اُس کی نہ صرف عزت ہی کرتے۔ بلکہ انہیں اسکا خوف بھی تھا۔ کوئی مزدور کام پر دیر سے آتا۔ تو عبدل اس کی وہ فضیحتی کرتا کہ بے چارا پانی پانی ہو جاتا۔

شنکر داس پریس کے ساتھ والے کمرے میں بیٹھے رہتے۔ خریدار اُن کے پاس کام لے کر آجاتے۔ شنکر داس اُن سے اُجرت طے کرتے اور دن میں کسی وقت کارخانے میں بھی چلے آتے۔ عبدل کو کام میں مصروف دیکھ کر وہ دل ہی دل میں جھوم اُٹھتے۔

شام کو کارخانے میں چھٹی ہوتی۔ مزدور ایک دوسرے کے ساتھ ٹھٹھا مخول کرتے ہوئے چلے جاتے۔ تب عبدل کپڑے بدل کر شنکر داس کے پاس چلا جاتا۔ اور کہتا۔ ''آپ ابھی تک کام کر رہے ہیں؟ کارخانہ تو بند ہو گیا۔''

شنکر داس مسکرا کر جواب دیتے۔ ''کیا بجا ہوگا؟''

عبدل دور صحن کی طرف اشارہ کر کے کہتا۔ ''دھوپ تو وہاں نکل گئی۔ سات یا ساڑھے سات بجے ہوں گے۔''

شنکر داس صندوق میں کاغذات بند کر کے اُٹھتے۔ اور عبدل کے ساتھ باتیں کرتے کرتے پھاٹک سے باہر چلے جاتے۔ عبدل کارخانے کے برآمدے میں چٹائی بچھاتا۔ حقے میں تازہ پانی ڈالتا۔ اور اندھیرا چھا جانے تک وہیں بیٹھ کر تمبا کو پیتا۔ اُس

وقت اسے اپنا آپ مزدور کی حیثیت میں نہیں بلکہ مالک کی حیثیت میں دکھائی دیتا۔ پریس کی کوئی چیز باہر پڑی پاتا۔ تو جھٹ سے اُٹھا کر حفاظت کے ساتھ رکھتا۔ رات کا کھانا اسے گھر ہی سے پہنچ جاتا۔ کبھی کبھار جی چاہتا۔ تو بچوں کو دیکھنے کے لئے گھر چلا جاتا۔ ورنہ رات اور دن کارخانے ہی میں رہتا۔ دن کو مزدوری کرتا اور رات پہرے داری۔

(۳)

پریس کے سامنے تھوڑی سی زمین تھی۔ لیکن ناہموار اور گھاس پھوس سے بھری ہوئی۔ یہ زمین شنکر داس کی اپنی تھی۔ زمین کے اردگرد کھائی تھی۔ جس میں بارش کا پانی جمع رہتا تھا۔ ایک دن جب کارخانہ بند ہو گیا۔ عبدل احاطے میں ٹہل رہا تھا۔ آسمان پر چودھویں کا چاند تھا۔ نکھری ہوئی چاندنی میں بے ترتیبی سے اُگی ہوئی گھاس اور ناہموار زمین اُسے اچھی نہ دکھائی دی۔ اُس نے من میں سوچا اگر یہاں پھولوں کی کیاریاں لگیں اور کنارے کنارے میوہ دار درخت۔ تو احاطہ کتنا خوبصورت دکھائی دے گا۔ خریداروں پر کام کی صفائی ہی کا صرف اثر نہیں پڑتا۔ بلکہ وہ شاندار مکان، خوبصورت باغ اور سجا دھجا سامان دیکھ کر بھی مرعوب ہوتے ہیں۔

اُس نے اُسی وقت کپڑے اُتارے۔ گرمیوں کے دن تھے۔ چاندنی تھی وہ چکور کی طرح مست ہو کر احاطہ صاف کرنے لگا۔ اُس نے اونچی اونچی جگہیں ہموار کیں۔ گھاس پھوس کو ایک جگہ جمع کیا اور اُس میں آگ لگا دی۔ صبح تک سارا احاطہ صاف ہو گیا۔ اُس وقت اُسے اپنا جسم ٹوٹا ٹوٹا سا محسوس ہوا۔ لیکن روح اطمینان اور مسرت سے لبریز۔

دوسرے دن مزدوروں نے احاطہ دیکھا۔ تو سب حیران رہ گئے۔ انہوں نے ایک دوسرے سے کہا۔ ”یہ چاچا عبدل کے سوا اور کسی کا کام نہیں۔ احاطہ کیا ہے۔

گلزار بنا دیا ہے۔'' اور جب شنکر داس بھی آ گئے۔ انہیں اپنی آنکھوں پر اعتبار نہ آیا۔ جو احاطہ انہوں نے شام کو دیکھا تھا۔ وہ یہ نہ تھا۔ جس میں وہ اس وقت کھڑے تھے۔ انہوں نے کارخانے کی طرف دیکھا۔ عبدل برآمدے میں کھڑا مسکرا رہا تھا۔

شنکر داس آہستہ آہستہ احاطے کو دیکھتے ہوئے اُس کی طرف بڑھے اور برآمدے کے پاس پہنچ کر بولے۔ ''عبدل! احاطہ کس نے صاف کیا ہے؟''

عبدل نے ہنس کر کہا۔ ''آپ کے غلام نے''۔

شنکر داس نے تعجب سے پوچھا۔ ''کب؟''

عبدل نے کہا۔ ''رات کو چاندنی میں!''

شنکر داس فرط عقیدت سے اُس کے قریب گئے۔ اُس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر بولے۔ ''تم اتنا کام کیوں کرتے ہو عبدل؟ کیا تم مجھے احسان سے اس قدر دبا رکھو گے کہ دوسری دنیا میں بھی نہ اُتار سکوں۔''

عبدل نے مسکرا کر کہا۔ ''احسان کیسا!؟ آخر آپ کا نمک کھاتا ہوں۔ آپ کے لئے جان نہ توڑوں۔ تو کس کے لئے توڑوں۔''

شنکر داس نے اسی طرح کہا۔ ''مزدور لگا لیا ہوتا!''

عبدل نے سنجیدگی سے کہا۔ ''جب تک میرے بازوؤں میں طاقت ہے۔ مجھے مزدور کی کیا ضرورت ہے۔ اور تو اور میں کہاں کا راجا ہوں۔ جو محنت کرنے میں شرم محسوس کروں۔''

شنکر داس نے کہا۔ ''لیکن احاطے کو صاف کرنے کی ضرورت ہی کیا تھی۔ اگر ہوتی تھی تو میں نہ کرا سکتا تھا؟

عبدل نے احاطے کے چاروں طرف نظر دوڑا کر کہا۔ ''اس کی بڑی ضرورت تھی صاحب! ابھی تو یہاں کیاریاں بنیں گی۔ پھول اُگیں گے۔ سبزہ

اُگیگا۔ میوہ دار درخت لگیں گے۔ اُس وقت اندر کارخانے کی بہار ہوگی۔ اور باہر احاطے میں قدرت کی بہار۔''

شنکر داس چپ چاپ اپنے کمرے میں چلے گئے۔ سوچنے لگے۔ ''عبدل آدمی نہیں فرشتہ ہے۔ جانے پچھلے جنم میں میرا کون تھا۔ جو اس جنم میں جان توڑ کر میرے لئے محنت کرتا ہے۔''

دوسری طرف عبدل بھی شاد تھا۔ جب سے اُس نے گھاٹ کی مزدوری چھوڑی تھی۔ اُس کے گھر پر ہن برس رہا تھا۔ ننھے ننھے بچے جو اُن دنوں نابالغ تھے۔ اب پیٹ بھر کر دونوں وقت روٹی کھاتے تھے اب ان کے بدن پر پیرہن بھی تھا۔ اور سر پر ٹوپی بھی۔ یہی اُن کے والدین کے نزدیک سب سے بڑی خوشی اور اطمینان کی بات تھی۔

(۴)

پریس میں کام کرتے کرتے عبدل کو پندرہ برس بیت چکے تھے۔ اب اس میں وہ طاقت نہ تھی۔ جو پریس قائم ہونے کے وقت تھی۔ اس کی تمام قوت پریس کی انہیں کلوں نے کھائی تھی۔ وہ اب انہماک اور مستعدی سے کام نہ کرسکتا تھا۔ صرف یا تو دن بھر آمدے میں پڑا رہتا۔ یا احاطے میں جہاں اس نے باغیچہ لگایا تھا۔ اگرچہ اس کی طاقت زائل ہوچکی تھی۔ لیکن شنکر داس کے لئے عقیدت اور ان کے پریس کی محبت اس کے دل میں بدرجہ اتم موجود تھی۔ زمانہ کے ساتھ ساتھ شنکر داس بھی بوڑھے ہوگئے تھے۔ انہوں نے ضعیفی کے سبب پریس میں آنا جانا چھوڑ دیا تھا۔ اور سارا کام اپنے بیٹے کے سپرد کر دیا تھا۔ اور وہ بھی اس وقت جب انہوں نے عبدل کے دو بیٹوں کو پریس میں نوکر رکھا۔ عبدل اس دن سے شنکر داس کا زیادہ احسان مند ہوگیا تھا۔ وہ اپنے خون کا قطرہ تک پریس ہی میں بہانا چاہتا تھا۔ جب کبھی پریس کا کوئی پرزہ خراب ہوجاتا۔

وہ جھٹ سے اسے ٹھیک کر دیتا۔ کوئی مزدور چھپائی کے کام میں نقص پیدا کرتا۔ تو وہ اس کی کھال کھینچتا۔ لیکن گوپی ناتھ پر ان باتوں کا کوئی اثر نہ ہوتا تھا۔ وہ نئی وضع کا جوان تھا۔ باپ کے قائم کئے ہوئے کارخانے کی وجہ سے اسے آج کل کے نوجوانوں کی طرح نوکری کے لئے پریشان نہ ہونا پڑا تھا۔ یہی اُس کی مستی کا سبب تھا۔

شنکر داس کارخانے میں ایک پیسہ بھی فضول خرچ نہ کرتے تھے۔ لیکن گوپی ناتھ اس کے برعکس آٹھ آنے کے سگریٹ ہی دن میں پی جاتا تھا۔ اس عادت کو روکنے کے لئے عبدل نے ایک بار اُس سے کہا بھی۔ لیکن گوپی ناتھ نے آگ بگولا ہو کر جواب دیا۔ ''تم کو میرے اخراجات سے کیا غرض! اپنی مزدوری کرو۔ میں وعظ نہیں سننا چاہتا۔'' عبدل خاموش ہو گیا۔ باپ بیٹے کی طبیعت اور طرز معاشرت میں اسے زمین اور آسمان کا فرق دکھائی دیا۔ اُس دن سے عبدل نے اُسے کبھی کچھ نہ کہا۔ جس کا تعلق گوپی ناتھ کے ذاتی اخراجات سے تھا۔ باقی مزدور بھی گوپی ناتھ سے کھچے کھچے ہی رہتے۔ اگرچہ اُس نے اُنہیں تنگ نہیں کیا تھا لیکن جو عقیدت اُن کے دل میں شنکر داس کے لئے تھی۔ اُس کا عشر عشیر بھی گوپی ناتھ کے لئے نہ تھا۔ اُنہیں محسوس ہو رہا تھا۔ جیسے وہ قیدیوں کی طرح مشقت کرنے پر مجبور تھے۔

ایک دن گوپی ناتھ کا چھوٹا لڑکا باغیچے میں کھیل رہا تھا۔ گوپی ناتھ دفتر کے کمرے میں بیٹھا کام میں مصروف تھا۔ عبدل برآمدے میں بیٹھا حقہ پی رہا تھا۔ معاً اُس نے دیکھا۔ بچے کے ہاتھ میں پھولوں کے وہ چند پودے ہیں۔ جو اُس نے ایک مہینہ پہلے بڑی مشکل سے حاصل کر کے وہاں لگائے تھے۔ اُس سے نہ رہا گیا۔ برآمدے سے نیچے اُترا اور باغیچے میں آیا۔ اُکھڑے ہوئے پودوں کو دیکھ کر اُس کا کلیجہ کٹ گیا۔ اُس نے بے اختیار گرج کر پوچھا۔ ''یہ کیا کیا تم نے؟''

بچہ عبدل کا غصہ دیکھ کر سہم گیا۔ اور دونوں ہاتھوں سے اپنی آنکھیں چھپا کر

زور سے رونے لگا۔ رونے کی آواز سن کر گوپی ناتھ برآمدے میں آ گیا۔ باغیچے میں بچے کو روتا دیکھ کر اس طرف گیا۔ عبدل سے پوچھا۔ ''کیا بات ہے؟''

عبدل کے چہرے پر اگرچہ غصے کی سرخی تھی۔ لیکن بچے کے رونے پر وہ نادم ہو گیا تھا۔ اُس نے سبزے پر بکھرے ہوئے پودوں کو جمع کرتے ہوئے کہا۔ ''پودے اکھاڑنے پر منع کیا تھا۔ رو پڑا......''

گوپی ناتھ کی آنکھوں میں خون اُتر آیا۔ بولا۔ ''تم آدمی ہو یا بندر۔ یہ تمہارے باپ کا باغیچہ ہے۔ جو طیش آ گیا۔''

عبدل کو جیسے کسی نے گولی مار دی۔ اُس نے حیران ہو کر گوپی ناتھ کی طرف دیکھا۔ جو غصے سے لال پیلا ہو رہا تھا۔

عبدل نے اپنے دل کو مضبوط کر کے کہا۔ ''یہ باغیچہ میں نے ہی لگایا ہے۔ جبھی میرے ہی دل میں خلش ہوتی ہے۔''

گوپی ناتھ کو گمان نہ تھا۔ عبدل اس دیدہ دلیری سے زبان ہلا سکے گا۔ اس کا پارہ چڑھ گیا۔ اُس نے عبدل کے منہ پر تھپڑ مار کر کہا۔ ''نکل میرے کارخانے سے! بے حیا! یہ جادو میرے سامنے نہ چل سکے گا۔''

عبدل کے پاؤں تلے کی زمین نکل گئی۔ لیکن جلد ہی اپنے آپ پر قابو پا کر اُس نے زہر خندہ کر کے کہا۔ ''مر نہ جاؤں گا جو خدا یہاں روزی دیتا تھا۔ وہ باہر بھی دے گا۔''

گوپی ناتھ نے بچے کو سنبھالتے ہوئے کہا۔ ''جا پھر وہی روزی کما۔ آج سے میرے کارخانے میں قدم رکھا۔ تو ٹانگیں توڑ دوں گا۔''

عبدل نے بے پروائی سے پوچھا۔ ''تو جاؤں؟''

اُسے یقین تھا۔ گوپی ناتھ اسے جانے نہ دیگا۔ لیکن جب گوپی ناتھ نے

دانت پیس کر کہا۔ ''ابھی چلے جاؤں۔ ابھی اس پھاٹک سے باہر ہو جاؤ۔'' تو عبدل کی آنکھوں میں اندھیرا چھا گیا۔ وہ آہستہ آہستہ قدم اُٹھاتا ہوا برآمدے کی طرف چلا گیا۔ اپنی ٹوپی اُٹھائی۔ اور کارخانے سے نکل گیا۔

اس دن بیوی نے اسے بے وقت آتے دیکھا۔ تو حیرانی سے پوچھا۔ ''خیر ہے۔ تم آج کیسے آ گئے۔''

عبدل خاموش رہا۔

بیوی کو اُس کی خاموشی پر شبہ ہوا۔ وہ اُس کے نزدیک آ گئی اور بولی ''کہو تو۔ خیر ہے''۔

عبدل کا ماتھا پسینے سے تر تھا۔ اُس نے ٹوپی اُتار کر فرش پر رکھ دی۔ اور بیوی کی طرف دیکھ کر کہا۔ ''آج پنڈت نے مجھے نوکری سے ہٹا دیا''۔

اُس کی بیوی ایک قدم پیچھے ہٹ گئی۔ پھر بولی۔ ''کس نے۔ بڑے پنڈت نے؟''

عبدل نے پیشانی سے پسینہ پونچھتے ہوئے کہا۔ ''نہیں چھوٹے پنڈت نے۔''

اُس کی بیوی نے فراغت کا سانس لیا۔ کہنے لگی۔ کوئی فکر نہیں۔ لڑکے زود رنج ہوتے ہیں۔ تمہارا ابھی تو کوئی قصور ہوگا۔''

عبدل نے مصنوعی ہنسی ہنس کر کہا۔ ''ہاں! میرا ہی قصور ہے خدا کی قسم!''

بیوی نے کہا۔ ''میں ابھی بڑے پنڈت کے پاس جاؤں گی۔ اور اسے سارا حال بتاؤنگی۔''

عبدل نے چمک کر پوچھا۔ ''کیوں جاؤ گی؟ مجھے پھر نوکر کرانے کے لئے؟''

بیوی نے کہا۔ ''نوکری نہ کرو گے تو کیا کرو گے۔ گھر میں پڑے پڑے زنگ نہ لگے گا۔ آخر جس نے ہماری جوانی ختم کی۔ کیا وہ بڑھاپے میں تمہیں ٹھکرا سکے گا؟''

عبدل نے کہا۔ '' خدا کارساز ہے۔ پنڈت بہانہ تھا۔ خدا نہ تھا۔ اُس نے میری نوکری ہی تو چھینی۔ رزق نہیں چھینا۔''

بیوی چپ ہوگئی۔ وہ اس سے آگے کچھ نہ بول سکی۔

شام کو عبدل کے بیٹے پریس سے آئے۔ تو انہوں نے کہا۔ '' ہم کل سے کارخانے میں نہ جائیں گے چاچا۔''

عبدل نے پوچھا۔ '' کیوں؟ اس لئے کہ پنڈت نے مجھے نکال دیا؟''

بڑے بیٹے نے کہا۔ '' ہاں اسی لئے۔ ہم عزت کی روٹی کمانا چاہتے ہیں۔ بے عزتی کی نہیں۔''

عبدل نے ہنس کر کہا۔ '' ابھی نادان ہو۔ اُس کی سختی کو تم نے بہت جلد محسوس کیا۔ لیکن احسانات بھلا دئے۔ کیا ہوا اُس نے مجھے نکالا۔ ہم پھر بھی جیتے جی اُس کا احسان نہ اُتار سکیں گے۔''

عبدل کو اب تک گمان تھا کہ گوپی ناتھ دو تین دن میں اپنی غلطی پر نادم ہوگا۔ اور مجھے دوبارہ بلا بھیجے گا۔ لیکن جب کافی دن گزر گئے اور گوپی ناتھ نے اسے بلا نہ بھیجا۔ تو عبدل کو جنوں سا ہو گیا۔ وہ ہر وقت اسی سوچ میں رہتا کہ کارخانے پر میرا کوئی حق نہ تھا۔ کیا میں نے ہی وہ احاطہ چاندنی میں جان توڑ کر صاف نہ کیا تھا۔ کیا میں نے ہی وہاں باغیچہ نہ لگایا تھا۔ کیا میری ہی کوششوں سے کارخانہ نہ چل سکا تھا؟''

(۵)

کارخانے سے عبدل کے چلے جانے کے بعد بڑی بے نظمی پیدا ہوگئی۔ کچھ مزدور عبدل کے بعد ہی بہانہ بنا بنا کر کھسک گئے۔ جو باقی تھے۔ وہ بھی وہاں رہنے پر

رضا مند نہ تھے۔ جس مشین پر وہ پہلے جان چھڑکتے تھے اب انہیں اس سے نفرت پیدا ہوگئی تھی۔ انہی دنوں شنکر داس بھی دنیا سے اُٹھ گئے۔ کارخانہ کئی دن بند رہا۔ عبدل نے جب شنکر داس کی موت کی خبر سنی۔ تو وہ بے اختیار اُس کے گھر چلا گیا۔ گوپی ناتھ نے وہاں اُسے دیکھتے ہی دوسری طرف منہ پھیر لیا۔ لیکن عبدل کو اس کے ساتھ کیا تھا۔ اسے شنکر داس کی عقیدت وہاں کھینچ لائی تھی۔ اپنے دل میں شاید اُس نے سوچا ہوگا۔ اب گوپی ناتھ میری منتیں مانے گا۔ مجھ سے معافی مانگے گا۔ لیکن جب اس نے منہ پھیر لیا۔ تو عبدل زیادہ دیر وہاں نہ بیٹھ سکا۔

وہ اب بھی کبھی کبھی اندھیرا چھا جانے کے بعد کارخانے میں چلا جاتا۔ ادھر اُدھر دیکھ کر جب اسے اطمینان ہوتا کہ وہاں کوئی چوکیدار نہیں۔ تو برآمدے میں جاتا۔ بند دروازوں کے شیشوں سے اندر جھانکنے کی کوشش کرتا پھر باغیچے میں آتا۔ اپنے ہاتھ سے لگائے ہوئے میوہ دار درختوں کو دیکھتا۔ کیاریوں اور پودوں کو دیکھتا۔ اسے محسوس ہوتا جیسے ان میں اب وہ رونق ہی نہیں۔ جو بڑے پنڈت کے دنوں میں ہوا کرتی تھی۔ ہر چیز میں اسے اداسی سی بے دلی سی اور افسردگی سی دکھائی دیتی۔

(۶)

ایک سال گزر گیا۔ گھر میں پڑے رہنے سے عبدل کی رہی سہی طاقت بھی ختم ہوگئی تھی۔ اب وہ زیادہ چل پھر نہ سکتا تھا۔ آنکھوں کی بینائی بھی خراب ہو چکی تھی۔ طبیعت میں بھی چڑچڑاپن آ گیا تھا۔ ایک دن شام کو آکر بیٹے نے کہا۔ ''چاچا۔ آج مشین خراب ہوگئی۔''

عبدل نے حیرت سے پوچھا۔ ''کیا ہوا؟''

بیٹے نے کہا۔ ''خدا جانے کیا ہوگیا۔ چلتی ہی نہیں۔''

عبدل نے ہنس کر کہا۔ ''چلو اچھا ہوا۔ خس کم جہاں پاک''۔

دوسرے دن بھی مشین ٹھیک نہ ہوسکی۔ تیسرے دن بھی نہیں۔ گوپی ناتھ نے شہر کے بہترین کاریگر بلائے۔ لیکن کوئی بھی مشین کو ٹھیک نہ کرسکا۔ ناچار کارخانہ عارضی طور پر بند ہوگیا۔ ایک دو مزدور دستی مشین پر کام کرنے کیلئے رکھے گئے۔ گوپی ناتھ صبح کارخانے میں آتا۔ میز کرسی باغیچے میں بچھا کر مکھیاں مارتا رہتا۔ اس طرح کارخانہ مہینہ بھر بند رہا۔

ایک دن پریس کا ایک پرانا مزدور جو عبدل کے ساتھ وہاں کام کرتا تھا۔ عبدل کے پاس آیا۔ بولا ''چاچا اب تو خوش ہو۔ خدا نے پنڈت کو سزا دی۔ ہمیں کیا نکالا کارخانہ ہی بند ہوگیا۔''

عبدل نے تھوڑی دیر فرش کی طرف ٹکٹکی باندھ کر سوچا۔ پھر سر اُٹھا کر کہا۔ ''چلو اچھا ہوا۔ لیکن مشین میں نقص کہاں ہوگیا۔ وہی پُرانا جوڑ تو نہیں چھوٹا؟''

اُس مزدور نے کہا۔ ''خدا معلوم۔ میرا خیال ہے۔ تمہارے سوا دوسرا مشین کو ٹھیک نہ کرسکے گا۔''

عبدل نے مسکرا کر کہا۔ ''جہاں شہر کے کاریگروں نے قسمت آزمائی کی ہو۔ وہاں میں کس شمار میں ہوں بھائی۔''

مزدور نے کہا۔ ''تم مشین کے پُرزے پُرزے سے واقف ہو۔ تم چاہو تو ہاتھ لگاتے ہی ٹھیک کردو گے۔''

عبدل نے سنجیدگی سے اس کے چہرے کی طرف دیکھا پھر کہا۔ میں چل پھر تو نہیں سکتا۔ کون جانے وہاں پہنچ کر گوپی ناتھ بےعزت ہی نہ کردے۔''

مزدور نے قریب آکر پوچھا۔ ''نہیں تو تم جاتے چاچا؟''

عبدل نے گھبرا کر جلد جلد کہا۔ ''نہیں تو۔ لاکھ روپے بھی مجھے دے۔ جب بھی نہ جاؤں گا۔''

مزدور نے زور سے ہنس کر اُٹھتے ہوئے کہا۔ ''مرحبا ہے تمہاری غیرت پر!''

اُس کے چلے جانے کے بعد عبدل کو جیسے کانٹوں پر لٹا دیا گیا۔ وہ آہستہ سے اُٹھ کر صحن میں آ گیا۔ سوچنے لگا۔ ''میں نے اس کا نمک پندرہ برس کھایا ہے۔ اگر آج اُس کی مشین کا نقص نہ نکال دوں۔ تو کل خدا کے آگے کیا جواب دوں گا۔''

لیکن پھر یہ سوچ کر مڑنے لگا کہ جب اس نے میرا حق نہ پہچانا تو میں کیوں اس کا غم کھاؤں۔ مشین خراب ہوگئی تو میری بلا سے۔

لیکن اس سے بھی اس کی تسلی نہ ہوئی۔ وہ پھر صحن کے دروازے کے نزدیک چلا گیا۔ بیوی نے اوپر سے دیکھ کر پوچھا۔ ''کہاں جاؤ گے۔ کہیں گر جاؤ گے تو......''

عبدل نے اُس کی طرف دیکھ کر کہا۔ ''کہیں نہیں جاتا۔ صحن میں ذرا چل پھر لیتا ہوں۔''

بیوی اندر چلی گئی۔ تو عبدل آہستہ سے دروازہ کھول کر نکلا۔ اور پریس کی طرف چلا گیا۔

پھاٹک پر پہنچ کر اس نے دیکھا۔ گوپی ناتھ دھوپ میں کرسی پر اپنے ہاتھوں کی ہتھیلیوں پر سر کو سہار کر بیٹھا کچھ سوچ رہا ہے۔ عبدل پہلے جھجکا۔ پھر بے اختیار اس کے نزدیک پہنچ کر رک گیا اور آہستہ سے بولا۔ ''سلام''

گوپی ناتھ چونک پڑا۔ سر کو اوپر اُٹھا کر اس نے بے دلی سے کہا۔ ''سلام۔ ابھی جیتے ہو عبدل؟''

عبدل نے مسکرا کر کہا۔ ''ابھی مرا نہیں۔ خدا بے انصاف نہیں۔''

گوپی ناتھ نے ظاہراً طور پر مسکرا کر کہا۔ ''اچھی بات ہے لیکن آج کیسے اس طرف آ نکلے؟''

عبدل نے کہا۔ ''میں نے سنا مشین خراب ہوگئی ہے۔ دل میں سوچا میں بھی

ایک نظر دیکھ آؤں۔ تو کیا ہرج ہے۔"

گوپی ناتھ نے طنزاً کہا۔" دیکھ لو۔ ہرج تو کوئی نہیں۔ ہاں اس سے تمہارے دل کی بھڑاس نکلے تو نکلے۔"

عبدل غور سے اسے دیکھنے لگا۔ اُس نے تھوڑی دیر بعد مسکرا کر کہا۔" بھڑاس نکالنے نہیں آیا ہوں۔ مشین کو درست کرنے آیا ہوں۔"

گوپی ناتھ نے حیرت سے پوچھا۔" تم۔ تم ٹھیک کرو گے؟"

پھر زور سے ہنس پڑا۔ کرسی سے اُٹھا۔ اور عبدل کو ہاتھ سے پکڑ کر کارخانے میں لے گیا۔ اس لئے نہیں کہ مشین درست ہو جائے بلکہ اس لئے کہ اسے شرمندہ کرے۔

عبدل نے سرسری طور پر مشین کو دیکھا۔ اور گوپی ناتھ سے کہا۔" اب تو بصارت بھی نہیں رہی۔"

گوپی ناتھ زور سے ہنس دیا۔ بولا۔" ہار گئے رستم صاحب!"

عبدل نے کہا۔" ذرا ٹھہرئے۔ آپ اپنی جگہ بیٹھیں۔ تو میں اطمینان سے کام کر سکوں گا۔"

گوپی ناتھ ہنستا ہنستا اور سگریٹ کو سلگاتا ہوا برآمدے میں چلا گیا۔

عبدل پرزوں کو کھولنے اور جوڑنے لگا۔

جب کافی دیر ہو چکی۔ اور عبدل باہر نہ نکلا۔ تو گوپی ناتھ دروازے میں کھڑا ہو گیا۔ بولا۔" آؤ اب۔ دن ڈھل چکا ہے۔"

عبدل نے مسکرا کر کہا۔" دن بھی ڈھل چکا۔ اور مشین بھی ٹھیک ہو گئی۔"

گوپی ناتھ کو خیال ہوا عبدل اس سے مخول کر رہا ہے۔

عبدل نے پھر کہا۔" ذرا سوچ دبایئے۔"

گوپی ناتھ حیرت کا مجسمہ بنا اسے دیکھنے لگا۔ عبدل نے پھر کہا۔

"دبایئے سوچ۔"

گوپی ناتھ نے پوچھا۔ "سچ کہتے ہو۔ ہوگئی مشین ٹھیک؟"

عبدل نے کہا۔ "خدا کو منظور ہوگا۔ تو ٹھیک ہوگئی ہوگی۔"

گوپی ناتھ نے فرط مسرت میں سوچ دبایا۔ مشین چھن چھن کرتی ہوئی چل پڑی۔

گوپی ناتھ ششدرہ گیا۔ اس نے کہا۔ "عبدل۔ تم کتنے بڑے کاریگر ہو۔"

عبدل نے کہا۔ "کاریگر نہیں ہوں۔ بندر ہوں بے حیا بندر۔"

گوپی ناتھ کو باغیچے کا واقعہ یاد آ گیا۔ اُس نے زمین کی طرف دیکھ کر کہا۔ "عبدل۔ تم مجھے معاف نہ کرو گے؟"

عبدل نے اُس کے شانے پر ہاتھ رکھ کر مسکراتے ہوئے کہا۔ "معاف نہ کیا ہوتا۔ تو آج یہاں کیسے آتا۔ یہ سچ ہے کہ تم نے میرا حق چھینا۔ لیکن میں اپنا فرض نہ بھول سکا۔"

............☆☆☆............

سہارا

خزاں کے موسم میں جب کبھی مطلع اَبر آلود ہو جاتا ہے۔ تو باغوں پر بھی ایک کیفیت سی چھا جاتی ہے۔ ہلکی اور میٹھی دھوپ میں پھیلا ہوا جوش کہیں کہیں یلکخت ٹھنڈا پڑ جاتا ہے اور کہیں کہیں کسی کے دل میں زیادہ اُبھر آتا ہے۔ آج بھی آسمان اَبر آلود تھا۔ لیکن مایوس فضا اور مکدر ماحول کو دیکھتے ہوئے بھی محکمۂ آثار قدیمہ کے تواریخی باغ میں کچھ نوجوان عورتیں مورنیوں کی طرح مسرت میں جھوم رہی تھیں۔ وہ سڑک کے کناروں سے اور باغ میں چنار کے جھڑے ہوئے زرد اور لال لال پتے بڑے انہماک سے جمع کر رہی تھیں۔ کبھی سوکھے ہوئے سبزے پر لوٹتی تھیں اور کبھی زور سے قہقہہ مارتی تھیں۔ اس وقت تک جب کہ پاس کی چھاؤنی سے تین بجے کے بگل ابھی ابھی بج کر خاموش ہو گئے تھے۔ انہوں نے باغ کے وسط میں پتوں کا ایک بہت بڑا ڈھیر جمع کیا ہوا تھا۔ ہنگامی مسرت کے ساتھ ساتھ اُن کی نگاہوں میں خوف بھی جھلک رہا تھا۔ کہیں محکمہ آثار قدیمہ کا کوئی ملازم انہیں پتے جمع کرنے سے نہ روکے۔ یا چھاؤنی کا کوئی سپاہی سڑک کے کنارے جھڑے ہوئے پتے جمع کرنے پر بُرا بھلا نہ کہے۔ وہ ہر سال اسی طرح مسرت اور خوف کے ملے جلے جذبات کے زیر اثر پتے جمع کیا کرتی تھیں۔ اور انہیں ٹوکریوں میں بھر کر خوشی خوشی گھر لے جاتی تھیں۔ اس مشقت سے جو محض عارضی اور کسی حد تک تصریحی بھی تھی۔ اُن کے مالک زمستان کے

ایک ضروری مصرف سے بے نیاز ہوجاتے تھے۔

اور آج بادل چھائے ہوئے تھے۔ جانے کس وقت آسمان سے پانی برسنا شروع ہوجائے اور محسن درختوں سے جھڑی ہوئی دولت بہہ کر ضائع ہوجائے۔ اور پھر اس موسم کے بعد زمستان...... کڑاکے کی سردی...... برف...... سبھی کچھ! جب پھیرن کے نیچے شعلوں سے دہکتی ہوئی کانگڑی ہر کشمیری کی روح بن جاتی ہے۔

باغ کے کونے میں ایک نوجوان دایہ دستی گاڑی میں بچے کو سلا کر سوکھی گھاس پر بیٹھی ہوئی تھی۔ اُس کے بال بے ترتیبی میں ہوا کے ہلکے ہلکے جھونکوں سے لہرا رہے تھے۔ اُس کی آنکھوں میں ذہنی پریشانیوں کے سبب انتشار سا پھیلا ہوا تھا۔ باغ میں وہ روزانہ آتی تھی۔ لیکن اس قبل وہ کبھی اس طرح من کو مار کر نہ بیٹھی تھی۔ اور نہ شاید اس سے اس طرح بیٹھا جاتا تھا۔ کچھ نہیں تو سوکھے پودوں ہی سے کھیلتی تھی۔ کچھ گنگنا ہی لیتی تھی۔ کسی کم سن سے بات چیت ہی کرتی تھی لیکن آج...... آج وہ خاموش تھی اور پریشان سی اور باغ میں کچھ نوجوان عورتیں مورنیوں کی طرح مسرت میں جھوم رہی تھیں۔ وہ پولو گراونڈ کے قریب، کلب روڈ پر، کمپنی باغ میں لاتعداد کشمیری عورتوں اور چھوٹے چھوٹے بچوں کو تنکے، درختوں کی ٹوٹی ہوئی ٹہنیاں اور سڑک پر بکھری ہوئی پتیاں جمع کرتے دیکھتی تھی۔ اور کسی حد تک ان سے مانوس بھی ہوچکی تھی۔ اگرچہ اُن کی معاشی زندگی سے اسے نفرت سی تھی۔ اور اپنے دل میں کبھی کبھی سوچتی تھی ''اتنی میلی کچیلی عورتیں زندہ کیونکر رہتی ہیں۔'' لیکن آج باغ میں پتے جمع کرنے والی عورتوں کو دیکھ کر اُس کی نفرت نمایاں نہ ہوئی اور نہ اُس کے دل نے سوال کیا۔ ''اتنی میلی کچیلی عورتیں زندہ کیوں کر رہتی ہیں۔''

اُس کی پُر ملال اور منتشر نگاہوں نے انہیں دیکھا۔ صرف دیکھا اور کانوں نے کبھی کبھی اُن کے قہقہے کی آواز سنی!

''اُف''......اُس کے ہونٹوں سے بے اختیار نکالا۔لیکن جلد ہی اس نے سنا خدا بچائے۔ہم دواؤں پر بچوں کو نہیں پالتیں۔ جتنا دودھ چھاتیوں سے نکلنے۔انہیں پلاتی ہیں یا کلچہ۔ستو۔شیریں چائے۔بھتہ۔تمہارا ' کی لم' نہیں۔''

''اور مکھن بھی نہیں؟''نصیرین نے حیران ہوکر پوچھا۔

ایک عورت نے ہنس کر کہا۔''یہاں یہ چیزیں بیماروں کو دیتے ہیں۔بچوں کو نہیں۔''

تینوں عورتیں پتوں کے ڈھیر کی طرف جانے لگیں اور نصیرن بھی گاڑی کو آہستہ آہستہ چلاتی ہوئی اسی طرف نکل گئی۔ چلتے چلتے ایک عورت نے پوچھا۔'' تمہاری میم کے کتنے بچے ہیں؟''

نصیرن نے جو کسی اور سوچ میں ڈوب گئی تھی۔ چونک کر کہا۔''صرف یہی ایک! یہی میرا ننھا......بابا؟''

دوسری عورت نے جلد جلد سوال کیا۔'' کتنے برس ہوئے اسے شادی کئے ہوئے؟''

گاڑی آہستہ آہستہ چلنے کی حرکت سے بچہ جاگ اُٹھا تھا۔نصیرن نے گاڑی روک کر اس کے بدن سے اونی رومال اُٹھالیا۔اور مسکرا کر اُس کی طرف دیکھتی ہوئی بولی۔'' سات برس'' تینوں عورتوں نے اپنی اُنگلیاں دانتوں تلے دبائیں اور ایک دوسرے کی طرف دیکھنے لگیں۔نگاہوں ہی نگاہوں میں استعجاب پھرنے لگا۔سات برس میں ایک بچہ! اُنکی شادی کو صرف پانچ برس گزرے ہوئے ہوں گے اور ان کے گھروں میں تین تین بچے کھیل رہے تھے اور میم کے ہاں سات برس میں صرف ایک بچہ!

''دراصل یہ لوگ......''اُن میں سیانی عورت نے سنجیدگی سے اور دو عورتوں کو کچھ کہنا چاہا تھا لیکن کہا نہیں۔

نصیرن بچے کو گود میں اُٹھا کر خوب ہنس دی۔ کل دوپہر سے اس وقت تک اُس نے شاید پہلی بار کھلے دل سے ہنسا اور وہ بھی تین چار بچوں کی ماں کی فلسفیانہ بات سُن کر! تینوں عورتیں بچے کو غور سے دیکھنے لگیں، جو میم کی سات برس کی شادی کا نچوڑ تھا۔

''کتنا موٹا بچہ ہے۔'' ایک عورت نے جاتے جاتے دوسری سے کہا۔ ''تین برس سے کیا کم عمر ہوگی؟''

نصیرن نے گاڑی میں بچے کو لٹا کر گاڑی پھاٹک کی طرف موڑ لی۔ اور واپس جانے لگی۔ اسے میلی کچیلی کشمیری عورتوں سے نفرت کی جگہ اُنس سا ہونے لگا۔ جو کسی حال میں اُس سے عمر میں زیادہ نہ تھیں۔ ہاں یہ ضرور تھا کہ محبت کے بے اعتدالیوں اور پست حالی کے سبب اُن کی زندگی میں ساز کے شکستہ تاروں کی طرح اُلجھاؤ پیدا ہو گیا تھا۔ لیکن پھر بھی اُس میں دلکش نغمے کی آواز گونج رہی تھی۔ جس کی لے نے انہیں بالکل مطمئن بے پروا اور قانع بنا رکھا تھا۔ اسکی وجہ اور کیا ہو سکتی تھی کہ وہ اپنے مردوں کے پہلوؤں میں لمحے گزار رہی تھیں۔ اُن کے ڈھیلے ڈھیلے بدن کے نیچے مضبوط اور تنومند سہارے آچکے تھے۔

وہ اسی خیال میں جا رہی تھی۔ حتیٰ کہ پُل کے پار کچی اینٹوں سے بنی ہوئی جھونپڑیوں کی طرف تینوں عورتیں چلی گئیں۔ اُسی طرح بے پروائی میں مسکراتی مسکراتی۔ ایک دوسری کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر۔ قہقہے مارتی ہوئی۔

نصیرن نے تھوڑی دیر کے لئے سڑک کے وسط میں اپنے قدم روک لئے اور اور اُن عورتوں کو جو ابھی ابھی اُس سے باتیں کر کے چلی گئی تھیں، دیکھنے لگی۔ نوجوان عورتوں کی مسرت کے سائے تلے اُس پر دیوانگی سی چھا گئی۔ ایک عجیب کیفیت۔! اُسے بچے تک کا خیال نہ رہا۔ جو نیلی نیلی آنکھوں سے اُسے دیکھ رہا تھا۔

کاش...... کاش! میرا بھی گھر ہوتا ایسا ہی۔ کچی اینٹوں کا بنا ہوا۔ بید کے

درختوں میں گھرا ہوا۔ جہاں ہر وقت، ہر طرف محبت ہی محبت چھائی رہتی۔ جس سے افلاس کی گرانباری محسوس نہ ہوتی۔ جہاں پھٹے ہوئے پاؤں۔ لٹکتی ہوئی چھاتیوں اور پیوند کئے ہوئے کپڑوں کی تنگ و ناموس نیلی نیلی آنکھوں میں کبھی بھی نراشا بن کر نہ جھلکتی...... کاش...... کاش میرا بھی ایسا ہی گھر ہوتا!

وہ اِسی سوچ میں آگے بڑھنے لگی۔ اُس کی نگاہوں کو اب سہارے کی جستجو تھی۔ جو اُس کے شباب کو اُٹھائے اُسے اپنے اُپر لئے پھرتا۔ راستے میں آنے جانے والے کتنے ہی فوجی سپاہیوں اور راہروں کو اُس نے دیکھا۔ اُس میں کچھ نوجوان تھے اور کچھ جوانی سے پرے پہنچے ہوئے...... لیکن،...... نہیں...... نہیں۔ نصیرن کی آگ کو آگ کی ضرورت تھی۔ اُس کے گرم لہو کو گرم لہو کی ضرورت تھی اور وہ راہ چلتے جوان...... وہ صرف ہنگامی اور غیر ارادی جذبات سے متاثر ہو کر اُسے دیکھتے تھے۔ حقیقی آگ کی تپش محسوس کرتے ہوئے نہیں اور ایسی آگ سے کھیلنا...... وہ نہیں چاہتی تھی...... وہ اسی خیال میں پھاٹک میں داخل ہوئی۔

نوبت خان رسوئی خانے کے باہر شکستہ بنچ پر پیاز چھیل رہا تھا۔ نصیرن کو دیکھتے ہی اُس کی بھویں تن گئیں۔ نصیرن نے بچے کو مالکن کے حوالے کر دیا۔ اور اپنے کمرے میں جانے کے عوض رسوئی خانے کے دروازے پر کھڑی ہو گئی۔ تھوڑی دیر کے بعد آہستہ سے بولی۔ ''شوربہ ہے؟''

نوبت خان نے حیران ہو کر اُس کی طرف دیکھا۔ اُسے یقین نہ آیا کہ نصیرن سچ مچ شوربہ مانگ رہی ہے۔ اُسے معلوم نہ تھا کہ نصیرن کا ظاہری وجود شوربہ ایسی مقوی غذا مانگ رہا ہے۔ لیکن باطنی وجود، اصلی نصیرن کی نگاہیں اُس سے کچھ اور طلب کر رہی تھیں۔ جسے وہ زُبان پر نہ لا سکتی تھی۔ اپنے ہونٹ زور سے بند کئے اور دل ہی دل میں نادم بھی ہوئی...... وہ اگر چہ زیادہ خوبصورت نہ تھی۔ یا کم از کم ایسی نہ تھی، جسے حُسن

کا کوئی معیار......ادنٰے ہی سہی قرار دیا جائے لیکن اُس کے نقش و نگار میں غیر معمولی کشش سی تھی۔ وہ کشش جو بعض اوقات سرراہ ترتیب میں آنے جانے والے فوجی سپاہیوں کے دلوں میں وقتی جذبات اُبھارنے میں کامیاب ہوتی تھی...... یا اُس کے خانساماں کو اُس کی طرف بسا اوقات متوجہ کرتی تھی۔ لیکن اِس کشش سے بھی وہ واقف نہ تھی۔ وہ صرف اتنا جانتی تھی کہ وہ ایک فرنگی عورت کی نوکرانی ہے۔ جس کا کام اُس کے بچے کو تازہ ہوا کھلانا ہے۔ صابن کی مرمریں جھاگ سے نہلانا ہے۔ وقت وقت پر کلم اور گلیکسو کھلانا ہے۔ مکھن اور شوربہ پلانا ہے۔ اسے گاڑی میں لٹا کر کلب روڈ۔ ہوٹل روڈ اور چھاؤنی کی طرف گھومانا ہے اور شام کے وقت بچے کو سلا کر اپنے کمرے میں....؟

کبھی کبھی جب وہ شدت احساس سے مجبور ہوتی۔ دل کے پوشیدہ کونے میں اپنی اور مالکن کی زندگی کا موازنہ کرتی۔ لیکن ایسا کبھی کبھی ہوتا اُس وقت آندھی کی طرح اُس کے جذبات میں طوفان اُٹھتا۔ اور گردوغبار کی طرح وہ اسی آندھی میں بہت دور جالگتی۔ حتےٰ کہ طوفان تھم جاتا اور اُسے اپنی غلطی کا احساس ہوتا۔ ایسے وقتوں میں صرف اُس کا دماغ ہی زبان اور آنکھوں کا کام کرتا۔ اور اُس کا ظاہری بدن اس موازنے کے ہنگامے سے ناآشنا رہتا۔ ''آخر مجھ میں اور مالکن میں کتنا فرق ہے۔ وہ انار کے دانے کی طرح لال اور میں...... میں نصیرن! لیکن دونوں عورتیں ہی تو ہیں۔ اور یہ پتے جمع کرنے والی کشمیری عورتیں! یہ بھی تو ہماری ہی سطح پر کھڑی ہیں۔ اگر سبھی عورتیں روزانہ مکھن۔ شوربہ اور برانڈی پینے کی عادی ہوں۔ تو سب کی ٹانگیں سڈول۔ چھاتیاں پتیل کے گیند کی طرح سخت اور بال ریشم کی طرح نرم و نازک ہوں گے اور رنگ ٹماٹر سے زیادہ سرخ۔ شعلے سے زیادہ خوبصورت اور جاذب نظر! لیکن ہم میں دال اور چاول کھانے کے عادی جس سے گردن کا گوشت بھی لٹک جاتا ہے۔''

اُس نے ایک دن خانساماں سے پوچھا۔ ''ہم تم شوربہ کیوں نہیں پیتے خان

؟'' خانساماں اُس وقت نصیرن کے فلسفے کی گہرائی کو نہ سمجھ سکا۔ غیر ارادی طور پر بولا۔ ''شوق سے، شوق سے!'' اور پھر زور سے مسکرایا۔

نصیرن کی خوشی کی انتہا نہ رہی۔ وہ اب شوربہ پیئے گی۔ کیک کھائے گی۔ اور اگر جی چاہے تو برانڈی بھی...... پھر مالکن اور اُس میں کوئی فرق نہ ہوگا۔

لیکن کل عجیب بات ہوئی۔ وہ شوربہ پی چکی تو خانساماں نے اپنا مضبوط ہاتھ اُس کے داہنے گال پر پھرا۔ اور آہستہ سے ہنس دیا۔

نصیرن کی آنکھوں میں اندھیرا چھا گیا۔ چہرے پر ہلدی سی پھیل گئی۔ اُس نے حیرت بھری نظروں سے خانساماں کی طرف دیکھا۔ جس کے ہونٹ مسکراہٹ کے بعد اب تک تھرتھرا رہے تھے۔

خانساماں نے دوبارہ اپنا ہاتھ اُس کے گال پر پھیرنا چاہا۔ تو نصیرن مضبوطی سے بولی...... ''کمینے...... پاپی......''

نوبت خان کئی انگریزوں کے پاس رہ چکا تھا۔ اُس نے نصیرن جیسی کئی نوکرانیاں دیکھی اور آزمائی تھیں۔

مُسکراتے ہوئے اُس نے پوچھا۔ ''خفا ہوگئیں؟''

نصیرن نے شوربے کا خالی گلاس دور پھینکتے ہوئے کہا۔

''تم مجھے اسی لئے شوربہ پلاتے رہے کہ میں تمہاری گالی برداشت کر سکوں......''

نوبت خان کو نصیرن کا غصہ بالکل بے حقیقیت دکھائی دیا۔ وہ خود بھی نوجوان تھا۔ لیکن جہاں دیدہ!

گالی کا لفظ سُن کر وہ زور سے ہنس پڑا۔ بولا۔ ''خدا کی قسم! تم مزے کی لڑکی ہو نصیرن! معمولی بات پر بہت زیادہ چڑ گئی۔ ہاہاہا...... گالی؟''

نصیرن کچھ بھی نہ بول سکی۔ لفظوں کی جگہ اُس کے منہ میں دھواں سا جمع ہو گیا اور آنکھوں میں حیرت کے ساتھ ساتھ آنسو بھی پھوٹ پڑے۔

نوبٹ خان اُس کے قریب آ کر سنجیدگی سے بولا۔ ''تم لاکھ برا مناؤ۔ لیکن ایک دن تمہیں کسی کی گالی برداشت کرنی پڑے گی۔ تمہارا شباب تمہارے خدوخال، آنکھیں خود گالی کے لئے آوارہ ہونگی......اور......آج۔''

نصیرن نے نوبت خان کی بات خوموشی سے سنی۔ لیکن غصے میں اُن کی آنکھیں جل رہی تھیں۔ اسے زندگی میں پہلی بار محسوس ہوا کہ وہ مالکن کے زیر سایہ رہتے ہوئے بھی کسی قدر کمزور اور بے بس ہے۔ نوبت خان کے چہرے سے سنجیدگی غائب ہو گئی اور مسکراہٹ پھیل گئی۔

نصیرن چپکے سے اُٹھی اور باہر نکل گئی۔ اسے محسوس ہوا۔ جیسے اُس کے دل پر، اُس کے گھٹنوں پر، اُس کے پپوٹوں پر کسی نے من من بھر کے پتھر، سرد اور بے مہر رکھ دئے ہوں۔ اُسے ساری کوٹھی بجھی ہوئی بھٹی سی دکھائی دی۔ جہاں اس کے لئے کہیں بھی شفقت یا ہمدردی کی گرمی نہ تھی۔ صحن میں بھنگی کوڑے کرکٹ کا ٹوکرا لئے باہر جا رہا تھا۔ نصیرن کو دیکھتے ہی اس کے قدم رک گئے۔ ہونٹوں پر ہلکی سی مسکراہٹ پھیلا کر اُس نے کہا۔ ''سلام ہے بُوا۔''

نصیرن نے بادل ناخواستہ اُس کی طرف دیکھا اور بھنگی نے پاس آ کر کہا۔ ''اپنے قدموں کی خیرات نہ ملے گی اب......''

بھنگی کئی دن سے اپنی جوان بیٹی کے لئے نصیرن سے پُرانی دھوتی مانگ رہا تھا۔ آج نصیرن کو رسوئی خانے سے نکلتے دیکھ کر اُسے اپنی بیٹی یاد آئی۔ جس کی شلوار رانوں پر سے پھٹی ہوئی تھی۔ اور خوف ندامت سے وہ باہر نہ نکل سکتی تھی۔

نصیرن کا جواب نہ پا کر بھنگی نے عاجزی سے کہا۔ ''اُس کی ٹانگیں، رانیں

ننگی ہو رہی ہیں۔ وہ باہر نکل ہی نہیں سکتی...... کہیں کوئی لفنگا اُسے گالی نہ دے ......اسی لئے......'' نصیرن نے بھنگی کی بیٹی نہ دیکھی تھی اور آج تک ہر روز بھنگی صرف قدموں کی خیرات مانگ رہا تھا۔ لیکن اب گالی کا لفظ سن کر اس کے دل میں بھنگی کی بیٹی کے لئے ہمدردی سی پیدا ہو گئی۔

''وہ ننگی ہو جائے گی اور پھر گالی......'' اُس نے دل میں سوچا۔ ''کپڑوں میں ملبوس ہوتے ہوئے بھی جب خانساماں مجھے گالی دے سکا تو اسے کون گالی نہ دے سکے گا۔'' وہ جلد جلد اپنے کمرے میں چلی گئی اور کھونٹی پر لٹکتی ہوئی دھوتی جو اس نے گذشتہ مہینے ہی سے استعمال کی تھی۔ بھنگی کی طرف پھینک دی۔

بھنگی اُس کی جان اور اُس کے بچوں کو دعائیں دیتا ہوا چلا گیا۔ حالانکہ نصیرن کا کوئی بچہ نہ تھا۔ اسے شک ہوا۔ بھنگی نے جان بوجھ کر اسے گالی نہ دی ہو۔ وہ درواز سے پر کھڑی ہو گئی۔ لیکن بھنگی پھاٹک سے باہر نکل چکا تھا۔ نصیرن کی خیرات نے اس کے قدموں میں سبک رفتاری پیدا کر دی تھی۔ اور وہ اپنی بیٹی کو کسی لفنگے کی گالی سے بچانے کے لئے قدم پر قدم اُٹھاتا جا رہا تھا۔

وہ کمرے میں بے تاب سی ہو اٹھی۔ خانساماں کی گالی اس کے دماغ میں گونج رہی تھی۔ اور ساتھ ہی اس کی خطرناک پیشین گوئی بھی۔ ''نصیرن ایک دن تمہیں کسی کی گالی برداشت کرنی پڑے گی۔ تمہارا شباب تمہارے خدوخال، تمہاری آنکھیں خود گالی کے لئے آوارہ ہونگی'' اس کے جذبات میں جوار بھاٹا آ گیا تھا۔ اگر آج صاحب موجود ہوتا تو وہ اُسے صاف صاف کہہ دیتی کہ خانساماں نے اس کی شرم وحیا پر حملہ کیا۔ لیکن وہ لام پر گیا ہوا تھا۔ اور میم صاحبہ سے شکایت کرنے کی اُس میں ہمت نہ تھی۔ وہ معمولی باتوں پر اسے جھاڑ دیتی تھی۔ لیکن یہ بھی حقیقت ہے کہ اسے نصیرن سے پیار بھی تھا۔

اُس نے سردرد کا بہانہ کر کے بچے کو سیر کے لئے نہ نکالا۔ اپنی کوٹھڑی میں رضائی کے نیچے سر چھپا کر لیٹ گئی۔ ایک بار مالکن خود اس کے کمرے کے دروازے پر آ گئی۔ نصیرن کو رضائی کے نیچے لیٹی دیکھ کر بولی ''نصیرن''۔

نصیرن اُٹھ بیٹھی ۔ دونوں ہاتھوں سے سر کو تھام کر بولی۔ ''حضور آج سر میں درد ہے۔ بہت درد ہے۔ آج باہر نہ جاسکوں گی......اور......''

میم کو اس کے بکھرے ہوئے بال، پسینے سے شرابور پیشانی اور ڈھیلا ڈھیلا بدن دیکھ کر اُس کے سر درد کا یقین ہو گیا۔ بولی۔ ''ڈاکٹر بلاؤں؟''

نصیرن نے گھبرا کر کہا۔ ''نہیں حضور! صبح تک ٹھیک ہو جاؤنگی۔''

میم نے اپنی نیلی آنکھوں میں چمک پیدا کر کے کہا۔ ''اوہ......ڈاکٹر نہیں۔ اچھی بات ہے روٹی مت کھاؤ......شوربہ پیو......''

شوربے کا نام سن کر نصیرن کی ملول آنکھوں میں دوبارہ خوف سا چھا گیا۔ اسی چیز نے خانساماں میں اُسے گالی دینے کی ہمت پیدا کی تھی۔ اُس نے جلد جلد کہا۔ ''شوربہ نہیں حضور! فاسٹ کروں گی۔''

میم نے جاتے جاتے کہا۔ ''اچھی بات ہے۔ لیکن بے بی سے چھونا مت! اچھا۔''

مالکن کے منع کرنے سے نصیرن کے دل میں ہلکی سہی خراش پیدا کی۔ وہ ''بابا'' پر جان دیتی تھی۔ لیکن سر درد میں اُسے چھونے کی ممانعت تھی۔ اس لئے کہ اُس کی خدمات مستعار اور اُس کی محبت غیر ارادی تھی!

لیکن نصیرن اُس سے غیر ارادی محبت نہ کرتی تھی ۔ اُسے اگرچہ معلوم نہ تھا کہ محبت کی انتہا کیسی ہوتی ہے اور آغاز کیسا۔ لیکن جس طریق پر وہ بچے کو چاہتی تھی ۔ کیا وہ محبت نہ تھی......وہ ہلکے سروں میں گا گا کر اُسے نہلاتی تھی۔ مسکرا کر اُس کے مکھن

جیسے ملائم بدن پر پوڈر ملتی تھی۔ صبح اور شام سیر کیلئے گاڑی میں لیٹا کر لے جاتی تھی وقت وقت اسے کلم اور گلیکسو کھلاتی تھی۔ کیا یہ محبت نہیں؟

اور صبح سے شام تک جب اُس نے اپنے ''بابا'' کو نہیں دیکھا تو وہ بیاکل ہوگئی۔ وہ آہستہ آہستہ کمرے سے نکلی۔ مالکن کے کمرے کے باہر ہیٹ سٹینڈ پر فوجی ٹوپی آویزاں تھی۔ ہو بہو ایسی ہی ٹوپی اُس کا صاحب بھی پہنتا تھا۔ لیکن وہ تو لام پر گیا ہوا تھا۔ اور ٹوپی پر ویسے ہی پیتل کے بلے لگے ہوئے تھے۔ جو دہلیز کے بلب کی روشنی میں چمک رہے تھے۔ اُس نے کانپتے ہوئے ہاتھوں سے ٹوپی اُتاری۔ اُسے اُلٹ پلٹ کر دیکھا اور حیرت زدہ ہو کر وہیں رکھ دی۔

اندر کمرے میں مکمل سکوت تھا۔ حتیٰ کہ دروازے پر لٹکتے ہوئے ریشمی پردے میں بھی کسی قسم کی حرکت نہ تھی۔ اور پرے رسوئی خانے میں شاید نوبت خان شوربہ پکا رہا تھا۔ نصیرن نے آہستہ سے پردہ ہٹایا اور ایک قدم اندر داخل ہوئی۔ معاً دونوں ہاتھوں سے اپنا چہرہ چھپا کر جلد جلد باہر نکلی۔ اور دہلیز کی سیڑھیوں کو پھاندتی ہوئی اپنے کمرے میں پہنچی۔ اُس کا سانس پھول چکا تھا۔ آنکھیں حیرانی کے سبب بہت بڑی ہوگئی تھیں۔ وہ بے ترتیبی سے پھیلی ہوئی رضائی پر بیٹھ گئی۔ آج اُس کی آنکھوں نے عورت کی صحیح تصویر دیکھی تھی۔ اُسے اب نوبت خان کی گالی کچھ کچھ ہلکی دکھائی دینے لگی۔ اُسے محسوس ہونے لگا۔ عورت دنیا میں صرف گالی کے لئے پیدا ہوئی ہے۔ خواہ وہ مالکن کی حیثیت میں ہو یا نوکرانی کی حیثیت میں۔ اسی لئے عورت محتاج بھی ہے۔ اور کبھی کبھی آوارہ بھی ہو جاتی ہے۔

رات کو اُس نے کچھ بھی نہ کھایا۔ اُسے اپنا ''بابا'' تک یاد نہ رہا۔ آج کا دن اُس کی زندگی میں اہم ترین دن تھا۔ اور آج کی رات طویل تریں! انہی چند گھنٹوں نے اُسے بہت نازک بات سمجھا دی تھی۔ جو آج سے بہت پہلے شوربہ پی پی کر بھی وہ نہ

سمجھ سکی تھی۔

''شوربہ بھی کتنی مقوی غذا ہے۔'' اُس نے سوچا۔ ''لیکن ہم ہندوستانی لڑکیوں کے لئے نہیں۔ ہمارے لئے دال اور چاول ہی اچھے ہیں۔ جسے کھا کر کوئی گالی نہیں دے سکتا۔ جس سے بدن سڈول نہیں ہوتا۔ جس سے اعضا میں سختی اور جاذبیت نہیں پیدا ہوتی۔''

وہ انہی خیالات کی ندی میں بہتی گئی۔ اور رات کا لمحہ لمحہ بغیر کسی سرسراہٹ کے اُس کے کمرے کے باہر گزرتا گیا۔

(۲)

اُس وقت بھی جب کہ مطلع ابر آلود تھا اور کشمیری عورتیں جھڑتے ہوئے پتے جمع کرنے میں منہمک تھیں۔ اُس کے ذہن میں کل کا واقعہ پھر رہا تھا۔ اُس نے آج صبح نوبت خان کی طرف دیکھا تک نہ تھا۔ اور نہ وہ اس کی طرف دیکھنا چاہتی تھی۔ وہ کبھی کبھی بے ساختہ طور پر باغ کی دوسری طرف پتوں پر جھکی ہوئی عورتوں کو دیکھتی تھی۔ کاش! وہ بھی اُن کی طرح آزاد ہوتی۔ اُس کا بھی گھر بار ہوتا اپنا دیس ہوتا۔ وہ بھی خزاں کے موسم میں ٹوکری سر پر اُٹھائے باغوں میں پھرا کرتی۔ اور اپنے کوارٹر کی بلندی کے برابر پتوں کا ڈھیر جمع کر کے کبوتری کی طرح اُس پر لوٹتی۔ لیکن وہ بابا کی دایہ تھی۔ اور بابا گاڑی میں ادنی رومال کے نیچے سو گیا تھا۔ وہ اس وقت واپس بھی نہ جا سکتی تھی۔ قدرت نے جہاں اسے اپنے وطن سے دور پھینکا تھا۔ وہاں اُس پر بھار ظلم بھی کیا تھا۔ حُسن کو حُسن کا تابع بنا رکھا تھا۔ وہاں اُس پر بھاری ظلم بھی کیا تھا۔ حُسن کو حُسن کا تابع بنا رکھا تھا۔ حالانکہ وہ حسن کے اصطلاحی معنی سے غیر واقف تھی۔ اُس پر یہی سوچتے سوچتے کیفیت سی طاری ہوگئی۔ وہ اب بیٹھ بھی نہ سکتی تھی۔ اسے انگور کی بیل کی طرح سہارے کی ضرورت محسوس ہوئی۔ جس پر وہ اپنے بدن کا، اپنی اُمنگوں

کا سارا بوجھ ڈال کر ملیا میٹ ہو جائے۔ اور زندگی کے مختلف دوروں سے گذرتے ہوئے اسے مطلق کوئی کوفت محسوس نہ ہو۔ لیکن سرینگر پردیس تھا۔ اور سہارا ابھی اُس کی نظروں سے اوجھل...... ابھی اُس کے تصور سے بھی باہر!

اور سامنے کشمیری عورتیں پتے جمع کرتی کرتی اُس کے نزدیک پہنچ گئی تھیں۔ وہ بات بات پر مسکرا رہی تھیں۔ دوپہر سے کام کرتے کرتے وہ تھک نہ گئی تھیں۔ پُرانے کپڑوں میں بجھا ہوا شباب اور اُس پر گھر بار کی بے پناہ محبت نے اُنہیں کس قدر مطمئن بنا رکھا تھا۔ پھٹے ہوئے پاؤں اور پیٹ تک لٹکتی ہوئی چھاتیاں اگرچہ اُن کی کم خوارکی اور پست مالی کا ثبوت تھیں۔ لیکن ان کی نگاہوں میں شعریت کا خمار اور قناعت کی جھلک تھی۔ اور ان کے برعکس نصیرن کا بدن جو شوربہ پی پی کر گٹھا ہوا تھا۔ چُست اعضاء دلکش خدوخال، صاف اور ستھری پوشاک۔ لیکن پھر بھی غیر مطمئن...... سکون سے نابلد!

''اچھی ہو؟'' ایک عورت نے اپنا جھاڑو زمین پر پھینکتے ہوئے نصیرن سے پوچھا۔

نصیرن کا خیالی خواب ٹوٹ گیا۔ وہ چونک سی اُٹھی۔ بولی۔ ''شکر ہے۔''

دوسری عورت اُس کے پاس آ کر بیٹھ گئی...... ''تم آج اُداس کیوں ہو؟'' اُس نے مُسکرا کر نصیرن سے پوچھا۔ ''مالک تو یاد نہیں آ گیا ہے؟''

نصیرن چنار کے ایک پتے کو مروڑنے لگی۔ تھوڑی دیر کے بعد بولی۔ ''کچھ بھی نہیں۔''

تیسری عورت عمر میں ان دونوں سے ذرا بڑی تھی۔ وہ ہٹ کر کمر سیدھی کرنے کے لئے لیٹ گئی۔

''تمہارا مرد کیا ہے؟'' پہلی عورت نے دوبارہ پوچھا۔ نصیرن یہ سوال سننا ہی

نہ چاہتی تھی۔ اسی سوال نے اُسے کل دوپہر سے ذہنی تکلیف دی تھی۔ اور اب تک یہی بات اُس کا پیچھا نہیں چھوڑتی تھی۔ وُہ اِس سوال کو ٹالنا چاہتی تھی۔ لیکن اُس سے کچھ بن نہ پڑا۔ مجبور ہو کر بولی۔ ''میں ابھی کنواری ہوں۔''

دونوں نوجوان عورتوں نے ایک دوسری کی طرف حیران ہو کر دیکھا۔ اُن کے خیال میں نصیرن کی عمر چار پانچ بچوں کی ماں بننے کی عمر تھی۔

اُن میں سے ایک عورت نے نہایت راز دارانہ طریقہ سے پوچھا۔ ''تمہارے دل میں کبھی بھی شادی کی خواہش نہیں ہوئی۔''

نصیرن نے سر سے نفی کا اشارہ کیا۔ لیکن خواہش کے لفظ کو وہ سمجھ نہ سکی۔ یہ کیسے پیدا ہوتی ہے۔ کب پیدا ہوتی ہے۔ یہ سمجھنا اُس کی فہم و فراست سے بالا تھا۔

نصیرن نے پوچھا۔ ''تم سب نے شادی کی ہے؟''

اُن میں سے ایک نے جو جھاڑو سے بھی کھیل رہی تھی۔ اور نصیرن کے خدوخال کو بھی غور سے دیکھ رہی تھی۔ مُسکرا کر جواب دیا۔ ''اوہو...... اب تک ماں باپ کے گھروں میں پڑی رہتیں؟ چشم بد دور ہم تو کئی بچوں کی مائیں بھی بن گئی ہیں اور...... اور......''

''اری...... اُٹھو بھی ...... بچے بلک رہے ہوں گے۔'' تیسری عورت نے جواب تک کمر سیدھی کر رہی تھی، دونوں نوجوان عورتوں سے مخاطب ہو کر کہا۔

نصیرن بھی اُن کے ساتھ کھڑی ہوگئی۔ دراصل اب لوٹنے کا وقت آ پہنچا تھا۔

''تم اپنے بچوں کو کلم نہیں کھلاتی!'' نصرین نے پُوچھا۔

''کلم کیا؟''

''دودھ کا سفوف!''

............☆☆☆............

الّو

دُھوئیں سے زیادہ سیاہ کالی کی سب سے بڑی خصوصیت یہ ہے کہ کہ اُس کے پچکے ہوئے بے ڈول اور لمبوترے چہرے پر ہر وقت مسکراہٹ ہوتی ہے۔ اُس کی اندر کو دھنسی ہوئی سیاہ دائروں میں چھوٹی چھوٹی آنکھیں اگرچہ کبھی کبھی اُس کی ذہنی پریشانی کا پتہ دیتی تھیں، لیکن اُس کی مُسکراہٹ انجان آدمی کو تذبذب میں ڈالنے کے لئے کافی ہے۔ ''اس کے پاس جوڑا ہوا سرمایہ ہوگا۔ یہ آسودہ حال ہوگی۔ یہ اس قدر میلی اور گندی کیوں ہے؟'' یہ پنہارن کا کام کیوں کرتی ہے؟'' اور سچ مچ شروع شروع میں میں یہی سوچتا رہا۔

کام کرتے وقت جب وہ میری میز کے سامنے سے اپنے میلے دوپٹے میں کوئی چیز چھپا کر مسکراتی ہوئی نکل جاتی تھی۔ تو میری نگاہیں اس وقت تک اُسکا تعاقب کرتیں۔ جب تک وہ دودھ کی دکان سے آگے اوجھل نہ ہوتی۔ کتنی بشاش عورت ہے۔ اور کتنی آزاد! گلہری کی طرح دن بھر پھدکتی پھرتی ہے۔ کاش! میں بھی اسی طرح آزاد ہوتا۔ اسی کی طرح خوش و خرم۔ نہ یہ شکستہ کُرسی ہوتی۔ نہ یہ سفیدے کی ٹیڑھی میز اور نہ آمنے سامنے براجے ہوئے گھمبیر افسروں کا خوف! ایک چھوٹی سی دنیا ہوتی میری۔ کالی کی طرح چھوٹی سی جونپڑی۔ ایک بے کیف بے تسلسل پہاڑی کی چوٹی پر، جس کے دامن میں کالے ناگ کی طرح بل کھاتی ہوئی کول تار کی سرمئی سڑک جارہی

ہے۔ اور اس کے نیچے نیلے پانی والا جہلم راگ الاپتا ہوا، چٹانوں سے تھر کتا ہوا آزاد اور بے پرواہ دریا......!

صبح اور شام وہ ڈیروں میں پانی بھرتی ہے۔ چاول صاف کرتی ہے۔ برتن مانجھتی ہے اور پھر خوش خوش آنچل میں چاولوں کا ریزہ باندھ کر چلی جاتی ہے اور اُس کے پیچھے پیچھے اُس کی ہم شکل بیٹی......اکو......ناچتی کودتی ماں کا آنچل تھامے جاتی ہے ۔اُس بکری کے بے بس بچے کی طرح جس کے تھنوں پر مالک نے کپڑے کی تھیلی چڑھادی ہو۔ تاکہ بچہ راستے میں دودھ نہ پی جائے۔ وہ دودھ جس پر صرف مالک کا حق ہے۔ بچے کا نہیں!

کالی کی طرز زندگی پر مجھے لمحہ بہ لمحہ رشک آتا گیا۔ جو ایک بار میرے ضبط کے باوجود جنون کی حد تک پہنچ گیا۔ میرا سر چکرانے لگا۔ آنکھوں میں اندھیرا چھا گیا۔ میں میز سے اُٹھا۔ اور اندر کمرے میں ٹین کے بڑے صندوق پر لیٹ گیا۔ سوچنے لگا۔ یہ زندگی خصوصاً! ہم کلرکوں کی زندگی جن کی روح خفتہ اور ضمیر مردہ ہے، کسی قدر مقید ہے۔ خوف اور حرص کی آہنی زنجیروں سے کسی ہوئی۔ جن سے عمر بھر چھوٹنے کی کوئی امید نہیں۔ کوئی امید نہیں۔ اگر یہ بھی نہ ہو......تو کیا ہوا؟......کیا ہوا ہمیں اُن کتوں کی طرح مسکین اور بے نور آنکھوں سے دنیا کی طرف دیکھنا ہوگا۔ جو کسی موٹے بنئے کو صبح سویرے حلوائی کی دکان پر پوریاں اور حلوا کھاتے دیکھتے ہیں۔ اور تصور ہی میں لذت کا احساس پیدا کر کے اپنے سیاہ نتھنوں پر خشک زبان پھیرتے ہیں۔ بنیا ڈکارتا ہوا اُٹھ کر چلا جاتا ہے اور کتے وہیں کسی دوسرے کی آس لگائے بیٹھے رہتے ہیں۔ کسی میں دیا ہوئی۔ تو روٹھا جھوٹا ٹکڑا ان کی طرف پھینک دیا۔ ورنہ نہیں۔ یا کسی بنیئے نے کہہ دیا۔ ''بڑے ذہین اور لالچی ہیں یہ سالے! منہ میں نوالا دیکھ کر جھٹ مچل اُٹھتے ہیں۔ انہیں میونسپلٹی کے ذریعے سے زہر دلوانا چاہیئے''۔ اُن کے برعکس غنیمت ہے ہماری

زندگی بھی۔ صبح اور شام روٹی تو میسر ہوتی ہے۔ باقی رہی روح کی آزادی۔ وہ نہ ہمیں ملنی چاہئے نہ ہم اُس کے اہل ہیں۔ آزادی سے روح آزاد نہیں ہوتی۔ اگر وہ بات ہوتی۔ تو تیجو جھیور سے کون زیادہ آزاد ہے۔ لیکن اُسی کو دیکھو۔ ہر وقت مایا کی جان کو روتا رہتا۔ کبھی وہ کسی سے اور کبھی کسی سے آنکھ لڑاتی ہے۔ عورت کیا ہے۔ آگ کا گولہ ہے جو بجھنے ہی میں نہیں آتا۔ تیجو دودھ اور پکوڑیاں بیچ کر دن میں دو ڈھائی روپے بنالیتا ہے۔ لیکن یہ سب پیسے یا چوکیدار کی نذر ہوتے ہیں یا تھانے کے مسلمان محرر کی، جو روزنامچے میں مایا کے غائب ہونے کا اندراج کرتا ہے۔ عورت اچھی اور نیک خصلت ہوتی۔ تو تیجو بادشاہ سے کم نہ تھا۔ کماتا بھی ہے لیکن روتا بھی ہے۔ جانے غریب نے پچھلے جنم میں کونسے کرم کیئے تھے۔ جو اس جنم میں ایسی کتیا گلے بندھ گئی۔ جسے اوروں سے دم سنگھانے ہی میں مزا آتا ہے۔ اور اُس کے مقابل میں یہ کالی...... آزاد اور بے پروا گلہری!

میس (Mess) کے ممبر میری طرح جذباتی آدمی نہیں تھے۔ اُنہیں نہ آزادی کی تمنا ہے نہ غلامی کا افسوس! خچر کی طرح تین من بوجھ اُٹھانے کے عادی ہیں۔ مجھ سے ابھی تک اچھی طرح ہل جھل بھی نہ گئے تھے۔ دونوں طرف سے ابھی نگاہیں ایک دوسرے کی سیرت ٹٹولتی تھیں۔ جو بے تکلف ہونے کے لئے لازمی ہے۔ ایک ممبر کے گھر سے گلاس اور نئے بادام آگئے تھے۔ دوسرا ممبران کے جائز مصرف پر بحث کر رہا تھا۔ چیزیں ایسی نہیں۔ جس سے زیادہ دیر تک رکھا جائے۔ اس لئے تقسیم ضروری تھی۔ دُور افتادہ مقام پر کھانے پینے کی چیزیں بانٹنے سے آدمی کبھی گھاٹے میں نہیں رہتا۔ اگرچہ تقسیم تلخ محسوس ہوتی ہے۔ لیکن حاصل تقسیم بہت شیریں ہوتا ہے۔

تھوڑی ہی دیر میں گلاس اور باداموں کے چھوٹے چھوٹے ڈھیر لگ گئے۔

ڈاکٹر محمد افضل میر

ڈپٹی صاحب کا ڈھیر۔ نائب صاحب کا ڈھیر۔ ہیڈ کلرک کا ڈھیر۔ اکونٹنٹ کا ڈھیر۔ سید صاحب کا ڈھیر۔ بدری ناتھ کا ڈھیر وغیرہ اور سب سے بڑا ڈھیر اا پنے لئے۔ اپنے میس کے لئے!

ساتھ بج چکے تھے۔ آفتاب کی نورانی کرنیں سامنے والی پہاڑی کی چوٹی کو چوم رہی تھیں۔ جن کے پرتو سے مزدور کی پیٹھ کی طرح کالی چٹانیں اور بھی سیاہ دکھائی دے رہی تھیں۔ اور نیچے دریائے جہلم مست شرابی کی طرح چٹانوں سے ٹکراتا ہوا، سنبھلتا ہوا جا رہا تھا۔ خانقاہ کے سفید اور قرمزی کبوتروں کا ڈار بیل گاڑیوں کی منڈی میں پہنچ چکا تھا۔ سڑک پر رات کو ٹھہری ہوئی بسوں کی بھوں بھوں گونجنے لگی تھی۔

اُسی وقت کالی آ گئی۔ مسکرا مسکرا کر اُس نے سب کو سلام کیا۔ اس کے ساتھ اکو بھی تھی۔ چھ سات برس کی بے فکر لڑکی۔ جو ماں سے ایک لمحے کے لئے بھی جُدا نہ ہوتی تھی۔ پھلوں کے ڈھیر دیکھ کر کالی کے ہونٹ مسکراتے مسکراتے کانوں تک پہنچ گئے۔ اور اکو کی ننھی آنکھیں پھیل کر بہت بڑی ہو گئیں۔ ٹاشی، ماں بیٹی کو دیکھ کر بھونکا نہیں۔ صرف دم ہلا دی شاید وہ ان سے کافی مانوس ہو چکا تھا۔

کالی نے پوچھا۔ ''یہ کہاں سے آئے بابو جی؟''

ایک ممبر نے جو بظاہر تمبا کو پی رہا تھا۔ لیکن نگاہیں ڈھیروں پر ٹکی ہوئی تھیں۔ سر اوپر اُٹھا کر کہا۔ ''ہمارے گھر سے۔''

''پکے پھل ہیں۔ رسدار اور پُر مزہ'' کالی نے سر کھجلاتے ہوئے کہا۔

''میوے ایسے ہی ہوتے ہیں۔ جنہیں انسان کھاتا ہے۔'' اُس ممبر نے بے رخی سے جواب دیا۔

اکو ماں کی ٹانگوں سے جن کا حُسن سوسی کے پھٹے اور پُرانے کپڑوں نے اپنی آغوش میں لیا ہوا تھا۔ چمٹ گئی۔ اور اس کی آنکھیں ماں کے چہرے پر جم گئیں۔ ماں

نے ذرا تندی سے اُس کا سر دباتے ہوئے کہا۔ ''ٹھہرو تمہیں بھی دیں گے۔''

سب ممبروں نے گردنیں اُٹھا اُٹھا کر پہلے کالی کی طرف دیکھا اور پھر لوٹتی ہوئی نگاہوں سے ایک دوسرے کی طرف۔

''اکو گلاس اور بادام کھائے گی۔ کتنی واہیات خواہش! جس کے نزدیک چاول کا ریزہ رس گلے اور قلاقند کی لذت رکھتا ہے۔ وہ گلاس اور بادام کھائے۔ اُسے اِن چیزوں سے جنہیں صرف انسان کھاتے ہیں کیا سروکار؟''

دوسرے ممبر نے جو زیادہ تیز مزاج مگر صاف دل تھا۔ خشک سی ہنسی ہنس کر کہا۔ ہنس کر کہا۔ ''تم بھی پھل کھاؤ گی اکوّ؟''

اکوّ کے ہاتھ ڈھیلے پڑ گئے۔ وہ ماں کی ٹانگوں سے الگ ہو کر برآمدے کے قریب آ گئی اور آزاد اور بشاش کالی زور زور سے ہنسنے لگی۔

''نادان بچی ہے بابو جی۔ جھٹ مچل جاتی ہے۔'' کالی نے ہنستے ہنستے کہا۔

''کوئی بات نہیں۔ کوئی بات نہیں۔ ہم بھی بال بچے والے ہیں۔'' تیسرے ممبر نے یہ کہہ کر تمام ڈھیروں سے سُرخی مائل سفید گلاس چُن لئے۔ اور تھوڑے سے بادام۔ اور اکو کو دیتے ہوئے کہا۔ ''اب تو خوش ہونا......''

کالی کی مسرت دوگنی ہوگئی۔ ان مہربانوں نے اُس کی بچی کی کتنی عزت اور محبت کی تھی۔ اُس کی آنکھوں کے گرد سیاہی کے دائرے چمک اُٹھے اور چمڑے کی ٹیڑی ترچھی جُھریوں پر احسان اور عقیدت کے فسانے نے منقش ہو گئے۔

چوتھے ممبر نے جو سب ممبروں سے سنجیدہ دکھائی دے رہا تھا۔ حُقے کی نے کو گھماتے ہوئے کہا۔ ''بچوں کو اِتنا نہیں مچلنے دینا چاہئے کالی! کسی وقت یہ بے عزت کرا دیتے ہیں اور ایسے ان کی عادت بھی خراب ہو جاتی ہے۔''

کالی معنی کی گہرائی کو نہ پہنچ سکی۔ اُس نے اُسی طرح ہنستے ہنسے کہا۔ ''سچ ہے

بابو جی!'' اور پھر دو ایک تھپڑ اکو کے سر پر دے مارے۔ تا کہ اُس کی عادت ٹھیک ہو۔
اُسی وقت میرو بازار سے سودا لے کر آ گیا۔ آتے ہی اُس نے نا اُمیدی کے لہجے میں کہا۔ ''آج ٹاشی کے لئے غدود نہیں ملے جی۔''

سب چونک اُٹھے۔ ''ایں...... نہیں ملے؟''

میرو نے کہا۔ ''قصاب بدمزاج ہے۔ بات تک نہیں سنتا۔ اور آج ٹاشی شوربے کے بغیر......؟''

ٹاشی شوربے کے بغیر زندہ کیسے رہے گا۔ قصاب کی بدمزاجی نے اُسے آج جائز غذا سے محروم کر دیا تھا۔ بدمعاش قصاب! اچکا دو سال سے اُسی کی دوکان سے گوشت خریدتے آئے ہیں۔ پھر بھی اُسے آدمی پہچاننے کا شعور نہیں۔''

کالی نے پانی کے لئے بالٹی اُٹھائی اور میرو سے پوچھا۔ ''اسے شوربہ دیتے ہو؟''

میرو نے چوکے میں داخل ہوتے ہوئے کہا۔ ''اور کیا دیں اس پہاڑ میں۔ بیچارہ آج صاف مر گیا۔''

''جب ہی تو پھول گیا ہے۔'' کالی نے کہا۔

دودھ چولھے پر گرم ہو رہا تھا۔ اُس کی بھینی بھینی خوشبو سارے برآمدے کو معطر کر رہی تھی۔ کالی پانی کی ایک بالٹی لے آئی۔ پھر دوسری...... پھر تیسری۔

ہم کپڑے بدل کر چار پائیوں پر بیٹھے دودھ پی رہے تھے۔ اور ٹاشی ہمارے سامنے للچائی ہوئی نگاہوں سے دیکھ کر زور زور سے دُم ہلا رہا تھا۔

ایک ممبر نے جو ٹاشی کا حقیقی اور لاشریک مالک تھا۔ اُسے مخاطب کرتے ہوئے کہا۔ ''تم بھی پیو گے دودھ شیطان''۔

سب کھکھلا کر ہنس پڑے اور دور گری ہوئی دیوار کے ملبے پر بیٹھی ہوئی کالی

اور اکو بھی۔

''دراصل کتا بہت ذہین ہوتا ہے۔'' ہم نے ایک دوسرے سے کہا۔

ٹاشی مالک کی بات سُن کر اور بھی مچل گیا اور نزدیک آ کر زیادہ زور سے اپنی گھچے دار دم ہلانے لگا۔

''میرو...... ٹاشی کی رکابی لا دینا بھئی......'' مالک نے کہا۔

ہم نے دودھ کا تین چوتھائی حصہ پی لیا تھا باقی دودھ ٹاشی کا اضطراب دیکھ کر ہمارے حلق سے نہ اُترا بے چارا بے زبان ہے۔ اور وفادار بھی ہم سے نہ مانگے تو کس سے مانگے۔

''اسے بھی دودھ دے میرو۔'' کالی نے بیٹھے بیٹھے ہی نوکر سے کہا۔

میرو نے کہا۔ ''میرے پاس کہاں ہے...... ہاہاہا......''

ایک ایک کر کے ہم چاروں نے رکابی میں بچا کھچا دودھ انڈیل دیا۔ ٹاشی نے مزے لے لے کر پیا۔ اور نتھنے پونچھ کر ملبے کے ایک ڈھیر پر جا بیٹھا۔

جب کالی سستا کر جانے لگی۔ تو جاتے جاتے اکو نے پھٹی پھٹی آنکھوں سے تاشی کی رکابی کی طرف دیکھا جو اُس نے چاٹ کر صاف کی تھی۔ اور پھر ہمارے پیالوں کی طرف جن میں دودھ کی کچھ بوندیں تھیں۔ اُس کے پاؤں آنگن سے نہ نکلتے تھے۔ لیکن ماں اُسے گھسیٹ کر لے گئی کہ کہیں اُس کی عادت خراب نہ ہو۔

اُس کے جانے کے بعد سنجیدہ رو ممبر نے کہا۔ ''بدتمیز ہوتے ہیں یہاں کے لوگوں کے بچے...... ہاہاہا...... نرا ڈنگر۔''

میں سارا دن ملول رہا۔ سوچتا رہا۔ کالی کس قدر آزاد ہے اور بشاش! تمام حِس سلب ہو کر بھی خوش! شاید حِس ضائع ہو کر انسان خوش ہی رہتا ہوگا۔ شاید! اور پھر میں...... مجھے کیا چاہئے۔ مجھے؟ ------ جو انسان ہے ------ اشرف المخلوقات۔

کاریگر

شوروم کی وسعت میں سجائی ہوئی چیزوں سے وہ بظاہر اپنے مذاق کے مطابق ایک چیز کا بھی انتخاب نہ کر سکا۔ اُسے تپائی، ٹیبل لمپ اور سگریٹ کیس سے زیادہ سنگار بکس کی ضرورت تھی۔ لیکن ڈیزائن...... وہ خود بھی نہ جانتا تھا کہ کونسا پسند کرے۔ بار بار اپنی بیوی کا معطر خط نکال کر پڑھتا تھا۔ جس میں لِکھا تھا۔ ''چیزیں بے حد خوبصورت اور جاذب نظر بالخصوص میرا سنگار بکس......''

''بے حد خوبصورت اور جاذب نظر'' کے صحیح معنی تلاش کرنے کے لئے اُس نے بار بار اپنے دماغ کے پوشیدہ کونے چھان ڈالے۔ لیکن وہ سمجھ ہی نہ سکا۔ کہ پانسو میل دور سے فرمائش بھیجنے والی بیوی نے ان لفظوں کو کس پیرائے میں لیا تھا۔ اگر اُس نے خوبصورتی کو اپنی مخروطی اُنگلیوں، سفید پوست اور مخمور آنکھوں کے پیمانے میں تول کر سنگار بکس کی فرمائش کی ہے۔ تو شوروم ایسی چیزوں سے بھرا پڑا تھا۔ صاف اور ستھرے سنگار بکس پالش سے جگمگا رہے تھے۔ اور مالک دکان کی حریص نگاہیں اور چرب زبانی اُسے بہت کچھ خریدنے کی ترغیب دے رہی تھیں۔ لیکن وہ کو نفسیات کا معلم تھا۔ اُسے اپنے معار اور اپنے پیمانے مین اُس جگہ ہر چیز کو تولنے کا حق تھا۔ جہاں اُس کی بمردطی اُنگلیوں والی بیوی نہ تھی۔ اسی لئے مالک دُکان کی حریص نگاہوں کی ہنسی اُسے پھانسنے میں ناکام رہی۔ کیونکہ اُس کے نزدیک حُسن صرر رومانی تصور کا دھندلا

سا نقش تھا۔ جس میں وہ اپنی زندگی، اپنے محسوسات اور اپنے مذاق کا جھلملاتا ہوا عکس دیکھ سکتا تھا۔ یہاں نہ اُنگلیوں کی وضع قطع، نہ پوست کی بے ثور رنگت اور نہ آنکھوں کی بے کیفی کو دخل تھا۔ سنگار بکس کا تحفہ اُسے اپنی بیوی کو پیش کرنا تھا۔ جس کے حُسن میں وہ دراصل اپنے رومانی تصور کی عکاسی دیکھنے کا خواہشمند تھا۔

"مجھے کوئی ڈیزئن پسند نہیں...... !" اُس نے پیشانی سے پسینہ پونچھتے ہوئے کہا۔

"ہی...... ہی...... ہی" دکان کا مالک غیر ارادی طور پر ہنسا۔ شوروم کی ساری وسعت وحشیانہ قہقے سے لرز اُٹھی۔ پھر وہ اُس کے قریب آ کر اُسے سر سے پاؤں تک دیکھنے لگا۔ ایک دراز قد جنٹلمین، جس کے چہرے کی بدصورتی کو چیچک کے ناتراشیدہ داغوں نے دوبالا کر دیا تھا۔ جس کی گھنی مونچھیں ہونٹوں کے پاس سگریٹ کے کثرت استعمال سے زرد ہونے لگی تھیں۔ جس کی آنکھیں ضرورت سے زیادہ چمکیلی، لیکن عزم مستحکم لئے ہوئے تھیں۔

مالک دُکان نے شوروم کا سرسری نگاہوں سے جائزہ لے کر طنزیہ لہجے میں کہا۔

"عجیب بات ہے صاحب! ہم نے اپنی طرف سے مشرقی اور مغربی دونوں مذاقوں کے مطابق چیزیں تیار اور فراہم کر رکھی ہیں۔ لیکن پھر بھی آپ...... یہ دیکھئے یہ ٹیبل لمپ! کنول کے پتوں میں پوشیدہ۔ یہ ڈنٹھل...... یہ ڈنٹھلوں سے لپٹی ہوئی مچھلیاں یہ پھول...... ہی...... ہی یہ مغربی آرٹ کی طرز پہر بنایا گیا ہے۔ انگریز لوگ اس ڈیزائن کو بہت پسند کرتے ہیں۔ اِس کے برعکس یہ لمپ دیکھئے۔ مہاتما بدھ اسے تھامے ہوئے ہیں۔ یہ مغربی آرٹ کی طرح پوشیدہ نہیں۔ عیاں ہے عیاں۔ اور حضور جب یہ روشن ہوتا ہے۔ تو بدھ کا مجسمہ منور ہو اُٹھتا ہے۔ آپ شاید اسے پسند کریں گے

بڑی اچھی چیز ہے۔"

نفسیات کے معلم نے مشرقی آرٹ کی طرز پر بنا ہوا لمپ ہاتھ میں لیا۔ سچ مچ اس میں مغربی آرٹ کی طرح کوئی چیز پوشیدہ نہ تھی۔ مہاتما بُدھ کے پتلے پتلے لکڑی کے ہاتھوں میں وہ ڈنڈی تھی۔ جس کے اوپر ہولڈر لگا ہوا تھا۔ اس میں نہ ڈنٹھل تھے نہ ڈنٹھلوں سے لپٹی ہوئی زیرِ آب مچھلیاں۔ ہر چیز واضح، عیاں اور مکمل تھی!

اُس نے سوچا۔ "یہ کشمیری ضاع بھی کس قیامت کے ذہین ہوتے ہیں۔ مغرب اور مشرق کی تہذیبوں کا یہ تضاد...... پوشیدہ اور عیاں کسی خوبصورت انداز میں لکڑی کے پالش شُدہ ٹکڑوں پر پیش کیا ہے۔ اس میں کتنی گہرائی، کتنی صدیوں کی عظمت پارینہ کی جگر خراش حسرت، کتنے معافی اور کتنی رنگین خیالی ہے۔ مغرب کی تہذیب پوشیدہ! ڈنٹھلوں سے لپٹی ہوئی مچھلیوں کی طرح محتاج اور غیر مکمل! اور مشرق کی تہذیب، مذہب کے دلفریب سایوں میں پروردہ، واضح اور مکمل!"

"یہ کس نے بنایا ہے۔ میرا مطلب ہے کس کاریگر نے؟" اُس نے سنجیدہ لہجے میں مالک دکان سے پوچھا۔

مالک دکان کی پلکیں، جن کے نیچے حرص وہوا کی روپہلی لکیر سی بہہ رہی تھی جلد جلد جھپکنے لگیں۔ اُسے یقین ہو گیا کہ خریدار مشرقی آرٹ کا ٹیبل لمپ خریدنے پر آمادہ ہو گیا ہے۔ بولا۔ "ہمارے کارخانے کے ایک معمر کاریگر نے......آپ دیکھیں گے اسے؟ حضور بڑا نیک نیت آدمی ہے۔ اور پچیس سال کا تجربہ کار۔ چیز کہ دو۔ بس ٹھیک بنا دیتا ہے۔ میں اُنیس تک فرق نہیں ہوتا......"

نچلی منزل کے ایک مختصر سے کمرے میں جہاں ایک چٹائی بچھی ہوئی تھی۔ ایک معمر انسان میلی سی شلوار میں ملبوس کسی چیز پر سنگ خرا سے پالش کر رہا تھا۔ تانبے کی طرح سیاہی مائل سُرخ جسم جس کی ہڈیاں گنی جا سکتی تھیں پسینے سے شرابور ہو چکا تھا۔

پیٹ پر قدرت نے آگ کے قلم سے نقش ونگار بنائے تھے۔

مالک دکان نے پر مسرت لہجے میں کہا۔ ''مام دینا'' اور پھر نفسیات کے معلم سے کہا۔ ''یہ ہے صاحب ہمارے کارخانے کا تجربہ کار کاریگر جس کے ہاتھ کی بنی ہوئی چیزیں نیویارک، لندن، وائنا اور استنبول تک پہنچ گئی ہیں......''

نفسیات کا معلم اور حسین سنگار بکس کا خریدار ٹھٹھک گیا۔ اُسے محسوس ہوا جیسے بد مذاق اور غیر آراستہ کمرے میں بیٹھے ہوئے نیم عریاں انسان نے اُس کے غرور کو جھٹلا دیا۔ جو شاید مغرب اور مشرق کی تعریف تک سے نا محرم تھا۔ جسے شاید اتنا بھی معلوم نہ تھا کہ ان پچیس سالوں میں دنیا کہاں سے کہاں پہنچ گئی۔ لیکن جو اسی کمرے میں آج سے کئی برس پیشتر لکڑی کے چھوٹے چھوٹے ٹکڑوں پر اپنے آہنی قلم سے تہذیب انسان کی بدلتی ہوئی لافانی تصویر بنا رہا تھا۔

مام دین نے قلم ہاتھ سے رکھا۔ اور چہرے پر اطمینان کی مسکراہٹ پھیلا کر بولا۔ ''سلام حصور!''

وہ اتنی پتلون کو اُوپر کھینچ کر کاریگر کے پاس بیٹھنے لگا۔ شاید یہ دیکھنے کے لئے کہ وہ کس چیز پر پالش کر رہا ہے۔

مالک دکان نے جھٹ اُس کا ہاتھ روک کر کہا۔ ''ہائے ہائے! کہاں بیٹھا چاہتے ہیں حضُور! یہ جگہ...... یہ...... ناصاف ہے''۔ مام دین بھی خریدارا کی اس بد تہذیبی پر گھبرا اُٹھا۔ کہیں ایسا نہ ہو۔ کہ قیمیتی لباس میں ملبوس جنٹلمین اُس کے برابر بیٹھ جائیوہ کھونٹی سے کپڑے کی چادر اُتارنے کے لئے دوڑا۔ تا کہ اُسے چٹائی پر بچھا کر نا صاف جگہ کو خریدار کے بیٹھنے کے قابل بنا سکے۔ اور نفسیات کے معلم کو بھی نہ نفسیات کا معلم! کارڈ مخمل کا پتلون...... عزت، شہرت!''

مالک دکان اس کا بدلتا ہوا ارادہ تاڑ گیا۔ ہنس کر بولا۔ حضور آپ کسی جگہ

بیٹھنے لگے تھے۔ اگر آپ یہ چیز دیکھنا چاہتے تھے۔ تو ہم اسے دفتر میں منگا سکتے ہیں۔ حقیقت میں یہ یہ ہماری بے عزتی ہے کہ ایسی مشہور دکان پر آیا ہوا خریدار ایک...... معمولی کاریگر کے پاس بیٹھے۔ اور اس چٹائی پر...... ہاہاہا......؟

نفسیات کا معلم دل ہی دل میں سوچ رہا تھا۔ ''مام دین کا وجود بھی ایک حُسن ہے۔ دماغی حسن۔ جو جسمانی حُسن سے بالکل مختلف ہے اور بے پروا۔ اور مشرقی آرٹ کی طرح واضح، عیاں اور اپنے سے مطمئن......!''

اُس نے مالک دکان کی باتیں توجہ سے نہ سنی تھیں۔ تاہم اُس نے کہا۔ ''ٹھیک ہے۔ ٹھیک ہے۔''

مالک دکان نے وہ لکڑی کا ٹکڑا رکھایا۔ جسے مام دین رگڑ رگڑ کر چمکا رہا تھا۔

''یہ ایک انگریز کی فرمائش ہے حضور! ایک سگریٹ کیس۔ آج پندرہ دن کے بعد تیار ہو گیا ہے۔ یہ دیکھئے باریک کام۔ یہ بیل بوٹے کس محنت اور جانفشانی سے اُبھارے گئے ہیں۔ اور پھر انہی بیل بوٹوں میں یہ چھوٹا سا مونو گرام (W.D) ولیم ڈیوس!......''

وہ اسے غور سے دیکھتا رہا۔ اور مام دین کی سوکھی سوکھی ٹانگیں میلی شلوار میں کانپنے لگیں...... کانپنے لگیں کہیں یہ جنٹلمین نقش و نگار میں کوئی نقص نہ نکالے۔

وہ کبھی کبھی مام دین کی طرف بھی اپنی ضرورت سے زیادہ چمکیلی آنکھوں سے دیکھتا گیا۔ اسے اس کے سوکھے بدن میں صرف حسن ہی حسن، نزاکت ہی نزاکت، رنگینی ہی رنگینی نظر آئی۔ تجربہ کار کاریگر جس کے دماغ کا حُسن اب بھی وائنا اور استنبول کی عالیشان عمارتوں کی زینت بنا ہوا تھا۔ لیکن جو خود میلی سی شلوار میں ایک بدمذاق کمرے کی چٹائی پر زندگی کے دن پورے کر رہا تھا۔

تھوڑی دیر کے بعد اس نے مالک دکان سے پوچھا۔ ''اس سگریٹ کیس کی

کیا قیمت ہوگی......؟؟

مالک دکان نے مام دین کی موجودگی ہی میں مسکرا کر کہا۔ ''واجبی دام اس حضور! آپ سے رعایت ہی ہوگی۔ دراصل انگریز لوگ قیمتوں کی اُلجھنوں میں زیادہ نہیں پڑتے۔''

اُس نے سگریٹ کا ایک لمبا کش کھینچتے ہوئے پوچھا۔ ''پھر بھی ہم سے کیا لیں گے؟''

مالک دکان نے فخریہ لہجے میں کہا۔ ''انگریز سے ساٹھ روپے۔ اگر آپ پسند کریں تو صرف پینتالیس!''

معلم کے دماغ میں دوبارہ مغرب اور مشرق کی تہذیبوں کا تضاد گھومنے لگا۔ انگریز سے ساٹھ اور ہندوستانی سے پینتالیس پوشیدہ اور عیاں محتاج اور واضح!

وہ روز سے ہنسا۔ بہت زور سے حتیٰ کہ لرزتا ہوا مام دین بھی اپنی دبی ہوئی مسکراہٹ کر قابو میں نہ رکھ سکا۔ ''انگریز سے ساٹھ اور مجھ سے پینتالیس ...... ہاہا...... ہا......؟

پھر اس نے مام دین سے کہا۔ ''استاد ہمیں ایک سنگار بکس کی ضرورت ہے۔ جس پر کوئی خوبصورت سی چیز ہو۔ میرا مطلب ہے ہمارے مذاق کے مطابق بیل بوٹے نہیں۔ ڈنٹھلوں سے لپٹی ہوئی مچھلیاں نہیں۔ بس کوئی جانور، کوئی پرندہ، اُڑتا ہوا، بھاگتا ہوا، آزاد اور مسرور، خوبصورت اور جاذب نظر! سمجھ گئے......؟''

مام دین نے مالک دکان کی طرف دیکھا۔ پھر ہاتھ جوڑ کر کہا۔ اچھی بات ہے حضور! بنادوں گا۔ انشاء اللہ آپ پسند کریں گے۔''

اُس نے پھر کاریگر کو سمجھانے کی کوشش کرتے ہوئے کہا۔ مثلاً چڑی مار، عقاب، باز، شیر ببر، یعنی جس کا شعار آزادی ہو۔ جس کا مقصد...... جِس کا مقصد بس

آزادی ہو۔صرف آزادی ہو۔سمجھ گئے؟''

مام دین کی بے کیف آنکھوں میں چمک سی پیدا ہوگئی۔اس کے بے نور چہرے پر سنجیدگی پھیل گئی۔آہستہ سے بولا۔''سمجھ گیا حضور۔زندگی یہی سمجھتے سمجھتے گزر گئی...... یہ بناتے بناتے گزر گئی......یہی عقاب اور باز، چڑی مار اور شیر، بدھ اور کنول۔لیکن آپ مطمئن رہیں۔حضور کی چیز ان سب سے نرالی ہوگی......''

نفسیات کے معلم نے لمبی سانس کھینچی۔ذہنی کوفت کا وہ ارتعاش جو اس کی روح تک کو چھو چکا تھا۔ختم ہوگیا۔ایک نرالی چیز......نہ عقاب نہ باز......صرف آزادی کے صحیح معنی لئیہوئی نئی تصویر جس کا عکس صرف مام دین کے رومانی تصور پر پڑ چکا تھا۔ اور نفسیات کا معلم اس سے بے خبر تھا...... مطلق ناواقف!

اُس نے مطمئن ہوکر کہا۔''اگر چیز ہماری پسند کی ہوگی۔تو ہم تمہیں انعام بھی دیں گے۔''

اور پھر انعام کا معیار قائم کرنے کے لئے اس نے شکارے میں بیٹھ کر مالک دکان سے پوچھا۔''اس کاریگر کی روزانہ اُجرت کتنی ہے''

مالک دکان نے مسکرا کر کہا۔''حضور پہلے تو بارہ آٹھی ساب پورا روپیہ لیتا ہے۔حساب کے معاملے میں بڑا ڈھیٹ واقع ہوا ہے۔''

شکارے میں بیٹھے بیٹھے وہ سوچتا رہا۔انگریز سے ساٹھ۔ہندوستانی سے پیتالیس اور حساب کے معاملے میں بڑے ڈھیٹ کاریگر کو صرف پندرہ روپے۔جس کینام کی بنیاد تک زمانے نے رگڑ رگڑ کر مٹا دی ہے۔جسے شاید اس کا بھی احساس نہیں کہ اُس کے اصلی نام کا مفہوم کیا ہے۔اور اب شہرت یافتہ لیکن مخفی نام کا مطلب کیا......!

دس دن کے بعد وہ پھر کارخانہ میں آگیا۔

مام دین اُس کے سنگار بکس پر سنگ خارا سے پالش کر رہا تھا۔

اُس نے دیکھا۔ سنگار بکس پر ایک اژدہے کی تصویر کُھدی ہوئی ہے۔ جو منہ کھولے کسی چیز کے پیچھے بھاگا جا رہا ہے۔

وہ مسرت سے جھوم اُٹھا۔ "واہ واہ! خوب چیز ہے۔" اُس نے مالک دکان سے کہا۔ "بالکل میرے مذاق کے مطابق۔ آزاد۔ بے پروا اژدہا...... جو تہذیب کا قائل نہیں۔ جو مذہب کا پروردہ نہیں۔ جو صرف آزاد ہے۔ آزاد۔"

مام دین اپنی چیز کی تعریف سن کر خوشی سے تھرتھراتے لگا۔ اُس کا چہرہ پسینے سے شرابور ہو گیا۔

نفسیات کا معلم ایک نظر سے سنگار بکس کو دیکھ رہا تھا۔ اور دوسری نظر سے دماغی حُسن کے سراپا مجسمے کو...... معاً اسے محسوس ہوا جیسے اژدہے کی چوبیں آنکھوں میں نفرت، کشمکش اور انتقام کی بے پناہ آگ دہک رہی ہے۔ اور جیسے وہ سارے کرہ ارض کو ڈسنے، اپنیز ہر سیتباہ و خاکستر کرنے کے لئے بھاگا آ رہا ہے۔

اُس نے کتنی ہی دیر تک مامدین کے چہرے اور نحیف جسم کی طرف خاموش مگر لرزاں نگاہوں سے دیکھا۔ لحہ بہ لحہ اُسے شک ہوا یہ اژدھا نہیں۔ یہی کانپتا ہوا مام دین ہے۔ یہی معمر کارگیر یہی تانبے کی طرح سیاہی مائل سرخ اور نیم عریاں انسان۔ جو انگریز اور ہندوستانی، مغرب اور مشرق، تہذیب اور مذہب سبھوں سے اپنا انتقام لینے کے لئے بھاگا آ رہا ہے۔

اُس کی ٹانگیں کانپنے لگیں۔ ہونٹ تھرتھرانے لگے۔

بے اختیار ہو کر اس سے کہا۔ "مام دین"

"جی حضور!"

"...... مام دین...... ما...... م...... دین۔" اُس نیز یادہ بے تابی سے کہا۔

''حضور کیا بات ہے۔ ڈیزائین پسند نہیں'' مام دین نے کانپتے کانپتے پوچھا۔

''بہت اچھا ڈیزائین ہے۔ بہت اچھا۔ لیکن ہمیں معاف کردو۔ معاف کردو۔ ہم نے تمہیں پہچانا نہیں۔ مغرب اور مشرق، انگریز اور ہندوستانی سب کو معاف کردو۔ سب کو بخشو۔ اپنا پھن سمیٹ لو۔ اپنا زہر نگل جاؤ......''

وہ جلد جلد سیڑھیاں اُترا۔ اُس کی سانس پھول چکی تھی۔ رگ رگ پھڑک رہی تھی۔ چمکیلی آنکھوں میں یاس پھیل گئی تھی۔ اور منہ سے تعفن سا آرہا تھا۔

''ہمیں معاف کردو۔ بخشو۔ ہم بے گناہ ہیں۔ زمانے کو ڈسو! تہذیب اور مذہب سے انتقام لو......لیکن ہمیں بخشو۔ بخشو! معاف کردو......!''

اور مام دین اپنے کمرے کی کھڑکی سے کہہ رہا تھا۔ ''حضور میرا انعام! ۔۔۔حضور......اے حضور۔ انعام!''

مالک دکان دونوں کی سراسیمگی اور دیوانگی پر حیران ہو رہا تھا۔

............☆☆☆............

سکھو کی واپسی

(۱)

بیوی کے مرجانے پر نریندر کی عمر بیس سال کی تھی۔ یہ اُس کا آخری سہارا تھا۔ جو موت کے بے درد ہاتھوں نے اُس سے چھین لیا۔ صرف چھیننا ہی نہیں بلکہ شاما کی تولید نے اس کی مصیبتوں میں اضافہ کردیا۔

اُس کی بیوی حُسن اور شباب کی دیوی تھی۔ نریندر اُسے دیکھ کر ساری دنیا کو بھول جاتا۔ جب تک وہ زندہ رہی۔ نریندر کے گھر میں مسرت اور شادمانی لائی۔ دونوں نے نہ صرف ازدواجی زندگی ہی بسر کرتے تھے۔ بلکہ محبت کی پاکیزہ اور حسین دنیا میں بھی رہتے تھے۔ اور اکثر راتوں ایک دوسرے کے پہلو میں بیٹھ کر کھو جاتے تھے۔

جب وہ بیمار پڑی۔ تو نریندر نے اُس کا علاج کرانے میں کوئی دقیقہ نہ اُٹھا رکھا۔ جہاں کہیں ڈاکٹر تھا۔ حکیم تھا۔ وئید تھا۔ پیر اور فقیر تھے۔ انہیں گھر بلایا۔ روپے پیسے کی کمی نہ تھی۔ تھیلیوں کے منہ کھلے رکھے۔ لیکن موت نہ محبت کو دیکھتی ہے نہ حسن کو اس نہ دولت کو۔ وہ خاموشی سے اپنا کام کرکے چلی جاتی ہے۔

تیمارداری کے دنوں میں نریندر کی صورت ہی بگڑ گئی۔ راتوں کو جاگ جاگ کر آنکھیں اندر کو دھنس گئیں۔ ڈاڑھی انچ انچ بھر بڑھ آئی۔ بدن سوکھ کر کانٹا ہو گیا۔

کپڑے مہینہ بھر سے نہ بدلے۔ اب نہ اس کا کارخانے میں دل لگتا تھا۔ نہ بیمار بیوی کو دیکھ کر گھر میں چین آتا تھا۔ کتنی ہی بار اس کی بیوی نے پوچھا۔ ''آپ میرے لئے اتنا غم کیوں کھاتے ہیں؟''

اُس وقت نریندر کی آنکھیں آنسوؤں سے پُر ہوتیں۔ وہ کچھ نہ کہہ سکتا۔ صرف آنسو بھری نظروں سے اُسے دیکھتا۔ اُس کی بیوی اُس کا غم غلط کرنے کے لئے کوئی اور بات چھیڑتی۔ کیونکہ وہ جانتی تھی۔ کہ نریندر کو اس سے محبت ہی نہیں بلکہ محبت کا جنون ہے۔ لیکن نریندر کسی بات میں بھی دلچسپی نہ لیتا۔ اسے ساری دنیا جلتی ہوئی دکھائی دیتی۔ جب وہ مر گئی۔ تو نریندر کی دنیا تاریکیوں سے بھر گئی۔ اسے محسوس ہوا۔ جیسے اس وسیع دنیا میں وہ اکیلا رہ گیا۔ اور اسکا ساتھی اسے دھوکا دے کر چلا گیا۔ اس نے کئی بار اپنے آپ کو ختم کرنے کی سعی کی۔ لیکن شاما کی محبت میں کچھ نہ کر سکا۔ یہ اُس کی بیوی کی آخری اور پاکیزہ نشانی تھی۔ جو مرتے دم اس نے اپنے خاوند کے حوالے کی تھی۔ اور بھرائی ہوئی آواز میں اور ہاتھ جوڑ کر کہا تھا۔ ''شاما کا خیال رکھنا۔ دوسری شادی بھی کرو گے تو اسے نہ بھولنا۔''

اس وقت نریندر کی حالت عجیب ہوگئی تھی۔ اس نے چاہا تھا کہ موت کے ساتھ مقابلہ کرے۔ اُسے ساری دولت دے کر ٹال دے لیکن آج تک ایسا کس نے کیا ہے۔ کون کر سکا ہے؟

(۲)

چار سال تک اسے دوسری شادی کا خیال نہ آیا۔ جو دوست اور رشتہ دار دوسری شادی کا مشورہ دیتے۔ انہیں وہ حقارت بھری نظروں سے دیکھتا۔ اور کہتا۔ ''کیا مرد اس قدر ذلیل ہیں کہ اپنی بیوی کے لئے اپنا سکھ بھی قربان نہ کر سکیں؟''

اُس کے دوست ہنستے۔ اور بے تکلفی سے کہتے۔ ''بندہ نواز یہ فلسفہ تو کئی

رشیوں نے شروع شروع میں بگھارا تھا۔ لیکن بعد میں وہی حقیر تنکوں کی طرح سیلاب عشق میں بہ گئے۔''

نریندر جواب دیتا۔ ''مجھے اُن رشیوں میں شمار نہ کریں۔ میں سیدھا سادا آدمی ہوں۔ ایک پاکیزہ اصول کا قائل!''

اُس وقت اس کی آنکھیں غمناک ہوتیں۔ اور اسکے برابر بیٹھے ہوئے دوست اور رشتہ دار چپ ہو جاتے اُن کے دل میں نریندر کی عزت بڑھ جاتی۔

اس نے شیاما کی پرورش کے لئے ایک دایہ رکھی تھی۔ اگر چہ اسے اپنے قدیمی نوکر سکھو پر پورا پورا بھروسہ تھا۔ لیکن اسے معلوم تھا کہ سکھو کی عمر پک چکی ہے۔ اور اب پانچ سالہ بچی کی پرورش کا بوجھ اُٹھانے کے قابل نہیں۔ شیاما کے لئے سکھو کا پیار ہے لیکن خدمت نہیں۔ ساتھ ہی ساتھ اُس کی کایا ہی پلٹ گئی۔ گھر میں شیاما اور سکھو نہ ہوتے تو شاید وہ سنیاس دھارن کر لیتا۔ لیکن ان کی محبت ہمیشہ اس کے راستے میں کھڑی ہو جاتی۔ اُسے اب نہ اپنے گھر میں دلچسپی تھی۔ نہ کارخانے میں۔ ایک قیدی کی طرح جس کی۔۔۔۔۔ وقید غیر معین ہو وہ دن بھر کارخانے میں رہتا۔ اور شام کو گھر لوٹتا۔ اسے ہر چیز میں ایک مجبوری سی دکھائی دیتی۔ وہ بشاشت وہ سکون جو چار سال پہلے اسے حاصل تھا۔ اب مکمل طور پر ختم ہو چکا تھا۔

وہ صبح سویرے بستر سے اُٹھتا اور مندر چلا جاتا۔ گھنٹوں وہیں برآمدے میں بیٹھتا۔ یہاں اسے عارضی سکون سا ملتا۔ جانے پہچانے لوگ اُسے عزت کی نگاہوں سے دیکھتے۔ اور ایک دوسرے سے کہتے ''دیوتا ہے۔ بیوی کیا مرگئی اپنے من کو مار لیا۔ اب پربھو کا کیرتن کرتا ہے۔''

مندر میں ایک حُسین لڑکی بھی آتی تھی۔ شکل وصورت سے معلوم ہوتا تھا۔ بڑے گھرانے کی ہوگی۔ اور کافی تعلیم یافتہ بھی۔ وہ اکثر نریندر کو مندر کے برآمدے

میں اداس بیٹھے دیکھتی ۔ تو دل ہی دل میں سوچتی۔ ''اسے کیا روگ ہے۔ اتنا خوبصورت اتنا جوان آسمان کے تارے بھی توڑ کر لانا چاہے تو لا سکتا ہے۔ پھر اُداس کیوں ہے؟''

نریندر بھی اسے دیکھتا۔ کبھی دیکھ کر دوسری طرف منہ پھیر لیتا اور کبھی تنگ ہو کر آنکھیں بند کر لیتا۔ وہ لڑکی اس کے پاس سے گزر جاتی ۔ اس کے کپڑوں کی خوشبو کافی دیر تک نریندر کے دماغ کو مہکائے رکھتی۔

ایک دن نہ جانے نریندر کو کیا ہو گیا۔ اس کے دل میں ہزاروں سوئیاں چبھ گئیں۔ اُٹھ کر گھر چلا گیا۔ سوچتا رہا۔ 'آج مجھے کیا ہو گیا۔ میرے دل میں یہ کمزوری کہاں سے آ گئی؟''

اسے محسوس ہوا۔ جیسے اس کے گلے میں رسی باندھی گئی ہو۔ اور کوئی ان دیکھی طاقت اسے گھسیٹ کر لے جا رہی ہو۔ سکھو چائے لے کر آ گیا۔ تو حیران رہ گیا۔ نریندر کُرسی پر گردن جھکائے بیٹھا تھا۔

نریندر نے گردن اوپر اٹھائی۔ آہستہ سے کہا ''لے آؤ بابا'' سکھو نے تپائی پر چائے رکھی اور باہر جانے لگا۔

نریندر نے پوچھا۔ 'شیاما نے چائے پی لی؟''

سکھُو ایک دو قدم واپس آ گیا۔ ہنس کر بولا۔ ''پی لی سرکار۔''

(۳)

نریندر اب مندر میں سکون حاصل کرنے کے لئے نہیں جاتا تھا بلکہ کرشنا کو دیکھنے کے لئے۔ اس سے باتیں کرنے کے لئے دونوں میں اس حد تک محبت ہو گئی تھی کہ مندر کے دیوتا کے سامنے انہوں نے شادی کرنے کا اقرار بھی کر لیا تھا۔ وہ گھنٹوں مندر کے باغیچے میں بیٹھے اور باتیں کرتے ۔ نریندر۔ اس حد تک بدل چکا تھا۔ کہ زنگ

آلو دلوہے کی طرح جسے مسلسل طور پر استعمال کیا جائے اس میں چمک پیدا ہوگئی تھی۔ وہ چہیتی لیکن مرحوم بیوی کو بھی فراموش کر چکا تھا۔ رات اور دن نئی دنیا کے خواب دیکھ رہا تھا۔ اور انہی خوابوں میں ڈوبا رہتا تھا۔ شام کو بھی کارخانے سے گھر آنے کی بجائے کرشنا کے ساتھ سیر کو جاتا۔ اور رات گئے وہاں سے واپس لوٹتا۔

ایک دن شام کو وہ دونوں سیر کو نکلے تھے۔ آسمان پر چاند بھی تھا اور بادل بھی تھے۔ نریندر کے منہ میں سگریٹ تھا وہ لمبے لمبے کش لگا رہا تھا۔

ایک جگہ اچانک رک کر اس نے کرشنا سے پوچھا۔ ''تم مندر میں کیوں آتی ہو کرشنا؟''

کرشنا اس کا مطلب تاڑ گئی۔ بولی۔ ''دیوتا کے لئے۔''

نریندر نے پوچھا۔ ''اور میری طرف کیوں دیکھتی رہتی ہو۔''

کرشنا کے گالوں پر سرخی چھا گئی۔ جلد جلد اس نے کہا۔ ''آپ کی طرف تو کبھی نہ دیکھا۔ اُلٹا آپ ہی مجھے گھور گھور کر دیکھ رہے ہیں۔''

نریندر نے ہنس کر کہا۔ ''ٹھیک ہے۔ کاش تم مندر میں آیا ہی نہ کرتیں۔ تم نے تو میری دُنیا ہی بدل دی۔''

کرشنا نے کہا۔ ''الزام میرے سر تھوپتے ہیں۔ آخر میرے چہرے پر کیا دھرا ہے۔ جس کی طرف آپ دیکھ رہے ہیں۔''

نریندر نے لمبی آہ کھینچ کر کہا۔ ''یہ میری آنکھوں سے پوچھو کرشنا، انہوں نے تمہارے چہرے پر کیا دیکھا۔''

کرشنا نے تعجب سے پوچھا۔ ''کیا دیکھا''۔

نریندر تھوڑی دیر بعد کہا۔ ''اپنی مرحوم بیوی کا حسن! اُس کی لافانی محبت!''

کرشنا کھلکھلا کر ہنس پڑی۔ کہنے لگی۔ ''آپ دقیانوسی آدمی معلوم ہوتے

ہیں۔ جو تیر کمان سے نکل گیا۔ اُس کا افسوس کیا۔ شکر کیجئے آپ کے کوئی بچہ نہیں۔ نہیں تو مصیبت ہوتی۔"

نریندر چونک پڑا۔ بولا۔ "کونسی مصیبت؟"

کرشنا نے ساڑھی کے پلے کو گھماتے ہوئے بے پروائی سے کہا۔ "کون اسے پالتا۔ کون اس کی دیکھ بھال کرتا۔ بیوی کے بعد اس کا بچہ ایک بوجھ سا معلوم ہوتا ہے۔ مرد کے لئے بھی اور دوسری بیوی کے لئے بھی؟"

نریندر نے آہستہ سے کہا۔ "اگر میرے کوئی بچہ ہو......تو......"

کرشنا نے چونک کر پوچھا۔ "ہے کوئی"

نریندر نے کہا۔ "اگر ہو۔ تو تم شادی نہ کروگی؟"

کرشنا خاموش ہوگئی۔ دور کھیتوں کی طرف دیکھ کر اس نے آہستہ سے کہا۔ "مشکل ہی ہوگی۔"

نریندر بے بس سا ہوگیا۔ اس نے چاہا کہ کرشنا سے کہہ دے شیاما میری بچی ہے۔ لیکن جنونِ محبت میں وہ ہونٹ نہ ہلا سکا۔

چاند اب بادلوں کے پیچھے چھپ گیا تھا۔ کرشنا نریندر کی بے بسی بھانپ گئی۔ اس نے دوبارہ پوچھا۔ "آپ کے کوئی بچی ہے؟"

نریندر نے جلد جلد اپنے راز کو مظاہر نہ کرنے کے لئے کہا۔ نہیں۔ نہیں تو......؟"

کرشنا نے فراغت کا سانس لیا۔ اور مسکرا کر بولی۔ "گڈ لک!"

چاند کبھی بادلوں سے نکلتا تھا۔ اور کبھی ان میں چھپ جاتا تھا۔ اور نریندر اور کرشنا آہستہ آہستہ قدم اُٹھاتے ہوئے سیر سے واپس آرہے تھے۔ جانے کے وقت نریندر خوش ہی نہیں بلکہ مست تھا۔ واپسی پر وہ ڈوبا ہوا سا تھا۔

اس رات وہ گھر میں سو نہ سکا۔ کبھی کرسی پر بیٹھا۔ کبھی پلنگ پر لیٹا۔ کبھی کمرے میں ٹہلا۔ سوچتا رہا۔ مجھے کیا ہو گیا۔ میں نے کیوں کرشنا سے نہیں کہا۔ ''شیاما میری بچی ہے۔ تمہیں منظور ہے تو میرے سات شادی کرو۔''

کبھی سوچتا۔ کرشنا کی بات بھی صحیح ہے۔ سچ مچ پہلی بیوی کی اولاد باپ کے لئے ایک مصیبت ہوتی ہے۔ اور خصوصاً نابالغ بچے۔ دوسری بیوی کو کیا پڑی ہے کہ اپنی سوت کے بچوں کو پالتی پھرے۔

(۴)

کئی دن بیت گئے۔ سکھو اپنے مالک کا سب کچھ بھانپ گیا تھا۔ وہ مالک کی بدلی ہوئی ذہنیت پر کبھی کبھی رو اُٹھتا۔ ایک دن شام کو نریندر نے سیر سے آتے ہی اسے بلایا اور کہا۔''

سکھو بابا۔''

سکھو نے آ کر حیرانی سے پوچھا۔ ''ہاں مالک!''

نریندر نے کہا۔ ''ایک بات کہوں۔ مانو گے؟''

سکھو نے بے تابی سے کہا۔ ''مانوں گا کیوں نہیں۔ جس کا نمک عمر بھر کھایا۔ اُس سے آنکھیں کیسے پھیر لوں۔''

نریندر تھوڑی دیر کے لئے اپنے سامنے لٹکتی ہوئی مرحوم بیوی کی تصویر کو دیکھنے کے بعد بولا۔ ''تم جانتے ہو سکھو۔ میں جوان ہوں پیسے والا ہوں، حسین ہوں............''

اس سے آگے وہ نہ بول سکا۔ اور بوڑھا سکھو کانپتا ہوا ذرا نزدیک آ گیا۔

نریندر نے فرش کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ ''چار سال میں اپنے آپ پر قابو رکھ سکا۔ بدمست ہاتھی کی طرح اپنے جوان دل کو آہنی زنجیروں سے باندھ رکھا۔

لیکن اب......اب۔''

سکھُو زیادہ بے تاب ہو گیا۔ بولا۔''اب کیا ہوا مالک؟''

نریندر نے ناخن سے فرش پر لکیریں کھینچتے ہوئے کہا۔''میں شادی کروں گا۔''

سکھُوں نے اطمینان کا سانس لیا۔ جھوم کر بولا۔''تو روکنے والا کون ہے سرکار؟ آپ نہیں دیکھتے۔ گھر اداس ہے۔ آپ اداس ہیں۔ شیاما اداس ہے۔ میں اداس ہوں۔ اور تو اور وہ رات ہی کیا جس میں چاند نہ ہو۔ وہ راجا ہی کیا۔ جس کی رانی نہ ہو۔ وہ گھر ہی کیا جہاں عورت نہ ہو۔ کیجئے مالک ضرور کیجئے۔ میرے لئے کیجئے۔ شیاما کے لئے کیجئے۔ اس بھرے گھر کے لئے کیجئے۔''

نریندر نے گردن اوپر اٹھائی۔ سکھُوں کی طرف دیکھا۔ اور زیر لب مسکرا دیا۔ تھوڑی دیر کے بعد بولا۔''لیکن تمہیں ایک کام کرنا ہوگا بابا؟''

سکھُو ابھی تک مسرت سے جھوم رہا تھا۔ اس نے پوچھا۔''کونسا! انتظام؟ وہ تو میں کر ہی لوں گا۔ کیا مجال کس چیز کا نقصان ہو۔''

نریندر نے کہا۔''نہیں انتظام نہیں۔ لیکن سننے سے پیشتر وعدہ کرو......کہ کسی پر ظاہر نہ کرو گے۔''

سکھو نئے خواب دیکھ رہا تھا۔ نئی رانی کا خوبصورت تصوّر اُس کے دماغ پر چھا گیا تھا۔ اُس نے کہا''کہہ دیجئے ایشور کی سوگند۔ کسی کو کانوں کان خبر نہ ہوگی۔''

نریندر نے زمین کی طرف دیکھتے ہوئے رُک رُک کر کہا۔ شیاما کو تم لے جاؤ۔''

سکھُو اب تک کھڑا تھا۔ اب اس سے نہ رہا گیا۔ اسے محسوس ہوا جیسے وہ پہاڑ کی چوٹی سے گرا جا رہا ہو۔ وہ اپنے آپ کو نہ سہار سکا۔ فرش پر بیٹھ گیا۔ اُس کا منہ حیرت

سے کھل گیا۔ آنکھوں میں چمک سی آ گئی۔ بولا۔ ''شیاما کو؟''

نریندر نے بھرائی آواز میں کہا۔ ''ہاں! آج سے اسے میں تمہیں دیتا ہوں۔ جب تک میں اجازت نہ دوں اسے اس گھر میں نہ لانا۔ اور نہ خود آنا۔ میں اس کی پرورش کے لئے تمہیں ہر مہینے روپیہ پیسہ دیا کروں گا۔ تم اس کی پروانہ کرنا۔''

سکھو نے حیرانی سے کہا۔ ''مالک!''

نریندر کی آنکھوں میں آنسو آ گئے تھے۔ وہ ضبط کرنا چاہتا تھا۔ اس نے اُٹھتے ہوئے کہا۔ ''ہاں سکھو۔ وعدہ نہ بھول جانا۔''

اُسی وقت دروازے پر شیاما آ گئی۔ باپ کو دیکھ کر مسکرائی۔ اور پاپا کہتی ہوئی دوڑ کر اس کی ٹانگوں سے لپٹ گئی۔

نریندر نے اسے گود میں اُٹھا لیا۔ ماتھے کو چوما۔ اور سکھُو کی گود میں رکھ کر آپ باہر چلا گیا۔

سکھُو بابا دونوں کو دیکھ کر اپنے آنسوؤں پر قابو نہ پا سکا۔

شیاما کے لئے ہاتھ پھیلاتے ہوئے اُس نے کانپتی ہوئی آواز میں کہا۔ ''میری بچی!''

(۵)

شیاما اور سکھُو چلے گئے تھے۔ دایہ کو بھی گھر سے جواب مل چکا تھا۔ گھر میں انکی جگہ نئے نوکر آ گئے تھے۔

شروع شروع میں نریندر کرشنا کی محبت میں سرشار تھا۔ لیکن کچھ دن بعد اسے معلوم ہوا۔ یہ خوشی اور کیفیت مستقل نہیں عارضی ہے۔ اسے گھر کی ہر چیز میں شیاما کا معصوم اور حسین چہرہ دکھائی دیتا۔ ہر آواز میں اسے پاپا سنائی دیتا۔

گھر سے کھچا کھچا اور بے دل رہتے دیکھ کر کتنی ہی بار کرشنا نے پوچھا۔ ''یہ

کیا رنگ ڈھنگ ہیں۔؟"

نریندر مصنوعی ہنسی ہنس کر کہتا۔ "کچھ بھی نہیں۔ اچھا تو ہوں۔" کرشنا کہتی۔ "وہ جوش و خروش جو شادی سے پہلے تھا۔ اب کہاں ہے؟ یا سمجھ گئے کہ اب میں آپ کی غلام بن گئی۔ اور میری ساری زندگی اسی غلامی میں گزر جائے گی۔"

نریندر کھلکھلا کر ہنس پڑتا۔ اس کی ٹھوڑی کو دبا کر کہتا۔ "تم بڑی فلاسفر ہو۔ دراصل فلاسفروں کو ہلکے وہم کی بیماری ہوتی ہے۔"

دونوں زور سے ہنستے۔

نریندر ہر ماہ سکھُوں کے گھر جاتا۔ جو دس میل کے فاصلے پر ایک گاؤں میں تھا۔ وہ گاؤں سے باہر اخروٹ کے درخت کے نیچے بیٹھ جاتا۔ اور کسی آنے جانے والے کے ذریعے سے سکھو کو کہلا بھیجتا۔ سکھُوں پہلے ہی اس کا منتظر ہوتا۔ دوڑ کر آتا۔ اور اس کے قدموں پر گرتا۔

نریندر پوچھتا۔ "شیاما راضی ہے؟"

سکھو کہتا۔ بہت راضی ہے سرکار۔ "کہو تو بلا لاؤں۔"

نریندر جلد جلد کہتا۔ "نہیں۔ بُلانا نہیں۔ میرا مطلب ہے اب تو نہیں روتی۔"

سکھُو مسکرا کر کہتا۔ "نہیں سرکار۔ بالکل نہیں روئی۔ لیکن اب ہمیں کب بلائیں گے آپ؟ اب تو گھر کو دیکھنے کی بڑی خواہش ہوتی ہے۔ کبھی جی چاہتا ہے کہ چلا ہی آؤں اور اپنی آنکھوں سے دیکھوں۔ سرکار کیسے ہیں۔ رانی کیسی ہیں۔ گھر کیسا ہے۔ کیونکر چلتا ہے۔ لیکن سوگند قدم روک لیتی ہے۔ ہاں سرکار!"

نریندر سگریٹ سلگاتے ہوئے کہتا۔ "خبردار! چلے نہ آنا۔ ہاں جب میں بلا بھیجوں۔ اس وقت۔"

سکھوں پوچھتا۔ "کب تک بچی کو ٹالتا رہوں۔ وہ کبھی کبھی پوچھتی ہے۔" پاپا گاؤں سے کب لوٹیں گے۔ وہ میرے لئے کیا لائیں گے کیسے آئیں گے۔"

نریندر کہتا۔ "تم کیا کہتے ہو اُسے؟"

سکھو ہنستے ہوئے کہتا۔ "سرکار صاف ٹال دیتا ہوں۔ کہتا ہوں وہ ہاتھی پر چڑھ کر آئیں گے۔ ہمارے تمہارے لئے بھینس لائیں گے۔ بکری لائیں گے۔ رانی لائیں گے۔ اور بندر کا چھوٹا سا بچہ بھی۔ پھر دونوں گھر جائیں گے۔ مزے کریں گے۔"

نریندر سکھوں کی باتیں سن کر اندر ہی اندر پگھل جاتا۔ اس کا روم روم رو اُٹھتا۔ وہ اس سے زیادہ کچھ نہ پوچھ سکتا۔ لیکن سکھوں کہتا۔ "آپ تو خوش ہیں اب!"

نریندر اس کا کوئی جواب نہ دیتا۔ دیتا بھی کیا۔ اپنی دنیا اُجاڑ کر وہ خوش کیسے رہ سکتا تھا۔ وہ جیب سے پندرہ روپے کے نوٹ نکال کر اُس کے آگے رکھتا۔ یا کبھی ریشمی فراک یا سلمہ ستارہ والی ٹوپی۔ اور پھر کہتا "میں وہاں کنارے کھڑا ہو جاؤں گا۔ تم شیاما کو لے آنا۔ اور واپس لے جانا۔ میں صرف دور سے اُسے دیکھوں گا۔ تم اُسے میرے متعلق کچھ نہ کہنا۔"

سکھوں ہانپتا کانپتا گھر چلا جاتا۔ اور ہاتھ سے پکڑ کر شیاما کو لے آتا۔ دور کھیتوں کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہتا۔ وہ دیکھو راج ہنس ندی میں نہار رہے ہیں۔"

شیاما راج ہنسوں کو ڈھونڈھنے میں لگی رہتی۔ اور سکھو مُڑ مُڑ کر اپنے مالک کو دیکھتا۔ اُس وقت نریندر کی حالت قابل رحم ہوتی۔ وہ چاہتا کہ دوڑ کر شیاما سے لپٹ جائے۔ اور ساری رات اُسے اپنے سینے سے لگائے رکھے۔ دو چار قدم وہ اس کی طرف بے اختیار ہو کر آ بھی جاتا۔ لیکن پھر رک جاتا۔ دل اور ہونٹ کانپنے لگتے۔ جب

سکھو اس کی یہ حالت دیکھتا تو شیاما کو گود میں اُٹھا کر آسمان کی طرف متوجہ کرتا۔ کہتا وہ دیکھو اُڑ گئے راج ہنس!"

آسمان کی طرف متوجہ کر کے ہی اسے واپس گھر لے جاتا۔

نریندر بھی آہستہ آہستہ قدم اُٹھاتا ہوا چلا جاتا۔ جب تک گاؤں اس کی نظروں سے اوجھل نہ ہو جاتا۔ وہ مڑ مُڑ کر دیکھتا۔ اور قدم قدم پر رک جاتا۔ کہ کہیں سکھو نے شیاما کو میرے متعلق نہ کہہ دیا ہے۔ اور وہ پیچھے سے "پاپا پاپا" کہتی ہوئی دوڑ کر نہ آ رہی ہو۔

گھر پہنچ کر بھی اس کی اُداسی نہ جاتی۔ باہر سے آہٹ سنتا۔ تو جھٹ دروازے پر آ کر کھڑا ہو جاتا۔ اندھیرے میں ٹارچ روشن کر کے پھاٹک تک دیکھ آتا۔

(٦)

چھ سال گزر گئے۔

نریندر کے کوئی اولاد نہ ہوئی۔ اگر چہ اسے اولاد کی تمنا نہ تھی لیکن عام طور پر رنڈوؤں سے بیاہی ہوئی عورتوں کی طرح کرشنا بچے کے لئے ترس رہی تھی۔ اور رات دن اسی غم میں گھلی جاتی تھی۔ اسے جہاں کہیں فقیر دکھائی دیتا۔ اُس سے تعویذ لیتی۔ حکیموں اور ڈاکٹروں سے دوائیں منگائی۔ مندروں خانقاہوں میں منتیں مانتی۔

ایک دن دوپہر کا وقت تھا۔ نریندر ابھی کارخانے سے نہ آیا تھا۔ کرشنا دروازے پر کھڑی اُس کا انتظار کر رہی تھی۔

پھاٹک پر ایک بوڑھا گٹھڑی لئے کھڑا ہو گیا تھا۔ کرشنا کو اس کی حرکات پر شبہ ہوا۔ دراصل بوڑھا گھور گھور کر اندر دیکھ رہا تھا۔ اور اندر جانے کا فیصلہ اپنے دل سے کر رہا تھا۔

کرشنا نے پکار کر پوچھا۔ "کون ہو تم؟"

وہ ایسے بوڑھوں کو اس نیت سے ضرور پوچھتی کہ کسی کے پاس اولاد کی دوا نہ ہو۔

بوڑھے نے پھاٹک کے اندر قدم رکھتے ہوئے کہا۔ ''سرکار آ گئے کیا؟''

کرشنا نے کہا۔ ''ابھی نہیں۔ تمہیں کیا کام ہے اُن سے؟'' بوڑھے نے مسکرا کر کہا۔ ''کام کوئی نہیں۔ اُن سے محبت ہے۔ میں نے کافی مدت انہیں گود میں کھلایا ہے۔ اور ان کا نمک کھایا ہے۔''

کرشنا نے حیرانی سے کہا۔ ''اوہ۔ اندر آؤ۔ ابھی آتے ہونگے انہیں لانے کے لئے شوفر کار لے کر چلا گیا ہے۔''

بوڑھا اندر چلا آیا۔ دروازے پر پہنچ کر کرشنا نے کہا۔ ''تمہیں معلوم ہے۔ سرکار بہت اداس رہتے ہیں۔''

دونوں ڈرائنگ روم میں پہنچ گئے تھے۔ بوڑھے نے تعجب سے پوچھا۔ '' کیوں بھلا؟''

کرشنا نے مسکرا کر کہا۔ ''تم سے چھپانا کیا۔ تم تو بزرگ ہو۔ میاں بیوی کو شادی کے بعد جس چیز کی تمنا رہتی ہے۔ انہیں وہ نہیں۔ سمجھ گئے میری بات؟''

بوڑھا چپ ہو گیا۔ فرش پر ٹکٹکی باندھے ہوئے اس نے آہستہ سے کہا۔ '' سمجھ گئے میری بات؟''

کرشنا نے بے تابی سے پوچھا۔ ''تمہارے پاس اس کا کوئی علاج نہیں؟ بعض اوقات تو تم لوگوں کے پاس خدائی ہوتی ہے۔''

بوڑھے نے اپنے داہنی طرف رکھی ہو گٹھڑی کو زور سے دبا کر رکھا اور مایوسانہ انداز میں کہا۔ ''نہیں سرکار۔ میں غریب آدمی ہوں۔ دوا دارو کیا جانوں۔ یہ چیزیں ایشور کے ہاتھ میں ہیں۔ کسی کو اولاد دے کر چھین لیتا ہے۔ اور کسی کو اس کے

لئے ترساتا ہے۔"

بوڑھے کے جواب سے کرشنا اپنے دل میں شرمندہ ہوگئی۔ بات کو ٹالنے کے بہانے سے بولی۔ "اس گٹھڑی میں کیا ہے۔ کوئی تحفہ اپنے سرکار کے لئے؟"

بوڑھے نے حسرت آلود نگاہوں سے گٹھڑی کی طرف دیکھا۔ اور پھر کرشنا کی طرف!

کرشنا نے دوبارہ مسکرا کر پوچھا۔ "کیا ہے اس میں؟"

بوڑھے نے آہستہ سے کہا۔ "کپڑے"۔

کرشنا زور سے ہنس پڑی۔ بولی۔ اوہ۔ میں سمجھی کوئی تحفہ لیکن کس کے کپڑے؟ اپنے؟"

بوڑھے نے دوبارہ گٹھڑی کی طرف دیکھا۔ اور رک رک کر کہا۔ "شیاما کے۔"

کرشنا اب کی بار حیران رہ گئی۔ بولی۔ "تم کیسی باتیں کرتے ہو! کس شیاما کے؟"

بوڑھا پہلے چپ رہا۔ جب کرشنا زیادہ بے تاب ہو کر اس کے نزدیک آگئی۔ تو اُس نے کہا۔ "تمہاری بیٹی کے!"

کرشنا کے پاؤں تلے کی زمین نکل گئی۔ اُس نے پھر حیرت سے پوچھا۔ "میری بیٹی کے...... میری......"

بوڑھا فوراً کھڑا ہوگیا۔ جیب سے جلد جلد پندرہ روپے کے نوٹ نکالے۔ انہیں گھٹھڑی پر رکھتے ہوئے بولا۔ "یہ نریندر سرکار کو دے دینا۔ اور کہہ دینا۔ شیاما کل مرگئی۔ یہ اُسی کے کپڑے ہیں۔ سکھو واپس دے کر چلا گیا۔"

کہتے کہتے اس کی آنکھیں آنسوؤں سے پُر ہوگئیں۔ اپنے نحیف بائیں ہاتھ

سے آنسو پونچھتے ہوئے وہ آہستہ آہستہ قدم اُٹھاتا ہوا اور مُڑ مُڑ کر اپنے مالک کے گھر کو دیکھتا ہوا پھاٹک سے باہر نکلا۔ اور کرشنا بت کی طرف دور تک اُسے دیکھتی رہی۔

............☆☆☆............

دنیا ہماری

کل بنک کے چوک میں، غلام رسول کی لانڈری کے قریب میری مایوس آنکھوں نے دنیا کی کئی تصویریں دیکھیں۔ ایک سے ایک حسین، ایک سے ایک جدا، ایک سے ایک مختلف۔

دو لڑکیاں فرکوٹ کی دھلائی کے متعلق غلام رسول سے باتیں کر رہی تھیں۔ ''دیکھنا کہیں فر خراب نہ ہو جائے۔''

''ڈرائی کلینگ سے بالوں کی سپیدی پر کوئی اثر نہ پڑے۔'' اور غلام رسول للچائی ہوئی نظروں سے دونوں کو دیکھ رہا تھا۔ اُن دونوں کو جن میں سے ایک کے شباب پر معصومیت اور شوخی، شعریت اور بے نیازی چھائی ہوئی تھی۔ اور دوسری کے شباب پر سنجیدہ سوختگی اور متانت، بے زادی اور یاس! دونوں کی شکلیں ملتی جلتی تھیں۔ ایک جیسے خدوخال، ایک جیسے نقش ونگار، ایک جیسی وضع قطع۔ صرف شباب کی شراب میں ایک زیادہ مخمور تھی اور دوسری کا خمار اُتار پر تھا۔ شاید ایک زندگی کے اس موڑ پر پہنچ چکی تھی۔ جہاں سے رنگین دنیا شروع ہوتی ہے اور دوسری...... وہ کچھ فاصلہ طے کر چکی تھی۔ ایک ضرورت سے زیادہ خوش تھی اور دوسری ضرورت سے زیادہ سنجیدہ! شاید اس کا شباب خراج حاصل کرنے میں ناکام رہا تھا۔

''کب تیار ہوگا کوٹ؟'' کھلنڈری جوانی کی مالکہ نے اپنی آنکھوں کو ایک

عجیب انداز میں گھماتے ہوئے پوچھا۔

''بس پرسوں ...... پرسوں مس صاحبہ! میرا وعدہ پکا ہوتا ہے۔'' غلام رسول نے جلد جلد کہا۔

پکے کے لفظ پر دونوں لڑکیاں ہنس پڑیں۔ شاید اُنہیں اعتبار نہ آیا کہ کوئی کشمیری بھی اپنے وعدے کا پکا ہوتا ہے۔ اور غلام رسول ایک معمولی لانڈری کا مالک، جو شروع شروع میں امیرا کدل کے امیروں کے کپڑے دھوتا تھا اور عام محنتی دھوبیوں کی طرح کمر پر گٹھڑی اُٹھائے پھرتا تھا۔ وہ وعدے کا پکا کیونکر ہوسکتا ہے؟ وہ وعدے کا پکا ہوتا تو آج لانڈری کا مالک نہ ہوتا۔ عام جذباتی دھوبی ہوتا۔ گاہکوں کے سفید کپڑے پہنے ہوئے اُجلا اُجلا سا دکھائی دینے والا۔ لیکن زندگی نام ہے جدوجہد کا ۔شاید اسی لئے وہ دھوبی سے لانڈری کا مالک بن گیا۔ نہ جانے جدوجہد کا دوسرا قدم اسے کہاں پہنچادے۔ سردست وہ اپنی زندگی کا ایک حسین خواب دیکھ رہا ہے۔ جہاں چوک میں لانڈری ہے۔ اور لانڈری کے برآمدے میں دو حسین وجمیل لڑکیاں ایک زندگی کے رومانی موڑ پر پہنچی ہوئی۔ دوسری مُڑ مڑ کر طے کئے ہوئے فاصلے کو حسرت سے دیکھتی ہوئی۔

غلام رسول بار بار اپنے سیاہ اور حریص ہونٹوں پر زبان پھیر رہا ہے۔ صرف اس لئے کہ ذرا قابو میں رہیں۔ اور سنہرا سپنا دراز سے دراز تر ہوجائے۔ لیکن اندر کا سانپ اسے چین سے نہیں بیٹھنے دیتا۔ اس کے روئیں روئیں سے باہر جھانک رہا ہے۔ مدھور شہنائی پر جو دو لڑکوں کے شباب اور حسن سے سر بازار بج رہی ہے۔ کتنا فریب خوردہ ہے۔ حسین نظروں کے رقص پر، حسین قہقہوں کے نغمے پر لہرا رہا ہے۔ حالانکہ اسے علم ہے کہ یہ لے یہ ترنم اور یہ ہوشربا نغمہ اس کی رسائی سے کہیں دور ہے۔ لیکن پھر بھی جھوم رہا ہے۔ اگر بے زبانوں نے بھی آدم کے بیٹے کے ساتھ ساتھ ترقی کی ہوتی

۔تہذیبیں بنا بنا کر مٹائی ہوتیں۔تو شاید اندر کا سانپ اتنا فریب خوردہ نہ ہوتا۔وہ آدم اور حوا کی پیدائش سے فریب کھاتا آرہا ہے اور فریب کھاتا ہی جائے گا۔اس کے نزدیک رسائی اور نارسائی کا سوال نہیں۔اُسے حُسن چاہئے اور موسیقی،نغمہ چاہئے اور ترنم!اور غلام رسول وعدے کا پکا ہے......!

ایک بھکارن ہاتھ پھیلا رہی ہے۔اس کا معصوم بچہ باسی روٹی کا ٹکڑا کھا رہا ہے۔غلام رسول کا سنہرا خواب ٹوٹ جاتا ہے۔

''خدا کے نام پر ایک پیسہ!''

اگرچہ بھکارن کو معلوم نہیں۔خدا کون ہے۔کہاں ہے،کیسا ہے!پھر بھی اُسی کا واسطہ دے کر وہ لوگوں کے جذبات پر دستک دیتی ہے۔نادیدہ کا واسطہ۔بے پروا کا واسطہ۔پردہ نشین کا واسطہ۔''خدا کے نام پر ایک پیسہ!''

لیکن کیوں ری بھکارن۔کہاں ہے تمہارا خدا؟جوانیوں کے نام پر حُسن کے نام پر،شوخی کے نام پر،ترقی کے نام پر کیوں پیسہ نہیں مانگتی؟ذلیل عورت!جبھی تو خاک چھانتی پھرتی ہے کہ تجھے صرف جذبات سے کھیلنا آتا ہے۔محسوسات سے نہیں۔

''دور ہٹ!بے حیا نہیں دیکھتی کون کھڑی ہیں؟''غلام رسول نے طنزیہ لہجے میں کہا۔

بچہ پھر بھی مطمئن ہے۔ماں دھتکاری جارہی ہے۔اور بچہ مزے سے روٹی کا ٹکڑا کھا رہا ہے۔کیا ہوا۔۔۔۔؟کچھ بھی تو نہیں!جذبات سے کھیلنے والوں کا،نادیدہ کا واسطہ دینے والوں کا اندر کا سانپ زمانے کی لاٹھی نے مار دیا ہے۔زندہ ہوتا تو شاید پھنکار اُٹھتا۔ڈسنے کے لئے اپنی پتلی سی زبان باہر نکالتا۔لیکن وہ مر چکا ہے۔مارا گیا ہے ہمیشہ کے لئے۔اور اس کا کسی کو افسوس نہیں۔نہ بھکارن کو نہ بچے کو۔نہ حُسین

وجمیل لڑکیوں کو اور نہ غلام رسول کو۔

بھکارن نے آنکھیں پھیلا کر اپنے سامنے کھڑی ہوئی لڑکیوں کو دیکھا۔ ننگی باہیں، اُبھرے ہوئے سینے، بوجھل بوجھل سی نرگسی آنکھیں، مرمریں چہرے، بالوں کی لٹیں کھلی اور پریشان......وہ انہیں دیکھ کر نہ مرعوب ہوئی نہ شرمسار!

''خدا کے نام پر ایک پیسہ!'' اس کے منہ سے بے اختیار نکلا۔ اور بچہ روٹی کا ٹکڑا ختم کر کے شوخ وشنگ لڑکی کی ٹانگوں سے لپٹ گیا۔

اُجلے اور چرچرے شلوار پر میلے ہاتھوں کے نشان لگ گئے۔

''دور......دور ہو جا......'' لڑکی نے ڈر کر، سہم کر اور ذرا پھلانگ کر کہا۔ اور پھر تاسف، غصے اور حقارت بھری نظروں سے پہلے اپنی شلوار کو دیکھا۔ پھر اس کم بخت بچے کی طرف! جواب بھی مطمئن تھا۔ البتہ اسکی ماں بے چین ہو اُٹھی تھی۔ اور بے چینی ہی میں اس نے بچے کے گال پر تھپڑ بھی دے مارا۔ ''پیسہ مانگ اِن سے......'' ماں نے بچے سے کہا۔

بچے کو تھپڑ کا کوئی احساس باقی نہ رہا۔ کیا ہوا۔......؟ کچھ بھی تو نہیں! اس نے ہاتھ جوڑ کر کہا۔ ''ایک پیسہ......مائی......''

دونوں لڑکیاں اور غلام رسول کھلکھلا کر ہنس پڑے۔ ''مائی کیسی مائی؟'' کیسی مائی؟''

شاید بچے کو علم نہ تھا۔ کہ ہر عورت بھک منگے کی مائی نہیں ہوتی۔

اور اُس کی ماں التجا بھری نظروں سے سب کو دیکھتی رہی۔ خصوصاً اُن دولڑکیوں کو۔ جن کے ہونٹوں پر افق اور شفق کھیل رہی تھی۔

بھکارن کیا دیکھ رہی ہے؟ اپنی ہی ذات، اپنی ہی نسائیت اپنا ہی عکس دیکھ رہی ہے۔ ایک بہناپہ سا، ایک رشتہ سا، ایک یگانگت سی، جو حوا نے دودھ کے ساتھ اپنی

اولاد کو بخش دی تھی ...... بے وقوف عورت ! ہوا کو کیا معلوم تھا۔ جب ننگے آدم کی اولاد غاروں سے نکل کر شہروں میں بسے گی۔ سماج بنائے گی۔ تہذیب کی طرح ڈالے گی۔ تجارت کرے گی۔ اس وقت وہ مقدس امانت جو تمہارے خیال کے مطابق سینہ بہ سینہ چلی آنی چاہئے تھی۔ ختم ہو جائے گی۔ اور ایک ہی زمین پر رہنے والے آدم کے بیٹے کئی لکیریں کھینچیں گے۔ کچھ سیدھی۔ کچھ ٹیڑھی، کچھ متوازی اور کچھ نا قابل فہم سی ! ایک لکیر کی قید میں بھک منگے ہوں گے۔ اور دوسری لکیر کی قید میں شوخ وشنگ لڑکیاں۔ تیسری لکیر میں غلام رسول۔ چوتھی لکیر میں غلام رسول کا ہمسایہ دکان دار۔ اور علیٰ ہذا القیاس۔ شکر ہے آج حوا ہے نہ آدم ! غریب پاگل ہو کر سمندر کی گہرائیوں میں ناچتے !

جا بے وقوف عورت ! کیا دیکھ رہی ہے تو ؟ کیسے پہچان رہی ہے تو ؟......
جا جذبات سے کھیل اور بھیک مانگ !

لڑکیاں چلی گئیں۔ نغمہ ختم ہو گیا۔ اور غلام رسول کے اندر کا سانپ اپنے بل میں جانے گا۔ بھکارن اسی طرح کھڑی دیکھتی رہی کہ کوئی لکیر پھاند کر اس کی جھولی بھر دے۔ لیکن کون ہے وہ؟ کہاں ہے وہ؟

بھکارن نہ زیادہ خوبصورت تھی نہ زیادہ بدصورت۔ بس خوبصورتی اور بدصورتی کو آپس میں ملا دینے والی حد پر کھڑی تھی۔ عمر بھی یہی تیس پینتیس کی تھی۔ بھیک نے اُس کا نسوانی غرور چھین لیا تھا۔ اب صرف التجا بن کر رہ گئی تھی۔ دودھ کے اُس پیالے کی طرح پرسکون، جس نے اپنی گرمی اور شیرینی مگھر کی کسی نامہرات کو کھو دی ہو۔

غلام رسول جب فرکوٹ کو کھونٹی پر لٹکا کر باہر نکلا۔ تو بھکارن اُس کے سامنے کھڑی تھی۔ اس نے پھر اپنی زبان حریص ہونٹوں پر پھیرنا چاہی۔ لیکن کیوں؟ اب حرص کو قابو میں رکھنے کی کیا ضرورت ہے۔ سانپ پھر لہرانے لگا۔ لیکن ہولے ہولے

۔ایک پھن پھیلائے ہوئے کوبرا کی طرح!

''ایک بات مانو گی......؟'' غلام رسول نے رازدارانہ لہجے میں کہا۔

''کہہ دو......''

(ہنس کر) ''میرا مطلب ہے......تم رات کو کہاں رہتی ہو؟''

''یہیں پار......مسجد کے تھڑے پر۔''

''......تو آج رات...... یہاں نہ رہ سکو گی......میری لانڈری میں۔''

بھکارن کا چہرہ انگارے کی طرح سرخ ہو گیا۔

غلام رسول اس کے سامنے وحشیانہ قہقہے لگانے لگا۔

بھکارن نے بچے کو اُنگلی سے تھاما۔ اور اسی طرح اُسی جوش میں برآمد سے سے نیچے اُتری۔

''مالزادی...... چڑیل......'' غلام رسول نے قہقہہ لگا کر سڑک پر جانے والی بھکارن سے کہا۔

بھکارن نے خاموشی میں گالی کھائی۔ اُس کا سانپ زندہ ہوتا۔ تو شاید وہ بھی لہرا اُٹھتا۔ البتہ اُس کی طبیعت ملول ہو گئی۔ کیوں؟

گالی کیا بُری ہے؟ اور بچے کی بھیک مانگنے والی ماں......لوٹ آ......تم جیسی لکیر کا ایک قیدی تمہاری جھولی بھر وے گا......

آ......آج کی رات اُس کی لانڈری میں بسر کر! اور پھر صبح چلی جا اس وسیع دنیا میں، بے پرواخدائی کا واسطہ دیتے ہوئے!

آ......آ بے وقوف بھکارن۔ سانپ لہرا رہا ہے!

لیکن ناسمجھ بھکارن چلی گئی۔ جیسے کچھ ہوا ہی نہیں......ہوا کی لہروں نے نہ جانے گالی کو کہاں دے پٹکا۔ ہنگامہ ہوتا۔ تو غلام رسول کا ہمسایہ دکاندار پتولون میں

ہاتھ ڈالے باہر نہ نکلتا۔

غلام رسول قہقہے لگا کر۔ بھکارن کو سیٹیوں سے بُلا کر جب نا اُمید ہوگیا۔ تو شکستہ کُرسی پر بیٹھ گیا۔

اور سامنے سے دو موٹے موٹے انسان اپنے سرمایہ کے نفع و نقصان کا اندازہ لگاتے لگاتے گزرے۔

"کاش یہ جنگ دو سال تک ابھی بند نہ ہوتی ......" ایک نے کہا۔ اور دوسرے نے قہقہہ لگایا۔ پھر دونوں سامنے بنک میں داخل ہو گئے۔

....

کیا یہی ہے دنیا ہماری؟ اور یہی ہے اس کا صول سانپوں کا لہراؤ۔ گالیاں کھاؤ۔ حساب و کتاب رکھو۔ ٹکراؤ۔ لیکن چلے چلو! چلے چلو!!

...........☆☆☆...........

اصُول کی دنیا

(۱)

بنک کا کوئی ملازم رادہاکشن سے مطمئن نہ تھا۔ سب اسے خفتی متکبر اور نہ جانے کیا کچھ سمجھتے تھے۔ حالانکہ حقیقت اس سے کوسوں دور تھی۔ وہ نہ خفتی تھا نہ متکبر بلکہ حلیم طبع اور خاموش نوجوان ہاں یہ ضرور تھا۔ کہ بنک کے اور ملازموں کی طرح نہ وہ فضول باتیں کرتا تھا اور نہ دوسروں کی عیب جوئی۔ دس بجے صبح سے چار بجے شام تک اپنے کام میں مگن رہتا تھا۔ اُس کے سامنے سے آنے جانے والوں کا تانتا بندھا رہتا تھا۔ لیکن وہ کسی کی طرف آنکھ اُٹھا کر بھی نہ دیکھتا تھا۔ اُس کے ہمدوش فرصت کے لمحوں میں ایک دوسرے پر یا بنک میں آنے والوں پر وہ پھبتیاں اُڑاتے تھے کہ بعض اوقات رادہاکشن کو بھی بادل نخواستہ ہنسنا پڑتا تھا۔

رادھاکشن کی زندگی کا جو مقصد تھا۔ اور جس اصول پر وہ زندگی بھر چلنا چاہتا تھا۔ وہ کسی سے پوشیدہ نہ تھا۔ لیکن کم مایہ کلرک ہونے کے سبب بجائے اس کے کہ اُس کی حوصلہ افزائی کی جاتی۔ اُس پر سَو سَو نام دھرے جاتے تھے۔ وہ جانتا تھا کہ ایک تنگ دست کے لئے کسی پاکیزہ اصول پر قائم رہنا کس قدر دشوار ہے۔ لیکن اُس نے نیک نیتی، پاکبازی، راست گوئی اور منکسر المزاجی کو مشعل راہ بنالیا تھا۔ اور اسی مشعل کی روشنی میں زندگی کی تاریک راہوں سے گزرنے کی ٹھان لی تھی۔

گھر میں بھی رادھا کشن کو وہ سکون حاصل نہ تھا۔ جو ایسی عمر میں اُسے حاصل ہونا چاہتے تھا۔ نہ جانے کس کی دعا سے ایشور نے اُس کا گھر بچوں سے بھر دیا تھا۔ اسکی بیوی کی کوکھ سے جو بچہ پیدا ہوا زندہ رہا۔ ورنہ بعض اوقاف ایسا بھی ہوتا ہے۔ کہ بچے پیدا تو ہوتے ہیں۔ لیکن جلد ہی مر بھی جاتے ہیں۔ ایسی اموات امیروں کے لئے باعث الم ہوں تو ہوں۔ تنگ دستوں کے لئے ہمیشہ موجب برکات ہوتی ہیں۔ دونوں قسم کے والدین رو دیتے ہیں۔ چھاتیاں پیٹتے ہیں۔ بال نوچتے ہیں۔ لیکن امیر کا ماتم اصلی ہوتا ہے۔ اور غریب کا مصنوی صرف اس آڑ میں کہ ماتم نہ کرنے پر اُسے اپنی برادری قصائی نہ کہے۔

رادہا کشن کی بسر اوقات پنتیس روپے میں نہ ہوتی تھی۔ اور دوسری طرف قرض لینے کا وہ عادی نہ تھا۔ وہ اپنے اصول کے اردگرد عزت کے ساتھ گھومنے کا متمنی تھا۔ خواہ اُس میں اسُے کتنا ہی نقصان کیوں نہ ہو۔ یہی خواہش ہر کام شروع کرنے سے پہلے اُس کے پیش نظر رہتی تھی۔ اس کی بیوی گھمبیر اور خوش مزاج تھی۔ لیکن تنگدستی نے اُسے کفایت شعار بنا دیا تھا۔ بٹی ہوئی محبت میں بھی وہ سب سے زیادہ سُکھی اپنے شوہر کو دیکھنا چاہتی تھی۔ جس میں صفات ہی صفات تھے۔ عیب ایک نہ تھا۔ اسے معلوم تھا کہ اس کا شوہر کس دشوار گذار راستے سے اپنی بیش قیمت زندگی کی منزلیں طے کر رہا ہے۔ پھر بھی وہ شاکر تھی۔ صابر تھی۔ اور قانع تھی۔ کم خوراک تنگدستی اور بچوں کی کثرت نے اس کا وہ حسن چھین لیا تھا۔ جس پر جوانی کے دنوں میں مرد ریجھ جاتے ہیں۔ لیکن پھر بھی وہ ہر حال میں مطمئن تھی۔ اگر چہ مجبور رہی۔ جن بچوں کو وہ شاہزادوں کی طرح دیکھنا چاہتی تھی۔ اُنہی کو جب پیوند لگے ہوئے چیتھڑوں میں دیکھتی۔ تو ایک سرد آہ کھینچ کر رہ جاتی۔ اُس کی نگاہوں میں اُس کا شوہر نہیں بلکہ خود بچے بد نصیب تھے۔ جو لاڈ پیار اور خوراک کو ترسنے کے لئے اس کی کوکھ سے پیدا ہوئے تھے۔

اُن کی ہمسائیگی میں پنڈت دینا ناتھ رہتے تھے۔ عمر میں رادھا کشن سے بڑے نہ ہوں گے۔ لیکن قسمت میں دونوں کا مقابلہ ہی نہیں ایک کے پاس بے پناہ دولت اور دوسرا نوالے کا محتاج۔ اگر عقل اور لیاقت پر خدا نے دولت تقسیم کی ہوتی۔ تو شاید دینا ناتھ گداگروں کی طرح کسی چوراہے میں بھیک مانگتا نظر آتا۔ لیکن خدا کے ہاں یہ قانون نہیں۔ وہ بن دیکھے، بن آزمائے کہیں فراخدل بن گیا ہے۔ اور کہیں جابر۔

کبھی کبھی پنڈت دینا ناتھ رادہا کشن سے ملتے۔ تو مسکرا کر پوچھتے "آپ اس قدر کمزور کیوں ہیں؟" "بنک میں زیادہ کام ہے کیا؟"

رادہا کشن مصنوعی ہنسی ہنس کر جواب دیتا۔ "جی آجکل سیزن ختم ہورہا ہے۔ سیاح حساب صاف کر کے جارہے۔"

دینا ناتھ کہتے۔ "اتنا کام ہوتے ہوئے بھی آپ اپنے سے بے پرواہیں۔ معلوم ہوتا ہے۔ آپ کام تو خوب کرتے ہیں۔ لیکن کھاتے کم ہیں۔ ٹھیک ہے میرا قیاس؟"

رادہا کشن سر اُٹھا کر اُس کی طرف دیکھتا۔ اپنی خودداری کو یوں پائمال نہ ہوتے دیکھ کر کہتا۔ "یہ بات نہیں صاحب! دراصل کچھ ایسا ہی ہوں۔"

دینا ناتھ زور سے ہنس کر چل دیتے۔ دولت نے اس کی عزت ہر جگہ بنا رکھی تھی۔ سماج گویا اسکا زرخرید غلام تھا۔ اُس کا احمقانہ شغل بھی جدت تصور ہوتا تھا۔ اُس کے مقابلے میں رادہا کشن صرف بنک کا کلرک تھا۔ ایک بے حقیقت اور بے مایہ کلرک۔ جو سماج کے نزدیک ایک بہتے ہوئے تنکے سے زیادہ وقعت نہ رکھتا تھا۔ آخر اُس ذات سے سماج کو کیا فائدہ تھا۔ جو وہ اسے سر آنکھوں پر جگہ دیتا۔ اُس کی لیاقت، اُس کا تدبر، اُس کا پاکیزہ اصول صرف بنک کی چاردیواری ہی میں ختم ہونے کے لئے تھا۔ اُس سے باہر نہیں۔ اور ایسے آدمی درنایاب ہوتے ہوئے بھی سماج کے آگے

ٹوٹے ہوئے کنکر سے زیادہ قیمتی نہیں۔

(۲)

بڑے بیٹے کو نیمونیا ہو گیا۔

رادھا کشن بسر اوقات کے لئے جتنا پُر زور جہاد کرتا جارہا تھا۔ اُتنا ہی اُس کا دامن مصیبتوں کی خاردار جھاڑیوں سے اُلجھتا جاتا تھا۔ بنک میں اگر چہ وہ ایسے کام پر مامور تھا۔ جہاں تنخواہ کے علاوہ وہ چار پیسے بھی کما سکتا۔ لیکن اُس نے کبھی اپنے من کو اُوپر کی آمدنی لے لئے میلا نہ ہونے دیا۔ شاید اس وجہ سے بھی وہ بنک میں اتنا ہر دلعزیز نہ بنا۔ جتنا اُس کا پشیرو۔ جس نے اُسی کُرسی پر بیٹھ کر ہزاروں روپے کمائے تھے۔ عزیت بنا رکھی تھی۔ اور ہر جگہ ساکھ بٹھا رکھی تھی۔

رادھا کشن کو مُصیبتوں پر مُصیبتیں ٹوٹنے کے سبب اپنے کیریکٹر کی پاکیزگی میں شبہات سے پیدا ہونے لگے۔ یہ پہلا موقع تھا۔ جب اُس کے قدم زندگی میں پہلی بار ڈگمگانے لگے۔ وہ جانتا تھا۔ کہ جلنے والا دیا ہی اندر اور باہر سے میلا ہوتا ہے۔ اُسے کوئی پُونچھتا نہیں۔ لیکن اِس کے باوجود اُس کے توسیع نور کے اصُول میں کوئی فرق نہیں پڑتا۔ وہ خاموشی سے سب کچھ سہہ کر روشنی پھیلاتا ہے۔ اور خود میل میں اٹا رہتا ہے۔ لیکن ایسا کیوں ہو۔ کیریکٹر کی پاکیزگی کی کوئی قیمت تو ہونی چاہئے۔ انسانوں کے پاس اگر نہیں، نہ سہی۔ دیوتا تو اندھے نہیں۔ وہ من کا بھید جانتے ہیں۔ کچھ نہیں دے سکتے۔ سکون اور فراغت تو بخش سکتے ہیں۔

لیکن اُس کا خیال ادھورا رہ جاتا۔ جب نظام قدرت کے دوسرے پہلو پر بھی نظر ڈالتا۔ شراب پینے والے، جوا کھیلنے والے، غریبوں کا خون چوسنے والے، پیسوں کے عوض اپنی بہو بیٹیاں فروخت کرنے والے جب مزے میں زندگی بسر کرتے ہیں۔ تو کہاں ہیں من کا بھید جاننے والے دیوتا اور کہاں ہے اُن کا انصاف! گھر

میں بیٹے کی بیماری سے پہلے تین دن کوئی گھبراہٹ پیدا نہ ہوئی۔ ہوتی بھی کیوں؟

چوتھے دن بھی جب اُس کا بخار نہ ٹوٹا۔ تو بچے کی ماں تلملا اُٹھی۔ ماںتا کے دہکتے ہوئے شعلوں سے تنگدستی کی راکھ اُڑ گئی۔ مندر سے لایا ہوا تلسی کا پانی، شوالے کا چرن امرت۔ بابا جی کے دوپ کی راکھ سب کا طلسم ٹوٹ گیا۔ اُس وقت تک رادہا کشن اپنے پاکیزہ اصول کی دنیا کو زور سے تھامے ہوئے تھا۔ لیکن جب بچے کی حالت خراب ہونے لگی۔ تو اس کی مُٹھیاں ڈھیلی پڑ گئیں۔ اصول کی دنیا لڑکھڑانے لگی۔

سراسیمگی میں بیوی سے بولا۔ ''کہو تو کسی ڈاکٹر کو بلا لوں۔''

بیوی نے اُس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر بھرائی ہوئی آواز میں کہا۔ ''ابھی کہنا باقی ہے۔ نہیں دیکھتے گھر لُٹ رہا ہے۔''

رادہا کشن نے تسلی دیتے ہوئے کہا۔ ''ہمت رکھو۔ بچے اکثر بیمار بھی پڑتے ہیں۔ اور اُٹھتے بھی ہیں۔''

بیوی نے بیمار بچے کے ماتھے پر ہاتھ رکھ کر کہا۔ ''وہ خوش نصیبوں کے بچے ہوتے ہیں۔ ہمارے بچے ناگ ہوتے ہیں۔ ڈستے ہیں اور چل دیتے ہیں۔''

رادہا کشن اب کچھ نہ بول سکا۔ اُس کی جیب میں تنخواہ سے بچا ہوا پانچ روپے کا نوٹ تھا۔ بیٹے کا علاج کرانا اُسے بہت آسان دکھائی دیا۔ بولا۔ ''تم فکر نہ کرو۔ میں ہر قیمت پر علاج کرا دوں گا۔ ہماری دنیا کے چاند تارے یہی بچے ہیں۔ لیکن......''

اس سے آگے وہ نہ بول سکا۔ آواز حلق میں رُک گئی۔ اُٹھ کر باہر چلا گیا۔

ڈاکٹر نے تسلی دیتے ہوئے کہا۔ ''ٹھیک ہو جائے گا۔ مجھے امید ہے۔''

لیکن ڈاکٹروں کی اُمید ہر وقت امید ہی نہیں ہوتی۔

ڈاکٹر نے پھر کہا۔ ''معلوم ہوتا ہے۔ آپ بچے سے بہت بے پروا رہے ہیں۔ جبھی یہ حالت ہوگئی ہے۔''

بچے کی ماں غمناک آنکھوں سے اپنے شوہر کو دیکھنے لگی۔ نظروں ہی نظروں میں دونوں نے اپنی بے پروائی کا اندازہ لگایا۔ دونوں ایک دوسرے سے من ہی من میں پوچھتے تھے۔ ''کیا ہم بے پروا ہیں؟''

ڈاکٹر ربڑ کی نالی سے ہزاروں مرض صرف دل کی دھڑکن پہچان کر جان سکتے ہیں۔ لیکن دل میں چھپی ہوئی بات کون سن سکتا ہے؟ ڈاکٹر نے نسخہ لکھا۔ تو پانچ روپے کا نوٹ چٹکیوں میں اُٹھ گیا۔ تین روپے میں بیرونی لیپ کی دوا آئی۔ اور دو روپے ڈاکٹر نے فیس میں لے لئے۔ پینے کی دوا بدستور باقی رہی۔ اب رادھا کشن کو معلوم ہوگیا کہ کہ نمونیا کتنی خطرناک بیماری ہے۔ اور اسکا علاج کرانا کتنا مشکل!

(۳)

بیمار کی حالت بہت خراب ہوچکی تھی۔ بخار ۱۰۵ درجے پر تھا۔ آج کی رات بحران ہونا تھا۔ رادھا کشن گھبرایا ہوا تھا۔ وہ آج بھی بنک میں چلا گیا۔ لیکن وہاں چین نہ آیا۔ بے شمار لوگ کونٹر کے آگے روپوں کا انتظار کر رہے تھے۔ اور بابو کی بے پروائی اور گراں خیزی پر حیران تھے۔ کچھ اُن میں ایسے بھی تھے۔ جو برملا کہتے تھے۔ ''ایسے سُست ملازموں سے بنک کے نام پر بٹہ لگ سکتا ہے۔''

رادھا کشن کا قلم بڑے بڑے رجسٹروں پر چلتا تھا۔ لیکن اُس کا دل بیمار بیٹے کے بستر کا طواف کر رہا تھا۔ وہ لوگوں کی باتیں گردن جھکائے چپ چاپ سن رہا تھا۔ آخر ایک بار اُس سے نہ رہا گیا۔ بولا۔ ''صاحب! گھر میں بچہ بیمار ہے۔ دل ہی نہیں لگتا۔''

ایک من چلے نے جو شاید کسی بیوپاری کا منیم تھا۔ کہا۔ ''خوب آدمی ہیں آپ

بھی۔''

شام کو جب بنک بند ہونے والا تھا۔ پنڈت دینا ناتھ آ گئے۔ اور پندرہ سو کا چک راد ہا کشن کو دیتے ہوئے بولے۔ '' ذرا جلدی کیجئے۔ میرا '' دولف '' چند دنوں سے بیمار ہے۔ اور ڈاکٹر کو لئے جا رہا ہوں۔''

راد ہا کشن نے گردن اُپر اُٹھائی۔ حیرانی سے پُوچھا۔ '' دولف؟ ''

دینا ناتھ نے مُسکرا کر کہا۔ '' جی۔ ابھی ایک ہی مہینہ ہوا۔ ایک انگریز سے پانسو روپے میں خریدا ہے۔ کل سے دسہرہ کی چھٹیاں نہ ہوتیں۔ تو شاید روپے نکالنے کی ضرورت نہ پڑتی کون جانے دولف کے عِلاج پر کتنا کچھ خرچ ہو......''

راد ہا کشن ٹکٹکی باندھے حیرت کی نگاہوں سے اسے دیکھتا رہا تھوڑی دیر کے بعد وہ اُٹھا۔ ایک بڑے رجسٹر میں چیک کا اندراج کیا۔ اور پھر خزانچی سے نوٹوں کے کئی دلفریب بنڈل لے آیا اور دینا ناتھ کے آگے رکھ دیئے۔ دینا ناتھ نے نوٹوں کو گنا نہ شمار کیا۔ جلد جلد اُٹھا کر جیب میں ڈال دیئے۔ اور چلے گئے۔ جلدی کی وجہ سے سو روپے کا ایک نوٹ وہ وہیں بھول گئے۔

راد ہا کشن نے نوٹ دیکھا۔ تو اُس کے پیٹ کا پسینہ چھوٹ گیا۔ اتنی بڑی رقم دینا ناتھ کیسے بھول گئے۔ وہ یہ نہ سمجھ سکا۔ اُس نے چاہا۔ کہ دینا ناتھ کو واپس بلا لیں۔ لیکن دینا ناتھ احاطے سے باہر چلے گئے تھے۔

راد ہا کشن نے اِدھر اُدھر دیکھا۔ پھر تھوڑی دیر سوچا کہ اب کیا کرنا چاہے۔ بنک کے قانون کے مطابق ایسی رقم ڈپازٹ میں درج ہوئی چاہئے تھی۔

راد ہا کشن نے اپنے دل میں سوچا۔ '' جب وہ اتنی بڑی رقم سے بے پرواہے۔ تو مجھے اُٹھانے میں کیا اعتراض ہے!''

لیکن پھر خیال آیا۔ '' پرماتما کو کیا جواب دوں گا۔ دینا ناتھ نے مجھ پر اعتبار

کیا۔ اور نوٹ نہیں گنے۔ میں کیسے......"

اُس نے پھر اِدھر اُدھر دیکھا۔ بنک کے دوسرے مُلازم چلے گئے تھے۔ بوڑھا چوکیدار شیشے کی کھڑکیاں بند کر رہا تھا"۔ اُس نے نظریں بچا کر نوٹ اپنی جیب میں رکھا۔ پاکیزہ اصول کی دنیا دھڑام سے گر پڑی۔

آتی دفعہ وہ بچے کے لئے پریشان تھا۔ جاتی دفعہ اُسے بچے کی پریشانی کے علاوہ ناقابل بیان افسوس تھا۔

جس وقت رادھا کشن گھر پہنچا۔ پنڈت دینا ناتھ کے ہاں ریڈیو بج رہا تھا۔ نہ جانے کس سٹیشن سے بچوں کا پروگرام براڈ کاسٹ ہو رہا تھا۔ کچھ بچے ہنس رہے تھے۔ کچھ گا رہے تھے ان کے ساتھ ساتھ پنڈت دینا ناتھ کے زور سے ہنسنے کی آواز بھی آ رہی تھی۔ شاید ڈاکٹر نے وولف کو دیکھ کر اُمید دلائی تھی۔

رادھا کشن نے اپنے کمرے میں قدم رکھا۔ تو بیوی نے اُسے دیکھتے ہی کہا۔" آج بچہ بہت بے آرام ہے۔"

اپنی مٹھی میں زور سے سو روپے کا نوٹ پکڑے ہوئے رادھا کشن نے کہا۔" تم نہ گھبراؤ۔ سو روپے بھی اُٹھ جائیں۔ تو غم نہیں۔"

اُمید کے آنسو اُس کی بیوی کی آنکھوں سے پھوٹ گئے۔ آج کتنے ہی دنوں کے بعد رادھا کشن نے اُسے دھیرج بندھائی تھی۔

رات کو بحران ہو گیا۔ بخار ٹوٹ کر ۹۵ سے نیچے گیا۔ اور اُس کے ساتھ ہی معصوم روح بھی چلی گئی۔ بچے کی ماں فرط غم سے بیہوش ہو گئی۔ اور رادھا کشن سرہانے مُردہ بچے کے چہرے پر نظریں جمائے بیٹھا رہا۔

محلے والے جمع ہو گئے۔ سارا گھر ماتم سرا بن گیا۔ لیکن رادھا کشن کی آنکھوں میں آنسو نہ تھے۔ ایک مستقل شکایت ایک نا تمام دردناک افسانہ۔ جسے سُنانے کے

لئے وہ کسی دردمند دِل رکھنے والے، کی تلاش میں آوارہ تھا۔

(۴)

شمشان سے آ کر وُہ سیدھا دینا ناتھ کے گھر چلا گیا۔ وُہ ابھی ابھی صُبح کا کھانا کھانے بیٹھے تھے۔ رادھا کشن کو دیکھ کہ حیرت سے بولے...... ''آپ......''

رادھا کشن کا دل ٹوٹ چکا تھا۔ اُس کی آنکھوں میں اندھیرا چھا گیا تھا۔ اُس نے بھرائی ہوئی آواز میں کہا۔ ''جی''

اور پھر جیب سے سو روپے کا نوٹ نکال کر اُس کے آگے رکھا اور کہا۔ ''کل یہ نوٹ آپ بنک میں بھول گئے تھے۔''

دینا ناتھ کے چہرے پر خوشی کی علامت ظاہر نہ ہوئی۔ اُس نے بے پروائی سے کہا۔ ''اوہ۔ لیکن لوٹا دینے میں کیا جلدی تھی۔ رکھ لیا ہوتا۔''

رادھا کشن کچھ کہنے بغیر باہر چلا آیا۔ وہ قدرت سے دو چیزوں کا سودا نہ کر سکا تھا۔ جہاں دونوں میں گھاٹا ہی گھاٹا تھا۔ ایک سودا اُس کے حدِ اختیار سے باہر تھا۔ لیکن دوسرے پر اُسے قدرت تھی۔

اُجڑی ہوئی اصول کی دنیا دوبارہ بس گئی!

............☆☆☆............

سائڈ لائین

''بے وقوف!''

وہ میری طرف التجا بھری نگاہوں سے دیکھنے لگا۔ پھر بولا۔ ''مجھے بھوک لگی ہے۔ میرے بچے بھوکے ہیں۔ میری بیوی بیمار ہے۔''

میرا جسم دفتر میں کام کرتے کرتے ٹوٹ گیا تھا۔ اور اسی ژولیدگی میں میرے دماغ نے نئے افسانے کے لئے کچھ تاثرات قبول کئے تھے۔ جو کچے دھاگے کی طرح کبھی ٹوٹ جاتے تھے اور کبھی جُڑ جاتے تھے۔

میں نے جل بھُن کر کہا۔ ''آگ لگے تمہارے پیٹ کو! کوئی سائڈ لائین کیوں نہ بنا رکھی۔ جو آج بھوکوں نہ مرتے۔''

بھوکا نوجوان میری طرف حیرت سے دیکھنے لگا۔ اور دور شوالے کے گھڑیال سے ٹن ٹن کی آواز آنے لگی۔

اُس نے آہستہ سے پوچھا۔ ''سائڈ لائین؟''

میں نے کہا۔ ''ہاں سائڈ لائن۔ مجھ ہی کو دیکھو۔ ملازم بھی ہوں اور افسانہ نویس بھی! افسانہ نگاری میری سائڈ لائین ہے۔ نوکری چھوٹ جائے گی۔ پھر بھی مزے میں رہوں گا۔ تمہاری بھی کوئی سائڈ لائین ہوتی تو یوں در بدر بھیک نہ مانگتے پھرتے۔''

نوجوان خاموش ہوگیا۔ جاتے جاتے اُس نے پُوچھا۔ "آپ کے پاس کوئی کام نہیں؟......کوئی مزدوری؟"

میں نے غصے کی حالت میں کہا۔ "کوئی نہیں۔ میں خود مزدور ہوں اسسٹنٹ ریکارڈ کیپر۔ پبلک ورکس کا ٹھیکیدار نہیں۔ جاؤ۔ میرا دماغ پھٹا جارہا ہے۔ میرا افسانہ! اُلجھا ہوا پلاٹ......جاؤ۔"

بھوکا جوان سر جھکا کر آنگن سے نکل گیا۔ میں کہانی لکھنے بیٹھ گیا۔ سوچتا رہا۔ کتنا بے وقوف تھا۔ گدھا! اُن کے پاس نہیں گیا جن کے کوٹھار دھان سے بھرے پڑے ہیں۔ جن کی جیبیں چاندی سے پھٹ گئی ہیں۔ جو ہڈیوں پر محلات تعمیر کرتے ہیں۔ لیکن آگیا میرے پاس۔ بندوبست کے اسسٹنٹ ریکارڈ کیپر کے پاس! بے وقوف! اُلو......"

شام ہوچکی تھی۔ شوالے کا گھڑیال خاموش ہوگیا تھا۔ چڑیا اور چڑا کمرے کے وسط کے شہتیر پر پروں میں گردن چھپائے بیٹھے تھے۔ اُن کے پیٹ بھر چکے تھے۔ خدا کی بخشی ہوئی آزادی نے اُنہیں ہر دھندے سے نجات دی تھی۔ دن بھر کھانا پینا۔ شام کو سو رہنا۔ انہیں دینو کی طرح کسی کے آگے دست سوال دراز نہیں کرنا تھا۔ اور نہ میری طرح دن کو مسلوں کی نتھی کرنا۔ اور رات کو "نئی صُبح" کے لئے کہانی لکھنا! اُن کی دنیا میں نہ رام داس جیسے موٹے ٹھیکیدار تھے نہ خواجہ غنی جُو جیسے غلہ فروش! اور نہ مجھ جیسے افسانہ نویس!

میں کمرے میں اکیلا تھا۔ میرے آگے امثلات کا بے پناہ ڈھیر آر سے نتھی کرنے کے لئے مُنہ کھولے تھا۔ جنہیں میں آج تکان کی وجہ سے نتھی نہ کرسکا تھا۔ اور میرے دماغ میں تاثرات کا ایک ٹھاٹھیں مارتا ہوا سمندر!

رائے نندلال نے میرے ساتھ ہمدردی تو کی تھی۔ اور مجھے نوکر گرادیا تھا۔

لیکن میرے دماغ۔ آتش خیز دماغ کے ساتھ کوئی ہمدردی کرنے والا نہ تھا۔ "نئی صبح" کا کانگریسی ایڈیٹر میرا سب سے بڑا مداح تھا۔ میری کہانیوں اور نظموں سے اُس کا اخبار دوسرے اخباروں سے بہت اونچا اُٹھ گیا تھا۔ لیکن خالی مدح سے پیٹ تو نہیں بھرتا۔ گھر کے اخراجات تو کم نہیں ہوتے۔ اُس کے لئے چاندی چاہئے۔ اور وہ ایسی بات سنتے ہی مسکرا کر کہتا تھا۔ "ہم اوروں سے چندہ لیتے ہیں۔ دینے کے عادی نہیں۔ یہ کیا کم دولت ہے کہ ملک میں تم مقبول ہو رہے ہو۔ شہرت کے اونچے آسمان پر اُڑے جاتے ہو۔" فطری کمزوری کے غلبے سے میرا منہ بند ہو جاتا۔ دراصل افسانہ نویسی کا شوق میرے لئے سائیڈ لائین تھی۔ ذریعہ معاشی نہیں۔ کیونکہ میں بندو بست کا اسسٹنٹ ریکارڈ کیپر تھا۔

۔ اور اُن کے دفتر کا چپڑاسی علیا صرف اس لئے تنخواہ پاتا تھا کہ وہ صرف چپڑاسی تھا۔ اُس کی کوئی سائیڈ لائین نہ تھی۔ رات کو اگر وہ گھر پر لکڑی کے چھوٹے چھوٹے شکاروں پر پیپر ماشی کرتا تھا۔ تو اُس سے وہ شہرت کے اُونچے آسمان پر نہ اُڑا جا رہا تھا۔ اور میں اُس کے برعکس مقبول تھا۔ مشہور تھا۔ اسسٹنٹ ریکارڈ کیپر بھی اور افسانہ نویس بھی! میں نے پھیلی ہوئی مسلوں کی طرف عاجزی سے دیکھا اور آنکھیں بند کر کے سر جھکا کر اُن سے کہہ دیا۔ "آج دَیا کرو! میرے اَن داتا آج دَیا کرو! آج اپنی چھاتیوں میں مجھے بے رحم چھید نہ کرواؤ!" ...... آج میرے دل میں بوڑھے بھکاری کا تصور جسے میں نے دفتر سے آتے آتے چنار کے نیچے لیٹے دیکھا۔ چھید کر رہا ہے۔ آج اُسی کو چھیدنے دو...... میری چھاتی ......اور کل صبح ...... "نئی صبح" کا علیا اُس چھید کا خون لے کر اپنے مالک کو دکھائے گا۔ وہ خوش ہوگا...... اُس کے خریداروں کی تعداد بڑھ جائے گی اور میں شہرت کے اونچے آسمان پر اُڑتا جاؤں گا۔"

رات کے بارہ بج چکے تھے۔ کلک کا پنڈولم سر ہلا ہلا کر کہہ رہا تھا۔ "نہ چھیدو

اپنی چھاتی......نہ بیچوا اپنا خون......تباہ ہو جاؤ گے......''

لیکن یہ بے جان پنڈولم، اسے کیا معلوم! چھاتی میں خود چھید کرنا میری سائیڈ لائین ہے۔اور خون بیچنا میری شہرت کا ذریعہ!

میری بیوی، میرے بچے شباب اور بچپن کے سپنے دیکھ رہے تھے اور شہتیر پر سویا ہوا جوڑا آزادی کے کیف آور خواب! اور بے جان پنڈولم ۔ ٹِک ۔ ٹِک ۔ ٹِک ......

بے وقوف! اِن کی بھی کوئی سائیڈ لائن ہوتی۔تو کیا مزے سے یوں پڑے رہتے؟ میری طرح چھلنی نہ ہوئے ہوتے۔ کاغذ کے کھلے پُرزوں پر اُن کا خون نہ پھیلا ہوا ہوتا۔کیا بے کار زندگیاں گزر رہی ہیں۔ دراصل زندگی سائیڈ لائین ہی کا نام ہے۔ جینا زندگی ہے۔اور پیٹ کو تھامے مٹی چھاننا اس کی پس پردہ سائیڈ لائن! لیکن مجھے کیا؟''

کبھی کبھی جی چاہتا ہے کہ اُس پتلے سے محافظ دفتر کی آنکھیں نوچ ڈالوں۔ بڑی بے رُخی سے کبھی کبھی کہتا ہے۔''یہ کہانیاں کیا ہیں؟ صاف دھوکا! تم لوگ حقیقت کو چُھپا کر ہم پر زبردستی اُس کو نقل ٹھونس دیتے ہو اور توقع رکھتے ہو کہ ہم تمہیں سر آنکھوں پر بٹھائیں''۔کتنا بدمذاق شخص ہے۔عمر کے چھپالیس سال یا تو کاغذ کے پُرزوں کو ٹھیک ٹھاک کرتے گزر گئے یا ناریل کا حقّہ پیتے پیتے! اور اب مجھ سے افسانہ نگاری پر بحث کرتا ہے۔ اُلو کے پٹھے کو اتنا بھی نہیں معلوم کہ دنیا بذات خود دھوکا ہے۔اُس کا اپنا وجود تک دھوکا ہے۔ ریٹائر ہوگا تو کتے تک نہ چاٹیں گے۔اور آج حوصلہ افزائی کے برعکس میرے دل میں افسانہ نگاری کی نفرت پیدا کرنا چاہتا ہے۔ گویا میں افسانہ کے لئے لکھتا ہوں کبھی کبھی حقے کے لمبے لمبے کش کھینچتا ہوا کہتا ہے۔'' کاغذوں کے ساتھ دل لگاؤ۔انہیں سے تمہاری قسمت بنے گی۔افسانوں سے نہ کسی کی

قسمت بنی ہے نہ بنے گی۔ سب افسانہ نویس ایڑیاں رگڑ رگڑ کر ہی مر گئے۔ کام کرو اور خوش رہو۔''

اس کے برخلاف دفتر کے سب چھوٹے بڑے بڑے ملازم میرے مداح ہیں۔ گلاب سنگھ چوکیدار تک میری کہانی پڑھ کر کبھی کبھی مجھے اُس کی داد دیتا ہے۔ حالانکہ وہ چوکیدار ہے اور ادب سے کوسوں دور!

بابو ہیمراج اپنی نوکری کی بے ثباتی پر کہتا ہے۔ ''تم بڑے خوش نصیب ہو۔ ایک لطیف آرٹ تمہارا غلام ہے۔ نوکری چھوڑ بھی دو گے تو مزے میں رہو گے۔ عزت بھی اور دولت بھی......!''

صبح کے چار بجے کہانی ختم ہوگئی۔ دفتر میں کام کرتے کرتے میرا جسم ٹوٹ ٹوٹ جاتا تھا۔ لیکن کہانی لکھتے وقت مجھ میں ناقابل یقین قوت اور مسرت پیدا ہو جاتی ہے۔ جتنا خون سینچتا ہوں۔ اُس سے کئی گنا زیادہ عود کر آتا ہے۔ اور یہ کلاک کا پنڈولم کہتا ہے۔ ''تباہ ہو جاؤ گے۔''

صبح سویرے علیا آ گیا۔ اُس کے ہونٹوں پر حسب دستور مُسکراہٹ تھی۔ اور بغل میں اخباروں کا پلندہ!

میں نے کہا۔ ''کہانی تیار ہے۔ ابھی لو گے یا خود دے آؤں؟''

علیا نے کہا ''مجھے دیجئے جناب ایڈیٹر صاحب نے کہہ رکھا تھا کہانی تیار ہو تو لے آنا اور کل ہمارا سنڈے ایڈیشن......''

علیا کہانی لے کر چلا گیا۔ شوالے سے صبح کا گھڑیال بجنے لگا۔ میرے دماغ پر رات کا جو بوجھ تھا۔ وہ اُتر گیا۔ گھڑیال کے ٹن ٹن سے کتنی شانتی۔ کتنی تسکین اور کتنا سکون خلا میں پھیلا رہا تھا۔

میری بشاشت مسامات سے پھوٹ پھوٹ رو رہی تھی۔ اور دوسرا افسانہ لکھنے

تک میں سبک اور ہلکا پُھلکا ہو چکا تھا۔

میں مسلوں کو بستے میں باندھ کر دفتر گیا۔ راستے میں کتنے ہی سر میری عقیدت میں جھک گئے۔ کتنے ہی آدمیوں نے مجھے گذشتہ ہفتے کی کہانی کو داد دی۔ اور کتنے ہی نوجوان مجھے حیرت سے دیکھتے رہتے۔ ''یہ ہے نگندر۔ نئ صبح کا مشہور افسانہ نویس!'' وہ ایک دوسرے سے دبی زبان میں کہتے تھے۔ اور ان کی سرگوشیاں سن کر میرا دماغ آسمان پر اُڑا جا رہا تھا۔ شاید میرے قدم بھی زمین پر نہ پڑتے تھے۔

(۲)

ایک دن میں ''نئ صبح'' کے دفتر میں گیا۔ ایڈیٹر نے مجھے دیکھتے ہی مجھ سے ہاتھ ملایا۔ اور سامنے کوچ پر بیٹھنے کا اشارہ کیا۔ اور بولا۔ ''آپ کی کہانی ''سنگم پر'' بہت مقبول ہوئی ہے۔ حالانکہ مجھے کہانیاں پڑھنے کا نہ شوق ہے نہ فرصت۔ لیکن میں نے بھی دوبارہ وہ کہانی پڑھی۔ اور حق تو یہ ہے کہ اس میں آپ نے حقیقت کو بے نقاب کر دیا ہے۔ سچ مچ غریبوں پر یہی کچھ ہوتا ہے ہے آہاہا...... کیا دلفریب کہانی تھی، ...... ماسٹر جی تک اُسے پڑھ کر جھومے۔ علیا کی آنکھوں میں بس آنسو ہی پھوٹ نکلے۔ ''

میں نے خشک سی ہنسی ہنس کر کیا۔ ''آپ کی نوازش ہے۔ ویسے تو کچھ ہو ہی جاتا ہے۔ جب آدمی توجہ سے لکھے۔''

ایڈیٹر سگریٹ پیش کرتے ہوئے کہا۔ ''لیجئے!''

''شکریہ! میں سگریٹ نہیں پیتا۔'' میں نے کہا۔

''پھر ہم آپ کی کیا خدمت کر سکیں۔ کچھ پھل منگوائیں؟'' ایڈیٹر نے گھنٹی کا بٹن دباتے ہوئے کہا۔

''مہربانی! نوازش...... میں کھانا کھا کر آیا ہوں''۔ میں نے جواب دِیا۔

ایک کتاب کو ہاتھ میں اُٹھاتے ہوئے وہ پھر بولے۔ ''نگندر صاحب! اب آپ بھی اپنی کہانیوں کو کتابی صورت میں چھپوائیں۔ یہ دیکھئے کتنی دیدہ زیب کتاب بن گئی ہے۔ بالکل اسی نوع کی۔ میرا خیال ہے۔ ہاتھوں ہاتھ بک جائے گی۔''

میں نے ایڈیٹر کے ہاتھ سے وہ کتاب لے لی۔ سچ مچ اُس کی کتابت۔ طباعت۔ جلد بندی بہت دیدہ زیب تھی۔

ایڈیٹر نے پھر کہا۔ ''آج کل لوگوں کی نگاہیں اندر کو نہیں دیکھتیں۔ اُوپر اُوپر دیکھتی ہیں۔ اس کتاب میں اگر چہ کوئی خاص بات نہیں۔ پھر بھی خوب بک رہی ہے اور ماشاءاللہ آپ کی چیزوں میں جان ہوتی ہے۔''

میں نے ہنس کر کہا۔ ''مجھے کیا اعتراض ہے۔ چھپوا دیجئے۔ کہانیاں میں انتخاب کر دوں گا۔''

ایڈیٹر نے ٹانگ پر ٹانگ رکھتے ہوئے کہا۔ ''ہماری تو وہ لائین ہی نہیں۔ میرا مطلب ہے۔ کسی پبلشر سے بات چیت کی جائے۔ وہ بھی فائدے میں رہے گا اور آپ بھی۔''

میں نے اُن کی طرف غور سے دیکھا۔ وہ پیتل کے ہاتھی سے کھیل رہے تھے اور شاید کسی چیز کے منتظر!

میں نے کہا۔ ''دیکھا جائے گا۔ وقت پر سب کچھ ہوگا۔''

اُسی وقت علیا کاپی لے کر آ گیا۔ جتنی دیر میں وہ کاپی پڑھتے رہے۔ میں اس کلاک کی طرف دیکھتا رہا۔ جو اُن کے کمرے کی دیوار پر لٹک رہا تھا۔ اس کا پنڈولم بھی سر ہلا ہلا کر جیسے مجھ سے کہہ رہا تھا۔ ''وہ تو ہماری لائین ہی نہیں ...... وہ تو ہماری لائین ہی نہیں۔ ہم خون بیچتے ہیں ...... اُسے اِکٹھا نہیں کرتے ...... کہ کوئی اُس سے اپنے لئے حرارت پیدا کر سکے...... وہ تو ہماری لائین ہی نہیں۔''

علیا کاپی پریس کے لئے لے گیا۔تو میں نے کہا۔''ایک عرض ہے۔بشرطیہ قبول ہو۔''

''ارشاد......ارشاد!''ایڈیٹر نے اپنی نوکیلی ٹوپی میز پر رکھتے ہوئے کہا۔اور میری طرف متوجہ ہوا۔

''ہمارا محکمہ ٹوٹ رہا ہے۔اس کے متعلق اپنی دو چار اشاعتوں میں کچھ لکھئے۔''میں نے کہا۔

ایڈیٹر نے مسکرا کر کہا۔''ٹوٹنے دیجئے۔آپ کو کیا؟''میں نے کوٹ کے بٹن کھولتے ہوئے کہا۔''صاحب۔کئی ملازم بے خانماں ہوجائیں گے۔اُن کا کیا بنے گا؟''

ایڈیٹر نے اُسی طرح مسکراتے مسکراتے کہا۔''سچ تو یہ ہے۔آپ کا محکمہ ملک کے خزانے پر خواہ مخواہ کا بوجھ ہے۔کسانوں،مزدوروں اور تاجروں سے حاصل کیا ہوا پیسہ اس طرح بے مصرف خرچ ہو۔اس کی ہم کیسے حمایت کرسکیں گے؟ اور آپ تو جانتے ہی ہیں۔ہماری پالیسی حریت پروانہ ہے۔اگر یہی پیسہ ملک کی کسی بہبود کے کام آئے تو کیا آپ خوش نہ ہوں گے......یقیناً ہوں گے۔''

میری پیشانی سے پسینہ چھوٹ رہا تھا۔مجھے اپنا آپ بہت بوجھل محسوس ہورہا تھا۔میں نے کہا۔''میری سروس ابھی پانچ سال کی بھی نہیں اور مجھے ڈر ہے......''

ایڈیٹر نے زور سے قہقہہ لگایا اور کہا۔''واہ صاحب! آپ بھی حد کرتے ہیں۔آپ کے ہزاروں مداح ہیں۔اتنے اخبار ہیں۔''نئی صبح'' ہے۔آپ کو کیا ڈر؟ آپ کی سایڈ لائین آپ کو گرنے نہیں دے گی۔''

''سچ مچ میری سایڈ لائن بہت مضبوط ہے''میں نے دل میں سوچا اور نظریں پھر پنڈولم کی طرف اُٹھیں۔جواب کہہ رہا تھا۔''آپ کی سایڈ لاین آپ کو گرنے نہیں

دے گی۔''

''سچ مچ ایسا محکمہ اڑنا ہی چاہئے۔ جس میں بدمذاق محافظ دفتر ہو۔ گلاب سنگھ سا ہر وقت اونگھنے والا چوکیدار ہو۔ لیکن بابو ہیم راج ٹھاکر دلیپ سنگھ۔ پنڈت دوار کا ناتھ......وہ میرے مداح......اُن کا کیا ہوگا؟'' میں نے پھر سوچا۔

اُٹھتے اُٹھتے ایڈیٹر صاحب بولے۔ ''کوئی نئی چیز لکھی ہے آپ نے؟ میرا مطلب ہے کوئی ایسی چیز، جو ''سنگھم پر'' سے زیادہ خوبصورت ہو۔ زیادہ نفیس!''

میں نے مصافحہ کرتے ہوئے کہا۔ ''لکھی ہے۔ کل سے صاف کر رہا ہوں۔ شاید آج ختم ہو جائے۔''

جب میں سیڑھیاں اُترنے لگا۔ تو وہ بھوکا نوجوان سیاہ وردی میں ملبوس ایک کاپی لے کر پریس سے آرہا تھا۔

میں نے قدم روک کر اُسے دیکھا۔ پھر کہا۔ ''دینو!''

دینو نے میری طرف حیرت سے دیکھا اور کہا۔ ''جی!''

''تم ملازم ہو گئے ہو؟'' میں نے پُوچھا۔

دینو نے سر جھکا کر کہا۔ ''جی۔ مارگن پریس والوں کے پاس۔''

میں نے خوش ہوتے ہوئے کہا۔ ''بہت خوشی ہوئی مجھے۔ بہت خوشی...... لیکن کیا تنخواہ دیتے ہیں۔؟''

دینو نے سیڑھی چڑھتے ہوئے کہا۔ ''بارہ روپے!''

''اب بھوک تو مٹ گئی ہوگی تمہاری؟'' میں نے سیڑھیاں اُترتے ہوئے پوچھا۔

دینو میری طرف مُڑ کر آہستہ سے مسکرا دیا۔ زبان سے کچھ بھی نہ بولا۔

ایک مہینے کے بعد اچانک وہ بخار ٹوٹ سا گیا۔ جو کئی مہینوں سے چھوٹے بڑے ملازموں کو چڑھا تھا۔ محکمے کا نصف عملہ تخفیف میں آچکا تھا اور اُن میں میں بھی۔ گلاب سنگھ بھی اور بابو ہیمراج بھی......اور بھی کتنے ہی......صرف وہ بد مذاق محافظ دفتر اور دو کلرک بچ گئے تھے۔

بابو ہیمراج میرے پاس آیا۔ اور ڈبڈبائی آنکھوں سے دیکھ کر بولا۔ "اب کہاں جائیں نگندر۔"

میرا دل نہ زیدہ پشیمانہ تھا نہ زیادہ مسرور۔ مجھے اپنی سائیڈ لائین پر بھروسہ تھا۔ جس نے میرے لئے ہزاروں مداح پیدا کر دئے تھے۔

میں نے ہنس کر کہا۔ "تم جان کیوں ہارتے ہو؟ خدا کارساز ہے۔ بھوکوں تو نہیں مارے گا۔"

بابو ہیمراج نے لمبی آہ کھینچ کر کہا۔ "بھئی۔ تم تو افسانہ نویس ہو۔ اخبار میں سما سکو گے۔ لیکن ہم......ہم کہاں جائیں؟"

میں نے ہمدردی ظاہر کرتے ہوئے کہا۔ "کاش! تم بھی افسانہ نگار ہوتے......اوہ کتنی عظیم غلطی کی ہے تم نے!......دن کو کلرکی کرتے اور رات کو افسانہ نویسی۔"

آرڈر پر سبکدوشی کا دستخط کر کے میں 'نئی صبح' کے دفتر میں آیا۔ راستے میں سوچتا رہا اب خوب افسانے لکھ سکوں گا۔ مطالعے میں بھی اضافہ ہوگا۔ کیا ہوا پچیس روپے کی نوکری گئی۔ شہرت۔ عزت اور دولت کا دروازہ تو کھل گیا۔

ایڈیٹر نے مجھے دیکھتے ہی کہا۔ "بڑا افسوس ہے۔ آپ تخفیف کی زد میں آ گئے۔ لیکن شکر ہے کہ ملک کے پیسے کا ناجائز مصرف ختم ہوا۔"

میں نے مصنوعی ہنسی ہنس کر کہا۔ "اور اب؟"

ایڈیٹر میرا طالب تاڑ گئے۔ بولے۔ "اب کیا ہے۔ اب تو آپ آزاد ہیں۔

اپنی سائیڈ لائین کو نہ گرنے دیجئے۔ اب افسانے لکھا کیجئے۔ دن اور رات۔ اور جب ہماری مالی حالت اجازت دے گی۔ ہم آپ کی کچھ مدد بھی کیا کریں گے۔ اس کا اطمینان رکھیں۔"

میری پیٹھ پر چیونٹیاں سی رینگنے لگیں۔ نتھنے زور زور سے دھڑ کنے لگے۔

بڑی ہمت سے میں نے پھر پوچھا۔ "اگر یہاں ہی کام کروں......تو۔"

ایڈیٹر نے مسکرا کر اور پھر ساری ہمدردی کو لفظوں میں جمع کر کے کہا۔ "افسوس ہے۔ ہمارے پاس اس وقت گنجائش نہیں......"

میرے چہرے پر اوس پڑ گئی۔

میری آنکھوں کے آگے۔ دینو۔ گھر کے کلاک کا پنڈولم اور بد مذاق محافظ دفتر پھرنے لگا۔

اور جب میں کمرے سے نکلنے لگا تو ایڈیٹر کے کلاک کا پنڈولم زور زور سے اپنا سر ہلا ہلا کر کہہ رہا تھا۔ "ہمارے پاس گنجائش نہیں......گنجائش نہیں!!"

............☆☆☆............

چتائیں

(۱)

جنم اشٹمی کا تیوہار تھا۔ گھر میں بڑی چہل پہل تھی۔ کوئی فریم میں جڑی ہوئی بھگوان کرشن کی تصویر صاف کر رہا تھا۔ کوئی ٹھاکر دوارے میں پوجا کے برتین مانجھ رہا تھا۔ کوئی کلیاں چن رہا تھا۔ کوئی پیٹ پوجا کا انتظام کر رہا تھا۔ بچے تلے ہوئے آلو اور تربوز کھانے کی خوشی میں سب کا ہاتھ بٹاتے تھے۔

میں اپنے کمرے میں بیٹھا نظم مکمل کر رہا تھا۔ یہ نظم آج رات کو کشمیری پنڈتوں کے عظیم الشان جلسے میں جو ہر سال بھگوان کرشن کی یاد میں منایا جاتا ہے۔ مجھے سنانی تھی۔ نظم قریب قریب ختم ہو چکی تھی۔ البتہ آخری بند پر طبیعت ایکا ایکی رک گئی تھی۔ بھگوان کرشن کا فلسفہ، اُن کا نیائے۔ اُنکے کارنامے، سب کا حال نظم میں آ گیا تھا۔ آخری بند کے لئے مجھے کچھ نہ سوجھتا تھا۔ میں اس میں ''لا انتہا سوز'' بے پناہ درد اور بے حد رنگینی پیدا کرنا چاہتا تھا۔ چنانچہ اسی خیال کے پیش نظر میں نے کتنے ہی مصرعے موزوں کئے۔ لیکن میری طبیعت کو ایک بھی نہ جچا۔ سب پھُسپھُسے اور بے جان سے معلوم ہوئے۔

طبیعت کو ایک مرکز پر لانے کے لئے میں نے کیا کچھ نہ کیا۔ کمرے میں ٹہلا۔ کبھی پلنگ پر لیٹا۔ کبھی سگریٹ سلگایا۔ لیکن پھر بھی روٹھی ہوئی طبیعت موزوں نہ

ہوئی۔ ناچار اُس جھروکے میں آکر بیٹھا۔ جو جنوب مشرق کی طرف کُھلتا ہے۔ میں نے دیکھا۔ مقابل کے خستہ مکان کے جھروکے میں ایک بہت حُسین لڑکی سر جھکائے اداس بیٹھی ہے۔

یہ جنم اشمٹی کا دن تھا۔ نئی بیاہی ہوئی لڑکیاں سسرال جانے کی تیاریاں کر رہی تھیں۔ اُن کے کپڑوں کی خوشبو سے سارا مکان مہک اُٹھتا تھا۔ مانگ کی سندور ننگے سروں پر مُسکراتی تھی۔ اور ماتھے پر سات رنگوں کا تلک تارے کی طرح چمک رہا تھا۔ اس دن اداس بیٹھنا سال بھر کے لئے بدشگون مانا جاتا ہے۔ پھر یہ حسین لڑکی سر جھکائے کیوں بیٹھی ہے۔ اس کی مانگ کا سندور کہاں ہے؟ اس نے ابھی تک کپڑے کیوں نہیں بدلے۔ تلک کیوں نہیں لگایا سسرال جانے کی خوشی میں جو ہندو استری کی سب سے بڑی خوشی ہوتی ہے یہ بھولی بھالی حسین لڑکی پاگل کیوں نہ ہو اُٹھی؟

مجھے معلوم تھا۔ اس خستہ مکان میں جس کی دیواریں کچی اینٹوں کے سہارے کھڑی تھیں۔ سورج رام کی مختصر دنیا آباد تھی۔ وہ مدرسے میں چپڑاسی تھا۔ رفتہ رفتہ ترقی کرتے کرتے وہ انسپکٹر صاحب مدارس کے دفتر کا جمعدار بن گیا۔ اب بھی کہ وہ ترقی کی انتہا پر پہنچ چکا تھا۔ اُس کا وہی رنگ ڈھنگ تھا۔ وہی جھکی ہوئی کمر۔ وہی چھوٹی چھوٹی سی آنکھیں۔ کاندھے کی ہڈیاں اُبھری ہوئی۔ داڑھی پر بھورے رنگ کا وسمہ لگائے۔ میلی زین کا پھٹا ہوا سرکاری کوٹ پہنے۔ سر پر خاکی پگڑی بے ترتیبی سے باندھے جب کبھی مجھے گلی میں آتا جاتا دیکھتا تھا۔ تو بڑے پیار اور پریم سے آشیرواد دیتا تھا۔ کبھی کبھی میرے گیت سنتا تھا۔ تو جھروکے میں بیٹھے بیٹھے ہی جھوم اُٹھتا تھا۔ اور حُقہ پینا تک بھول جاتا تھا۔ ہر صبح وہ ٹھاکر دوارے میں پوجا پاٹ کرتا تھا۔ اس کی آواز میں غضب کی کشش۔ منتر اس انداز میں پڑھتا۔ کہ لوہا بھی پگھل کر بہ جاتا۔ اپنی مختصر سی

دنیا میں بہت خوش تھا۔ لیکن عمر بھر صرف ایک ہی ارمان رہا۔ اتنی منتیں مان کر اور جی توڑ کر بھی بھگوان نے اُسے لڑکا نہ دیا۔ ہاں لڑکیاں بہت دیں۔ لیکن اُن میں بھی صرف جانکی ہی زندہ رہی۔ باقی آگے پیچھے والدین کو داغ مفارقت دے کر چل بسی۔

جن دنوں، میں مدرسے میں پڑھتا تھا۔ جانکی مجھ سے بہت چھوٹی تھی۔ اس کی صورت دیکھ کر معلوم ہوتا تھا۔ جیسے سورج رام کی ساری عبادت کا نور اس کے چہرے پر نکھر گیا ہے۔ لڑکی کیا ہے سرسوتی کا اوتار ہے۔ جس گھر میں جائیگی۔ اسے بقعہ نور بنائے گی۔ جانکی بڑی ہو کر بیاہی گئی۔ پرکھ پرکھ کہ سورج رام نے بات طے کی۔ وہ اپنی عمر میں سکھ اور مکمل سکون کا ایک دن بھی نہ دیکھ سکے تھے۔ لیکن اپنی بیٹی کے لئے انہیں ایسے سمندر کی تلاش تھی۔ جہاں وہ مسرتوں اور قہقہوں میں ایک روندے ہوئے حسین کنکر کی طرح ڈوب جائے۔ جہاں اس کی وہ آرزوئیں پوری ہوں۔ جو اس کے غریب والدین کے گھر میں پوری نہ ہوئی تھیں۔ اسی لئے انہوں نے ٹھنک بجا کر جانکی کا بیاہ کیا۔ قسمت کی یاوری سے گھرانہ بھی ایسا ملا۔ جہاں بھگوان نے سب کچھ دیا تھا۔ صرف کھانے والے نہ دئے تھے ساس اور سُسر کی ساری دنیا ان کا اکلوتا بیٹا تھا۔ جو حال ہی میں سرکاری نوکر بھی ہو گیا تھا۔ کشمیری پنڈت کو اپنی بیٹی کے لئے کچھ نہ ملتے تو پروا نہیں۔ البتہ لڑکا سرکاری ملازم ہونا چاہئے۔ یہی اس کے اور اس کی بیٹی کے لئے دولت لازوال ہے۔

جانکی سسرال گئی۔ تو ساس اور سسر کی پلکیں اُس کا بچھونا ہو گیں۔ میری نظروں کے سامنے اب تک وہ رنگین شام ہے۔ جب سورج رام کے گھر جانکی کی برات آئی تھی۔ اُس دن سورج رام رفل کا سفید پیرہن پہنے اور ململ کا صافہ باندھے کمر جھکائے ہوئے آرام کُرسی پر بیٹھا تماشہ دیکھ رہا تھا۔ اور آرزوؤں کو پورا ہوتے دیکھ کر اندر ہی اندر جی اُٹھتا تھا۔ آج وہ چپڑاسی نہ دکھائی دیتا تھا۔ ماتھے پر سندور کے تلک سے

مہرشی سا دکھائی دیتا تھا۔ محکمہ تعلیم کے چھوٹے بڑے افسر اپنے کہن سال چپڑاسی کی خدمات کو خراج عقیدت ادا کرنے کے لئے قطاروں میں کھڑے تھے۔ اور محلے کا بچہ بچہ جان توڑ کر کام کر رہا تھا۔ وہ بھی آج سورج رام کی شفقت کا معاوضہ ادا کر رہے تھے۔

معاً میرے سامنے چادر بچھائی گئی۔ میرا حسین خواب ٹوٹ گیا۔ میری بیوی رکابی میں تلے ہوئے آلو اور کچھ پھل لے کر کھڑی تھی۔ مسکرا کر اُس نے پُوچھا۔ ''بھوک تو نہیں لگی؟''

میں نے کہا۔ ''بالکل نہیں۔ جنم اسٹمی اور بھوک! توبہ!''

بیوی نے حیرانی سے پُوچھا۔ ''تو آپ کچھ نہ کھائیں گے؟''

میں نے کہا۔ ''کھاؤں گا اگر کچھ ملے گا۔ لیکن یہ تو بتاؤ۔ سورج رام کے مکان کے جھروکے میں بیٹھی ہوئی یہ لڑکی کون ہے؟''

بیوی نے چادر پر رکابی رکھ دی۔ اور کھڑکی سے باہر جھانکا۔ اور پھر بولی۔ ''آپ نہیں پہچانتے اسے۔ جانکی نہیں کیا؟''

میں نے بے اختیار کہا۔ ''اُوہ۔ جانکی ہے؟ دو برس گھر سے باہر رہ کر میں سب کچھ بھول گیا ہوں۔ جانکی! ہاں شکل وصورت تو وہی ہے۔''

بیوی نے آہستہ سے کہا۔ ''اب اس کی شکل وصورت کا کیا۔ جب سہاگ ہی نہ رہا۔''

میرے پاؤں تلے کی زمین نکل گئی۔ میں حیرانی سے پُوچھا۔ ''کیا ہوا اسے؟''

بیوی نے کہا۔ ''یہ تو بیاہ کے دو مہینے بعد ہی بدھوا ہوگئی۔ جو موتی سیپ سے نکلا تھا۔ وہ ٹوٹ چکا ہے۔ نکلنے کے وقت موتی تھا، ٹوٹنے کے بعد وہ کانچ کا ٹکڑا''۔

میرا دل بیٹھ گیا۔ سورج رام کی ساری دنیا قدرت کے ایک کرشمے سے خاکستر ہوگئی تھی۔ میں نے کہا۔ ''بڑا غضب ہوا۔ بے چارہ سورج رام آخر عمر میں لُٹ گیا۔''

بیوی نے پھر کہا۔ ''اب بے چاری جانکی کی ساس بھی مرگئی۔ اور ماں بھی۔ نہ وہاں رہ سکتی ہے نہ یہاں۔ ساری دنیا میں اس کے لئے اندھیرا ہی اندھیرا چھا گیا۔''

اُسی وقت ایک بچے نے بھگوان کرشن کی صاف کی ہوئی تصویر میرے سامنے لاکر رکھی اور کہا۔ ''اب ٹھیک ہوگئی مدھو بابو۔''

میں نے تصویر دیکھی۔ وہ مسکرا مسکرا کر اور جھوم جھوم کر بانسری بجا رہے تھے۔ شاید اُس وقت جب انہوں نے انیائے پر فتح حاصل کی تھی۔

میرا دل اُچاٹ ہوگیا تھا۔ بادلِ نخواستہ میں نے بچے سے کہا۔ ''بالکل ٹھیک ہوگئی۔ لے جاؤ اب۔''

بیوی نے پوچھا۔ ''اور یہ پھل؟''

میں نے نظم پر ٹکٹکی باندھتے ہوئے بے پروائی سے کہا۔ ''یہ بھی۔''

(۲)

میری نگاہوں میں جانکی کا مستقبل پھرنے لگا۔ بھولی بھالی حسین لڑکی جس نے ابھی دنیا کی روشنی نہ دیکھی تھی۔ عمر بھر کے لئے لٹ چکی تھی۔ شاید ابھی اسے اتنا بھی احساس نہ تھا کہ اس کی زندگی کن ہیبت ناک تاریکیوں، دردناک فریادوں اور غمناک مصیبتوں سے بھر گئی تھی۔ وہ ہندو سماج میں بدھوا کے لفظی اور عملی معنی سے بے خبر تھی۔ بوڑھے باپ کی حیات تک کسی حد تک وہ اپنے سے بے پروا ہو سکتی تھی۔ لیکن اس کے اُٹھ جانے کے بعد اس کا کیا ہوگا؟ کون اس کے شباب، اس کی مستی۔ اور اس کے حسن کا محافظ ہوگا۔ انسان کا دل کمزوریوں سے بھرا پڑا ہے۔ کیا عجب ہے باپ

مرنے کے بعد جانکی کے معصوم دل میں کمزوری پیدا ہو۔ اور وہ اپنی ساری تقدیس کو قربان کر بیٹھے۔ بے چاری پر مصیبت ٹوٹنے کے وقت سب کے دل اس کے لئے ہمدردی سے بھرے گئے ہونگے۔ لیکن کسی نے اس کے مستقبل کی خوفناک تصویر کا اندازہ نہ کیا ہوگا۔

ہمارے دھرم اور ایمان کا آدرش کتنا ہی بلند اور پاکیزہ کیوں نہ ہو۔ لیکن جب تک ہمارے سماج کے قوانین ہیں۔ ہم عورت ذات کے آگے سرنگوں ہیں۔ قانون ساز نے جہاں کچھ پایا۔ اُس نے وہ مردوں کو دے دیا۔ عورت کو صرف خوبصورت الفاظ میں ٹال دیا۔ یہ ہمارا ایمان ہی نہیں بلکہ ہم یہ محسوس بھی کرتے ہیں۔ اور چپ رہنے کے سوا چارہ ہی نہیں دیکھتے۔ اندر اندر سے زوردار الفاظ میں اس کی دھجیاں بھی اُڑاتے ہیں۔ تنقیدیں بھی کرتے ہیں۔ مخالفت پر بھی اُتر آتے ہیں۔ لیکن جب عملی ثبوت کا موقعہ آتا ہے۔ تو جان بچا کر بھاگتے ہیں۔ صرف اس خوف سے کہ برادری میں ہمارے نام پر حرف نہ آئے۔ اور ہم بدستور سعادت مندوں اور مریدوں میں شمار ہوتے رہیں۔ لیکن کیا دنیا میں اس سے بڑھ کر بھی کوئی بزدلی ہے؟

ہمارے قوانین ناقص ہیں۔ رسوم تباہ کن ہیں، ان کی بدولت ہم آئے دن قعر پستی میں گرتے جاتے ہیں۔ لیکن بھیڑوں کی طرح سر نہیں اُٹھا سکتے۔ ایک معصوم لڑکی کا سب کچھ ہمارے سامنے لُٹ جاتا ہے۔ اور ہم آنسو بہانے کے سوا کچھ نہیں کر سکتے۔ ہمارے چاروں طرف بھولی بھالی زندہ لڑکیوں کی ہزاروں چتائیں جلتی ہیں۔ اور ہم اُن کے شعلوں کی تپش تک محسوس نہیں کرتے۔ کس قدر مردہ دلی کتنی خوفناک غفلت!

(۳)

سات بجے میں کمرے سے نکلا۔ میرا دل خوش تھا۔ میں نے آج وہ نظم لکھی

تھی۔ جو میں آج تک نہ لکھ سکا تھا۔ جنم اشٹمی کے تہوار کی بڑائی کو نظر انداز کر کے میں نے آج قوم کے نام ایک فریاد لکھی تھی۔ جس کے لکھنے میں فرض اور درد نے میرا ہاتھ بٹایا تھا۔

ساڑھے سات بجے میں جلسہ گاہ میں پہنچا۔ میرے آنے سے دور دور کی فضا میں ہلچل مچ گئی۔ بوڑھے بچے اور نوجوان سبھی عزت کی نظروں سے مجھے دیکھ رہے تھے۔ کیونکہ اس قسم کے جلسوں میں میرے گیت اور میری ترنم بھری آواز انہیں بے خود کیئے دیتی تھی۔

نظم کے پہلے تین بند سامعین نے نہایت جوش میں سنے۔ واہ واہ اور زندہ باد کے نعروں سے شامیانہ ہلنے لگا۔ لیکن جونہی میں چوتھا بند پڑھا۔ تو ہر طرف موت کی سی خاموشی چھا گئی۔ پانچویں اور چھٹے بند کے وقت بھی یہی کیفیت رہی۔ میں سمجھا میری محنت اکارت گئی ہے۔ لیکن حقیقت اس سے مختلف تھی۔ فریاد کی تاثیر نے دلوں کو مسوس لیا تھا۔ سب کی آنکھوں سے آنسو جاری تھے۔

ساتویں اور آٹھویں بند پر بھر کھسر پھسر ہونے لگی۔ اور جب میں نواں بند پڑھنے لگا۔ تو طوفان بدتمیزی اُٹھا۔ جلسہ کے پریذیڈنٹ نے اشاروں ہی میں مجھے بیٹھ جانے کو کہا۔ کیونکہ ہجوم مشتعل ہو چکا تھا۔ اور کئی کونوں سے مجھے باغی۔ دہریہ اور بھرشٹ کی آوازیں آ رہی تھیں۔

ایک بال بدھواہ کی فریاد سب سننے کے لئے تیار تھے۔ لیکن بھگوان کرشن کا انیائے سننے کے لئے کوئی تیار نہ تھا۔ ان کے نزدیک بھگوان صرف حمد وثنا ہی سننے کے لئے تھے۔ شکوہ اور فریاد سننے کے لئے نہیں۔ میں نے دیکھا۔ جو میرے عقیدت مند، قدردان اور مہربان تھے۔ سب کے سب غصے میں لال پیلے ہو گئے تھے۔ آج انہیں مجھ میں دنیا بھر کی کمزوری اور گناہ وعیب دکھائی دے رہے تھے۔ میں نے جلد جلد

نظم پڑھی۔اور آہستہ سے سٹیج سے اُترا۔اور باہر نکلا۔

شامیانے کے باہر سورج رام کمر جھکائے سوٹی کے سہارے کھڑا تھا۔شاید اسے ہجوم کی وجہ سے اندر جگہ نہ ملی ہو۔اس نے مجھے دیکھا۔تو مسکرا کر کہا۔''مدھو بابو۔ یہ تم نے آج کیا لکھا تھا۔بھلا بھگوان کے لئے اس قدر سخت لفظ استعمال کئے جاتے ہیں۔بھگوان ہر حال میں بھگوان ہیں۔''

میں نے حیرت سے اس کی طرف دیکھا۔اور کچھ کہے بغیر چلا گیا۔البتہ مجھے محسوس ہوا۔اگر سورج رام میں آج شباب کی طاقت ہوتی۔تو شاید سب سے پہلے وہی مجھے جلسہ گاہ میں حقیقت کو آشکار کرنے کے لئے بے عزت کرنے کا فخر حاصل کرتا۔ حالانکہ اس حقیقت کا احساس اسی دن مجھے اُس کی جانکی کو دیکھ کر ہی ہوا تھا۔لیکن وہ بے خبر تھا۔وہ قسمت کا قائل اور بھگوان کا بھگت تھا۔اسے ہر ذرے میں بھگوان دکھائی دیتا تھا۔لیکن اپنی بیٹی کی جلتی ہوئی چتا نہیں۔جو صرف میں دیکھ سکا تھا۔

............☆☆☆............

لباس تلے

وشومبر بہت خوش تھا......

اُسے ساری دنیا پھولوں پر لوٹتی ہوئی دکھائی دے رہی تھی۔ بات یہ تھی کہ مالک نے اسے بڑے دن کی خوشی میں اپنا پرانا اوورکوٹ عطا کیا تھا۔ کوٹ بظاہر نیا دکھائی دے رہا تھا۔ صرف اوپر کا پلش کثرت استعمال سے اُڑ گیا تھا۔ جیبیں پھٹ گئی تھیں اور کہیں سے استر بھی غائب تھا۔

لیکن پُلش کا کیا ہے۔ گرمی تو کپڑے میں ہوتی ہے۔ جو میل جم جانے کے سبب موٹا نظر آرہا تھا۔ اور جیبیں......اُن کی مرمت آسان تھی۔

آج اُسے گھر کے چھوٹے بڑے حتیٰ کہ بدصورت مالکن بھی شریف اور حسین دکھائی دے رہی تھی۔ ہاں حسین اور شریف، جس نے اس عطیے پر اعتراض نہ کیا۔ دراصل قیمتی لباس تلے ان لوگوں کے سینوں میں بہت بڑے دل ہوں گے۔ جو ایسی بخشش کو بغیر کسی کوفت کے برداشت کر سکتے ہیں۔ ورنہ کہاں چھ روپے تنخواہ لینے والا وشومبر اور کہاں بابو سری کنٹھ کا اوورکوٹ!

"بھگوان نے انہیں سب کچھ دیا ہے۔ صرف اس لئے کہ ان کی نیت صاف ہے۔" اس نے دل میں سوچا۔

اس نے اپنے کمرے میں کوٹ کو پہن کر بغور دیکھا۔ بالکل نیا کوٹ تھا۔ دو

رو یہ ہڈی کے بڑے بڑے بٹن لگے تھے۔ بائیں بغل میں چھوٹی سی جیب تھی۔ جس میں مالک ریشمی رومال رکھا کرتے تھے۔ اس کے علاوہ دو بڑی بڑی جیبیں بھی تھیں۔ لیکن دونوں پھٹی ہوئی اور کوٹ بظاہر نیا تھا۔

"مالک انسان نہیں۔ دیوتا ہیں؟ وشومبر نے اپنے دل سے کہا۔ انسان کو خوب پہچانتے ہیں۔"

اس سے قبل وہ کئی سال سے یہ کوٹ دیکھنے کا۔ اسے جھاڑنے کا اسے تہ کر کے فینائل چھڑک کر دیکھنے کا عادی تھا۔ اور ان دنوں یہ کوٹ زیادہ نیا نہ تھا۔ پلش بھی اُڑ گیا تھا۔ جیبیں پھٹ گئی تھیں۔ استر بھی غائب تھا۔ لیکن آج اسے اس میں سب کچھ نیا اور اپنا پن سا دکھائی دیتا تھا۔ پپوٹوں میں چھپی ہوئی عقیدت پر بے پناہ محبت چھا گئی۔ دل میں اپنی چیز کا پیار اُمڈ آیا۔ کمرے میں دو چار قدم ٹہلنے پر اسے اپنا بدن بھلا بھلا دکھائی دیا۔ بالکل مالک جیسا......! اس کے بغیر وہ کچھ بھی نہ دیکھ سکا۔ اپنی پُر شور جوانی۔ بھیگی ہوئی مسیں۔ جن کی مچھلیاں پھٹی ہوئی قمیص سے اُبھری ہوئی تھیں۔ اپنا دو ہاتھ چوڑا سینہ۔ مندر کی سیڑھی کے پتھر کی طرح مضبوط لیکن گھسی ہوئی پیٹھ۔ میلی اور تنومند ٹانگیں۔ کچھ بھی اسے دکھائی نہ دیا۔ اس کی نگاہوں کا مرکز اوور کوٹ تھا۔ یا اس سے پرے مالک کی صاف نیت!

اب وہ مکمل انسان تھا۔ کوٹ کی کمی نے اُسے کس قدر نیچے دھکیل دیا تھا۔ اسکا احساس اسے اب ہونے لگا۔ اب وہ اکڑ کر بازار بھی جائے گا۔ وکاندار سے جھگڑا بھی کرے گا اور تو اور سب کچھ کر سکے گا۔

ایک بار نفسانی خواہشات سے بے قابو ہو کر اس نے ایک طوائف کو آنکھ سے اشارہ کیا تھا تو کتنی آفت آ گئی تھی۔ بازار کا بازار جمع ہو گیا تھا۔ حالانکہ وہ طوائف جاذب نظر تھی نہ جوان، لیکن پیاس کے وقت کون دریا کی لہروں کا حسن دیکھتا ہے۔ وہ

شرمندہ ہو کر چپکے سے لوگوں کی گالیاں سن کر بھنگ نکلا تھا۔ شاید بات یہ تھی کہ اس دن کے بدن پر میلے اور پھٹے ہوئے کپڑے تھے۔ لیکن اب......اب قسمت کا پانسہ پلٹ گیا تھا۔ اسے اوورکوٹ ملا تھا۔ اوورکوٹ پہن کر نکلنا اس بات کا ثبوت ہے کہ آدمی شریف اور سب کچھ کرنے کا مجاز ہے۔ اس کے متعلق شک وشبہ کرنے کے کی مطلق گنجائش نہیں رہتی۔ اوورکوٹ انسان کے سب عیب حتیٰ کہ پھٹی ہوئی قمض اور گھسی ہوئی پیٹھ تک چھپالیتا ہے۔

اس نے کوٹ کو جھاڑ کر کھونٹی پر لٹکا دیا اور اوپر میلی چادر پھیلا دی۔

پہلے وہ کبھی کبھی کام سے اُکتا جاتا تھا۔ لیکن تازہ عطیے نے اس کے دل میں زیادہ کام کرنے کی خواہش سی پیدا کر دی۔ کاش ایسا کام ملے۔ جس کے لئے کوسوں دور جانا پڑے۔ کوٹ پہن کر تکان بھی محسوس نہ ہوگی۔ قدموں میں ہوا کی تیزی اور رفتار میں بجلی کی سرعت پیدا ہوگی۔ اور بدن ...... گرم اور حسین۔ حسین اور شریف، بالکل مالک جیسا نظر آئے!

بابو سری کنٹھ نے اپنے لئے دوسرا کوٹ سلوایا لیا تھا۔ اُن ایسے صاحب دولت مند لوگوں کے لئے اوورکوٹ نہایت ضروری ہے اور خصوصاً سردیوں کے آغاز میں جب سرد اور خشک ہواؤں میں بھالے چھپے ہوتے ہیں۔

بڑے دن کی خوشی کے ساتھ ساتھ نئے کوٹ پر بحث بھی ہو رہی تھی۔ یار دوستوں کی نظریں کپڑا، سلائی، ڈیزائین پرکھ رہی تھیں۔

"کپڑے کا ڈیزائن جاذب نظر ہے۔ وہ ایک نے کہا۔

"سلائی بہترین ہے۔" دوسرے نے کہا۔

"لیکن اس میں سوت بھی ملا جلا نظر آتا ہے۔" تیسرے نے ہنستے ہنستے خطرناک انکشاف کیا۔

بابو سری کنٹھ، ان کی بیوی اور باقی دوست چونک اُٹھے! ''سوت؟''

''کم سے کم دس فیصدی ہوگا......لیکن قابل برداشت! اور تو اور آج کل خالص اونی چیز ملے گی کہاں سے؟'' انکشاف کرنے والے دوست نے سنجیدگی سے کہا۔

بابو سری کنٹھ جلد جلد کوٹ کے اندر کی طرف سے ایک دھاگہ کھینچ لیا اور اسے دیاسلائی دکھادی۔ دھاگہ آہستہ آہستہ جل کر ختم ہوگیا۔

''دیکھ لیا صاحب! اُون ہوتی تو یکلخت جل کر سکڑ جاتا۔'' بابو سری کنٹھ کی حیرانی میں اضافہ ہوا۔ ''تعجب ہے۔'' انہوں نے بیوی سے کہا۔

وشومبر دروازے پر یہ باتیں سن رہا تھا۔ سوت اور اون کی پہچان اس کے لئے بالکل نئی تھی۔ مالک کے فرشتہ ہونے میں اب کچھ بھی باقی نہ رہا۔ پہلے وہ انسان پہچان سکتے تھے۔ اب سوت اور اون بھی پہچانتے ہیں۔ اسے دکاندار پر، جس کے ہاں سے مالک نے یہ کپڑا خریدا تھا۔ بہت غصہ آیا۔ ''کمینہ، سالا......نیت دیکھے بغیر ہی دھوکہ دیتا ہے۔''

''اور میرا کوٹ......'' اُس نے دل ہی دل میں سوچا۔ وہ دبے پاؤں اپنے کمرے میں چلا گیا۔ کوٹ کو کھونٹی سے اُتار کہ جیب کے پاس سے ایک دھاگہ نکال لیا اور اسے دیاسلائی دکھادی۔ دھاگہ یکلحت جل کر سکڑ گیا۔ دھوئیں میں کراہت نہ تھی۔ بھنے ہوئے گوشت کی سی بو تھی۔

''آہاہا......خالص اُون......'' اس نے فرط مسرت میں اُچھل کر کہا۔

''مجھے دھوکہ نہیں لگا......میرے کوٹ میں سوت، دس فیصد سوت نہیں۔'' اس نے اپنے آپ ہی سے کہا۔

آخر بابو جی تو نادان نہیں۔ جو آٹھ برس کے نوکر کو سوت اور اون کا بنا ہوا

کوٹ دے دیتے۔ انہوں نے اسے انسان پہچان کر ہی یہ بخشش دی تھی۔

بحث ختم ہو چکی تھی۔ بابو سری کنٹھ کو نقصان کا بے حد افسوس تھا۔ وہ ہزاروں روپے کے مالک تھے۔ لیکن جان بوجھ کر انہوں نے ایسا نقصان نہ اُٹھایا تھا۔ وشومبر دوبارہ دروازے پر کھڑا ہو گیا۔ وہ اس وقت کام کا طلبگار تھا جس کے لئے اسے کہیں دور جانا پڑے۔

مالک نے اسے دیکھتے ہی کہا۔ ''میرا پُرانا اوورکوٹ خالص اونی ہے۔ وہ میں جیون سنگھ کی دکان سے لیا تھا...... جبھی بارہ برس چلا۔''

وشومبر کے دل میں مالک کے ان الفاظ نے ذرا خراش سی پیدا کر دی۔ کاش! مالک نے میرا پُرانا اوورکوٹ نہ کہا ہوتا۔ وشومبر کا کوٹ کہا ہوتا۔ تو وشومبر کس قدر پھول جاتا۔ پھر بھی اس کا بدن مسکرا اُٹھا۔ بازوؤں کی مچھلیاں فرطِ خوشی سے پھول گئیں۔ اور سینے میں کشادگی سی آ گئی۔

مسکرا کر اس نے آہستہ سے کہا۔ ''آپ......؟''

اس سے آگے بولنے میں اسے خوف سا محسوس ہوا۔ بولے یا نہ بولے۔ لیکن گھر اپنا تھا۔ مالک اپنا تھا۔ مالکن اپنی تھی۔ سبھی اپنے تھے۔

مالکن نے نئے کوٹ کو اُوپر نیچے کرتے ہوئے بے پروائی سے پوچھا۔ ''کیا؟''

وشومبر کی ہلکی سی مسکراہٹ دبے ہوئے قہقہے میں بدل گئی۔ اس کے گم گشتہ الفاظ کو سہارا مل گیا۔ وہ ایک قدم اندر آ گیا۔ بدصورت مالکن اسے اس وقت بے حد حسین دکھائی دی۔

وشومبر نے آہستہ سے کہا۔ ''آپ میرا کوٹ پہنیں......وہ خالص......''

بابو سری کنٹھ اور اس کے احباب ہنس پڑے۔ لیکن مالکن کا سارا حسن جو

ابھی ابھی وشومبر ہی کو دکھائی دیا تھا۔ بدصورتی میں تبدیل ہو گیا۔

"بے وقوف...... گدھا! اس نے چمک کر کہا۔

وشومبر کی مسکراہٹ بلبلے کی طرح سطح ہی پر غائب ہو گئی اور دو ہاتھ چوڑا سینہ سکڑ کر پُرانے اوورکوٹ کی چھوٹی جیب کے برابر ہو گیا۔

اس نے اپنی طرف سے ہمدردی کا اظہار کیا تھا۔ لیکن پھر بھی وہ بے وقوف تھا اور گدھا! حالانکہ گدھا اس کے خیال میں اتنا بیوقوف نہیں جتنی وہ کم ظریف طوائف ،جس نے اس کے محسوسات کا اندازہ لگائے بغیر ہی اسے بے عزت کرا کے لوٹا دیا تھا۔ اس دن اس کی جیب میں پورے آٹھ آنے تھے۔ اور یہ رقم اس نے صرف اسی کے لئے بچا بچا کر رکھی تھی۔ لیکن بے وقوف...... محض بے وقوف! جس نے دوار پر آئی ہوئی دولت ٹھکرا دی۔ طوائف نے اس کی جیب میں پیسے نہیں دیکھے۔ صرف اس کا لباس دیکھا۔ لباس تلے کیا تھا۔ یہ اس کی فریب خوردہ نظریں نہ دیکھ سکیں۔

وہ کمرے سے نکل ہی نہ سکا۔ فریب مسرت پر وہ دروازے سے ایک قدم اندر آ گیا تھا۔ اس وقت وہ صرف ایک ہی قدم دکھائی دیا۔ لیکن اب جیسے کوس بھر زمین دروازے تک پھیلی ہوئی تھی۔ وہ مشکل سے باہر نکلا۔ اس کا بدن ٹوٹا ہوا تھا۔ گھر ہی میں اس نے کتنا لمبا سفر کیا تھا۔ "کاش! اوورکوٹ پہن کر گیا، ہوتا!"

دوسرے دن گھر کا کام کر کے اور مالک کے کام پر چلے جانے کے بعد اس نے اوورکوٹ پہنا۔ شیشے کو سامنے رکھ کر صافہ باندھا۔ رات کا دھویا ہوا پائجامہ کہیں کہیں سے گیلا تھا لیکن ٹانگوں نے، پیٹ نے، یارانوں میں نمی بالکل محسوس نہ کی۔ اسے اتنا بھی خیال نہ رہا کہ پائجامے میں نیل کہاں کہاں زیادہ لگی ہے۔ اور کہاں کہاں میل اُبھر گیا ہے۔ اُسے اُس وقت اپنا آپ خوبصورت دکھائی دیا۔ اور جب ہڈی کے بڑے بڑے بٹن کاجوں میں پیوست ہو گئے۔ تو وہ بہت اچھا...... نہیں

مکمل انسان سا نظر آنے لگا۔ جیبوں کا استر پھٹ گیا تھا۔ لیکن باطن کو کون دیکھتا ہے۔ بارہ آنے کی ریز گاری اس کی واسکٹ میں لیٹی ہوئی تھی۔

وہ آج سارے شہر کا گشت لگانا چاہتا تھا۔ حالانکہ اس سے قبل ہزاروں بار شہر کا گشت لگا چکا تھا۔ اور شہر کے چپے چپے سے واقف تھا۔ لیکن ان دنوں وہ صرف وشومبر تھا۔ آج مکمل انسان ہے۔ آج کی خوشی میں اسے بے حد لذت اور شیرینی محسوس ہو رہی ہے۔ وہ زمین پر نہیں، ہوا پر اُڑا جا رہا ہے۔ اور سڑکیں جن سے وہ مانوس ہے، آج اجلی اور بالکل مختلف سی نظر آ رہی ہیں۔

وہ ہر راہ چلتے کو بغور دیکھتا اور اپنی اور اس کی پوشاک کا موازنہ کرتا۔ ان میں کتنے ہی شریف اور شاید اعلیٰ افسر بھی تھے۔ لیکن ان کی پوشاک چال ڈھال اور طرز رفتار میں اسے اپنے سے کچھ بھی زیادہ نہ دکھائی دیا۔ ہاں اتنا ضرور تھا کہ ایسے انسانوں میں اکثر پتلے پتلے اور سوکھے ہوئے سے تھے۔ وہ خود ان کے مقابلے میں کافی مضبوط تھا۔ اس کا جسم گوشت سے بھرا ہوا تھا اور سینہ دو ہاتھ چوڑا لیکن اوورکوٹ سب ایک سے تھے۔ ڈھیلے ڈھیلے کون جانے، خالص اونی یا دس فیصد سوت والے!

وہ آگے چلتا گیا۔ بالکل غیر ارادی طور پر۔ کبھی کبھی جب بے اختسار اس کے ہاتھ جیبوں میں چلے جاتے اور انگلیاں پیٹ سے چھو جاتیں تو اسے احساس ہوتا کہ اوورکوٹ کی جیبیں پھٹی ہوئی ہیں۔ وہ گھبرا کر آگے پیچھے دیکھتا کہ کسی نے انگلیوں سے پیٹ کو چھوتے تو نہیں دیکھا۔ لیکن دنیا باطن کو نہیں دیکھتی، وہ صرف ظاہر پرست ہے۔ اور وشومبؔر ظاہرا طور پر آج بالکل شریف اور مکمل انسان دکھائی دے رہا تھا۔

سڑک کے کنارے فٹ پاتھ پر رضائیاں اوڑھے کتنے ہی بھکاری بیٹھے

ہوئے تھے۔ان کی نقل وحرکت سے، ان کے لباس سے اور ان کی منتشر نگاہوں سے مجبوری اور زندگی سے تنفر ظاہر ہورہا تھا۔لیکن ان کے پیلے پیلے چہروں پر اطمینان تھا۔

اطمینان جو انتہائی ناامیدی کے بعد خود بخود حاصل ہوتا ہے، دنیا ان سے بے پرواہ تھی۔اس نے انہیں ظاہر پرستی کی کسوٹی پر پرکھ کر کھوٹے مال کی طرح ٹھکرا دیا تھا۔لیکن ان کا باطن ابھی پرکھا نہیں گیا تھا۔ان کے لباس تلے پرشور جوانیاں بھی تھیں ۔اور دہلتی ہوئی بھٹیاں بھی، جو دھیرے دھیرے وہیں فٹ پاتھوں پر آپ ہی آپ بجھی جارہی تھیں۔ان کی پوشیدہ آگ میں کتنی حرارت رکھتا جوش اور کتنی روشنی تھی۔ یہ کسی نے جاننے کی کوشش نہیں کی۔ دنیا دبی جوالا کی طرح ان کی روشنی سے بیزار، ان کے وجود سے منکر اور ان کی حرارت سے متنفر تھی۔ محض بے کار لوگ، جو سڑکوں پر کتوں کی طرح مرنے کے لئے پیدا کئے جاتے ہیں۔ جو کھاتی پیتی دنیا کو اپنی بے جان آنکھوں سے دیکھنے کیلئے زندہ رہتے ہیں اور ترستے ترستے، آہیں بھرتے بھرتے۔ ہاتھ پھیلاتے پھیلاتے، وہیں اونی دھاگے کی طرح یک لخت جل کر سکڑ جاتے ہیں اور مرجاتے ہیں۔

اور موٹروں میں گھومنے والے، رخساروں پر غازہ ملنے والے، دنیا کو اپنی ٹھوکروں میں اچھالتے پھرتے ہیں۔دنیا ان کے ظاہر و باطن دونوں کو پرکھا ہے۔ ان کے لباس کی نفاست اور لباس تلے کی سیم وزر سے اٹی ہوئی جیبیں، دز دیدہ نگاہوں سے دیکھتی ہیں۔ وہ ان کی بجھی ہوئی حرارت سے ٹھنڈی پڑی ہوئی بھٹیوں سے اپنا نظام چلارہی ہے۔اور انہیں سوت کے دھاگے کی طرح آہستہ آہستہ جینے اور ختم کرنے کی متمنی ہے۔

''یہ لوگ اوورکوٹ کیوں نہیں پہنتے؟''۔وشومبر نے اپنے دل سے پوچھا۔ پھر ایک لیٹے ہوئے بھکاری سے بولا۔''تمہارے پاس اوورکوٹ نہیں؟''۔

میرا مطلب ہے، خالص اونی اوورکوٹ''!

بھکاری نے نرالی بات سنی ۔''اوورکوٹ ! خالص اونی !'' وہ وشومبر کا مطلب نہ سمجھ سکا۔اور نہ سمجھنے کی کمزوری ہمیشہ مسکراہٹ سے چھپائی جاتی ہے!

دوسرے ہی لمحہ میں بھکاری کے مطمئن چہرے پر مسکراہٹ پھیل گئی ۔اسی طرح اس نے لیٹے ہی لیٹے کہا۔''شکر ہے جیتے ہیں''!

وشومبر نے حیرت سے اس کی طرف دیکھا۔اوورکوٹ کے بغیر ہی، وہ اپنے جینے پر شکر کر رہا تھا اور مطمئن تھا۔

''کاش ،ان لوگوں کے بھی مالک ہوتے ۔جو بڑے دن کی خوشی میں انہیں اپنے پرانے اوورکوٹ عطا کرتے''۔وہ اور آگے بڑھا۔اسے گھر یاد ہی نہ رہا۔بدن پر پہنے ہوئے کوٹ اور واسکٹ میں لپٹی ہوئی ریزگاری نے اس کے جذبات میں رنگ بھر دیا تھا۔

اس نے اپنے دل میں کچھ سامان خریدنے کی بھی ٹھان لی۔صافہ باندھنے کا شیشہ، جو مالک کے کمرے سے کبھی کبھی اٹھالاتا تھا۔ایک چمٹا ،جس کے بغیر چلم پر آگ رکھتے وقت اس کی انگلیاں جھلس جاتی تھیں ۔ایک خوشبودار صابون کی ٹکیا۔فینائل کی گولیاں جو گرمیوں میں اوورکوٹ کے بچاؤ کیلئے ضروری تھیں۔

سامنے تصاویر کی دکان تھی ۔اوورکوٹ پہنے کچھ لڑکے اور لڑکیاں تصویریں خرید رہی تھیں ۔ وشومبر بھی دکان پر چڑھا۔اسے دکان پر چڑھتے وقت کوئی جھجک محسوس نہ ہوئی۔

اس کے کمرے میں کوئی تصویر نہ تھی ۔ماسوائے ایک کرم خوردہ تصویر کے، جو وہ نہ جانے کب کسی بزاز کی دکان سے اٹھا کر لایا تھا۔

اور سامنے شلفوں پر، الماریوں میں، دیواروں پر دیدہ زیب تصویریں لٹک

رہی تھیں۔ حسن اور جوانی کی نیم عریاں اور نیم خنداں تصویریں! جو مکمل انسان کے کمرے کی زینت بننے کے لائق تھیں۔ اس نے ایک ہی نظر سے ساری تصویروں کا جائزہ لیا۔ کاش! یہ ساری تصویریں اس کے کمرے کی دیواروں پر لٹکتیں تو اس کی زندگی کتنی مستی میں گزر جاتی!

دکان کے مالک نے قریب آکر پوچھا۔ ''حکم؟''

وشومبر شش و پنج میں پڑ گیا۔ وہ حکم کرنے کا عادی نہ تھا۔ حکم کی تعمیل کرنا اس کی خو تھی۔ وہ دراصل یونہی دکان پر چڑھا تھا۔ اور اوورکوٹ پہن کر دکان پر یونہی چڑھنا کچھ برا نہیں۔ یوں بھی تصویر اس کے ضروری سامان کی فہرست میں نہ تھی!

وشومبر کی حیرت کو بھانپ کر دکان دار نے پھر پوچھا۔ ''کیا حکم ہے سرکار؟''

کتنی حلیمی اور کتنا پیار تھا ان الفاظ میں! وشومبر کے کان ایسے الفاظ سے ناآشنا تھے۔ مکمل انسانوں کی دنیا میں کتنی راحت اور کتنی محبت ہوتی ہے۔ یہ اسے اس وقت معلوم ہوا۔ جب وہ خود مکمل انسان کے بھیس میں اس دنیا میں آگیا۔ وہ کئی بار پہلے بھی اس دکان کے آگے کھڑا ہو گیا تھا۔ لیکن دکان دار نے اس کی طرف کوئی توجہ نہیں دی تھی۔ آج وہ بات نہ تھی۔ آج ہزاروں روپے کا مالک اس سے پوچھ رہا تھا۔ ''کیا حکم ہے سرکار؟''

اور وشومبر کے واسکٹ میں بارہ آنے تھے۔ اوورکوٹ کی پھٹی ہوئی جیب میں ہاتھ ڈال کر اس کی انگلیاں ریزگاری سے چھو گئیں۔ اس کی آنکھوں میں نشہ سا چھا گیا۔

اس نے ایک نیم عریاں فلم ایکٹریس کی تصویر اپنے لئے منتخب کی، جس کی باریک ساڑھی پر سلمے ستارے کا کام کیا ہوا تھا۔ لیکن پھر بھی اُس کی سڈول ٹانگیں، گول گول بازو، چاند سا شفاف سینہ صاف نظر آرہا تھا۔ دکان دار نے تصویر کاغذ کے

لفافے میں ڈال کراس کے آگے رکھ دی اور کہا۔ ''ڈھائی روپے!''

وشومبر کی ٹانگیں کانپنے لگیں۔ نتھنے پھول گئے۔ وہ ہوا میں لٹک رہا تھا۔ اب زمین پر آگرا۔ ''اتنی مہنگی؟'' اس نے سوکھی سی ہنسی ہنس کر کہا۔ ''تصویر ہی تو ہے!''

خرید وفروخت کرنے والی لڑکیوں نے اس کی طرف حقارت بھری نظروں سے دیکھا اور زیرلب مسکرا کر آنکھیں پھیرلیں اور دکان دار نے زور سے قہقہہ لگایا۔

وشومبر نے محسوس کیا۔ جیسے وہ قہقہہ نہیں، توپ ہے، اسے اپنے حسن انتخاب پر فسوس آگیا۔ اور اپنی نادانی پر رنج، جس نے اُسے دکان پر چڑھنے کی ترغیب دی حالانکہ تصویر اس کی ضروریات زندگی کی فہرست میں نہ تھی!

''نہ جانے کس کا کوٹ پہن رکھا ہے غریب نے؟''

ایک شوخ لڑکے نے مالک دکان سے ہنستے ہنستے کہا۔ ''تصویر بھی خوب پسند کی تھی۔۔۔ ہاہاہا۔''

وشومبر کا چہرہ ندامت سے لال ہوگیا۔ اسے اس وقت گیلے پائجامے کی نمی رانوں پر محسوس ہوئی اور کہیں کہیں ابھرا ہوا میل بھی دکھائی دیا۔

''کس کا کوٹ؟'' دکان سے اتر کر اس نے اپنے دل سے پوچھا۔ ''میرا مالک سوت اور اون پہچان سکتا ہے۔ انسان پہچان سکتا ہے۔ اور یہ لفنگا...... بدمعاش......''

ایک گلی میں داخل ہو کر اس نے اپنے آپ کو سر سے پاؤں تک دیکھا ''ہاں، وہی اُوورکوٹ تھا۔ وہی جو مالک نے اسے دیا تھا۔ جو اس کا تھا۔ صرف اس کا! غریب کے بدن پر اچھا کپڑا دیکھ کر بھی یہ لفنگے خوش نہیں ہوتے۔''

یہی سوچتا سوچتا وہ شہر کی طرف مڑا۔ شیشہ، چمٹا، صابون کی ٹکیا اور فینائل کی گولیاں سب کچھ بھول گیا۔

تفریح طبع کیلئے اس نے سگریٹ کی ڈبیا خرید لی۔ اور ایک پان بھی منہ میں رکھ لیا۔

بے عزتی کا اسے زیادہ احساس نہ ہوا۔ ''دنیا میں سبھی کچھ ہوتا ہے۔ دھوکہ۔ فریب۔ گالی گلوچ۔ یہاں سبھی جیون سنگھ نہیں۔ جو خالص اونی کپڑا دیں۔ جس میں سوت کی آلائش تک نہ ہو۔'' اسی وقت اسے وہ طوائف یاد آ گئی۔ جس نے اسے کچھ عرصہ پیشتر بے عزت کیا تھا۔ صرف اس لئے کہ طوائف کی نگاہوں نے ظاہر وشومبر کو دیکھا تھا۔ باطنی وشومبر کو نہیں۔ جہاں مٹی اور گھاس پھوس کے نیچے ڈھکی ہوئی برف کی طرح محبت تھی۔ پگھلنے کے لئے بیقرار محبت! آج اگرچہ اسے اپنے جذبات پر قابو تھا۔ لیکن انتقام بھی کیا برا ہے؟ آج وہ طوائف کو بتا دینا چاہتا تھا۔ دنیا کتنی اندھی ہے۔ جسے اس نے ایک دن پھٹے ہوئے کپڑوں میں دیکھ کر دھتکارا تھا۔ آج وہی بھونرے کی طرح اس کے حسن کا رس چوس کر گاتا گاتا چلا جائیگا۔ اور اندھی دنیا، اندھی عورت، اندھا بازار دیکھتے کا دیکھتا رہ جائے گا!

اس کا رواں رواں دماغ کی اس جدت آفرینی پر جھومنے لگا۔ اسے اتنا بھی خیال نہ رہا کہ منہ میں رکھا ہوا پان کہاں گیا! اس کی پیک کہاں گئی! ہاں شیرینی اس کے منہ میں جاتی تھی۔

وہ سیڑھیاں چڑھا۔ آنکھ سے اشارہ کرنے کے دن اسے کوے کی طرح چوکنا ہو کر ادھر ادھر دیکھنا پڑتا تھا۔ پھر اس نے بائیں آنکھ کو زور سے جھپکا دیا تھا۔ لیکن آج سڑک پر چلنے والوں کی موجودگی میں، دکان پر بیٹھے ہوئے لوگوں کو دیکھتے دیکھتے، سگریٹ کے لمبے لمبے کش لگاتا ہوا اوپر چڑھا۔ دروازے پر ملا سا وہ لٹک رہا تھا۔ جس پر خالص اون کے دھاگے سے نقوش کاڑھے گئے تھے۔ کبھی یہ پردہ بہت جاذب نظر اور خوبصورت ہوگا۔ لیکن اب طوائف کی طرح اس کے نقوش مٹے ہوئے اور پھیلاؤ

میں بے ترتیبی سی آ گئی تھی۔ وہ ذرا ٹھٹھک گیا لیکن عارضی طور پر۔۔۔وہ آج بہت مضبوط تھا۔

''اندر آیئے!'' شباب سے ڈھلی ہوئی طوائف نے اسے دیکھتے ہی پرتپاک لہجے میں کہا۔

وشومبر نے بوٹ اتارا۔ کمرے میں قدم رکھتے ہی سلام کیا۔ ''خان نے بھیجا ہے؟'' طوائف نے پوچھا۔

وشومبر سوال پر حیران رہ گیا۔ طوائف نے پھر پوچھا۔ ''کہاں سے آئے ہو؟''

وشومبر نے سگریٹ کو انگلیوں ہی میں بجھایا۔ اسے آگ کی حرارت محسوس ہی نہ ہوئی۔ اس نے آہستہ سے مصنوعی ہنسی کے ساتھ کہا۔ ''میں۔۔۔خود آیا ہوں۔''

طوائف کے پھیکے سے چہرے پر مسکراہٹ پھیل گئی۔ ''خوب! میں بھی کتنی بے وقوف ہوں۔۔۔''

وشومبر کے غیر ارادی جذبات مچل اٹھے۔ اسے پیاس بھی لگ گئی۔ دریا اس کے سامنے تھا اور دریا کی لہروں کا حسن بھی۔

طوائف ناز و ادا سے اس کے قریب شکستہ صوفے پر بیٹھ گئی اور اس کے ساتھ ہی وشومبر بھی۔

تھوڑی دیر کے بعد بولی۔ ''آپ کیا پسند کرتے ہیں؟'' ''وسکی یا روز؟''

وشومبر کے لئے دونوں چیزیں نئی تھیں۔ پھر بھی کمزوری کو چھپاتے ہوئے اس نے کہا۔ ''روز!''

دوسرے لمحے میں ایک بوڑھا روز کی بوتل اور دو گلاس لے کر حاضر ہو گیا۔ اور بولا۔ ''ڈھائی روپے۔''

وشومبر شکستہ صوفے کی سپرنگ والی گدیوں پر بیٹھا تھا۔ ڈھائی روپے کا لفظ سن کر اسے محسوس ہوا جیسے اس کے نیچے عمیق غار ہے۔ جس میں وہ اترتا جاتا ہے۔ اس نے اپنا داہنا ہاتھ اوورکوٹ کی جیب میں ڈالا اور ناخن سے اپنے پیٹ پر اندر ہی اندر لکریں کھینچنے لگا۔ طوائف نے مسکرا کر کہا۔ ''بل دیجئے اسے۔ چلا تو جائے۔''

وشومبر کا چہرہ کنپٹیوں تک جل گیا۔ جلد ہی اپنے آپ کو سنبھال کر بولا۔

''افسوس ہے۔ میں بٹوہ بھول آیا۔''

طوائف کی آنکھوں میں چمک پیدا ہوگئی۔ بولی۔ ''پھر یونہی عشق کرنے آئے تھے؟ جیسے تمہاری ماں کا گھر ہے۔''

وشومبر کچھ بھی نہ بول سکا۔ اس کی جیب میں صرف ساڑھے نو آنے باقی رہ گئے تھے اور ابھی ضروریات کی فہرست باقی تھی۔ مچلے ہوئے جذبات پر اوس پڑ گئی۔ پیاس بجھ گئی۔ وہ اٹھ کر دروازے کے قریب آیا۔ اور بوٹ پہننے لگا۔

طوائف نے زہر خند کر کے کہا۔ ''یہ کس کا کوٹ پہن رکھا ہے، جو بٹوہ ہی گھر پر بھول آئے۔''

وشومبر نے کوئی جواب نہ دیا۔ وہ جلد جلد سیڑھیوں سے اترا۔ گذشتہ واقعہ اس کی آنکھوں میں دوبارہ پھر گیا۔ اس نے دنیا کو اندھی سمجھ لیا تھا۔ لیکن اب اسے معلوم ہوا۔ دنیا اندھی نہیں۔ وہ خود اندھا ہے۔ مالک نے اسے ایسا کوٹ دیا۔ جس کی جیبیں پھٹی ہوئی تھیں۔

وہ اب بازار سے گزر ہی نہ سکا۔ کاش اس کے پاس روپے ہوتے۔ وہ اپنے ارمان نکالتا۔ تصویریں خریدتا۔ روز پیتا اور۔۔۔''

اب تک اسے اپنا آپ ہلکا ہلکا سا محسوس ہو رہا تھا۔ لیکن اب کوٹ کے بوجھ سے اس کے شانے ٹوٹ سے گئے تھے!

اسے معلوم ہوا۔ مچھلیوں والے بازو، پرشور جوانیاں۔ مطمئن چہرے۔ خالص اونی کوٹ، سب اس دنیا کے سامنے فضول اور بے حقیقت ہیں۔ حقیقت صرف پیسہ ہے۔ ابھی وہ وقت نہیں آیا۔ جب انسان کے قانون میں تنومندی کا احترام ہو۔

وہ دل ہی دل میں بڑبڑاتا ہوا گھر جانے لگا۔ راستے میں کتنے ہی لوگ اوورکوٹ پہنے جا رہے تھے۔ لیکن اس وقت وشومبر کا دماغ موازنے کی لذتوں سے اسے فریب نہیں دینا چاہتا تھا۔ آنگن میں پہنچ کر کتا بھونکنے لگا۔ حالانکہ اسے معلوم تھا۔ یہ مالک کا وشومبر ہے۔ لیکن پرایا کوٹ بدن پر دیکھ کر حیوان نے بھی تعجب کا اظہار کیا۔

''ابھی اتارتا ہوں۔ بھئی۔ یہ میرا کوٹ نہیں۔ تمہارے ہی مالک کا کوٹ ہے۔'' وشومبر نے جل بھن کر کتے سے کہا۔ کتا جیسے مفہوم سمجھ کر خاموش ہو گیا۔

کمرے میں وشومبر نے کوٹ اتار کر کھونٹی پر لٹکا دیا۔ نہ اس پر میلی چادر پھیلائی اور نہ لٹکانے سے پہلے جھاڑا۔ اتارتے اتارتے اپنے ہی آپ سے کہنے لگا۔

''دیوتا! یہ کوٹ واپس لے لو۔۔۔ ہم لوگ ان چیزوں کو پہن کر زندہ نہیں رہ سکتے۔ سر بازار بیٹھنے والی طوائف اور پالے ہوئے کتے تک کو اعتبار نہیں آتا کہ یہ میرا کوٹ ہے۔ ہم انسانیت کے بے پناہ جوہڑ کے مچھر ہیں جو گندگی ہی میں موٹے ہوتے ہیں اور زندہ بھی رہ سکتے ہیں۔ ہماری بے رنگ و بو زندگیوں کے سکون کو اپنی دنیا کی لذتوں سے آشنا کر کے فنا نہ کرو۔ ہم ابھی انسان نہیں۔۔۔! ہم ابھی انسان نہیں!!

............☆☆☆............

لہروں کا رقص

رؤف، چاند سنگھ، مولوی، جمال۔ روڈا اور بھی کتنے ہی قلی چک پوسٹ کی منڈی میں کام کرتے تھے۔ سب کی نفسیات جدا تھی اور سب کے نظریے مختلف مثلاً چاند سنگھ ہر وقت گرد سے اٹی ہوئی ڈاڑھی کو اپنی انگلیوں سے کنگھی کرنے کا عادی تھا۔ مولوی فرصت کے لمحوں میں یا تو نماز پڑھتا تھا۔ یا کچھ گنگنایا کرتا تھا۔ روڈا بخشش کے پیسے جمع کرنے کی فکر میں گھلا جاتا تھا۔ جمال کو اپنی بزرگی پر ناز تھا۔ اور یہ ناز اس وقت نمایاں ہوتا تھا۔ جب وہ آدھا لیٹ آدھا بیٹھا قیلولہ کرتا تھا۔ لیکن رؤف ان سب سے نرالا تھا۔ پست قامت، لنگڑا جانور نما انسان، جس کی پیشانی پر نہ کبھی بل پڑتے تھے۔ اور نہ جس کی آنکھیں کبھی آنسو بہاتی تھیں۔ اس نے شدید دنیا کو چک پوسٹ کی منڈی سے زیادہ نہیں سمجھ رکھا تھا۔

جہاں دن بھر ہزاروں قسم کے انسان جمع ہوتے ہیں۔ زادِ راہ کھولتے ہیں۔ تلاشیاں دیتے ہیں۔ ایک دوسرے سے ہمدردیاں جتاتے ہیں۔ چک پوسٹ کے افسروں کے فرضی منصبی کو نگاہوں نگاہوں ہی میں اپنے اوپر زیادتی سی محسوس کرتے ہیں۔ لیکن اظہار نہیں کر سکتے اور بچھڑ جاتے ہیں۔ دنیا کی پریشانیوں سے اپنے آپ کو بے نیاز رکھنے کے سبب ہی شاید وہ سب قلیوں سے ہشاش بشاش نظر آتا تھا۔ اسے نہ مذہب کی پرواہ تھی۔ نہ پیسے جمع کرنے کی خواہش ہر وقت ہنسنا ہنسانا، فقرے چست

کرنا، اور لنگڑاتے لنگڑاتے بوجھ ڈھونا اس کا معمول تھا۔ اپنے ساتھیوں میں جن کے ساتھ اس اس کی زندگی بسر ہورہی تھی۔ ہر دلعزیز ہونا کوئی معمولی بات نہ تھی۔ سیاح بھی ایک ہی نظر دیکھ کر اس کی جدت پسندی اور آزاد فطرت کی داد دیتے تھے۔ شگفتہ مزاجی کے علاوہ اس کی طبیعت میں خودداری کا بھی بہت بڑا عنصر تھا۔ اسی لئے چاند سنگھ اور روڈا کی طرح سیاحوں سے گڑگڑا کر وہ بخششیں کبھی قبول نہ کرتا تھا۔ ہاں کسی نے خندہ پیشانی سے کچھ دیا۔ تو رؤف نے اپنا ہاتھ آگے بڑھا دیا۔ اور رؤف کی یہ عادت ساتھی قلیوں کے نزدیک بہت بری تھی۔ نہایت قابل اعتراض!

دو ڈھائی من کا بوجھ سر پر اٹھائے ہوئے اسے مذاق ہی کی سوجھتی۔ کوئی پاس نہ ہوتا۔ تو کمر پر لادے ہوئے بوجھ ہی کو یا اس کے ان دیکھے مالک کو ایک میٹھی سی گالی سنا دیا۔ اور اوپر قہقہہ لگا دیتا۔ ایسے مذاق صرف اسی وقت کثرت سے ہوتے۔ جب اس کی خوددار طبعیت نے بارہ آنے سے زیادہ پیسے قبول کر لئے ہوتے۔ اور اس کے تصور پر ابلے ہوئے انڈے کی چکنی چکنی سفیدی اور دلنواز شیرینی چھائی ہوئی ہوتی۔ جو قریب کے ریسٹوران میں وہ کھانے کا عادی تھا۔ اس وقت اس کے طرز کلام میں خود بخود تحکمانہ انداز پیدا ہو جاتا۔ اور بالکل وہی لب ولہجہ استعمال کرتا۔ جو دن میں کئی بار وہ چھٹی پر آئے ہوئے فوجیوں کی زبان سے سننے کا عادی ہو چکا تھا، جو وہ ریسٹوران میں داخل ہوتے وقت سفید وردی میں ملبوس خانساماں سے کیا کرتے تھے۔ آخر ان میں اور رؤف میں کیا فرق تھا۔ مقررہ تنخواہ کے علاوہ اس کی جیب میں بارہ آنہ سے زیادہ رقم آ چکی تھی۔

''ایک انڈا مانگتا ہے۔'' وہ خانساماں سے کہہ کر کرسی پر بیٹھنے کیلئے اندر چلا جاتا ہے۔

''رکابی کہاں ہے؟ رکابی میں انڈا لے آؤ۔''

''رکابی......؟'' خانساماں تعجب سے اس کی طرف دیکھتا ہے!

''ہاں۔ہاں۔رکابی۔۔۔میں انسان نہیں ہوں...... بے وقوف گدھا!''

خانساماں چینی کی رکابی میں انڈا اس کے سامنے رکھ دیتا۔اور زیر لب مسکرا دیتا۔لیکن اس کی مسکراہٹ جس میں طنز کا پہلو زیادہ ہوتا۔رؤف کے سر کے اوپر سے اڑ کر چلی جاتی۔

انڈا کھانے کے بعد وہ بسا اوقات اپنا منہ اسی چادر سے صاف کرتا۔جو میز پر بچھی ہوتی۔

اس ناشتے سے جو اسے کبھی کبھی ہی میسر ہوتا تھا۔اس میں نئی جان سی پیدا ہوجاتی۔دن بھر تھکنے کے سبب سے مذاق کے پرسکوں سمندر میں پھر لہریں اٹھنے لگتیں۔لیکن اس وقت منڈی خالی ہوچکی ہوتی۔سیاحوں سے بھری ہوئی گاڑیاں۔چک پوسٹ کے افسر اور ملازم۔دلال،اور کبوتروں کا ڈار چلا گیا ہوتا۔اور ٹاؤن ایریا کا بوڑھا بھنگی جنگلی جھاڑیوں کے جھاڑو سے سڑک پر بکھری ہوئی لید،گوبر اور گھاس پھوس کو دریا کے کنارے کی طرف دھکیلتا ہوا دکھائی دیتا۔جمال،چاند سنگھ،روڈا اور باقی قلی۔دریگ کے نیچے لمبے لمبے لیٹے ہوئے ہوتے۔اور نیچے سطح دریا پر لہریں بن بن کر بگڑتیں۔اور بگڑ بگڑ کر بنتیں۔

ایک شام کو انڈا کھانے کے بعد جب وہ سڑک پر آیا۔تو اس کی نظر سیدھی مولوی پر جا پڑی۔جو سڑک کے کنارے بنی ہوئی چوڑی مگر پست قامت دیوار پر نماز پڑھ رہا تھا۔

رؤف لنگڑاتے لنگڑاتے اس کے قریب آ گیا۔پرسکون سمندر میں جوار بھاٹا پیدا ہونے لگا تھا۔اور لہریں ساحل ٹکرا ٹکرا کر بے نیل مرام لوٹ رہی تھیں۔

رؤف نے ہنس کر کہا۔''بھائی! میں نے انڈا کھایا۔میرے لئے کچھ نہ

مانگنا۔''

مولوی اس وقت دونوں ہاتھ داڑھی پر دھرے بائیں طرف دیکھ رہا تھا۔ جب اس نے دائیں طرف منہ پھیرا۔اور دونوں ہاتھ داڑھی پر پھیرے۔تو رؤف نے ہنس کر کہا۔''کیا بات ہے۔بس اب نواب بن ہی گئے سمجھو......''

مولوی کی آنکھوں میں خون اتر آیا۔لیکن وہ کچھ کہہ نہ سکا۔

رؤف نے پھر کہا۔''ساری عمر بوجھ ڈھوتے ڈھوتے گزر گئی۔اب کس آس پر ماتھا رگڑ رہے ہو؟''

مولوی نے دیوار سے اترتے ہوئے خشمگین لہجے میں کہا۔''میں نے لاکھ بار کہا ہے۔نماز کے وقت نہ ستایا کرو۔بار بار کا مذاق اچھا نہیں۔ایسا نہ ہو۔کہیں ہنسی میں پھنسی ہو جائے۔''

رؤف نے اس کے شانے پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا۔''تم خفا ہوتے ہو مولوی۔میں مذاق نہیں کرتا۔سچ کہتا ہوں۔ہم لوگوں کو خدا سے مانگنے کی ضرورت ہی کیا ہے۔جو کچھ وہ ہمیں دے سکتا تھا۔اس نے دے دیا۔اب اس سے برا کیا کرے گا۔آخر انسانوں کے لئے گدھے بھی تو چاہئیں۔''

مولوی کی مذہب پرستی پر چوٹ لگی۔اسے لنگڑے رؤف سے یہ سننے کی توقع نہ تھی۔جو خدا کے فصل و کرم ہی سے توانا ہو کر روٹی کما رہا تھا۔اس نے آگ بگولا ہو کر کہا۔''دور ہو جا میری آنکھوں سے ! جہنمی ، لامذہب کتے ! اپنے نصیبوں کو نہیں روتا۔خدا پر کیچڑ اچھال رہا ہے۔''

رؤف زور زور سے ہنسا۔بولا۔''ارے یہ کس وہم میں پھنس گئے ہو۔کیا جہنم اور بہشت ! جہنم تو یہی ہے۔یہی چک پوسٹ کی منڈی۔جہاں ہم سب کی کمر ٹوٹ جاتی ہے۔جوانیاں مٹی کے ذروں کے ساتھ مل کر آوارہ پھرتی ہیں۔اور پھر شام

کو ایک انڈا تک میسر نہیں آتا...... دعا کرو ساری دنیا پومپائی کے شہر کی طرح غرق ہو جائے۔"

مولوی اس پر کچھ نہ کہہ سکا۔ حالانکہ وہ بہت کچھ کہنا چاہتا تھا۔

دریگ کے پاس پہنچ کر مولوی کے حلق میں اٹکے ہوئے جملے باہر نکلنے کے لئے بے تاب ہو گئے۔ روڈا پیسے گن رہا تھا۔ چاند سنگھ داڑھی کی لٹیں سنوار رہا تھا۔ اور جمال پتھر پر سر دھر کر لیٹا ہوا تھا۔

مولوی نے سنجیدگی سے کہا۔ "مذہب خدا کا نور ہے رؤف! آج تم پر جوانی کا زور ہے۔ اس لئے کچھ سوجھائی نہیں دیتا۔ لیکن کل...... جب یہ طوفان تھم جائے گا۔ تو تمہاری نظریں آسمانوں کو کریدنے لگیں گی۔ سمجھ گئے...... جاؤ کھاؤ انڈا اور مزے کرو۔"

روڈا اور چاند سنگھ چونک پڑے۔ لیٹا ہوا جمال اٹھ بیٹھا اور بولا۔ "کون کہتا ہے مذہب نور نہیں......"

مولوی نے ہنس کر کہا۔ "یہ لنگڑا...... جسے شاید آج بارہ آنے سے زیادہ پیسے ملے ہیں۔"

"توبہ۔ توبہ۔ واہگورو......" سب نے بے اختیار کہا۔ اور کریدتی ہوئی نظروں سے رؤف کو دیکھنے لگے۔

جمال نے پھر کہا۔ "اس کا دماغ پھر گیا ہے۔ کسی سے بخشش نہیں مانگتا۔ نواب زادے کی ہتک ہوتی ہے۔

مہینوں کا بھوکا رہنا پڑے۔ تو پڑا رہے گا۔ کسی سے روٹی نہیں مانگے گا۔ میں پوچھتا ہوں۔ ہم لوگوں کو شرم کاہے کی ہونی چاہئے۔"

چاند سنگھ نے انگلیوں سے ڈاڑھی میں کنگھی کرتے ہوئے کہا۔ "سچ ہے۔

گورونانک کی قسم ! بالکل سچ ہے ۔ آج ایک صاحب سے میں نے بخشش مانگی ۔ تو گالیاں دینے لگا ۔ لیکن میں بھی کہاں چھوڑنے والا تھا ۔ جب تک ایک آنہ نہ لیا ۔ پیچھا نہ چھوڑا ۔ رؤف ہوتا تو جھگڑا کیا ہوتا ۔''

روڈے نے کہا ۔''یار گالیوں کا کیا ہے ۔ دن میں بیسوں بار کھا ہی لیتے ہیں ۔ ٹھیکیدار کی گالیاں ، منشیوں کی گالیاں ، وزیٹروں کی گالیاں ، گالیاں تو سب دے سکتے ہیں ۔ لیکن پیسے کوئی کوئی دیتا ہے ۔ ہاہاہا......''

رؤف شرمندہ ہوگیا ۔ اسے اپنا فلسفہ پانی پر اٹھے ہوئے بلبلے کی طرح بے حقیقت دکھائی دیا ۔۔۔ ''سچ ہی تو ہے'' اس نے سوچا ۔''جو ذلیل سے ذلیل کام کرتے ہیں شرفا سے وہ بخشش مانگنے سے کیوں شرمائیں ۔۔۔ اور پومپائی اسی لئے غرق ہوگیا کہ ان لوگوں کو مانگنے کا ڈھنگ نہ آتا تھا ۔''

مولوی نے وردی کا کوٹ اتار کر سرہانہ بنایا ۔ اور لیٹ گیا ۔ اس نے رؤف کو ہرا دیا تھا ۔ اور ساتھ ہی اس کے مستقبل کے متعلق بھی خوفناک پیشن گوئی کی تھی ۔ جب وہ خدا کا محتاج ہوگا ۔ اب اس کے تھکے ہوئے جسم اور مطمئن روح کو آرام کی ضرورت تھی ۔

ایک دن دوپہر کی جھلسانے والی گرمی میں کانٹے کے نزدیک فساد ہوگیا ۔

چاند سنگھ ایک کھدر پوش سیاح سے جھگڑا کر رہا تھا ۔ سب قلی اردگرد جمع ہوگئے تھے ۔ چاند سنگھ دومن کا صندوق ایک فرلانگ کی دوری سے اٹھا کر لایا تھا ۔ اس کا چہرہ ، اس کی داڑھی ، اس کی ٹانگیں سب پسینے سے شرابور ہوگئی تھیں ۔ سر کے بال بکھر کر پریشان ہوگئے تھے ۔ سیاح اسے صرف ایک آنہ دے رہا تھا ۔ اور چاند سنگھ چار آنے مانگ رہا تھا ۔ معمولی تکرار کے بعد چاند سنگھ کے بالوں سے ڈھکے ہوئے چہرے پر چپت بھی پڑی تھی ۔ اور اس کے کانوں نے سیاح کی گالیاں بھی سنی تھیں ، دراصل چاند

سنگھ نے اپنے میلے ہاتھوں سے سیاح کی اجلی قمیض کا دامن تھام لیا تھا۔ اور اسے چار آنے دیئے بغیر جانے نہ دیتا تھا۔ یہ بات سیاح کو بہت ناگوار گزری۔ وہ بمبئی کا ایک مشہور آدمی تھا جس کی نصف سے زیادہ عمر وطن کی خاطر جیل میں بیت گئی تھی۔ آج تک کسی نے اس کی چپل کو چھونے کی جرأت نہ کی تھی۔ اور چک پوسٹ پر ایک میلے، بندر نما انسان نے جس کے چہرے پر صرف دھنسی ہوئی آنکھیں دکھائی دیتی تھیں۔ اس کا دامن تھام لیا تھا۔ اجلی قمیض پر اب تک میلی انگلیوں کے نشان تھے۔ جنہیں کھدر پوش سیاح متاسف نگاہوں سے دیکھ رہا تھا۔ مجمع میں چاند سنگھ کی اس بدتمیزی پر بہت ناراضی پھیلی ہوئی تھی۔

"الو کہیں کے...... عزت والے آدمیوں کے بھی دامن تھام لیتے ہیں۔"

"آٹھ روپے تنخواہ کے علاوہ رشوت کی بھی توقع رکھتے ہیں۔"

"شرم تو ان لوگوں نے بھون کر کھا رکھی ہے۔"

"ایک آنہ کیا کم تھا۔ ایک اور چار میں انہیں فرق ہی دکھائی نہیں دیتا۔"

"ٹون ایریا کا انتظام ہر جگہ ناقص ہے۔ ایسے آدمیوں کو ان سے نکالا بھی نہیں جاسکتا۔"

سب تماشبین اپنے اپنے فقرے چست کر رہے تھے۔ اور چاند سنگھ ندامت کے پسینے میں ڈوب کر اکنی کے کنگرے گن رہا تھا۔

اسی وقت رؤف آ گیا۔

"کیا ہے؟ کیا ہے؟" اس نے جمال سے پوچھا۔

"چاند نے بدتمیزی کی رؤف...... ہماری ناک کٹوادی۔" جمال نے آہستہ سے جواب دیا۔

چاند نے رؤف کو دیکھا۔ تو جیسے اس کی جان میں جان آ گئی۔

سیاح ریسٹوران میں داخل ہو چکا تھا۔ رؤف نے سارا معاملہ سنا۔ تو وہ جل بھن گیا۔

''جا۔ اکنی اسے لوٹا دے۔'' اس نے چاند سنگھ سے کہا۔

چاند سنگھ پر جیسے پہاڑ ٹوٹ پڑا۔ اسے رؤف کی موجودگی میں زیادہ اجرت ملنے کی توقع تھی۔ اور رؤف اسے اکنی بھی لوٹا دینے کو کہہ رہا تھا۔

اس نے حیران ہو کر رؤف کی طرف دیکھا۔ اور بادل نخواستہ کہا۔ ''یہ بھی لوٹا دوں......؟''

رؤف نے اسی مضبوطی سے کہا۔ ''ہاں......لوٹا دے......دوڑ۔''

چاند سنگھ کے پیروں تلے کی زمین نکل گئی۔ لیکن جلد ہی سنبھل کر اس نے جمال کی طرف ایک جھنجلاتی نظر ڈال کر کہا۔

نہیں......وہ یہ بھی رکھ لے گا......بڑا پاکھنڈی معلوم ہوتا ہے۔''

رؤف کی آنکھوں میں آگ لگ گئی۔ وہ گرج کر اس کی طرف لپکا۔ اور بولا۔ ''ارے چپت اور گالیاں سہہ کر بھی تم ایک آنہ رکھنے پر رضا مند ہو۔ پاجی کے بچے۔ تمہاری غیرت کہاں ہے؟ کتا بھی ناحق کی لات کھا کر بھونکتا ہے۔ جا اسے یہ آنہ بھی لوٹا دے......اور کہہ دے مجھے معاف کرو حضور! میں نے اجرت مانگی تھی۔ رشوت نہیں......آپ جتنا بوٹ پالش پر مہینے خرچ کرتے ہیں۔ اتنی ہی میری بھی تنخواہ ہے۔ انسان نہ ہوں نہ سہی۔ لیکن ابھی گدھا نہیں ہوں......''

مجمع پر حیرانی اور خوف کا ملا جلا رنگ چھا گیا۔ اور چاند سنگھ نے بڑے اطمینان کے ساتھ اکنی اپنی جیب میں ڈال دی۔ اور ہنستے ہنستے کہہ کر چلا گیا۔ ''بڑا خیر خواہ ہے تو مشکل سے ایک آنہ ملا۔ وہ بھی حضرت لوٹا دینے کو کہہ رہے ہیں۔ ہاہاہا......''

مجمع میں قہقہہ بلند ہوا۔ اور اسی کے ساتھ سب آہستہ آہستہ منتشر ہو گئے۔

"لنگڑا بڑا شیطان ہے۔" ایک بوڑھے مسلمان نے اپنے ساتھی سے کہا۔

دونوں رؤف کی طرف دیکھ کر ہنسے۔ اور چلے گئے۔

رؤف کو جیسے کسی نے گولی ماری ہو۔ آج اس کی خودداری کو شکست ہوئی تھی۔ آج اس کی شگفتہ مزاجی خاک میں مل گئی تھی۔

وہ سر جھکائے باؤلی کی طرف جانے لگا۔ شاید اسے پیاس لگی تھی۔ یا پیاس سے زیادہ اسے تنہائی کی ضرورت محسوس ہوتی تھی۔

وہ میرے سامنے سے کئی قدم آگے نکل گیا۔

"رؤف"

رؤف مڑ کر میرے قریب آ گیا۔

"دیکھا تم نے۔ چاند سنگھ کتنا لالچی ہے۔" میں نے کہا۔

رؤف نے بھرائی ہوئی آواز میں کہا۔ "سچ ہے منشی جی۔ ہم لوگ بہت لالچی ہیں۔ اور اسی وجہ سے گالیاں بھی کھاتے ہیں۔"

پیچھے سے میرے معاون نے مجھے ایکسپریس چھٹی دکھائی۔ ہیڈ آفس والے بارہ سال کے سیاحوں کے ہند سے مانگ رہے تھے۔ اور آج ہی۔۔۔"

میرے سر پر جیسے ڈھائی من سے زیادہ بوجھ چڑھ گیا۔ ہم دونوں نے ایک دوسرے کی طرف آج استعجاب بھری نظروں سے دیکھا۔ جیسے اندر ہی اندر سے کہہ رہے ہوں۔ یہ نقشہ کیا آج تیار ہو سکتا ہے؟ گدھے بھی تو رات کو کسی درخت کے نیچے یا مٹی کے ڈھیر پر سوتے ہیں۔"

میں نے لمبی سانس کھینچ کر رؤف سے کہا۔ "جاؤ رؤف۔ انتظار کرو۔ وہ وقت آ رہا ہے۔ جب تمہیں اور ہمیں اپنی محنتوں کا پورا پورا پھل ملے گا۔ جب ہماری جوانیوں کی قیمت ہمیں ملے گی۔ سردست جاؤ۔ کھاؤ انڈے اور لیٹو در یگ کے

نیچے...... میں ہند سے تیار کروں گا......"

معاون نے پوچھا۔ "اب؟"

"بنانے ہی پڑیں گے۔" میں نے ناامیدی کے لہجے میں جواب دیا۔

رؤف کے چہرے پر اطمینان کی جھلک سی نمودار ہوئی۔ وہ میرے قریب آ گیا۔ اور بولا۔ "پھر کیا ہوگا منشی جی!"

میں نے اپنے آپ کو کرسی پر ڈالتے ہوئے کہا۔ "پھر کوئی تمہاری کمر پر ڈھائی من بوجھ نہ رکھ سکے گا۔ گالیاں نہ دے سکے گا۔ بے عزت نہ کر سکے گا۔ سب ایک جیسے ہوں گے۔ ایک جیسے......"

رؤف چلا گیا۔ اور ہم ہند سے بنانے میں محو گئے۔ پہلے سال کی میزان میں دو ہزار انگریز سیاحوں کا فرق آ گیا۔

میرا معاون ذرا کند ذہن ہے۔ اس نے غلطی کی زیادہ پروا نہ کرتے ہوئے کہا۔ "کاش اسی طرح......"

اس سے آگے وہ نہ بول سکا۔ لیکن میں اس کا مطلب صاف سمجھ گیا۔ اور اسے احساس نہ دلانے کی کوشش کرتے ہوئے زیر لب مسکرا اٹھا۔

دوسرے دن شام کو میں نے دریا کے کنارے رؤف کو لیٹے دیکھا۔ مجھے دیکھتے ہی وہ اٹھ بیٹھتا۔ اور گھبراتے ہوئے پوچھا۔ "منشی جی۔ وہ وقت کب آئے گا۔ جب سب ایک جیسے ہوں گے۔ وہ آج ہی کیوں نہیں آتا...... آج ہی......"

میں نے ہنس کر پوچھا۔ "تم انڈا کھا چکے۔ آج تو کاروبار اچھا تھا۔"

رؤف نے ریسٹوران کی طرف دیکھ کر کہا۔ "اب میں انڈے نہیں کھاؤں گا۔ آج اس خنزیر نے مجھے میز پوش سے منہ صاف کرنے پر خانساماں سے نکلوا دیا۔ حالانکہ میں فی انڈا پانچ پیسے دیتا تھا......"

میں اپنی ہنسی ضبط نہ کر سکا۔ بولا۔ ''بس اتنی سی بات پر ہڑتال ۔ ارے انڈے کھاؤ۔ انڈے۔ زیادہ سے زیادہ بوجھ اٹھا سکو گے۔''

رؤف نے مچلتے ہوئے کہا۔ ''بس منشی جی اب نہیں کھاؤں گا۔

جب ہی کھاؤں گا۔ جب سب ایک جیسے ہوں گے۔ پھر نہ ریسٹوران سے کوئی نکلوائے گا۔ اور نہ کوئی فی انڈا پانچ پیسے مانگ سکے گا۔ لیکن منشی جی ۔ وہ وقت آج ہی کیوں نہیں آجاتا......''

میں نے کہا۔ ''اپنے وقت پر سب کچھ ہو گا رؤف ۔ سردست گالیاں سہو۔ چپ رہو۔ اور انتظار کرو۔''

اس دن سے شاید رؤف نے انڈا نہیں کھایا۔ حالانکہ میرے سامنے کئی بار اسے بارہ آنے سے زیادہ پیسے ملے تھے۔ وہ اب مولوی سے بھی شرارت نہ کرتا تھا۔ نہ نماز کے وقت اسے چھیڑتا تھا۔ اور نہ چاند سنگھ کی ڈاڑھی کو کھینچتا تھا۔ گدھے کی طرح کمر پر بوجھ اٹھاتے ہوئے ہنہناتا بھی نہیں تھا۔ اور نہ بوجھ کے ان دیکھے مالکوں کو گالیاں دیتا تھا۔ دراصل وہ سب کچھ سہہ لیتا تھا۔ چپ رہتا تھا۔ اور انتظار کرتا تھا۔ اسے شاید نواب بننے کی توقع تھی......اور کتنے ہی نواب لنگڑے بھی ہو گزرے ہیں۔

جاپان کی پیش قدمی سے برما اور رنگون کے متمول گھرانے ہندوستان کی طرف بھاگے۔ اور ان میں سے کچھ لوگ کشمیر کی طرف آئے ۔ پیسہ ان کی حفاظت کرتا تھا۔ اور وہ پیسے کی حفاظت کرتے تھے۔

چک پوسٹ کی منڈی میں معمول سے زیادہ کام رہنے لگا، قلیوں کو بارہ بجے کی روٹی کھانی بھی مشکل ہو گئی۔ جان بچانے والے سیاح قلیوں کو منہ مانگی بخشش دیتے تھے۔

ریسٹوران کے مالک نے بھی دیواروں پر قلعی کرا دی تھی، اور بید کے میزوں

اور کین کی بنی ہوئی کرسیوں پر کوپل وارنش کر دیا تھا۔ میز پوش بھی دھلائے گئے تھے۔ اور ریسٹوران کے باہر جلی حروف میں ریٹ لسٹ چسپاں کی گئی تھی۔

رؤف کو اب مذاق کرنے کا موقع ہی نہ ملتا تھا۔ جب دیکھو کانٹے کے نزدیک یا تو سامان کا وزن کرا رہا ہے۔ یا سر پر بوجھ لئے شاداں شاداں جا رہا ہے۔ سیاحوں کا یہ ہجوم کتنے ہی دنوں جاری رہا۔ ہم دن بھر کام کرتے کرتے مرے جا رہے تھے۔ اور دوسری طرف حکومت خوش تھی کہ سیاح زیادہ تعداد میں کشمیر آ رہے ہیں۔

ایک دن شام کو مجھے بھوک لگی۔ میں انڈا کھانے کی نیت سے ریسٹوران کی طرف گیا۔ دیکھا باہر برآمدے میں رؤف بیٹھا انڈے چھیل رہا ہے۔

''منشی جی۔ انڈے کھائیے۔ زیادہ کام کر سکیں گے۔''

اس نے مسکرا کر کہا۔

''رؤف......'' میں نے کہا۔ ''تم پھر اسی ریسٹوران میں انڈے کھا رہے ہو۔ جہاں ایک دن......'' رؤف نے کہا۔

''ٹھیک ہے منشی جی، ٹھیک ہے۔'' لیکن اب اندر تو نہیں کھا رہا ہوں۔ اور آج کل کام زیادہ رہتا ہے منشی جی۔ اور خنزیر نے معافی بھی تو مانگی ہے۔''

''معافی......؟ میں نے تعجب سے پوچھا۔'' تم سے معافی مانگی......''

رؤف نے سنبھل کر کہا ''نہیں۔ دراصل اس دن میرا ہی قصور تھا۔ میں نے چادر سے منہ صاف کیا تھا نا...... ہاں منشی جی یہ بھی تو معافی ہی ہوئی کہ میں پھر انڈے کھانے لگا......''

تھوڑی دیر بعد روڈا اور چاند سنگھ بھی آ گئے۔ انہوں نے آئس کریم منگائی۔ اور وہیں برآمدے میں بیٹھ کر کھانے لگے۔ حالانکہ اس سے قبل میں نے انہیں کبھی ریسٹوران سے کوئی چیز خریدتے یا کھاتے نہیں دیکھا تھا۔

رؤف نے انڈے کی زردی منہ میں ڈالتے ہوئے کہا۔ "منشی جی۔ آج کل بڑے مزے کے دن ہیں۔ خوب بخشش ملتی ہیں۔ سنا ہے یہ لوگ بڑے نیک دل ہیں......اور تو اور اب مجھ سے سہا نہیں جاتا۔ خدا کرے۔ آپ کا وہ وقت کبھی نہ آئے۔ جب سب ایک جیسے ہوں۔ اور کسی کو ایک انڈا بھی زیادہ کھانا نصیب نہ ہو۔"

میری آنکھوں کے آگے اندھیرا چھا گیا۔

میں نے بے اختیار اپنے آپ کو کہتے سنا۔ "رؤف"

رؤف نے دوسرا انڈا منہ میں ڈالتے ہوئے کہا۔ "منشی جی یہ بڑے مزے کے دن ہیں۔ گالیاں جمع نہیں ہوتیں۔ پیسے جمع ہوتے ہیں۔ اور آج۔۔۔میں نے چار روپے کمالئے ہیں۔ آپ بھی انڈے کھائیں منشی صاحب۔ بڑے مزے کے دن ہیں۔"

میں کھویا کھایا ہوا سا دریا کی طرف چل دیا۔ لہریں اٹھ رہی تھیں۔ بڑھ رہی تھیں۔ اور رقص کرتے کرتے نابود ہو جاتی تھیں اور پانی بہے جاتا تھا۔ بہے جاتا تھا۔

............☆☆☆............

تین زاویئے

شالیمار باغ کی اس بارہ دری پر جہاں کبھی حسن اور عشق، ناز اور نیاز اور گل و بلبل ملے ہوں گے ۔ وہ تینوں ملے۔ ہونٹوں پر بے مطلب مسکراہٹیں پھیلائے ہوئے، آنکھوں میں حیرت اور خوشی کے جذبات لئے ہوئے ۔اور ان کے دائیں بائیں، آگے پیچھے مغلیہ عظمت کا بے عنوان افسانہ کھلا پڑا تھا۔ جسے لاکھوں نے پڑھا تھا، لاکھوں نے سنا تھا اور لاکھوں پڑھنے اور سننے کی آرزو رکھتے تھے ۔اور جس کا ہر شیدائی اپنے اپنے ظرف اور مذاق کے مطابق عنوان رکھتا آیا تھا۔۔۔شالہ مار، آماجگاہِ حسن و عشق، قدرت کا شاہکار مغلیہ فنِ تعمیر کی بہترین یادگار۔۔۔

چار بج چکے تھے اور نہ معلوم وہ تینوں کب باغ میں داخل ہوئے تھے ۔اور اپنے اپنے مذاق کے مطابق انہوں نے اس افسانے کا کیا نام رکھا تھا کہ ان میں سے ایک لمبے بالوں والے انسان نے اپنے سامنے کھڑے پست قامت نوجوان سے مسکرا کر پوچھا۔ ’’آپ کا شبھ نام؟‘‘

’’نام؟‘‘ پست قامت نوجوان نے آہستہ سے مسکرا کر کہا۔

’’نام کبھی ہوا کرتا تھا۔اب کچھ بھی نہیں۔‘‘

’’کچھ بھی نہیں؟‘‘ لمبے بالوں والے انسان نے حیرت سے پوچھا۔

’’جی بالکل کچھ نہیں ۔ہاں آپ کو دقت ہو تو کچھ وقت کیلئے مجھے صحرائی کہہ کر

پکار لیں''۔

لمبے بالوں والے انسان نے ہنس کر کہا۔''بڑا جذباتی نام ہے۔صحرائی۔''

''اور آپ کا؟''اسی انداز میں اس نے دوسرے نوجوان سے پوچھا جو فرش پر بکھرتے ہوئے،اڑتے ہوئے پتوں کو اپنے پیروں سے مسلنے کی کوشش کر رہا تھا۔

''میرا؟''وہ چونک کر متوجہ ہوا اور بولا۔''مجھے منیم کہتے ہیں یعنی ڈولومل رتن لال کا منیم۔بہت بڑی دکان ہے ہماری۔''

صحرائی نے جیب سے سگریٹ نکال کر سلگایا اور پھر لمبے بالوں والے انسان سے پوچھا۔''اور آپ کا؟''

لمبے بالوں والے انسان نے کیمرا اسٹینڈ کی پتلی پتلی آہنی ٹانگوں پر اپنا ہاتھ پھیرتے ہوئے کہا۔''اجی ناموں میں کیا رکھا ہے۔ آدمی دراصل عمل سے پہچانا جاتا ہے۔اور میرا عمل بس یہی لٹکتا ہوا کیمرا ہے۔''

منیم نے اس کی پیٹھ پر لٹکتے ہوئے کیمرے کی طرف دیکھ کر کہا۔''بس یہی ٹھیک ہے،صرف عمل،یعنی عمل اچھا ہو تو ساری دنیا بھلی لگتی ہے ورنہ......''

صحرائی نے سگریٹ کا ایک کش کھینچتے ہوئے لمبے بالوں والے انسان سے کہا۔''تو گویا آپ فوٹوگرافر ہیں۔لیکن نام بھی اگر بتا دیں تو کیا ہرج ہے۔''

لمبے بالوں والے انسان نے بچوں کی ہنس کر کہا۔''جی ہرج کوئی نہیں تھا۔لیکن میرا نام اسی دن مر چکا جب ایک جوتشی نے میرے پاؤں میں چکر دیکھ کر میری بوڑھی ماں سے کہا۔''مائی تیرا بیٹا ایک اڑتا پنچھی ہے۔اسے قفس میں ڈالنے کی کوشش نہ کرنا۔اور سچ بھی یہی ہے کہ یہ ساری دھرتی مجھے آشیانہ دکھائی دے رہی ہے۔''

صحرائی نے مسکرا کر پوچھا۔''خوب۔لیکن جنم کہاں ہوا تھا آپ کا؟''

فوٹوگرافر نے کہا۔''پیلا میں۔آپ کبھی اس طرف گئے ہیں؟''

منیم اچھل کر بول اٹھا۔ ’’پیلا۔ بہت اچھا ملک ہے صاحب! پچھلے سال ہم نے وہاں سے خشخاش منگائی تھی۔ اور اتنی سستی آئی تھی کہ ہمیں کافی فائدہ ہوا۔ ہمارے لالہ جی آپ سے مل کر بے خوش ہوں گے۔ ممکن ہے ہم اس سال بھی خشخاش کا سودا کریں اور آپ ہی کی وساطت سے......‘‘

فوٹو گرافر نے بے چین ہوکر کہا۔ ’’آپ سودا ضرور کیجئے۔ لیکن میری وساطت سے نہیں۔ میں صرف تصویریں اتارتا ہوں۔ اور دیس دیس گھومتا ہوں۔‘‘

صحرائی یہ گفتگو بادل نخواستہ سن رہا تھا۔ فوٹو گرافر نے اسے مخاطب ہوکر کہا۔ ’’اور آپ نے ہمیں اپنے شغل کی نسبت کچھ نہیں کہا۔‘‘

صحرائی کا سگریٹ جلتے جلتے انگلیوں تک پہنچ چکا تھا۔ اس نے آخری کش لگا کر سگریٹ کو پھینکا اور کہا۔ ’’شغل تو ویسے کچھ بھی نہیں۔ ہاں کبھی کبھار ذہن میں جمع ہوئے تاثرات سے ایک لہر سی اٹھتی ہے جو یا تو گیت بن جاتی ہے یا ایک کہانی۔ ورنہ ویسے کوئی خاص شغل نہیں۔ اور سچ پوچھئے یہی لہر مجھے دو سو میل سے یہاں کھینچ لائی۔ یہاں جہاں کبھی شاہجہاں اور ممتاز محل انہی بارہ دریوں پر بیٹھ کر ایک دوسرے میں کھو جاتے تھے۔ ڈوب جاتے تھے۔ پھر ابھرتے تھے۔‘‘

منیم نے پھٹی پھٹی نظروں سے باغ کا جائزہ لیا۔ شاید یہ دیکھنے کے لئے کہ شاہجہاں اور ممتاز محل کہاں ڈوبا کرتے تھے کہاں ابھرا کرتے تھے۔‘‘

اور فوٹو گرافر نے ہنس کر کہا۔ تو آپ کوی ہیں۔ شاعر جو فوٹو گرافر کے بہت قریب ہوتا ہے۔ یعنی ایک تخیل سے تصویریں کھینچتا ہے۔ اور دوسرا کیمرے سے۔‘‘

صحرائی نے پختہ کار کی طرح اپنے ہونٹوں پر مسکراہٹ پھیلا دی اور کہا۔ ’’یہ آپ کا حسن ظن ہے ورنہ محکوم ملک میں کوئی شخص اپنے آپ کو شاعر کہہ سکتا ہے۔ اگر وہ شاعر ہو بھی......؟‘‘

فوٹو گرافر نے انداز گفتگو بدلتے ہوئے سنجیدگی سے کہا۔ ''سچ ہے صحرائی صاحب !انگریز صرف ہمارے ملک ہی پر حکومت نہیں کرتا۔ ہماری روحوں پر بھی قابض ہوگیا ہے۔اور یہ قبضہ اتنا شدید ہو چلا ہے کہ ہمارے لاشعور میں شکست پسندی کے گہرے نقوش پیدا ہو گئے ہیں۔ہم سچ مچ شاعر نہیں ہو سکتے ۔ ہاں مصور ہو سکتے ہیں۔''

منیم نے بے ضرورت ایک قہقہہ لگایا۔اور کہا۔ ''یہ مصوری بھی ایک طرح کا جنون ہے۔ہمارے لالہ جی کہا کرتے ہیں۔جب وہ جوان تھے تو انہیں بھی کیمرے کا بے حد شوق تھا۔جو پیسہ انہیں ملا کرتا وہ اسی جنون کی نذر کرتے۔حتیٰ کہ ایک دن انہیں بمبئی سے انعام ملا۔خاصا انعام سوا سو روپے کا۔ بلکہ ہماری آج کی دکان اسی انعام کا نتیجہ ہے۔''

فوٹو گرافر اور صحرائی کے منہ حیرت سے کھل گئے۔منیم نے دوبارہ فخریہ انداز میں کہا۔ ''اُدھر سے انعام ملا۔اِدھر سے صابون کی دکان چل نکلی ۔اس میں نفع ہوا تو نمک آیا۔پھر روئی پھر ہلدی اور پھر کریانہ اور آج ۔۔۔کریانے کے علاوہ تھوڑا بہت سودا بیاج بھی ہوتا رہتا ہے ۔ میوے کی آڑھت بھی کرتے ہیں اور چاندی کی خرید وفروخت بھی......''

فوٹو گرافر نے آنکھیں پھیلا کر پوچھا۔ ''بڑے خوش قسمت ہیں آپ کے لالہ جی ،شوق نے انہیں کہاں سے کہاں پہنچادیا۔لیکن اب بھی وہ شوق ہے کہ نہیں......؟''

منیم نے کہا۔ ''جی نہیں، کہتے ہیں وہ جوانی کے دن تھے۔جب برے بھلے کی سدھ بدھ نہیں ہوتی ۔اب انہیں کیمرے سے نفرت ہے اور کیمرے کی تصویروں کو بالکل پسند نہیں کرتے۔ہاں جرمن پرنٹ کی مہا لکھشمی کی تصویر ملے تو دکان میں

لٹکا دیتے ہیں۔۔۔ بڑے اصولی آدمی ہیں۔"

صحرائی نے نہ جانے کیوں ایک خشک پتے کو اپنے دونوں ہاتھوں سے مسلتے ہوئے ہنسا اور پھر فوٹو گرافر سے پوچھا۔ "آپ یہاں کب آئے؟"

۲۵/ اکتوبر کو۔ ارادہ یہی ہے کہ کچھ تصویریں اتار کر لے جاؤں۔ لیکن دِقت یہ ہے کہ فلم نہیں ملتے۔"

"کتنے فوٹو لے چکے آپ؟"

"اٹھارہ ایک۔ اب کیمرے میں صرف چھ باقی ہیں۔ وہ بھی کل تک ختم ہو جائیں گے۔"

"کس قسم کے فوٹو لیتے ہیں آپ، یہی مناظر کے، درختوں کے، عمارتوں کے؟"

"جی نہیں" فوٹو گرافر نے ہنس کر کہا۔ "میرا انداق کچھ نرالا ہے۔ میں صرف ان کی تصویریں لیتا ہوں۔ جن کی جڑیں دھرتی کی چھاتی میں گڑ گئی ہیں لیکن روحیں ابھی وسعتوں ہی پر ہیں......"

صحرائی سے اب کھڑا نہ رہا گیا۔ اور تینوں زمین پر بیٹھ گئے۔

"اس سے آپ کا مطلب؟" صحرائی نے پوچھا۔

فوٹو گرافر نے چمڑے کے بیگ سے کچھ تصویریں نکالیں اور انہیں فرش پر بکھیرتے ہوئے بولا۔ "دیکھ لیجئے۔ شاید میرا مطلب واضح ہو جائے گا۔"

صحرائی تصویریں دیکھتا گیا۔ اور پھر وہی تصویریں منیم کے ہاتھ میں پہنچتی گئیں۔ چھوٹے چھوٹے بچوں کی تصویریں جن کے میلے بدن تصویروں میں بھی عریاں تھے۔ معمر عورتیں جن کے چہروں کی جھریوں میں زمانے نے اپنے لازوال قلم سے عجیب عجیب دور کھودے ہوئے تھے۔ گھاس پھوس کی جھونپڑیاں جن کے آگے

مریل سے بیل دور دور کی ہریالی کو تک رہے تھے۔نوجوان بھکارن جو ایک بڑے مجمع میں پیٹ کیلئے اپنے افلاس کا رقص کر رہی تھی اور دیکھنے والوں کی آنکھوں میں شہوانیت کے سانپ لہرا رہے تھے۔ پگ ڈنڈیوں پر بیٹھے ہوئے فقیر جو گلمرگ جانے والے ہر سیاح کے آگے اپنا نحیف ہاتھ پھیلا دیتے ہیں۔اور جرائم پیشہ قبیلہ کی وہ عورتیں اور خیمے جنہیں دیکھتے ہی انسان کے بدن میں تھرتھری سی پیدا ہوتی ہے اور ان کی نیت مشکوک نظر آنے لگتی ہے۔آخری تصویر صحرائی کے ہاتھ میں تھی۔اور وہ ایسی نظروں سے فوٹو گرافر کو دیکھنے لگا جو آپ ہی آپ کہہ رہی ہوں کہ شاعر تو تو ہے۔جو دنیا کی کھڑکی کھول کر کیمرے کی آنکھ سے اندر جھانکتا ہے۔اور ایسے ایسے بھید اور زخم پالتا ہے جو ہزاروں برس ٹکریں مارنے کے بعد بھی ایک مفروضہ شاعر نہیں پا سکتا۔جس کی روح پر نہ انگریز کا قبضہ ہے نہ شکست پسندی کا باریک اور مضبوط خول۔

فوٹو گرافر نے اس کی طرف دیکھ کر پوچھا۔"پسند آئیں آپ کو؟ میں ہمیشہ سے حقیقی آرٹ کا متلاشی رہا ہوں۔کیوں کہ جن لوگوں کے پاس یہ تصویریں جائیں گی انہیں نہ کشمیر کی حکومت سے کوئی غرض ہے نہ کشمیریوں کے افلاس سے ہمدردی، وہ صرف قدرت کی اصلی پینٹنگ دیکھنا چاہتے ہیں۔اب دیکھئے یہ بوڑھی عورت ہے۔اس کی یہ جھریاں کتنی شاندار ہیں۔ان سے آدمی یعنی نفسیات کا طالب علم ایک مستقل سٹڈی کا کام لے سکتا ہے۔اور یہی میرے خیال میں حقیقی آرٹ ہے۔حسن اور حقیقت کی ہم آہنگی۔

صحرائی نے مرعوب ہو کر آہستہ سے کہا۔"بالکل بجا ہے۔میں سوچتا ہوں اس تصویر کو دیکھ کر ایک لمبی نظم کہی جا سکتی ہے......عورت، جو نور جہاں بھی تھی۔ممتاز محل بھی اور یہ بڑھیا بھی۔جس نے شراب بھی پلائی، اپنے مدفن پر تاج محل بھی تعمیر کرایا اور پیلا کے ایک فوٹو گرافر کے آگے کھڑی ہو کر اپنی جھریوں کی تصویر بھی کھچوائی۔"

منیم نے ہنس کر کہا۔ ''لیکن صاحب یہ صورتیں اتنی بھولی بھالی نہیں جتنی آپ سمجھ رہے ہیں۔ ۱۹۳۱ میں جب یہاں فسادات ہوئے۔ تو عورتیں تک اپنے گھروں سے ڈانگ لے کر نکلیں۔ خدا غارت کرے اس قوم کو......!''

فوٹو گرافر نے چونک کر کہا۔ ''ٹھیک ہے۔ میں ان دنوں کولمبو میں تھا۔ مجھے یاد ہے۔ میں نے کشمیر کے فسادات کے متعلق ایک بار اخبار میں کچھ پڑھا ضرور تھا۔ لیکن اب اچھی طرح یاد نہیں...... کچھ لوگ مارے بھی گئے ہوں گے؟''

''کچھ لوگ ہی کیوں؟ سینکڑوں، اور دکانیں بھی لوٹ لی گئیں لیکن شکر ہے۔ ہم بچ گئے۔ ہمارے لالہ جی کی دوسری دھرم پتنی مر گئی تھی۔ اور دکان بند بھی۔ ورنہ ہمارا بیڑا ابھی پار ہوا ہوتا۔''

فوٹو گرافر نے حیران ہو کر اس کی طرف دیکھا اور کہا۔ ''معلوم ہوتا ہے۔ بلوائی ہجوم میں آئے ہوں گے۔''

''بہت بڑا ہجوم صاحب! جس کی ہزاروں آنکھوں میں آگ کے شعلے لپک رہے تھے۔ ہزاروں ہاتھوں میں ڈانگ اور پتھر تھے۔''

فوٹو گرافر نے ہنس کر کہا۔ ''کتنی اچھی پکچر ہوتی۔ ہجوم۔ جو اپنا دماغی توازن کھو بیٹھتا ہو۔''

''لیکن فساد کیوں ہوئے منیم صاحب۔'' صحرائی نے پوچھا۔ '''' یہی بھوک کی وجہ سے؟''

''جی نہیں۔ بھوک بہانہ تھا۔ مقصد دراصل لوٹ مار تھا۔'' منیم نے جواب دیا۔

صحرائی کا چہرہ جیسے پچک گیا۔ اس کا بدن بے مایہ کپڑے کی طرح ڈھیلا ہو گیا۔ اسی وقت ایک خوانچہ فروش آ گیا۔ چھابڑی کو زمین پر رکھتے ہوئے اس نے

کہا۔ ''سلام سائیں جی، سیب، گوشہ بگو، تریل کھائے گا؟''

فوٹوگرافر نے پوچھا۔ ''کس بھاؤ دوگے؟''

خوانچہ فروش نے ایک سیب ہاتھ میں اٹھاتے ہوئے کہا۔ ''آپ سے کمانا کیا۔ خدا دوست ہو۔ سیب بارہ آنے سیر میلگا، گوشہ بگو دس آنے اور تریل ساڑھے آٹھ آنے۔ بہت اچھا پھل ہے اور اسی باغ کا......''

''اسی باغ کا؟'' منیم نے پوچھا۔

''خدا کی قسم!''

''بہت مہنگے بیچتے ہو۔ یہ نہ سمجھو ہمیں پھلوں کا کچھ پتہ نہیں۔ ہم بھی آڑھت کا کام کرتے ہیں۔'' منیم نے دوبارہ کہا۔

''تو جو مرضی آئے......دے دو۔'' چھاپڑی فروش نے ہتھیار ڈالتے ہوئے کہا۔

منیم نے ایک سیب کو دانتوں سے کاٹتے ہوئے کہا۔ ''چھ آنے سیر دیں گے۔ کہو منظور!''

چھابڑی فروش لاجواب سا ہوگیا۔ بولا ''بچے کی قسم! سات آنے میں خود خریدا ہے۔ آگے حاکم ہو......''

''چل تول تین سیر'' منیم نے سیب کھاتے ہوئے کہا۔ ''تکڑی میں پاسنگ تو نہیں؟''

چھابڑی فروش نے کہا۔ ''اتنی بے ایمانی نہیں کرتا ہوں اور کروں بھی کیوں جب دام کھرے ملیں۔''

منیم نے اپنی جیب سے چھ آنے نکال کر اس کے ہاتھ میں تھما دیئے اور ڈھیر سے دوسرا سیب اٹھا کر کھانے لگا۔

چھابڑی فروش نے پیسے واپس کرتے ہوئے کہا۔ ''یہ کم ہیں لالہ۔ لفظ سات آنے کا ہو گیا۔''

منیم حیران رہ گیا۔ بولا۔ ''تو پھر اٹھا لو سارے سیب، ہم اتنے مہنگے سیب نہیں کھا سکتے۔''

چھابڑی فروش نے خندہ پیشانی سے سیب واپس اٹھائے اور چل دیا۔

منیم نے اپنے سہمے ہوئے سے ساتھیوں کی طرف دیکھا اور کہا۔ ''بڑا چالاک بنا پھرتا تھا۔ لیکن ہم نے بھی دو کھا ہی لئے......''

فوٹو گرافر اور صحرائی آہستہ سے مسکرا دیئے۔

دن ڈھلتا گیا۔ اور میٹھی میٹھی سردی نومبر کی شرمائی ہوئی دھوپ کی گود میں سے سر نکالنے لگی۔ فوٹو گرافر نے فرش پر بکھری ہوئی تصویریں بیگ میں ڈالتے ہوئے صحرائی سے کہا۔ ''آپ اب کیا سوچ رہے ہیں صحرائی صاحب! اپنا کوئی گیت ہمیں بھی سنائیے۔''

صحرائی نے کہا۔ ''سوچ رہا ہوں، آیا ہم فطرت کی حقیقی نقاشی کو دنیا کے سامنے پیش کر سکتے ہیں، انہی رنگوں میں اسی خدوخال کے ساتھ، وہی رعنائی اور جاذبیت لئے ہوئے۔ میرا خیال ہے اس میں کوئی کامیاب نہیں رہ سکتا۔

فوٹو گرافر نے کہا۔ ''آپ کسی حد تک سچ کہتے ہیں کہ ایسا نہیں ہو سکتا۔ لیکن ایک مصور فطرت کے کسی رنگیں حصے کی تصویر اپنے کیمرے کی مدد سے دنیا کو دکھا سکتا ہے۔ جو شاید شاعر نہیں کر سکتا۔''

صحرائی نے چمک کر کہا۔ ''یہ غلط ہے صاحب! مصوری اور شاعری ادب کی قسمیں ہیں۔ اور ادب کسی ایک انسان پر ختم نہیں ہو سکتا۔ جب تک زندگی ہے۔ ادب موجود ہے۔ اور جس جس پہلو زندگی کروٹیں بدلتی رہے گی ادب بھی بدلتا رہے گا۔

مثلاً اسی باغ کو لیجئے۔ کون جانے یہاں کیا ہوتا رہا ہے۔ ان محرابوں کے نیچے، چناروں کی اوٹ میں، ان فواروں کو دیکھ دیکھ کر کس کس نے زندگی کے سہانے خواب دیکھے ہیں۔ لیکن آج جب زندگی دوسری کروٹ لے رہی ہے۔ یہاں کچھ بھی نہیں۔ باغ میں جب ہو کا عالم ہے۔ چناروں پر جنگلی کوے گا رہے ہیں۔ پانی کی ندیاں کنگال کے پیٹ کی طرح سوکھ گئی ہیں اور محرابیں...... وہ اس قدر چھیلی گئی ہیں کہ ان کی چمک میں اب دیکھنے والا تعمیر کرنے والے کے ذوق کو نہیں بلکہ لاتعداد سیدھی ٹیڑھی اور کھردری لکیریں اور نام دیکھ سکتا ہے۔ صدیقہ بیگم، این ساہنی، سوم ناتھ...... محمد رمضان......"

منیم نے بیچ میں دخل دیتے ہوئے کہا۔ "یہاں بہار کی کسی ایت وار کو آنا چاہئے جب مزا ہے۔ سماوار، کلچے، بوتلیں، گوشت اور مچھلیاں گورے گورے انگریز اور شمعی سیمیں اِدھر سے اُدھر بھاگتی پھرتی ہیں۔ اب تو خزاں ہے۔ اور خزاں میں ایسا ہی ہوتا ہے۔ پتے جھڑ جاتے ہیں۔ انہیں اکٹھا کر کے جلایا جاتا ہے۔ اور پھر کوئلے...... روپے کے سات بورے...... پہلے سولہ بوریاں ملتی تھیں۔ ہی ہی ہی۔۔۔ اور سچ پوچھو تو میں دکان چھوڑ کر کوئلے خریدنے کے لئے ہی آ گیا ہوں۔ ورنہ اب یہاں کیا ہے۔"

فوٹوگرافر اور صحرائی ایک دوسرے کو دیکھ کر ہنسنے لگے۔ اور پھر تینوں وہاں سے اٹھ کر آہستہ آہستہ نیچے اترنے لگے۔ ان کے پاؤں کے نیچے زرد اور لال پتے چر چر، چر چر کرتے رہے۔ جیسے کہہ رہے ہوں۔ "ہمیں نہ روندو۔ ہمیں بہار میں دوبارہ آنا ہے۔"

............☆☆☆............

فرار

یہ ہسپتال نہیں، پناہ گاہ ہے۔ان بدقسمت انسانوں کی جو زندگی سے یا تو خود بھاگ کر آتے ہیں یا جنہیں زندگی بھاگنے پر مجبور کرتی ہے۔ یہاں ایسے بھی پناہ گزیں ہیں جو مرنے سے پہلے جدوجہد کرنے کی تھوڑی بہت استطاعت رکھتے ہیں۔ یہ استطاعت شاذونادر ہی کامیاب ہوتی ہے۔ ورنہ عام طور پر موت اسے بھی روح کے ساتھ تحفے کے طور پر قبول کر لیتی ہے اور مرنے والے کی ہمت پر ایک قہقہہ لگاتی ہے۔

ہسپتال کے وارڈوں میں صبح سے شام تک ایک معنی خیز خاموشی سی رہتی ہے اور ایک عجیب ناامیدی سی۔ جسے سمجھنا ناممکن نہیں۔البتہ محسوس کرنا مشکل ہے۔مریض کبھی کھڑکیاں کھول کر بیٹھتے ہیں اور کبھی برآمدے میں، ان کی نگاہیں دور دور بھٹکتی ہیں اور اس دنیا کو دیکھتی رہتی ہیں۔ جو ہسپتال سے کچھ دور، میدان سے پرے، شوروشر، گہما گہمی اور بھیڑ بھاڑ سے پٹی پڑی ہے۔ جہاں زندگی سمندری طوفان کی طرح ہر وقت چھائی رہتی ہے۔اور موت قہقہوں کی اوٹ میں جھانکتی رہتی ہے......

ہسپتال میں مریضوں کے علاوہ اور بھی کچھ لوگ ہیں۔ جو بظاہر متنفر نہیں لیکن......جنہیں زندگی سے، باہر کی دنیا سے اور اس سارے ہنگامہ سے تنفر سا ہے۔ مثلاً پختہ کار کمپونڈر جو دواخانہ کی کھڑکی پر عینک لگائے بیٹھا رہتا ہے۔کبھی کبھی اخباروں کے وہ چیتھڑے پڑھتا ہے جن مریضوں کے رشتہ دار ڈبل روٹیاں لپیٹ کر لاتے ہیں

۔جب گرمی زیادہ ہوتی ہے۔اور چناروں کے پتے شرما شرما کر سرنگوں ہوتے ہیں۔ وہ کسی وارڈ میں داخل ہوتا ہے۔اور جو چیز جہاں سے ملے قبول کر لیتا ہے۔تمباکو کے ایک دو کش چائے کی ایک آدھ پیالی بچا کھچا سالن یا روٹیوں پر لپٹے ہوئے اخباروں کے چیتھڑے، اس کے چہرے پر ہر وقت ہنسی کا طوفان ہوتا ہے جو تھمنے ہی میں نہیں آتا۔اور خصوصاً اس وقت زیادہ تیز ہوتا ہے۔جب کوئی مفرور اس پناہ گاہ کی درو دیوار سے بھی نجات پاتا ہے۔سنا ہے کبھی چار بچوں کا باپ ہوا کرتا تھا۔جو سب وبائی بیماری کا شکار ہو گئے۔آخری بچے کی موت پر جن لوگوں نے اسے دیکھا ہے وہ کہتے ہیں اس کی آنکھوں سے آنسو کی ایک بوند بھی نہیں ٹپکی۔الٹا قہقہے پر قہقہہ لگاتا رہا۔اور تب سے آج تک برابر قہقہے لگا رہا ہے۔اس کے رشتہ دار، دوست احباب ان قہقہوں کو سخت جانی اور بے شرمی سے تعبیر کرتے ہیں۔لیکن کمپونڈر کو ان کی پرواہ نہیں۔وہ صبح سے شام تک قہقہے لگاتا جاتا ہے۔

اس کے علاوہ ایک نرس ہے، بے حد خوبصورت اور جوان، اس کے چہرے پر عجیب متانت اور سنجیدگی ہے۔وہ بولتی کم ہے سنتی اور دیکھتی زیادہ ہے۔جب وہ سفید لباس پہن کر وارڈ میں داخل ہوتی ہے۔تو یہی گمان گزرتا ہے۔کہ سنسکرت کے کسی عالم کی تخلیقی شہزادی بددعا کے زیر اثر ان رشیوں کی خدمت کر رہی ہے جو زندگی سے گھبرا کر ،زندگی کے مایہ جال سے بچ کر جنگلوں سے بچ کر جنگلوں میں عبادت الٰہی میں مصروف ہیں۔اور زندگی جنگلوں سے باہر ان کا منہ چڑا رہی ہے۔ان پر قہقہے لگا رہی ہے اور بعض اوقات انہیں حسن وعشق کے دلفریب کھلونے دکھا کر واپس آنے کی ترغیب دے رہی ہے۔لیکن وہ رشی ہی کیا، جو زندگی کے اس دام میں پھنس جائیں اور قدرت کو حقیر انسان کے ہاتھوں مغلوب ہوتے دیکھ سکیں۔

مریضوں کو جس قدر محبت ہنسوڑ کمپونڈر سے ہے۔اسی قدر نفرت اس

خوبصورت اور سنجیدہ نرس سے ہے۔ایک طرف وہ داخل ہوتی ہے اور دوسری طرف دیکھنے والے آنکھوں ہی آنکھوں میں باتیں کرنے لگتے ہیں۔کبھی کبھی وہ اپنی آنکھوں سے یہ باتیں سنتی ہے۔لیکن پھر بھی چپ رہتی ہے۔اس کی خاموشی نے ہر وقت مجھے تذبذب میں ڈال دیا ہے۔ جوانی اور حسن، کبھی خاموش رہ سکتے ہیں؟ کبھی سنجیدہ بن سکتے ہیں؟ کہتے ہیں یہ ایک ہندولڑکی تھی ۔ جو بچپن ہی میں بیوہ ہوگئی اور جوانی میں اپنے خاندان کا نام ڈبو کر، اپنی سات پشتوں کو نرک میں جلا کر ایک ملیچھ نوجوان کے ساتھ بھاگ نکلی ۔اس کے رشتہ دار تڑپ اٹھے۔دھرم کانپ اٹھا۔ہندو عورت کا آدرش سرنگوں ہوگیا۔گاؤں میں ہاہا کار مچ گئی ۔دھرم منڈیوں.اور دھرم کے محافظوں نے سوچ بچار کیا۔ ہندولڑکی کی جنسی بھوک پر، بے حیائی اور کھلی بغاوت پر چار حرف بھیجے گئے ۔لیکن وہ بھاگ چکی تھی ۔اس کے شباب کی لچکدار بیل کو سہارا مل گیا تھا۔اور جسے سہارا ملے وہ مذہب کی کیا پرواہ کرتا ہے۔کہتے ہیں اسی فرار نے نرس کو سنجیدہ بنا دیا ہے ۔اوراس کے حسن و شباب میں متانت کا گہرا رنگ بھر دیا ہے ۔اب بھی کچھ نیک بندے اس کے منہ پر برا بھلا کہتے ہیں لیکن وہ پھر بھی خاموش رہتی ہے۔بولتی کم، سنتی اور دیکھتی زیادہ ہے۔

نرس کے بعد ڈاکٹر ہیں، ایک بڑا ڈاکٹر دوسرا چھوٹا ڈاکٹر۔ بڑا ڈاکٹر صرف جمعرات کو آتا ہے۔اور وارڈوں کا گشت لگا کر چلا جاتا ہے۔اسے یہ سننے کی فرصت ہی نہیں کہ ان آٹھ دنوں میں کتنے مفرور پناہ گاہ میں چھپ گئے ۔اور کتنے زمیں میں۔وہ پرشور دنیا سے بھاگا بھاگا آتا ہے۔اور بھاگا بھاگا واپس جاتا ہے ۔ان کی اس بھاگا بھاگی پر کسی کو اعتراض نہیں۔نہ مریضوں کو، نہ محافظوں کو۔البتہ ان کے آنے سے پہلے جوش وخروش کی ایک لہر سی اٹھتی ہے۔اور سارے ماحول پر ایک معنی خیز خاموشی سی، عجیب ناامیدی سی چھا جاتی ہے۔ جسے سمجھنا ناممکن نہیں البتہ محسوس کرنا مشکل ہے۔

مجھے ایسے آدمیوں پر رشک آتا ہے جو زندگی کی پیٹھ پر چڑھ کر سواری کرتے ہیں۔ اور دنیا تکتی رہتی ہے۔

چھوٹے ڈاکٹر صاحب رات دن ہسپتال ہی میں رہتے ہیں۔ اوٹ ڈور بیماروں کو دیکھنے کے بعد وہ چنار کے نیچے یا تو کوئی کتاب لے کر بیٹھتا ہے یا کچھ کھانے لگتا ہے۔ انڈے، فروٹ، مٹھائی۔ اس کے خیال میں بیماری کوئی چیز ہی نہیں۔ محض ایک تو ہم غذا کے فقدان کا پیدا کردہ...... البتہ غذا...... وہ غذا جو انسان کو نہیں ملتی۔ بیماروں کو نہیں ملتی۔ کسی کو نہیں ملتی۔ جس کو حاصل کرنے کیلئے ازل سے آج تک سب آوارہ ہیں۔ انسان شہروں اور بستیوں میں، حیوان جنگلوں اور ویرانوں میں۔ انسان کی سیاست، ترقی، تہذیب ادب، سب اسی غذا کے پیچھے آوارہ ہیں۔ حتیٰ کہ کمپونڈر کے قہقہے اور نرس کی سنجیدگی بھی اسی غذا کے مختلف روپ ہیں۔ اسی آوارگی کی متضاد شکلیں۔ ایک آگ ہے کہ اس کے دماغ میں دہک رہی ہے، ایک ناسور ہے جو اس کے خیالات سے رس رہا ہے۔ اور وہ خوش ہے کہ اس نے بالآخر زندگی کا بھید پالیا ہے اور وہ بھی پناہ گاہ میں جو ہسپتال نہیں۔

ایک دن ملول سا سماں تھا۔ بادل کے کچھ ٹکڑے پہاڑوں میں پناہ لینے کے لئے آسمان پر بھاگے جا رہے تھے۔ اور کچھ ٹکڑے بغاوت پر اتر کر وادی کی طرف لپک رہے تھے۔ چھوٹا ڈاکٹر چنار کے نیچے ایک عورت کو دیکھ رہا تھا۔ جس کے دانت میلے تھے۔ آنکھیں میلی تھیں۔ کپڑے میلے تھے۔ ساری زندگی میلی تھی۔ اور اس کے دائیں طرف ایک خوش پوش نوجوان اپنی بیوی سے باتیں کرر ہا تھا۔ ان سے ذرا دور فرش پر بیمار عورت کا ساتھی مرد ڈاکٹر کی طرف معنی خیز نگاہوں سے دیکھ رہا تھا۔ ڈاکٹر نے اشارے سے اسے بلایا اور پوچھا۔ "یہ تمہاری کیا لگتی ہے؟"

"میری گھروالی ہے۔" مرد نے ہنس کر کہا۔

''گھر والی؟ لیکن یہ اتنی میلی کیوں ہے؟''

مرد۔ سر جھکا کر زیر لب ہنسا اور کہا۔ ''بس ایسی ہی ہے، ڈاگڈر صاحب ہمارے گھروں میں ایسی ہی عورتیں ہوتی ہیں۔''

خوش پوش نوجوان کے ساتھ باتیں کرنے والی عورت کھکھلا کر ہنس دی۔ اور ڈاکٹر نے میلی عورت کے شوہر سے کہا۔ ''اسے کوئی بیماری نہیں۔ خدا نے اسے بچہ دیا ہے۔''

''بچہ؟'' شوہر کے منہ سے ہلکی سی چیخ نکلی۔ ''بچہ......؟'' مجھے بچہ نہیں چاہئے۔ میرا گھر پہلے ہی بچوں سے بھرا پڑا ہے مجھے بچہ نہیں چاہئے۔

ڈاکٹر نے اس کی اندرونی آواز نہیں سنی۔ بولا۔ ''اسے غذا دو، ڈبل روٹی۔ انڈے، مکھن، شوربہ اور فروٹ......''

عورت نے پھٹی پھٹی نظروں سے ڈاکٹر کی طرف دیکھا۔ جن میں خوشی اور استعجاب کے جذبات کم تھے۔ مگر بیم ورجا کے تاثرات زیادہ۔

مرد بے قرار ہو گیا۔ بولا۔ ''لیکن انڈے ڈیڑھ روپے......''

ڈاکٹر اس کا مطلب تاڑ گیا۔ ہنس کر بولا'' جسے خدا بچہ جیسی نعمت بخشے وہ گرانی کی پرواہ نہیں کرتا...... جاؤ اسے غذا دو۔ صبح اور شام، رات اور دن ---۔ صرف غذا......!'' لیکن اس کی روح اندر سے برابر کہتی رہی۔ ''مجھے بچہ نہیں چاہئے۔ دنیا گرانی کی آگ میں جل رہی ہے۔ مجھے بچہ نہیں چاہئے......''

ڈاکٹر خوش پوش نوجوان کی بیوی کی طرف متوجہ ہوا۔ اسے ملاحظہ کئے بغیر ہی اس نے کہا۔ ''معلوم ہوتا ہے۔ یہ غذا بہت کم کھاتی ہیں۔ یا کھاتی ہی نہیں۔''

میاں بیوی دونوں کھکھلا کر ہنس پڑے۔ بات سچی تھی اسی لئے۔

اس کے شوہر نے ڈاکٹر کے ساتھ اتفاق کرتے ہوئے ہنس کر کہا۔ ''بالکل

بجا ہے ڈاکٹر صاحب ۔ میں اسے سمجھاتے سمجھاتے تھک گیا۔ کسی طرح مانتی ہی نہیں۔"

ڈاکٹر نے سنجیدگی سے کہا۔" یہ بری بات ہے۔ غذا زندگی کیلئے بہت ضروری ہے۔"

عورت نے نخرے کرتے ہوئے اپنے شوہر سے کہا۔" مجھے دراصل یہ چیزیں پسند ہی نہیں۔ یہ بھی کیا زندگی ہے کہ آدمی صبح اور شام رات اور دن صرف انڈے چھیل چھیل کر کھایا کرے۔ پھونک پھونک کر دودھ پیا کرے۔ اور زندہ رہے۔"

اس کا شوہر اور ڈاکٹر دونوں ہنس پڑے۔ پھر ڈاکٹر نے کہا۔" اس وقت آپ کی پسند کا سوال نہیں محترمہ۔ اس وقت زندگی کا سوال ہے۔ اور زندگی ۔۔۔ بڑی قیمتی ہوتی ہے......"

عورت کے شوہر نے طرح دیتے ہوئے کہا۔" اب اس کی کوئی ضد نہ چلے گی ڈاکٹر صاحب! آپ اطمینان رکھئے۔ یہ ہر چیز میری نظر بچا کر گلی میں پھینکتی رہی ہے۔ جس سے گلی کا کتا ہاتھی برابر ہو گیا ہے۔ لیکن اب......اب اسے خود ہتھنی بننا پڑے گا......ہی ہی ہی......"

دونوں ٹانگے پر بیٹھ کر چلے گئے۔ گھنگھروں کی آواز میں ہنستے ہنستے، ایک دوسرے کو مخول کرتے کرتے......" اب گلی کا کتا ہاتھی نہیں بنے گا۔ اور زندگی بڑی قیمتی ہوتی ہے......"

دوسرا جوڑا ابھی تک سبزے پر بیٹھا حیران نگاہوں سے اِدھر اُدھر دیکھ رہا تھا۔ ڈاکٹر نے اٹھتے ہوئے مرد سے پوچھا۔" تم جاتے کیوں نہیں۔ کچھ اور کہنا ہے؟"

مرد نے کھڑے ہو کر گھبرائی ہوئی آواز میں کہا۔" آپ نے انڈے، روٹیاں

اور شوربہ کھانا......"

"ہاں ہاں انڈے۔شوربہ، روٹی اور فروٹ......خوب کھلاؤ۔خوب کھلاؤ۔"

ڈاکٹر چلا گیا۔اور وہ دونوں وہیں کھڑے رہے۔ہارے ہوئے جواریوں کی طرح۔گناہ کرتے کرتے پکڑے ہوئے مجرموں کی طرح۔

تھوڑی دیر بعد شوہر نے کہا۔"چلو۔اب دیکھتی کیا ہو۔جو ہونا تھا ہو گیا۔ لیکن تم نے مجھے کیوں نہیں کہا۔اصل میں یہ بات...... ہے"

بیوی نے لجاتے ہوئے کہا۔"مجھے کیا معلوم تھا......اپنی طرف سے...۔"

مرد نے تنک کر کہا۔"مجھے بچے کی پرواہ نہیں ۔ بچہ جائے جہنم میں ۔لیکن انڈے......روٹیاں......اور شوربہ......"

"مجھے کچھ بھی نہیں چاہئے ۔اللہ قسم ۔ مجھے کوئی بیماری نہیں۔" بیوی نے احتجاج کرتے ہوئے کہا۔

دونوں پھاٹک کی طرف جانے لگے۔اور پھاٹک کے نزدیک رکے۔عورت ہسپتال کی طرف دیکھنے لگی۔اداس اداس نظروں سے۔مری ہوئی آنکھوں سے، جن میں ایک کرید تھی۔ایک فریاد تھی زندگی کے خلاف، اور مجھے محسوس ہوا کہ زندگی سے فرار ہونے کا جذبہ اس کے دماغ میں رینگ رینگ کر داخل ہو رہا ہے۔اور مایوس پناگاہ اپنی ٹھنڈی اور بے مہر باہیں کھول کر اسے اپنی آغوش میں لینا چاہتی ہے۔

آسمان پر بادل کے کچھ ٹکڑے پہاڑوں میں پناہ لینے کیلئے آسمان پر بھاگے جا رہے تھے اور کچھ ٹکڑے بغاوت پر اتر کر وادی کی طرف لپک رہے تھے......ایک عورت کا شوہر اپنی بیوی کو ہتھنی بنانے کیلئے زندگی کی طرف بھاگ گیا تھا۔اور دوسری عورت کا شوہر اپنی بیوی کو روح کی آواز میں پکار پکار کر کہہ رہا تھا۔"تم کتیا ہو۔ کتیا" اور بیوی......زندگی سے بھاگنے کی تیاریاں کر رہی تھی۔

اوران سے پرے......ہسپتال کے برآمدے پر خوب صورت نرس نے اپنی آنکھوں سے آنسو پونچھے اور جلد جلد ایک وارڈ میں سنجیدہ صورت بنائے داخل ہوگئی۔

خداجانے کیوں؟

............☆☆☆............

ڈھول

پری محل کی مہیب صورت پہاڑیوں کے پیچھے سے صبح کا مسکراتا ہوا سورج دو نیزے اُوپر آچکا تھا اور ابھی تک اُسے اپنے پپوٹوں میں آنسوؤں کی نمی کا احساس ہو رہا تھا۔

اُس کے قدموں کے آگے، ڈل کے کشادہ پاٹ سے پرے، بیلوارڈ کی حسین سڑک پر سبزی سے بھرے ہوئے چھکڑے شہر کی طرف دوڑ رہے تھے اور سڑک کے کنارے بنے ہوئے بنگلوں اور ہوٹلوں کے دروازوں پر ٹٹو والے گھوڑوں کی باگیں تھامے انتظار کر رہے تھے۔

اُس نے مٹی کا گھڑا پانی میں ڈبویا اور خود بھی کسی خیال میں ڈوب گئی۔ اپنی پھٹتی ہوئی جوانی سے جو تڑپ، جو سوز، جو اضطراب وہ کبھی کبھی ایسے موقعوں پر محسوس کیا کرتی تھی، آج اُس کا کہیں نام و نشان تک نہ تھا۔ جیسے کارواں گذر چُکا ہو اور شاہراہ پر صرف دُھول رہ گئی ہو۔ اور سچ مُچ یہ دھول اُسے ہر کہیں نظر آ رہی تھی...... اپنے بدن پر، اپنی آنکھوں میں ڈل کے ساکن و جامد پانی پر، بلیوارڈ کے ہوٹلوں اور بنگلوں پر۔ اُڑتی ہوئی سی، چھائی ہوئی سی۔ اور وہ سوچ رہی تھی، اتنی دُھول آج اچانک آئی کہاں سے؟ لیکن نہیں، یہ صرف اُس کے ادراکی وجود کی یاسیت تھی جس نے اُس پر غلبہ پایا تھا۔ ورنہ اتوار کی صبح کو بلیوارڈ اور گگری بل کے نزدیک دُھول کہاں؟ وہاں تو موت کو فریب

دے کر آئی ہوئی زندگی ہوتی ہے، زندگی کے متحرک سائے ہوتے ہیں اور سایوں کے قہقہے!

سڑک پر اب خاصی چہل پہل شروع ہوگئی تھی۔ ہوٹلوں میں ٹھہرے ہوئے ہندوستانی صاحب لوگ صبح کی سیر سے واپس آرہے تھے۔ ہاتھوں میں علَم اور کیمرے لئے ہوئے مرد، عورتیں اور بچّے...... سب خوش وشادان، شاید وہ شنکراچاری کی پہاڑی سے اُترے تھے۔ اُن کے چہرے سندُور کی طرح سُرخ تھے اور بدن تانبے کی طرح سخت تھے۔ اُنہیں دیکھ کر اُسے اپنا بچپن یاد آ گیا۔ جب وہ ڈل کے پار بلیوارڈ کے اُس طرف اپنی ماں کے ساتھ رہتی تھی۔ جھونپڑی اگرچہ چھوٹی تھی، مگر خوشیوں اور بے فکریوں سے بھری ہوئی۔ اُس وقت اُسے یہ معلوم ہی نہ تھا کہ ڈل کا یہ نیلا پانی جس کا بہاؤں بہتے ہوئے بھی محسوس نہیں ہوتا، اُسے اس جونپڑی سے کبھی جُدا کرے گا۔ اُن دنوں وہ ہر صبح اپنی سہیلیوں کے ساتھ ان پہاڑیوں پر چڑھتی اور سُوکھی لکڑیوں کا ایک ٹوکرا بھر لاتی۔ جو اُس کے خیال کے مطابق بہت بڑی دولت تھی۔ لیکن اب ہر صُبح کے ساتھ زندگی کے متحرک زاوئے بدل چکے تھے۔ عمودی زاوئیے ٹیڑھے ہو چکے تھے اور بچپن کی بہت بڑی دولت اب حقیر نظر آرہی تھی بلکہ نفرت کی حد تک حقیر۔ عورت کے شباب کی دولت کچھ اور ہوتی ہے۔ ایک بچّہ جو اپنی کوکھ سے پیدا ہو اور زندگی کی لَو کو جلائے رکھے۔ لیکن وہ...... وہ اس دولت سے ابھی محروم تھی اور خاوند کے آئے دِن کے طعنوں سے اُسے یُوں محسوس ہو رہا تھا جیسے زندگی کی لَو بُجھا چاہتی ہے اور اُس کے آگے مہیب تاریکی چھا رہی ہے...... مہیب اور لرزہ خیز!

آج بھی خاوند نے اُسے طعنہ دیا تھا۔ ہر چند وہ گزشتہ ایک ماہ سے بیمار تھا۔ مگر اپنی منکوحہ کو طعنے دینے کے لئے مرد کے پاس ہمیشہ بے حد قوت ہوتی ہے۔ اُسے شاید اپنی زندگی کی لَو بجھتی ہوئی نظر آرہی تھی۔ جسے وہ دیکھنا نہ چاہتا تھا۔ لیکن اس

میں بیوی کا کیا قصور تھا؟ کیا اُس نے ہر موقع پر اپنا جسم اُس کے حوالے نہیں کیا تھا؟ اُس کی ہر ناز برداری نہ کی تھی......وہ یہ سوچ رہی تھی۔ اُس کی بچپن کی سہیلیوں کے گھر لڑکیوں اور لڑکوں سے بھرے ہوئے تھے۔ صرف وہ تھی جس کا گھر سُونا سُونا سا تھا۔ کیا ہر عورت کے بچّہ ہونا ضروری ہے؟ کیا زندگی کی لَو بچّے کے بغیر زندہ نہیں رہ سکتی؟ شاید نہیں رہتی ہو! اُس کی سہیلیوں اور گاؤں کی بُوڑھیوں کا کیا خیال تھا۔ بچّہ خاوند اور بیوی کے درمیان وہ رشتہ ہے جو ازل اور ابد کو مِلا تا ہے اور یہ رشتہ دواؤں سے بھی حاصل کیا جاسکتا ہے۔ بَچھواڑے میں جو نرس رہتی ہے وہ یہ دوائیں بیچتی ہے۔ پانچ روپے میں ایک پُڑی یا ایک بچّہ جو زندگی کی لو کو جلائے رکھنے کا ضامن ہے۔ مگی یہ پانچ روپے کہاں تھے؟ ایک بے چارے مزورد کی بیوی پانچ روپے پس انداز نہیں کرسکتی۔ اپنے مرد سے مانگ بھی نہیں سکتی۔ وہ ہمیشہ ایسے اخراجات پر قہقہے لگاتے ہیں۔ جو چیز آٹھ برس کی ازادواجی زندگی اور اُس زندگی کی دُعائیں حاصل نہ کرسکی وہ پانچ روپے کی دوا کب کرسکتی ہے؟ لیکن اُسے مردوں کے اس فلسفے میں اعتقاد نہیں۔ اُس نے ہر بار بَچھواڑے کی نرس کے گرِد حاجت مند عورتوں کا ایک ہجوم دیکھا ہے اور پانچ روپے کی بے شمار پُڑیاں......!

اُس نے کئی بار پس انداز کرنے کا مصمم ارادہ کیا۔ اور جُوں ہی تھیلی میں تین روپے سے زیادہ اکنیاں اور دونیاں جمع ہوتیں، یک لخت اُس کا خاوند بستے پر دراز ہوجاتا۔ دوادارد کے لئے تھیلی بھی خالی ہوجاتی اور میر بحری کے مشہور سُود خوار پنڈت سے بھی آٹھ دس رُوپے قرض پر لئے جاتے۔ ایسے موقعوں پر اُس نے کبھی تھیلی کو نہیں چھپایا۔ اور ہمیشہ اُس کا خاوند اکنّیوں اور دونّیوں سے بھری تھیلی دیکھ کر دِل ہی دِل میں اُس کی دوراندیشی اور پاک بازی کا معترف ہوتا۔ لیکن زبان پر کبھی بھی شُکریے کا ایک آدھ لفظ تک نہ آنے دیتا۔ حلانکہ اُسے اپنے خاوند کی ناشُکر گذراری کا کبھی احساس

تک نہ تھا۔ جس کی دولت تھی اُسی کے کام آئی۔ پھر شُکر یہ کیا؟ اس بار بھی اُس نے چار سے زیادہ روپے جمع کئے تھے اور اب ہر لمحے اُسے زندگی کی لو کو حاصل کرنے کا یقین تیز تر ہوتا جاتا تھا۔ مگر زندگی نے پر پلٹا کھایا اور خاوند بیمار پڑا۔ بیماری کے شروع شروع میں وہ بیوی کا پس انداز دیکھ کر اپنا آپ دَبا دَبا سا محسوس کرتا۔ لیکن جوں ہی سُود خوار کی باری آئی، احساس ختم ہوگیا۔ اور وہ طعنوں پر اُتر آیا۔ کاش میرا بھی بچّہ ہوتا جو شام کو آٹھ آنے کے پیسے کما لاتا لیکن تم جیسی بانجھ عورتوں کے بچہ کہاں! خاوند کے اس زہریلے غصّے سے اُس کا لاشعور جھنجھنا اُٹھتا۔ جیسے کانچ کے ہزاروں برتن یک لخت گر گئے ہوں اور، گرانے والا اپنی احتیاط پر حیران و پریشان ہو رہا ہو!

وہ یہ سوچ رہی تھی کی پار سے ایک شِکارا اُسے اپنی طرف آتا ہوا دِکھائی دیا۔ جس میں مّلاح کے علاوہ دو آدمی تھے۔ ایک خوش پوش اور دوسرا عام نوکروں کی طرح اُجلا اُجلا لباس پہنے ہوئے۔ خوش پوش شاید مالک تھا۔ اُس کے ہاتھ میں ایک کمیرہ تھا اور نوکر کے ہاتھ میں ایک ڈِبہ...... وہ انہیں دیکھ کے بالکل حیران نہ ہوئی۔ ہر اتوار کو اس قسم کے خوش پوش انسان کئی شِکاروں میں اُدھر سے گذرتے تھے اور گھاٹ پر کھیلتی ہوئی لڑکیوں کی تصاویر لیتے تھے یا پری محل کے اُداس اور اُجڑے مناظر کی۔ اور وہ انہیں تصویر لیتے وقت دِل ہی دِل میں ہنستی۔ ان لڑکیوں میں کیا ہے؟ ننگی اور بھوکی لڑکیاں جن کی ساری تفریح گدلے پانی سے کھیلنا ہے۔ یہ تصویریں بھی ایسی ہی آئی ہونگی۔ میلی کچیلی، بدصورت اور ننگی۔ لیکن شاید وہ نہیں جانتی تھی کہ جنت ارضی کی میلی مخلوق کی تصویریں جہنم کے بے فکر باسی بے حد پسند کرتے ہیں!

شِکارا نزدیک آ رہا تھا اور وہ اُن کی باتیں سُن سکتی تھی۔ ''تصویر لینے دیگی۔'' نوکر پہلے خاموش رہا۔ جیسے اپنے آپ سے فیصلہ کر رہا ہو۔ پھر بولا۔ ''کیوں نہیں حضور'' وہ یہ سُن کر چونک اُٹھی۔ کیا وہ اُس کی تصویر لیں گے؟ کیا اُنہوں نے بھی

اُسے ایک میلی کچیلی اور آوارہ سی لڑکی سمجھ رکھا ہے جو شکارے میں بیٹھے ہوئے ہر صاحب لوگ کو زور زور سے چلّا کر ''سلام صاحب'' کہتی ہے۔ وہ جھک کر اپنے دونوں ہاتھوں سے گھڑے میں پانی بھرنے لگی اور نوکر نے شکارا نزدیک پہنچ کر کہا ''ہتہ بی''!

اُس نے گردن اُٹھا کر لا اُبالیانہ انداز میں شِکارے کی طرف دیکھا اور پھر جلد جلد نظریں جُھکا لیں۔

نوکر نے مُسکرا کر کہا۔ ''صاحب تمہاری تصویر لینا چاہتے ہیں۔''

اُس نے خاموشی میں گھڑا اُٹھایا اور گھر کی طرف چل دی۔

مالک نے نوکر سے کہا۔ ''تم نرے گدھے ہو۔ اپنی ذات کی ایک معمولی عورت تک کو نہ پھانس سکے جس کی تصویر سے ہم ہزاروں کما سکتے۔''

''ہزاروں؟'' نوکر حیران ہو کر دل ہی دِل میں سوچتا رہا اور پھٹی پھٹی نظروں سے اُسے جاتے دیکھنے لگا۔ واقعی وہ خوبصورت تھی اور ایسی عورتیں اُس نے میر بحری کے سارے علاقے میں نہ دیکھی تھیں۔

مالک نے کہا۔ دیکھتے کیا ہو؟ جاؤ پیسہ دِکھاؤ۔

نوکر چلانگ لگا کر کنارے پر آ گیا اور اُس کے نزدیک پہنچ کر بولا۔ ہتہ بی صاحب تمہیں پانچ روپے دیگا۔

پانچ روپے کا نام سُن کر وہ ٹھٹھک گئی۔ اُسے ایسا محسوس ہوا جیسے اُس کی ٹانگوں میں سیسہ بھر دیا گیا ہو...... پانچ روپے...... پانچ روپے...... بچھواڑے کی نرس بھی پانچ ہی مانگتی ہے...... اُس نے ہرنی کی طرح معصوم نظروں سے اُسے دیکھا۔ جیسے وہ فیصلہ نہ کرسکتی ہو کہ اُسے پلٹ جانا چاہیئے یا نہیں۔ اور نوکر نے اُسے اُکساتے ہوئے کہا۔

"بہ خدا ڈرو نہیں۔ صرف ایک منٹ لگے گا۔ اور پھر پانچ روپے۔"

اُس نے پھر بھی کوئی جواب نہ دیا۔ اُسے محسوس ہوا جیسے ایک بچے اور اُس کے درمیان ہزاروں پردے حائل ہیں جو ایک ایک کے کے ہٹتے جارہے ہیں اور بچہ بازو پھیلائے اُس کی طرف آرہا ہے۔

نوکر نے پھر کہا۔ "میں بھی تمہارا ہی مسلمان بھائی ہوں۔ اگر مالک کی جیب سے پانچ روپے تمہارے لئے نکلیں تو کیا ہوا۔ کم از کم آٹھ ترک شالی تو خرید سکوگی۔"

لیکن اسے شالی کی ضرورت نہ تھی۔ اُسے بچھواڑے کی نرس کے لئے پانچ روپے چاہیں......

وہ آہستہ آہستہ گھاٹ کی طرف آگئی۔ کندھے سے گھڑا اتار کر ایک طرف رکھ دیا۔ اور خاموش کھڑی رہی۔

"آیئے صاحب!" نوکر نے مالک سے کہا۔

مالک دِل ہی دِل میں خوش ہوا۔ لیکن اس کا اظہار کرنا اُس نے ضروری نہ سمجھا تاکہ عورت اور نوکر کو یہ احساس نہ ہو کہ اُن دونوں نے اُس کے لئے کوئی بڑی قربانی دی ہے۔ اُس نے کیمرہ ٹھیک کیا۔ نوکر نے اُسے (Pose) سمجھا دیا۔ دونوں ہاتھ آگے کو۔ بدن ڈھیلا ڈھیلا۔ ہونٹوں پر ہلکی سی مُسکراہٹ اور آنکھوں میں مصنوعی خمار۔ وہ پار بلیوارڈ کی طرف دیکھنے لگی۔ سڑک پر گہما گہمی شروع ہوگئی تھی اور دور کبوتر خان سے رنگ برنگی پردے لہراتی ہوئی ٹیکسیاں گھاٹوں کی طرف آرہی تھیں۔

ایک......دو......تین......اور تصویر لی گئی!

آتی بار جو دُھول اُسے ہر چیز پر چھائی ہوئی سی نظر آگئی تھی، واپسی پر وہ کہیں نہ تھی۔ پری محل کے اُوپر مُسکراتے ہوئے سُورج کی کرنیں ہر چیز پر لوٹ کر قہقہے لگا رہی تھیں۔ بنگلے، ہوٹل، ڈل، گاؤں سب ان قہقہوں سے دوہرے ہورہے تھے۔ اس کے

پپوٹوں میں بھی اب نمی نہ تھی۔ اس کے برعکس اُسے اپنے آپ میں ایک لطیف قہقہے کی لذّت محسوس ہو رہی تھی جو گدگداہٹ سے ابھرتا ہے اور روکنے کے باوجود ابھرتا ہی رہتا ہے۔ اچھا ہوا، آج تک اُسے بچہ نہیں ہوا ورنہ سیاہ پھیرن کے تلے کچے انار کی طرح یہ سخت چھاتیاں کہاں ہوتیں۔ گورے چہرے کا تناؤ اور بازوؤں کا تناؤ کہاں ہوتا؟ وہ اُس ناشپاتی کی طرح دِکھائی دیتی جس کا رس نچوڑا گیا ہو۔ گوشت اور پوست کے نیچے صرف ہڈیوں کا پنجر رہ جاتا۔ اور زندگی کسی مُفلس کی شرمیلی مُسکراہٹ کی طرح نظر آتی۔

گھر پہنچ کر اُس نے خاوند سے کچھ بھی نہ کہا۔ ممکن ہے وہ اس حرکت کو ناپسند کرے۔ لیکن خاوند چُپ نہ رہ سکا۔ بولا...... ''دیر کیوں ہوگئی؟''

یوں ہی!'' اُس نے بے پروائی سے جواب دیا اور کندھے سے گھڑا اُتار کر رکھ دیا۔ اُس کے خاوند کو اس جواب سے تسلّی نہ ہوئی۔ یوں ہی دیر کیسے ہوتی ہے! وہ سوچنے لگا۔ بڑی دیر تک وہ اسی تذبذب میں بھٹکا رہا۔ پھر بولا...... یونہی کیسے؟'' بیوی نے دوبارہ بے پروائی سے جواب دیا۔ ''کچھ بھی نہیں ایک صاحب تصویر لے رہے تھے۔''

''کس کی؟''

بیوی شاید اس سوال کی متوقع نہ تھی۔ وہ اندر ہی اندر لرزنے لگی اور اُس کا خاوند بڑی بے تابی سے جواب کا مُنتظر رہا۔ بالآخر اُس نے مِٹی کی خالی ہانڈی کو بالکل غیر ارادی طور پر ایک جگہ سے اُٹھا کر دوسری جگہ رکھتے ہوئے...... ''ایک عورت کی!''

اُس کا خاوند چونک اُٹھا۔ جیسے جھونپڑی کی چھت اُس کے سر پر آ گری ہو۔ ''عورت کی؟ کون تھی وہ؟''

مجھے کیا معلوم......؟ اُس نے اس انداز میں جواب دیا جیسے اُسے خُود اُس

عورت سے نفرت ہو۔

"اور تُو تماشہ دیکھتی رہی۔۔۔۔" اس بار اُس کے الفاظ میں طنز تھی۔

وہ اس سوال پر حیران رہ گئی۔ اس نے اندر رہی اندر پیرہن کی جیب میں پڑے ہوئے نوٹ کو چھوا اور ہلکا سا اطمینان محسوس کیا۔

خاوند نے اپنی طنز ناکافی محسوس کرتے ہوئے کہا...... "آج کل کی عورتوں کا کیا ہے، جسم بھی کوئی کہے وہ بھی پیش کریں گی۔"

اُس کی آنکھیں پھیلنے لگیں۔ اُسے اپنے پاؤں تلے کی زمین سرکتی ہوئی سی دکھائی دی۔ وہ اضطراب میں بار بار مٹی کی ہانڈی کو ایک جگہ سے اُٹھا کر دوسری جگہ رکھتی گئی۔ جیسے سارے کمرے میں اُس ہانڈی کو رکھنے کے لئے کہیں موزوں جگہ نہ مِلتی تھی، جہاں وہ سہارے کے بغیر رہ سکے۔ اُس نے اس دَوران میں ایک بار بھی بستر پر پڑے خاوند کی طرف نہ دیکھا۔ اُسے محسوس ہونے لگا جیسے اُس کی پیشانی پر گھاٹ کی ساری کہانی لکھی جا چکی ہے اور وہ اُسے ایک ہی نظر سے پڑھ ڈالے گا۔

سُودخوار پنڈت نے کل ہی سات روپے دیئے تھے۔

اُس نے فیصلہ کیا کہ یہ پانچ روپے اُسی کو دوں گی۔ بوجھ تو ہلکا ہو گا لیکن فوراً اُسے خاوند کا خیال آیا۔ شائد پوچھ بیٹھے یہ پانچ روپے کہاں سے آئے، جب وہ خالی تھیلی آج سے دس دِن پہلے دیکھ چکا تھا۔

وہ سوچتی رہی۔ بالآخر خاوند کو کھانا کھلا کر وہ فیصلہ کئے بغیر ہی نرس کے پاس چلی گئی۔ اور جب واپس آ گئی تو وہ بے خد خوش تھی۔ خاوند کے طعنوں کے تمام نقوش لاشعور سے مِٹ گئے تھے۔ نرس نے اُسے دوا دی تھی اور بچّے کا یقین دِلایا تھا۔ اُس رات اُس کا بیمار خاوند اُس کی عجیب وغریب حرکتوں پر حیران رہا...... "یہ کیا بچپنا ہے؟" اُس نے کئی بار پوچھا اور وہ ہر بار مُسکراتی رہی۔

اور دوسرے دِن صبح اُسے سچ مُچ اپنے پیٹ میں ایک زِندہ بچّے کا احساس ہوا...... زِندہ بچّہ جو اُس کی زندگی کی لَو کو بجھنے نہیں دے گا۔ جو ازل اور ابد کو مِلائے گا۔ دوشیزگی سے کل رات تک جو تشنگی سی اُسے ہر وقت محسوس ہوتی تھی وہ آج بُجھ گئی تھی۔ وہ اُداسی اور تفکّر، جو ہر صُبح پڑوس کے بچّوں کو روتے اور ہنستے دیکھ کے اُس کے اندر ہی اندر ذہن کا احاطہ کئے رہتی تھی، اب مِٹ چکی تھی۔ ایک موہوم سی اُمید نے اُسکی زندگی کے تاروں کو مِلا کر اُن سے ہم آہنگ آواز پیدا کر دی تھی۔ اگر چہ وہ آواز ابھی اس قدر مدھم تھی کہ اُس کا بیمار شوہر نہ سُن سکتا تھا۔ مگر وہ سُن سکتی تھی۔ تاروں کا ارتعاش اور ارتعاش کی جھنجھناہٹ محسوس کرتی تھی۔ یہی ارتعاش اُس کی آرزُو تھی جسے محسوس کرنے کے لئے وہ آٹھ سال سے بے تاب تھی۔ اب اسے سنبھالنے کے لئے بلند حوصلگی کی ضرورت تھی، ضبط کی ضرورت تھی۔ کاش اُس نے کچھ عرصہ پیشتر یہ اقدام کیا ہوتا! لیکن کیمرے لئے ہوئے سیاح صرف ننگی اور بھوکی لڑکیوں کی تصویریں لیتے تھے۔ اور وہ بھی بلا کسی معاوضے کے نہ لڑکیاں اس کے لئے احتجاج کرتی ہیں نہ تصویر کھینچنے والے اس کی ضرورت محسوس کرتے ہیں اور پری محل کے اُجاڑ کھنڈر بیلوارڈ سے پرے سب کچھ دیکھتے ہیں اور چھپ رہتے ہیں کل بھی ان کھنڈروں نے اُسے فوٹو گرافر کے سامنے کھڑا دیکھا اور وہ نوٹ بھی دیکھا جو اُس کے نوکر نے تصویر کھنچ جانے کے بعد مُسکراتے ہوئے اُس کے ہاتھ میں تھما دیا تھا۔ اور آج صُبح وہ اُسے پھر دیکھ رہے ہیں جب وہ ایک نامحسوس بشاشت سے پھٹی پڑی ہوئی ہے۔ اور سب کو راز کی بات کہنا چاہتی ہے، مگر کہہ نہیں سکتی۔

کچھ دِنوں بعد اُس کا خاوند ٹھیک ہو گیا۔ اور پھر وہی طعنے شروع ہو گئے...... اس سے پہلے یہ طعنے سُن کر اُس کا دِل ملول ہو جاتا تھا اور اکثر آنکھوں میں آنسو پُھوٹتے تھے۔ لیکن اب یہی طعنے اُسے میٹھے سے لگنے لگے۔ اور وہ اُنہیں سُن کر ہر بار

مُسکرادیتی۔ جیسے کہتی ہو...... ان کی عمر زیادہ نہیں۔ یہ بوڑھے ہو گئے ہیں اور جلد ہی مرجائیں گے۔ چند ہی مہینوں کی بات تو ہے جب یہی طعنے لوریوں میں تبدیل ہوں گے۔ وہ آج ہی سے ان کا انداز بھی لگا سکتی تھی۔ خاوند سر جُھکائے ہوئے ہے۔ اُس کے چہرے پر شرمندگیاں ہیں اور اُس کے ذہن کو ان کی تلافی کے لئے موزوں الفاظ نہیں ملتے۔ وہ عالی ظرف عورت کی طرح اب بھی مُسکرا رہی ہے۔ چُبھتے ہوئے گذشتہ طعنوں کو بُھلا رہی ہے بلکہ بھول چُکی ہے۔ لیکن اُس کا خاوند ندامت میں غرق ہے اور بچّہ...... ہنڈولے میں ایڑیاں رگڑ رگڑ کر باہر نکلنے کی کوشش کر رہا ہے۔ شاید کہہ رہا ہے۔ میں بھی ڈل کے نیلے پانی میں کھیلوں گا۔ میلی کُچیلی اور بدصورت آوارہ لڑکیوں کے ساتھ سارا سارا دن گھاٹ گھاٹ پر بیٹھا کروں گا اور سیاح میری تصویریں لیا کریں گے۔ مگر وہ اُسے گھاٹ پر نہیں جانے دیگی۔ چہ جائیکہ پری محل کے اُجاڑ کھنڈر سب کچھ جانتے ہیں اور ہمیشہ سب کچھ جانتے رہیں گے۔

چار مہینے گذر چکے تھے۔

ایک شام اُس کا خاند مزدوری سے واپس آیا اور اُسے بُلا کر پُوچھا...... "تم اُس عورت کو جانتی ہو جس کی تصویر کسی صاحب نے لی تھی؟"

وہ اندر ہی اندر سے کانپنے لگی۔ سر سے اشارہ کر کے بولی۔ نہیں!

خاوند نے مُسکرا کر دوبارہ پُوچھا...... "جانتی ہوگی"

"کِس عورت کو؟" اُس نے گھبرائی ہوئی آواز میں جواب دیا۔ "ہر روز ہی تو صاحب تصویریں لیتے ہیں۔"

خاوند نے اُسی انداز میں کہا "تمہیں نہیں یاد۔ آج کوئی چار مہینے گذرے جب تم ہی نے کہا تھا کہ کسی صاحب نے عورت کی تصویر لی۔"

اب کی بار اُس کے چہرے کا رنگ فق ہو گیا۔ پری محل کی مہیب پہاڑیوں کی

غیر جذباتی چوٹیاں اُسے زمین پر گرتی ہوئی نظر آئیں اور ڈوبتے ہوئے سورج کی سُنہری کرنیں کیچڑ میں لت پت دِکھائی دیں۔ کیا پری محل کے کھنڈروں نے اُس کا راز افشا کر دیا تھا؟

وہ خاموش مگر حیران نظروں سے اُسے دیکھنے لگی جس کے چہرے کی مصنوعی مُسکراہٹ آہستہ آہستہ غصّے میں بدل رہی تھی۔ ''تو تم نہیں جانتی اُسے؟'' اُس نے ایسے انداز میں کہا جیسے وہ سب کچھ جانتا ہو۔ اور اب اُس کے مُنہ سے ہاں سننے کا مُنتظر ہے۔ اُس نے بھی اپنے دِل میں اب کچھ کہہ ڈالنے کا قصد کیا۔ لیکن الفاظ کی قطار آتے آتے اس کے ہونٹوں پر بکھر گئی۔ صرف ایک ارتعاش پھیل گیا جسے اس کا خاوند نہ سمجھ سکا۔

یکا یک اُس کے خاوند نے اندر کی جیب سے تصویر نکالی اور اُسے دِکھاتے ہوئے بولا...... ''یہی ہے نا وہ...... جسے تم شاید اب بھی نہیں جانتی......؟''

تصویر کو دیکھتے ہی اُس کے مُنہ سے ہلکی سی چیخ نکلی۔ وہ آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر فرش پر پڑی ہوئی تصویر کو دیکھنے لگی۔ سیاہ پرہن میں لپٹا ہوا گورا گورا بدن، چہرے پر شہد آمیز مُسکراہٹ جیسے بادام کے پھول دونوں ہاتھ آگے کو جیسے کنول کے دو پھول جڑے ہوئے۔

وہ ایک نظر سے تصویر دیکھتی رہی اور دوسری نظر سے خاوند کے چہرے کا اُتار چڑھاؤ۔ اُسے فوراً ہی محسوس ہوا جیسے تصویر میں پیرہن کے باوجود بھی وہ سر سے پاؤں تک ننگی ہے۔ اُس کی کچی انار جیسی چھاتیاں ننگی ہیں۔ پُر گداز بازو ننگے ہیں اور اُس کے سارے بدن پر بیلواڑ کی دُھول اُڑ رہی ہے۔

خاوند نے زہریلے ہوئے لفظوں میں کہا...... دیکھتی ہو۔ اب تو اُسے پہچانتی ہوگی سُنا ہے بازار میں خُوب بِک رہی ہے۔ لوگ اُسے ولایت تک لے رہے ہیں۔

کتابوں میں چھاپ رہے ہیں۔ اخباروں میں نِکال رہے ہیں اور کشمیر کی عورتیں اسے دیکھ کر پانی پانی ہورہی ہیں۔ ''تم نے تصویر کیا کھنچوائی اپنی ماؤں اور بہنوں کی عزّت بیچ ڈالی۔''

اُس کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ وہ آنسو جو طعنے سُن سُن کر بھی اتنے تلخ نہ ہوتے تھے۔ آج کے آنسوؤں میں دُھوئیں کی سی کڑواہٹ تھی۔ تیزاب کی سی جلن اور زہر کی سی تلخی خاوند اُس کے آنسو دیکھ کر بھڑک اُٹھا۔ بولا...... ''اب روتی کیا ہو۔ جو ہونا تھا ہو چکا۔ اُس صاحب نے تمہاری تصویر ہی نہ لی بلکہ تمہاری عصمت پر بھی تُھوکا۔ تمہارے خاندان پر تُھوکا۔ تمہارے نسائیت اور تمہاری زندگی پر تُھوکا اور یہ تُھوک ایسی ہے جو زندگی بھر تمہارے بدن سے الگ نہ ہوگی۔ اب جو چاہو کرو۔ کیا تعجّب ہے جو کچھ تمہارے پیٹ میں ہے وہ بھی کسی صاحب کا......''

اُس کا چہرہ تمتما اُٹھا۔ آنکھوں کی پلکیں تیز تیز جھپکنے لگیں اور کچے انار جیسی چھاتیاں پھڑکنے لگیں۔ اُس کے دماغ میں ایسی حالت پیدا ہوگئی جیسے بارود کا بہت بڑا ڈھیر یک لخت چنگاری لگنے سے پھٹ گیا ہو۔ وہ بے ہوش ہو کر دھڑام سے گر پڑی۔

جب اُسے ہوش آیا۔ رات آدھی اُدھر تھی آدھی اِدھر۔ کمرے میں تاریکی اور خاموشی باہوں میں باہیں ڈالے اُونگھ رہی تھیں۔ وہ سوچنے لگی۔ ''آخر میں نے کیا کیا؟ کیا مرد اپنی تصویریں نہیں کھنچواتے؟''

اُس نے اپنا ہاتھ آہستہ سے اُبھرے ہوئے پیٹ پر پھیرا۔ اُسے شدّت سے محسوس ہوا جیسے اُس کے پیٹ میں وہ بچّہ نہیں جو اُس کی زندگی کی لَو کو جالائے رکھے گا بلکہ دُھول ہے جو ہمیشہ ہمیشہ کے لئے اُس کے مستقبل پر چھائی رہے گی۔

............☆☆☆............

کاریگر

شورُوم کی وُسعت میں سجائی ہوئی چیزوں سے وہ بظاہر اپنے مذاق کے مطابق ایک چیز کا بھی انتخاب نہ کر سکا۔ اُسے تپائی، ٹیبل لمیپ اور سگریٹ کیس سے زیادہ ایک سنِگار بکس کی ضرورت تھی۔ لیکن ڈائزاین...... وہ خود بھی نہ جانتا تھا کی کون ساپسند کرے ۔ بار بار اپنی بیوی کا معطّر خط نکال کر پڑھتا تھا جس میں لکھا تھا......''چیزیں بے حد خوبصورت اور جاذب نظر ہوں، بالخصوص میرا سِنگار بکس......''

''بے حد خوبصوت اور جاذب نظر'' کے صحیح معنی تلاش کرنے کے لئے اُس نے بار بار اپنے دِماغ کے پوشیدہ کونے چھان ڈالے۔ لیکن وہ سمجھ ہی نہ سکا کہ پانسو میل دُور سے فرمائش بھیجنے والی بیوی نے ان لفظوں کو کس پیرایے میں لیا تھا۔ اگر اُس نے خوبصورتی کو اپنی مخروطی انگلیوں ،سفید پوست اور مخمور آنکھوں کے پیمانے میں تول کر سنگار بکس کی فرمائش کی ہے تو شورُوم ایسی چیزوں سے بھرا پڑا تھا۔ صاف اور سُتھرے سنگار بکس پالش سے جگمگا رہے تھے اور مالک دُکان کی حریص نگاہیں اور چرب زبانی اُسے بہت کچھ خریدنے کی ترغیب دے رہی تھیں۔ لیکن وہ خود نفسیات کا مُعلّم تھا۔ اُسے اپنے معیار اور اپنے پیمانے میں اُس جگہ ہر چیز کو تولنے کا حق تھا۔ جہاں اُس کی مخروطی اُنگیوں والی بیوی نہ تھی۔ اسی لئے مالک دُکان کی حریص نگاہوں کی ہنسی اُسے پھانسنے میں ناکام رہی ۔ کیونکہ اُس کے نزدیک حُسن صرف رومانی تصور کا

دُھندلا سا نقش تھا جس میں وہ اپنی زندگی اپنے محسوسات اور اپنے مذاق کا جِھلمِلا تا ہوا عکس دیکھ سکتا تھا۔ یہاں نہ اُنگلیوں کی وضع قطع، نہ پوست کی بے نُور رنگت اور نہ آنکھوں کی بے کیفی کو دخل تھا۔ سِنگار بکس کا تحفہ اُسے اپنی بیوی کو پیش کرنا تھا۔ جس کے حُسن میں وہ دراصل اپنے رومانی تصوّر کی عکاسی دیکھنے کا خواہش مند ہے۔

''مجھے کوئی ڈیزائن پسند نہیں ......!'' اُس نے پیشانی سے پسینہ پونچھتے ہوئے کہا۔

''ہی......ہی......ہی!'' دُکان کا مالک غیر اِرادی طور پر ہنسا شورُوم کی ساری وُسعت وحشِیانہ قہقہے سے لرز اُٹھی۔ پھر وہ اُس کے قریب آکر اُسے سر سے پاؤں تک دیکھنے لگا۔ ایک دراز قد جنٹلمین جس کے چہرے کی بدصورتی کو چیچک کے ناتراشیدہ داغوں نے دوبالا کر دیا تھا۔ جس کی گھنی موچھیں ہونٹوں کے پاس سگریٹ کے کثرتِ استعمال سے زرد ہونے لگی تھیں۔ جس کی آنکھیں ضرورت سے زیادہ چمکیلی لیکن عزمِ مستحکم لئے ہوئے تھیں۔

مالک دُکان نے شورُوم کا سرسری نگاہوں سے جائزہ لے کر طنزیہ لہجے میں کہا۔ ''عجیب بات ہے صاحب! ہم نے اپنی طرف سے مشرقی اور مغربی دونوں مذاقوں کے مطابق چیزیں تیار اور فراہم کر رکھی ہیں۔ لیکن پھر بھی آپ یہ دیکھئے یہ ٹیبل لمیپ! کنول کے پتوں میں پوشیدہ یہ ڈنٹھل یہ ڈنٹھلوں سے لپٹی ہوئی مچھلیاں۔ یہ پھُول......ہی......ہی یہ مغربی آرٹ کی طرز پر بنایا گیا ہے انگریز لوگ اس ڈایزائن کو بہت پسند کرتے ہیں۔ اس کے برعکس یہ لمیپ دیکھئے۔ مہاتما بُدھ اسے تھامے ہوئے ہیں۔ یہ مغربی آرٹ کی طرح پوشیدہ نہیں۔ عیّاں ہے عیّاں۔ اور حضور جب یہ روشن ہوتا ہے تو بُدھ کا مجسمہ منوّر ہو اُٹھتا ہے آپ شاید اسے پسند کریں گے' بڑی اچھی چیز ہے!''

نفسیات کے معلّم نے مشرقی آرٹ کی طرز پر بنا ہوا لمیپ ہاتھ میں لیا۔ سچ مُچ اس میں مغربی آرٹ کی طرح کوئی چیز پوشیدہ نہ تھی۔ مہاتما بُدھ کے پتلے پتلے لکڑی کے ہاتھوں میں وہ ڈنڈی تھی جس کے اُوپر ہولڈر لگا ہوا تھا۔ اس میں نہ ڈنٹھل تھے نہ ڈنٹھلوں سے لپٹی ہوئی زیرِ آب مچھلیاں۔ ہر چیز واضح، عیاں اور مکمّل تھی۔

اُس نے سوچا۔ ''یہ کشمیری صنّاع بھی کس قیامت کے ذہین ہوتے ہیں۔ مغرب اور مشرق کی تہذیبوں کا تضّاد...... پوشیدہ اور عیاں کس خوبصورت انداز میں لکڑی کے پالش شدہ ٹکڑوں پر پیش کیا ہے۔ اس میں کتنی گہرائی، کتنی صدیوں کی عظمتِ پارینہ کی جگر خراش حسرت۔ کتنے معانی اور کتنی رنگین خیالی ہے۔ مغرب کی تہذیب پوشیدہ! ڈنٹھلوں سے لپٹی ہوئی مچھلیوں کی طرح محتاج اور غیر مکمّل! اور مشرق کی تہذیب، مذہب کے دِل فریب سایوں میں پروردہ، واضح اور مکمّل!''

یہ کس نے بنایا ہے۔ میر مطلب ہے کس کاریگر نے؟ اُس نے سنجیدہ لہجے میں مالک دُکان سے پوچھا۔

مالک دُکان کی پلکیں جن کے نیچے حرص و ہوا کی روپہلی لکیر سی بہہ رہی تھی۔ جلد جلد جھپکنے لگیں۔ اُسے یقین ہوگیا کی خریدار مشرقی آرٹ کا ٹیبل لمیپ خریدنے پر آمادہ ہوگیا ہے۔ بولا...... ''ہمارے کارخانے کے ایک معمّر کاریگر نے...... آپ دیکھیں گے اِسے؟ حضور بڑا نیک نیّت آدمی ہے اور پچیس سال کا تجربہ کار۔ چیز کہہ دو بس ٹھیک بنا دیتا۔ بیس اُنیس تک فرق نہیں ہوتا۔''

نچلی منزل کے ایک مختصر سے کمرے میں جہاں ایک چٹائی بچھی ہوئی تھی، ایک معمّر انسان میلی سی شلوار میں ملبوس کسی چیز پر سنگِ خارا سے پالش کر رہا تھا۔ تانبے کی طرح سیاہی مائل سُرخ جسم کی ہڈیاں گِنی جاسکتی تھیں۔ پسینے سے شرابور ہو چکا تھا۔ پیٹ پر قدرت نے آگ کے قلم اسے نقش و نگار بنائے تھے۔

مالک دُکان نے پُر مسّرت لہجے میں کہا۔ مام دِینا اور پھر نفسیات کے معلّم سے کہا۔ "یہ ہے صاحب ہمارے کا خانے کا تجربہ کار کاریگر جس کے ہاتھ کی بنی ہوئی چیزیں نیویارک، لندن، وی آنا اور استنبول تک پہنچ گئی ہیں۔"

نفسیات کا معلّم اور حسین سنگار بکس کا خریدار ٹھٹھک گیا۔ اُسے محسوس ہوا جیسے بدمذاق اور غیر آراستی کمرے میں بیٹھے ہوئے نیم عُریاں انسان نے اُس کے غرور کو جُھٹلا دیا۔ جو شاید مغرب اور مشرق کی تعریف تک سے نامحروم تھا جسے شاید اِتنا بھی معلوم نہ تھا کہ ان پچیس سالوں میں دُنیا کہاں سے کہاں پہنچ گئی۔ لیکن جو اِسی کمرے میں آج سے کئی برس پیشتر لکڑی کے چھوٹے چھوٹے ٹکڑوں پر اپنے آہنی قلم سے تہذیب انسان کی بدلتی ہوئی لافانی تصویریں بنا رہا تھا...... مام دِین نے قلم ہاتھ سے رکھا اور چہرے پر اطمینان کی مُسکراہٹ پھیلا کر بولا...... "سلام حضور!"

نفسیات کا معلّم "سلام حضور" سُن کر چونک پڑا۔ اُس نے مصنوعی طور پر ہنس کر کہا۔ "سلام ہے!"

وہ اپنی پتلون کو اُوپر کھینچ کر کاریگر کے پاس بیٹھنے لگا۔ شاید دیکھنے کے لئے کہ وہ کس چیز پر پالش کر رہا ہے۔

مالکِ دُکان نے جھٹ اُس کا ہاتھ روک کر کہا۔ "ہائے ہائے! کہاں بیٹھا چاہتے ہیں حضور! یہ جگہ...... یہ...... ناصاف ہے! مام دین بھی خریدار کی اس بدتہذیبی پر گھبرا اُٹھا۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ قیمتی لباس میں ملبوس جنٹلمین کے برابر بیٹھ جائے۔ وہ کھونٹی سے کپڑے کی چادر اُتارنے کے لئے دوڑا تاکہ سے چٹائی پر بچھا کر ناصاف جگہ کو خریدار کے بیٹھنے کے قابل بنا سکے اور نفسیات کے معلّم کو بھی نہ جانے کیا یاد آیا۔ اُس نے پتلون کو پھر ڈھیلا چھوڑ دیا۔ ناصاف جگہ...... نفسیات کا معلّم! کارڈ مخمل کا پتلون ...... عزّت، شہرت!"

مالکِ دکان اُس کا بدلتا ہوا ارادہ تاڑ گیا۔ ہنس کر بولا۔ ''حضور آپ کس جگہ بیٹھنے لگے تھے۔ اگر آپ یہ چیز دیکھنا چاہتے تھے تو ہم اسے دفتر میں منگا سکتے ہیں۔ حقیقت میں یہ ہماری بے عزّتی ہے کہ ایسی مشہور دُکان پر آیا ہوا خریدار ایک معمولی کاریگر کے پاس بیٹھے اور اس چٹائی پر...... ہاہاہا......''

نفسیات کا معلّم دِل ہی دِل میں سوچ رہا تھا۔ مام دین کا وجود بھی ایک حُسن ہے۔ دماغی حُسن جو جسمانی حُسن سے بالکل مختلف ہے اور بے پروا......اور مشرقی آرٹ کی طرح واضح، عیّاں اور اپنے سے مطمئن......!

اُس نے مالک دُکان کی باتیں توجّہ سے سُنی تھیں۔ تاہم اُس نے کہا۔ ٹھیک ہے۔ ٹھیک ہے

مالک دُکان نے وہ لکڑی کا ٹکڑا دِکھایا جسے مام دین رگڑ رگڑ کر چمکا رہا تھا۔ ''یہ ایک انگریز کی فرمائش ہے حضو! ایک سگریٹ کیس آج پندرہ دِن کے بعد تیار ہو گیا ہے۔ یہ دیکھئے باریک کام۔ یہ بیل بُوٹے کس محنت اور جانفشانی سے اُبھارے گئے ہیں اور پھر ان ہی بیل بوٹوں میں یہ چھوٹا سا مونا گرام (W.D) وِلیم ڈیوس!''

وہ اُسے غور سے دیکھتا رہا اور مام دین کی سُوکھی سُوکھی ٹانگیں میلی شلوار میں کانپنے لگیں...... کانپنے لگیں، کہیں یہ جنٹلمین نقش ونگار میں کوئی نقص نہ نکالے۔

وہ کبھی کبھی مام دین کی طرف بھی اپنی ضرورت سے زیادہ چمکیلی آنکھوں سے دیکھتا گیا۔ اُسے اُس کے سُوکھے بدن میں صرف حُسن ہی حُسن، نزاکت ہی نزاکت، رنگینی ہی رنگینی نظر آئی۔ تجربہ کار کاریگر۔ جس کے دماغ کا حُسن اب بھی وی آنا اور استنبول کی عالی شان عمارتوں کی زینت بنا ہوا تھا۔ لیکن جو خود میلی سی شلوار میں ایک بدمذاق کمرے کی چٹائی پر زندگی کے دن پورے کر رہا تھا۔

تھوڑی دیر کے بعد اُس نے مالک دُکان سے پوچھا۔ ''اس سگریٹ کیس کی

کیا قیمت ہوگی......"

مالک دُکان نے مام دین کی موجودگی میں ہی مُسکرا کر کہا۔ "واجبی دام ہیں حضور! آپ سے رعایت ہی ہوگی۔ دراصل انگریز لوگ قیمتوں کی اُلجھنوں میں زیادہ نہیں پڑتے۔"

اُس نے سگریٹ کا ایک لمبا کش کھینچتے ہوئے پوچھا۔ "پھر بھی ہم سے کیا لیں گے؟"

مالک دُکان نے فخریہ لہجے میں کہا۔ "انگریز سے ساٹھ روپے۔ اگر آپ پسند کریں تو صرف پنتالیس روپے!"

معلّم کے دماغ میں دوبارہ مغرب اور مشرق کی تہذیبوں کا تضاد گھومنے لگا۔ انگریز اسے ساٹھ اور ہندوستانی سے پنتالیس پوشیدہ اور عیاں محتاج اور واضح!

وہ زور سے ہنسا بہت زور سے حتا کہ لرزتا ہوا مام دین بھی دبی دبی مُسکراہٹ کو قابو میں نہ رکھ سکا۔ "انگریز سے ساٹھ اور مجھ سے پنتالیس...... ہاہا...... ہا......"

پھر اُس نے مام دین سے کہا۔ اُستاد ہمیں ایک سنگار بکس کی ضرورت ہے۔ جس پر کوئی خوبصورت سی چیز ہو۔ میرا مطلب ہے ہمارے مذاق کے مطابق۔ بیل بُوٹے نہیں، ڈنٹھلوں سے لپٹی ہوئی مچھلیاں نہیں۔ بس کوئی جانور، کوئی پرندہ، اُڑتا ہوا، بھاگتا ہوا آزاد اور مسرور ہر، خوبصورت اور جاذب نظر! سمجھ گئے......؟

مام دین کے مالک دُکان کی طرف دیکھا۔ پھر ہاتھ جوڑ کر کہا۔ اچھی بات ہے حضور۔ بنا دوں گا۔ انشاء اللہ آپ پسند کریں گے!

اُس نے پھر کاریگر کو سمجھانے کی کوشش کرتے ہوئے کہا۔ "مثلاً چڑی مار، 'عقاب'، 'باز'، شیرِ ببر یعنی جس کا شعار آزادی ہو، جس کا مقصد...... جس کا مقصد بس آزادی ہو۔؟ صرف آزادی ہو...... سمجھ گئے؟"

مام دین کی بے کیف آنکھوں میں چمک سی پیدا ہوگئی۔ اُس کے بے نُور چہرے پر سنجیدگی پھیل گئی۔ آہستہ سے بولا۔ سمجھ گیا حضور۔ زندگی یہی سمجھتے سمجھتے گذر گئی۔ یہی بناتے بناتے گذر گئی۔ یہی عقاب اور باز، چڑی مار اور شبر بُدھ اور کنول۔ لیکن آپ مطمئن رہیں، حضور کی چیز ان سب سے نرالی ہوگی......

نفسیات کے معلّم نے لمبی سانس کھینچی۔ ذہنی کوفت کا وہ ارتعاش جو اُس کی رُوح تک کو چھو چکا تھا، ختم ہوگیا۔ ایک نرالی چیز ......نہ عقاب نہ باز......صرف آزادی کے صحیح معنی لئے ہوئی نئی تصویر، جس کا عکس صرف مام دین کے رومانی تصور پر پڑ چکا تھا اور نفسیات کا معلّم اُس سے بے خبر تھا اور نفسیات کا معلّم اُس سے بے خبر تھا ......مطلق ناواقف!

اُس نے مطمئن ہو کر کہا۔ ''اگر چیز ہماری پسند کی ہوگی تو ہم تمہیں انعام بھی دیں گے!''

اور پھر انعام کا معیار قائم کرنے کے لئے اُس نے شکارے میں بیٹھ کر مالک دُکان سے پوچھا۔ ''اس کاریگر کی روزانہ اُجرت کتنی ہے؟''

مالک دُکان نے مُسکرا کر کہا۔ ''حضور پہلے تو بارہ آنہ تھی، اب پورا روپیہ لیتا ہے۔ حساب کے معاملے میں بڑا ڈھیٹ واقع ہوا ہے۔''

شکارے میں بیٹھے بیٹھے وہ سوچتا رہا۔ انگریز سے ساٹھ، ہندوستانی سے پنتالیس اور حساب کے معاملے میں بڑا ڈھیٹ کاریگر کو صرف پندرہ روپے، جس کے نام کی بنیادی تک زمانے نے رگڑ رگڑ کے مٹا دی ہے۔ جسے شاید اس کا بھی احساس نہیں کہ اُس کے اصلی نام کا مفہوم کیا ہے اور اب شہرت یافتہ لیکن مخفی نام کا مطلب کیا......!

دس دِن کے بعد وہ پھر کارخانہ میں آگیا۔

مام دین اُس کے سنگار بکس پر سنگ خارا سے پالش کر رہا تھا۔

اُس نے دیکھا۔ سنگار بکس پر ایک اژدہے کی تصویر کُھدی ہوئی ہے جو منہ کھولے کسی چیز کے پیچھے بھاگا جا رہا ہے

وہ مسّرت سے جھوم اُٹھا "واہ واہ! خوب چیز ہے۔" اُس نے مالک دُکان سے کہا "بالکل میرے مذاق کے مطابق آزاد، بے پرواہ اژدہا۔۔۔۔ جو تہذیب کا قائل نہیں، جو مزہب کا پروردہ نہیں۔ جو صرف آزاد ہے......آزاد۔"

مام دین اپنی چیز کی تعریف سُن کر خوشی سے تھر تھرانے لگا۔ اُس کا چہرہ پسینے سے شرابور ہوگیا۔

نفسیات کا معلم ایک نظر سے سنگار بکس کو دیکھ رہا تھا اور دوسری نظر سے دماغی حُسن کے سراپا مجسّمے کو......معاً اُسے محسوس ہوا جیسے اژدہے کی چوبیں آنکھوں میں نفرت، کش مکش اور انتقام کی بے پناہ آگ دہک رہی ہے اور جیسے وہ سارے کُرہ ارض کو ڈسنے، اپنے زہر سے تباہ و خاکستر کرنے کے لئے بھاگا آ رہا ہے۔

اُس نے کتنی ہی دیر تک مام دین کے چہرے اور نحیف جسم کی طرف خاموش مگر لرزاں نگاہوں سے دیکھا۔ لمحہ بہ لمحہ اُسے شک ہوا۔ یہ اژدہا نہیں، یہی کانپتا ہوا مام دین ہے۔ یہی معمر کارگر۔ یہی تانبے کی طرح سیاسی مائل سُرخ اور نیم عُریاں انسان جو انگریز اور ہندوستانی، مغرب اور مشرق، تہذیب اور مذہب سبھوں سے اپنا انتقام لینے کے لئے بھاگا آ رہا ہے۔

اُس کی ٹانگیں کانپنے لگیں۔ ہونٹ تھر تھرانے لگے۔

بے اختیار ہو کر اُس نے کہا۔ "مام دین"

"جی حضور!"

"......مام دین......ما......م......دین۔" اُس نے زیادہ بے تابی سے کہا۔

حضور کیا بات ہے۔ڈیزائن پسند نہیں؟ مام دین نے کانپتے کانپتے پوچھا۔

''بہت اچھا ڈیزائین ہے۔ بہت اچھا۔لیکن ہمیں معاف کر دو۔ معاف کردو۔ہم نے تمہیں پہنچانا نہیں۔ مغرب اور مشرق۔ انگریز اور ہندوستانی سب کو معاف کردو۔سب کو بخشو۔اپنا پھن سمیٹ لو۔اپنا زہر نگل جاؤ......''

وہ جلد جلد سیڑھیاں اُترا اُس کی سانس پھول چکی تھی۔ رگ رگ پھڑکتی تھی۔چمکیلی آنکھوں میں یاس پھیل گئی تھی اور مُنہ سے تعفّن سا آرہا تھا۔

''ہمیں معاف کردو۔ بخشو۔ہم بے گُناہ ہیں ۔زمانے کو ڈسو! تہذیب اور مذہب سے انتقام لو۔لیکن ہمیں بخشو ۔بخشو !معاف کردو......''اور مام دین اپنے کمرے کی کھڑکی سے کہہ رہا تھا ۔''حضور میرا انعام !اے حضور......اے حضور انعام!''

مالک دُکان دونوں کی سراسیمگی اور دیوانگی پر حیران ہورہا تھا!

............☆☆☆............

جنازے

(ستمبر ۱۹۴۳ء)

آج بیگو بہت اُداس تھی۔

اس لئے نہیں کہ اُسے جسمانی تکلیف تھی یا کسی گزرے ہوئے واقعے کی یاد اسے ذہنی کوفت پیدا کر رہی تھی۔ بلکہ اس لئے کہ اس کا کاروبار روز بروز ماند پڑھ رہا تھا۔ اور اُس کے مقابل میں سلیمہ کی دُکان چمک رہی تھی۔ یہ سچ ہے کہ کچھ عرصہ پیشتر جب اِس کے لہو میں آگ زیادہ اور شفقت کم تھی۔ اِس نے اچھے دن بھی دیکھے تھے۔ اور پروانوں کو اپنے شباب جھپٹتے۔ جھپٹ کر پلٹتے۔ پلٹ کر جلتے اور اور جل کر گرتے بھی دیکھا تھا۔ لیکن اب وہی پروانے سلیمہ کی شمع کے گرد منڈلانے لگے تھے۔ اور بیگو کھڑکی پر بیٹھی اُنہیں آتے جاتے دیکھی تھی۔

اپنے شریف کی تجویز پر جو بیگو کا اِتنا چاہنے والا نہیں۔ جتنا ہمدرد تھا۔ اُس نے حسن اور شباب کو واپس بُلانے کیلئے دوسری ریشمی انگیا' غازہ اور کاجل خریدہ تھا اور یہ سارا سامان دوسرے دن کی صبح کے وعدے پر بطورِ قرض خریدا تھا۔

اِس نے سرِ شام ہی انگیا اپنی لٹکتی ہوئی چھاتیوں پر کس کر باندھ لی۔ بڑی توجہ سے چہرے پر غازہ مَلا۔ اور رمضانی سے آنکھوں میں سُرمہ بھی گلو دیا۔ لیکن پھر بھی کوئی اِس کی طرف متوجہ نہ ہوا۔ وہ برابر کھڑکی پر بیٹھی ایسی نگہاہوں سے ہر راہ رو کو

دیکھتی رہی۔

جن میں مصنوعی حُسن و شباب کا اِستغناء کم لیکن محبت کی دعوت زیادہ تھی۔ کہی بار کسی کسی کو دیکھ کر اُس کے لال لال ہونٹوں پر بجلیاں بھی چمکیں۔ آنکھوں کے مصنوعی خمار سے بھرے ہوئے پپوٹے جو کاجل سے بوجھل ہو گئے تھے۔ تیز تیز چمکنے بھی لگے۔ لیکن تب بھی سڑک کسی نے آہ نہ کی۔ نہ کوئی گھائیل ہو کر ٹھٹھک گیا۔

کاش آج ہی شریف واپس لوٹتا تو اپنی بیگو کو دیکھ کر وہ کتنا خوش ہوتا۔ غازہ، کاجل، انگیا اور پھر اُس کا بنایا ہوا شباب وہ یقیناً پاگل ہو جاتا۔ یقیناً لیکن اِس کے لوٹنے میں ابھی دو دن باقی تھے۔ اور سنگھار کے سامان کی قیمت کل صُبح ادا کرنی تھی۔

راہ رو سڑک پر بدستور آجا رہے تھے۔ خوش پوش جوان۔ لاٹھی ٹیکتے ہوئی بوڑھے۔ نقاب میں لپٹی ہوئی عورتیں۔۔ بے راہ رو بچے، بھک منگے، چور اُچکے، شرابی .... لیکن سڑک خاموش نگاہوں سے بیگو کو دیکھ رہی تھی۔ جس نے شریف کی غیر حاضری میں آج اپنے آپ کو ضرورت سے زیادہ ابھارا تھا۔

سلیمہؔ کے کمرے کی روشنی چکوں سے چھَن چھَن کر دُور دُور تک پھیل رہی تھی۔ اور اسے دیکھائی دیتی تھی۔ جیسے قہقہے کا ایک آبشار گُنگُناتا ہوا بے مہر اور بے مروت پتھروں پر گر رہا ہو۔ کمرے کی روشنی بھی کبھی گُل ہو جاتی تھی اور کبھی دوبارہ روشن ہوتی تھی۔ اور بیگو اپنی کھڑکی پر بیٹھی مایوس نگاہوں سے دیکھ رہی تھی۔ کبھی اِن کے کمرے کی روشنی بھی یوں نہیں چھَن چھَن کر نکلتی تھی۔ یوں نہیں بُجھ جاتی تھی۔ اور یوں نہیں ہو جاتی تھی۔ لیکن اب .... اُس نے ریشمی انگیا خریدی تھی۔ اچھے دنوں میں اُس نے سوتی انگیاؤں سے کام لیا تھا۔ جو پروانوں کے بے درد ہاتھوں سے بہت جلد پھٹ جاتے تھے۔ اور تناؤ میں ڈھیلا پن بھی آجاتا تھا۔ اِن دنوں

پانچوں گھئی میں تھی۔ اسلئے بیگو نے سوتی انگیا کے تجارتی پہلو پر سوچنا ضروری نہیں سمجھا۔ حالانکہ شریف شروع ہی سے سُوتی انگیا کے خلاف تھا۔ شاید اُس نے سلیمہ کے سنگار کا بہت غور سے جائزہ لیا تھا۔ وہ جانتا تھا۔ کہ اس محفل میں آنے والے کے ہاتھوں محبت سے زیادہ حیوانیت ہوتی ہے۔ لیکن اس راز کو بیگوؔ اُس وقت سمجھ چُکی تھی۔ جب اُس کے پاس بَنک میں صرف ڈھائی سو روپے کی رقم جمع تھی۔

''دُنیا کس قدر مصروف اور بے مروت ہے۔'' بیگوں نے اپنے دل میں سوچا اور سوچتے سوچتے ہی اس کی ٹھوڈی نے کھڑکی کے چوکھٹ کا سہارا لیا۔ اِس کی نگاہوں میں آہستہ آہستہ چُھپا ہوا جزبہٗ دعوت کم ہوتا گیا۔ اور ہونٹ ایک دوسرے کے ساتھ پیوست ہونے لگے۔ دُور کے کھمبے سے لیمپ کی روشنی کالی سڑک پر پھیل چُکی تھی۔ جس کے ایک حصے پر بیگوؔ کی کھڑکی کے عین سامنے ہوتا۔ کمرے کی روشنی غالب آ گئی تھی۔ دونوں قسم کی روشنیوں کو راہ رو اپنے پیروں تلے روندتے چلے جاتے تھے۔ کچھ اپنی ہی دُھن میں مست، کچھ قہقہ لگاتے ہوئے کچھ بحث کرتے ہوئے۔ کچھ میٹھی میٹھی نگاہوں سے دیکھتے ہوئے۔ اُس وقت بیگوؔ کا کلیجہ مَسل کر رہ جاتا تھا۔ اُسے سڑک کی بے پروائی اور خاموشی پر غصہ آتا تھا۔ جو راہ رووٗں کے پیروں تلے اِس حصے کو بھی پائمال کرا کے خاموش تھی۔ جس پر بیگوؔ کے کمرے کی تیز روشنی غالب آ گئی تھی۔ بیگوؔ سب کچھ سہی۔ لیکن بے غیرت نہ تھی۔ اِسی سڑک نے اُس کے اچھے دن بھی دیکھے تھے۔ اور یہی سڑک اِس کے یہ دن بھی دیکھ رہی تھی۔ جب پروانے چلے گئے تھے۔ جب شمع کی روشنی دھویں میں لپٹ کر بُجھ رہی تھی۔

سڑک پر آمد و رفت بہت کم ہو گیا اور بیگوؔ اس طرح چوکھٹ پر ٹھوڑی رکھے بیٹھے رہی۔ حتیٰ کہ ایک لمبا سایہ سڑک کے سرے سے آتا ہوا دیکھائی دیا۔

وہ چونک اُٹھی اس کا دل دھڑکنے لگا۔ سائے کی رفتار سے اُس نے اندازہ

لگایا۔ضرور کوئی شرابی ہوگا۔جو اپنی مستی بیگو کے مسنوعی شباب کے حوالے کرنے کیلئے آ گیا ہو۔جبھی اِس کے قدم بے ترتیبی میں اُٹھ رہے تھے۔جوں جوں راہ نزدیک پہنچتا گیا بیگو کے ہونٹوں پر مسکراہٹ پھلانے کیلئے تیار ہوگئی۔اس نے جلد جلد اپنی چھاتی کی طرف دیکھا جس پر زور سے ریشمی انگیا کسی ہوئی تھی۔

بیگو نا اُمید ہوگئی..........

ایک ننگا آدمی اپنی دھن میں مست تیز اور مدہم روشنیوں کو روندکر چلا گیا۔

''بدمعاش لفنگہ تو اگر شرابی نہیں تو بیوقوف ہے''۔بیگو نے سوچا.....

''جو آبشار کے نزدیک پہنچ کر بھی تھوڑی دیر کیلئے کھڑا نہیں ہوسکا''۔

سڑک سے ننّھے ننّھے پِلوں نے ''چاؤں چاؤں'' اور بیگو کو محسوس ہوا جیسے پلوں کی زبان میں سڑک نے اُسے گالی دے کر زور سے قہیقہ لگایا۔

اِس نے آنکھیں پھیلا کر دیکھا تو ابھی کتا پلوں کو پیٹ کے نیچے آدھی چُھپائے بیٹھ گئی تھی۔اِس کی ٹانگیں اور پلوں کی ریشمی دُمیں تیز روشنی میں صاف دیکھائی دے رہی تھی۔بیگو کیلئے اب کھڑکی پر بیٹھنا بھی مُشکل ہوگیا۔جب دُنیا کو اِس کی ضرورت تھی تو وہ کبھی کھڑکی پر نہ آ بیٹھی تھی۔اور اب کھڑکی پر بیٹھ کر، کوئی اِس کی طرف متوجہ نہ ہوتا تھا۔اگرچہ اس کے پاس بُک میں ڈھائی سو سے زیادہ رقم جمع نہ تھی۔اور انگیا، غازے اور کاجل کی............. قیمت اِس سے اور ہوسکتی تھی۔لیکن
.........لیکن یہ تجارت کا اُصول نہ تھا۔وہ کھڑکی پر سے اُٹھی اپنا سر باہر نکال کر اُس نے سڑک کے دوسرے سرے تک نگاہ دوڑائی۔لیکن کوئی بھی نہ تھا۔دُور سلیمہ کے مکان سے باجے کی آواز گونج رہی تھی۔قہقہے بلند ہو رہے تھے۔اور کچھ بھی نہ تھا۔سایہ سڑک خاموش تھی۔صرف پرے مدہم اور تیز روشنیوں کے انفال میں کُتیا اپنے پلوں کو چھپائے بیٹھی تھی۔بے پرواہ اور بے نیاز۔اُسے اس تک کا خیال نہ

تھا۔جس نے اُسے پانچ بچے دئے تھے۔آخر کُتیا کُتیا ہی تھی جو اپنے ماحصل پر مطمئن تھی!

بیگو کو سر میں ہلکا ہلکا درد سا محسوس ہوا۔وہ کہیں سالوں سے اسی مکان میں رہنے کی عادی تھی۔اِن دنوں سب کچھ نرالہ اور حسین تھا۔سڑک پر نئی نئی کولتار بچھائی گئی تھی اور اس کے ذروں اور کنکروں تک سے اُسے مرمت کی بو آتی تھی۔وہ بوڑھی کُتیا سے بھی کسی حد تک مانوس ہو چکی تھی۔جو سال میں دو دو بار اِس جگہ بچے دیا کرتی تھی۔اور پھر اُس وقت تک غائب رہتی تھی جب تک اس کا پیٹ زمین سے لگ جاتا تھا۔اور تھن مشروم جیسے دیکھائی دیتے تھے۔یہ جگہ شاید کُتیا کو بہت پیاری تھی۔جبھی ہر بار وہ اس جگہ بچے دیا کرتی تھی اور مہینہ بھر انہیں دُودھ پلا کر غائب ہو جاتی تھی اُس دوران میں کُتے ہی کُتے شاید ان بچوں کا باپ بھی اِدھر سے گزرتے تھے اُس وقت کُتیا غضب ناک ہو کر دانت نکالتی تھی۔اور کُتوں کو آگے بڑھنے کی ہمت نہ پڑھتی تھی۔

یہ تمام واقعے بیگو کے ذہن میں پھرنے لگے لیکن پھر بھی کُتیا کُتیا تھی۔اُسے حقیقی محبت سے کیا واسطہ تھا۔ہاں اُس وقت کُتیا کی غیرت جوش میں آجاتی تھی جب دوسری جوان کُتیا اِس کے سامنے سے گزرتی تھی۔اور اِس کے پیچھے کہی کُتے شاید بوڑھی کُتیا کا حقیقی شوہر بھی چلا جاتا تھا۔مگر دِل میں اُس وقت ساری نفرت اِکھٹی ہو جاتی۔بوڑھی کُتیا کیلئے بلکہ اِن کیلئے نئے جو جوان کُتے اِن کے پیچھے پیچھے آتے ہیں۔اِنہی خیالات میں ڈھوب کر بیگو کمرے میں ٹہلنے لگی۔ایک سرے سے دوسرے سرے تک نیچے سڑک پر کتنے ہی آدمی سڑک کے فُٹ پاتھ سے گزر گئے۔قہقہے لگاتے لگاتے ایک دوسرے کو مخول کرتے کرتے کبھی اِس کے کمرے میں بھی ایسے ہی مخول صرف محبت کی خاطر کئے جاتے تھے۔لیکن اب قدِ آدم آئینے کے سوا اس کے کمرہ میں کچھ بھی نہ تھا۔جس نے بیگو کے بے کیف دن دیکھنے کی تاب نہ لا کر اپنے اوپر گرد کی

موٹی سی تہہ اوڑھ لی تھی۔

سڑک پر گزرتے ہوئے کسی نے اپنے ساتھی سے کہا "یہ تو اب لاش ہے ....لاش"، بیگو چونک اُٹھی وہ کھڑکی کے قریب آگئی اور اپنا سر باہر نکال کر دیکھنے لگی۔

دو آدمی مدھم روشنی میں چلے جا رہے تھے ایک مُڑ مُڑ کر بیگو کے مکان کی طرف دیکھ رہا تھا۔

"بھونرے مُرجھائی ہوئی کلیوں پر نہیں بیٹھتے۔ اُنہیں نکھرے ہوئے پھول چاہئیں۔" ....

دونوں نے زور سے قہقہہ لگایا۔ اور پھر مُڑ کر بیگو کے مکان کی طرف دیکھا۔ بیگو کے مکان کی طرف دیکھا۔ بیگو کا چہرہ کانوں تک جل اُٹھا۔ یہ جانی پہچانی آواز تھی۔ اُس نے اپنے دِماغ پر زور ڈالا اور اُسے یاد آیا ہاں مُنیر ....جو پرسوں تک اُسکا پجاُری رہا تھا۔ جو اپنی بیوی اور بچوں کے ہوتے ہوئے بھی بیگو پر لُٹ چُکا تھا ۔اور آج وہی اپنی ساتھی محبوبہ کو لاش کہہ کر اور قہقہے لگاتا ہوا جا رہا تھا۔

بیگو نے اپنا سر اور باہر نکالا۔ اور چاہا کہ مُنیر کو آواز دے۔ اور اُسے کاجل اور انگیا میں اپنا روپ دکھاتی لیکن وہ بہت آگے نکل گیا تھا۔

وہ قدِ آدم آئینہ کے سامنے کھڑی ہوگئی انگوچھے سے اُسے صاف کیا۔ اور اپنا چہرہ دیکھنے لگی۔ ہلکی ہلکی جُھریاں اُسے بالکل نظر نہ آئیں جنہیں غازے نے چُھپا لیا تھا۔ ہاں سُرمے کی سیاہ لکیروں کی آغوش میں لمبی لمبی آنکھیں، زور سے کسی ہوئی انگیا اور چمکتا ہوا چہرہ اُسے بہت حسین دیکھائی دیا۔ کتنی ہی دیر آئینہ کے سامنے کھڑی رہی اُس وقت اُسے اپنے آپ میں بیگو کے علاوہ عورت ذات بھی دیکھائی دی......ایک عورت.......جو صرف عورت تھی ماں نہیں۔ اُسے وہ دن بھی یاد آگیا جب اُس کی آنکھوں نے اپنے ماحصل کو بدنامی سے بچنے کیلئے شریف کے ہمدرد ہاتھوں سے

دبائے رکھا تھا۔ اُس دن سے اُسے رونا تو آیا تھا لیکن وہ صرف بیگو رہنا چاہتی تھا۔ اور اپنے پروانوں کی محبت اُن آنسوؤں کو پلکوں سے گرنے نہیں دیا تھا۔ اور نہ ہی اُسے کو صدقہ پہننے دیا تھا۔

لیکن آج اُسے اپنے بچے کی یاد آرہی تھی۔ کاش وہ بھی کسی کی ماں ہوتی۔

رمضان نے دروازے پر آکر کہا'' کھانا لے آؤں؟''

بھیگی ہوئی پلکوں کو اوپر اُٹھا کر بیگو نے رمضان کی طرف دیکھا۔ اور کہا ''ابھی بھوک نہیں''

''بھوک نہیں.......کیوں؟''

''میرے سر میں درد ہو رہا ہے شاید کچھ بھی نہ کھا سکوں''

بیگو نے ٹہلتے ٹہلتے جواب دیا۔

''ہائے..... ہائے.... آج تو کچھ بھی نہیں ہوا کئی دنوں سے کچھ نہیں ہوا'' اور درد........کہو تو میں سر کو سہلا دوں...'' رمضان نے پُوری ہمدردی کے ساتھ کہا۔

بیگو نے نا اُمیدی سے بھری ہوئی نظریں دوبارہ آئینے پر گاڑ کر کہا۔ ''نہیں رمضان تو میرے درد کو سہلا نہیں سکتے.... تم جاؤ.... میں....'' اُسی وقت سڑک پر دوسرا قہقہہ بلند ہو بیگو کی آنکھیں پھیل کر بہت بڑی ہو گئیں۔ کہیں سڑک نے اُن کی توہین میں دوسرا قہقہہ نہ لگایا ہو۔ ایک نوجوان مرد۔ ایک نوجوان عورت شاید میاں بیوی ایک دوسرے کی باہوں میں باہیں ڈالے جا رہے تھے۔

سڑک کے تیز روشنی والے حصے کو دونوں نے یکساں طور پر روندا اور آگے نکل گئے، مرد نے جلد جلد قدم اُٹھاتے ہوئے کہا۔ ''چلی چلو.......''

بیوی نے چونک پُوچھا'' کیوں تو۔''

مرد شاید ادیب تھا۔ متانت سے بولا'' اِس بازار میں ہمارے سماج کی

لاشیں اور جنازے ہیں...... پر تم چلی چلو.....''

بیوی نے حیرت سے ادھر اُدھر دیکھا۔ پھر مُسکرا کر بولی ''یہ بھی شاعری ہے''

''شاعری نہیں حقیقت ہے لیکن تم چلی چلو۔'' ادیب نے گھبرا کر کہا۔ تھوڑی دیر کیلئے بیگو کو محسوس ہوا۔ جیسے اُس کے سر پر ناب ڈالا گیا ہو۔ لیکن جلد ہی بعد پھر اُسے شدّت کا درد محسوس ہوا۔ دو بھنوؤں کے درمیان اُسے ایک میخ سی گڑی ہوئی محسوس ہوئی۔

''لاشیں اور جنازے''

بیگو کے خیال میں دُنیا بے حد مصروف تھی لیکن ادیب کسی سے غافل نہ تھا۔ اُس نے خالص جزباتی اور ادبی رنگ میں اپنی بیوی کو دُنیا کی طویل ترین لیکن ناتمام کہانی سُنائی۔ جس کا آغاز اُس دن سے ہوا تھا جب زمین مُشترک تھی اور انسان ننگا اور اس کے بعد کروٹوں پر کروٹیں۔ زمین کی تقسیم، شادی کا رواج، غلامی، پردہ، آزادی کی آرزو، تجارت، سرمایہ اور لاشیں لیکن اس کے بعد........ادیب نے اپنی بیوی سے نہیں کہا۔ شاید ماحول موافق نہ تھا۔ اور بیگو کو یہ تمام منزلیں اپنی زندگی سے ملتی جُلتی نظر آئیں۔ جب اُس نے شادی بھی کی تھی نقاب بھی اُوڑھا تھا پھر آزادی کی آرزو میں وہ شریف کے ساتھ مُلتان سے کشمیر بھاگ آئی تھی۔ اِس کے بعد مائسمہ کے پچھلے بازار میں خالص تجارتی اُصولوں پر کاروبار'' .... پاس ٹک ......اور......'' لیکن اِس کے بعد کون سی منزل آنے والی تھی۔ یہ نہ ادیب نے کہا تھا اور نہ بیگو جانتی تھی۔ ایسا نہ ہو کہ غازہ، کاجل اور انکیا کی قیمت صبح سے نہ ملنے پر دُکاندار اِس کی بے عزتی کر دے۔ ''اس کی غیرت سب کچھ برداشت کر سکتی لیکن بے عزتی نہیں......''

اُس نے آئینے کی طرف پیٹھ کر کے چُپکے سے دو آنسوں پُونچھ لئے جو کاجل سے سیاہ ہو گئے تھے۔ شاید اپنی شکل تک کر............جن میں اُسے بیگو کے علاوہ کچھ

اور بھی نظر آیا تھا۔ قلبی کمزوری سے واقف نہ ہونے دیتی تھی۔

اُس نے بجلی بُجھا دی۔ اور پھر کھڑکی پر آ کر بیٹھ گئی۔

سڑک کا منوّر حصّہ دُور کے کھمبے کی روشنی کے ساتھ مل کر اشترا کی بن گیا۔ توہین، گالیاں اور قہقہے ختم ہو گئے۔ اور ان کے ساتھ ہی کُتیا کی ٹانگیں اور پلوّں کی ریشمی دُمیں بھی.........۔

سلیمہ کے مکان میں بجلی کے قمقموں کی روشنی چکوں سے چھن چھن کر نکل رہی تھی۔ کبھی گانے کی آواز بلند ہوتی تھی اور کبھی قہقہے گونجتے تھے۔ لاشوں کے بازار میں اندھیرا بھی تھا۔ اور اُجالا بھی۔

بیگّو کے دماغ میں اب تک ادیب کے الفاظ گونج رہے تھے۔

''لاشیں اور جنازے''

''اُلو کہیں کا۔ اُسی اپنی بیوی جیسے کفن ہو اور تابوت میں ڈھانپنے اور کندے پر لئے پھرتا ہے۔ جنازے میں دکھائی دی۔ میرے دُکان کو جنازہ کہہ گیا۔ جہاں تجارتی اُصولوں پر انگیا کسی جاتی ہے۔ کاجل لگایا جاتا ہے اُدھار پر چیزیں خریدی جاتی ہیں بیوقوف...... فلسفی کُتا......''۔ اُسے محسوس ہوا جیسے اُس کے سینے سے بوجھ اُتر گیا۔ سر کے درد میں بھی کافی افاقہ ہوا۔ نہ جانے دل کے کس گوشے میں یہ کمزوری سی آ گئی تھی جس نے اُسے اپنا ظاہری وجُود تک بھلا دیا۔ وہ اب بیگّو تھی بیگو ....جو سنگار کا سامان بیچنے والے کی طرف محبت کی تجارت کرتی تھی.........۔ اُسی وقت کوئی اس کی کھڑکی کے نیچے آ کر رُک گیا۔ بیگّو نے آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر دیکھا۔ کوئی تو ہے.......

''کون ہو.....'' اُس نے پوچھا

''دُکان ڈھونڈ رہا ہوں جہاں رات بسر کرسکوں......اور غذا........'' ایک

انسان نے جواب دیا......بیگو چمک اُٹھی بولی دُکان؟ آؤ آؤ........یہ سیڑھیاں چڑھو.......یہی دُکان ہے........آؤ.........

کمرے میں دوبارہ روشنی ہوگئی سڑک کا مختصر سا حصہ منّور ہوگیا۔لیکن اس بار بیگو نے کھڑکی بند کردی۔

''اندر آؤ.....تم بہت تھکے ہوئے معلوم ہوتے ہو ڈرو مت یہ دُکان ہے۔ایک ادھیڑ عمر کا آدمی ڈرتے ڈرتے سہمی ہوئی نگاہوں سے اِدھر اُدھر دیکھتا ہوا کمرے میں داخل ہوا۔

بیگو نے اُسے سہارا دیکر قالین پر بیٹھا دیا۔اُس کے ہاتھ بے حد ٹھنڈے تھے لیکن گوشت سے بھرے۔

تھوڑی دیر کیلئے بیگو مایوس سی ہوگئی اُسے اپنی چھاتیوں میں تناؤ محسوس ہوا۔لیکن ممکن ہے کہ رات کو یہ تناؤ ڈھیلا پڑھ جائے کیونکہ انگیا ریشمی تھی۔اور اس کے پھٹنے کا زیادہ احتمال نہ تھا۔

''مجھے بھوک لگی ہے کچھ کھانے کو ملے گا۔'' ادھیڑ عمر کے آدمی نے کہا۔

بیگو نے جلد جلد کہا۔''سب کچھ سب کچھ۔تم اطمینان رکھو۔ڈرو مت لاؤ تمہارے پاس کیا ہے۔''

ادھیڑ عمر کے آدمی نے گوشت سے بھرا ہوا ٹھنڈا ہاتھ اپنی جیب میں ڈال دیا۔اور کہا میری بیوی اسپتال میں مرگئی ہے۔''میں گاؤں کا رہنے والا ہوں۔اُس کا جنازہ اُٹھوا کر ابھی ابھی آرہا ہوں۔کچھ پیسے گورکن کو دئے اور باقی ....یہ ہیں........''

بیگو نے گھبرا اُس کی طرف دیکھا۔''جنازہ''

پھر سنبھل کر اُس کی مٹھی کھولی۔ساڑھے گیارہ آنے تھے۔

وہ حیران ہوگئی اُمیدیں خاک میں ملتی ہوئی دکھائی دیں صرف کاجل اور غازے کی قیمت۔۔۔۔۔۔۔انگیا کے دام باقی تھے۔

''مجھے بھوک لگی ہے اور میں سوجانا چاہتا ہوں۔ یہاں کوئی مرد نہیں۔'' ادھیڑ عمر کے آدمی نے حیرت سے پُوچھا۔

بیگو نے قہقہہ لگا کر کہا۔''مرد....کیا صرف مرد وں کو ہی تجارت کرنے کا حق حاصل ہے۔ہم عورتیں تجارت نہیں کرسکتیں؟ لیکن تمہیں اِن باتوں سے کیا۔؟تمہیں غذا چاہیئے!''

ادھیڑ عمر کے آدمی نے جلد جلد کہا

''ہاں غذا ......اور کانگڑی .....جس سے میں اپنے آپ کو گرم کروسکوں.......''

بیگو نے اطمینان کا سانس لے کر کہا۔شُکر ہے تم نے سردی محسوس کی۔تمہیں سچ مُچ تمہیں غذا سے زیادہ گرمی کی ضرورت ہے۔آ ؤمیں پنے حنائی ہاتھوں سے تمہیں گرمی پہنچادوں۔''

آدھیڑ عمر کا آدمی گھبرا اُٹھا۔اُس نے کہا مجھے کانگڑی چاہیئے اور روٹی.........''

بیگو نے مسکرا کر کہا'' کانگڑی سے زیادہ میرے بدن کی گرمی مُفید ہے۔تم بیوقوف مت ہو۔میری بات کو سمجھنے کی کوشش کرو۔''

ادھیڑ عمر کا آدمی خوف سے اُٹھ کھڑا ہوا۔اُس نے کہا۔''تُم ....تم کنجری ہو۔''

بیگو کے چہرے پر سنجیدگی پھیل گئی۔اُس نے سنجیدہ لہجے میں کہا

''خبردار دُکانوں پر سودے ہوتے ہیں۔توہین نہیں۔اگر تمہیں گرمی کی ضرورت نہیں تو جاؤ سیاہ رات باہر تمہارا انتظار کررہی ہے۔اور ہاں قبرستان میں تمہاری بیوی کی تازہ لاش۔''

''میرے پیسے؟'' ادھیڑ عمر کے آدمی نے کھڑے ہو کر پوچھا۔

بیگو نے بے پروائی سے کہا۔ ''وہ میرے مشورے کی اجرت تھی۔ اگر تم میری گرمی بھی خریدتے تو تمہیں اور دینا تھا...... سمجھ گئے..... جاؤ...... دیر ہو رہی ہے اور رات تاریک تر ہوتی جا رہی ہے..........''

ادھیڑ عمر کا آدمی لرزتے لرزتے سیڑھیاں اُترا۔

اور بیگو نے قہقہہ لگا کر کہا ''جاؤ بے وقوف ادیب سے کہہ دو اپنی ادھوری کہانی کا بقیہ حصّہ تمہیں سنائے۔''

پھر زور سے پُکار کر بولی ''او رمضانی..... آؤ..... کھانا لے آ.... کھانا.....''

دوسرے دن خلافِ توقع شریف واپس آیا تو بیگو اُسے لپٹ دھاڑیں مار مار کر رونے لگی۔

شریف حیران رہ گیا۔

اُس نے پُوچھا ''بیگو کو مجھ سے اس قدر محبت ہے۔''

لیکن کون جانے............... یہ رونا کس لئے تھا۔ محبت کیلیئے، نا اُمیدی کیلیئے...................... یا انگیا کی قیمت کیلیئے........''

............☆☆☆............

اُجالے اندھیرے

صُبح ہوگئی......

فروری کی میلی دُھوپ کا جال تڑاخ سے کرہ ارض پر پھیل گیا۔ اور ایک ہلکی سی بدصورت سی مُسکراہٹ ہر چیز پر لوٹنے لگی۔ آووں پر کام کرنے والے نیم عریاں مزدور، شمشان کے چوکیدار اور دریا کے کنارے پر بہتی لاشوں کا انتظار کرنے والے کتے اور گِدھ سب اس جال کے نیچے حرکت میں آگئے اور اپنی آنکھیں کھول کر دور دور دیکھنے لگے۔ جدھر سے کوڑے کرکٹ اور غلاظت سے بھرے ہوئے چُو چِر مر کرنے والے سفید کفن میں ملبوس انسانی لاشیں اور دریا کی نرم و نازک لہروں پر تیرتے ہوئے مردار آتے تھے۔ دریا کے اس پار والی کول تار کی سیاہ سڑک پر مہین آٹے کی فرح ہلکی کہر سرشام ہی لیٹ گئی تھی جو دھوپ کی کرنوں میں آہستہ آہستہ غائب ہوجاتی تھی۔ کہیں کہیں ایک آدھ مُتنفس سر سے پاؤں تک لوئی اوڑھے کنارے کنارے جارہا تھا اور دور گاجر اور پیاز کے کھیتوں سے دھواں سا اُٹھنے لگا تھا۔ جو فضا میں تحلیل ہوتا جاتا تھا۔ درختوں کی ننگی شاخوں پر چڑیاں اپنے الجھے ہوئے فالتو پر چُن چُن کر نیچے پھینک رہی تھیں جو ہوا میں بل کھا کھا کر آوارہ ہوجاتے تھے۔

زندگی نئی صبح پر سوار ہو کر آگئی تھی اور ابھی تک جاوید بستر استراحت پر دراز چھت کی میلی کڑیوں کو بے مطلب تک رہا تھا۔ رات کو سونے سے قبل جن جذبات

سے متاثر ہو کر اس نے اپنے ذہن میں سُنہرا جال بُننا شروع کیا تھا۔ وہ ابھی تک اسے ڈھیلا ڈھیلا سا ہی محسوس ہو رہا تھا۔ کیونکہ اس میں بے شمار گرہیں آ گئی تھیں۔ اسے یہ بھی یاد نہ تھا کہ خواب نے اسے کس وقت اپنی آغوش میں لے کر اس کے ذہن کو پیہم فکر سے نجات دلائی تھی۔ اسے افسوس تھا کہ اس نے سونے سے پہلے سارا جال کیوں نہ بنا!

دریا کی طرف کھلنے والی کھڑکی کے شیشے میں میلی دھوپ کی ایک لکیر اس کے چہرے اور بستر پر پھیل گئی اور وہ کروٹ بدل کر اٹھا۔ دریا کے بند شور اس کے لاشعور میں گونجنے لگا اور کھڑکی کھولتے ہی اس کی نگاہ بدصورت آووں اور خاموش مرگھٹ کے چھپر سے ٹکرائی۔ جس کی چھت کی نئی ٹین دھوپ سے پگھلی ہوئی کہر کی وجہ سے چمک رہی تھی۔ اسے محسوس ہوا جیسے یہ آوے اور مرگھٹ، کتے اور مزدور بڑھتی ہوئی زندگی کے ایسے خلاء ہیں جو کبھی پر ہی نہیں ہوتے...... حتیٰ کہ کوڑا کرکٹ جل جاتا ہے لاشیں بھسم ہوتی ہیں مردار صرف پنجرارہ جاتا ہے بھوک انتڑیاں کاٹنے لگتی ہے اور پھر سب کے سب نئے شکار، نئی بھرائی کے منتظر رہتے ہیں زندگی کا ایک دن ختم ہوتا ہے دھوپ کا جال ٹوٹ جاتا ہے اور تاریکی سسکتے ہوئے لمحوں کی سلائی سے زندگی کی تھکی ہوئی آنکھوں میں کاجل لگاتی ہے۔

جاوید کمرے سے نکلا اور سڑک پر آیا۔ زندگی کی دھڑکنیں تیز ہو گئی تھیں اور دیہات سے آنے والی کچی اور پکی سڑکوں پر مرد اور عورتیں شہروں کی طرف آنے لگی تھیں۔ یہ لوگ سر پر سرگیں، ساگ سبزی، اناج، دودھ اور مچھلیوں کے ہلکے پھلکے بوجھ لئے ہوئے کچھ تیز تیز قدم اُٹھا رہے تھے اور کچھ اپنے آپ کو گھسیٹ کر لے جا رہے تھے۔ ایک دریا سا تھا جو بہہ رہا تھا جس میں بوجھ اٹھائے ہوئے مرد اور عورتیں ان لاشوں کی طرح دکھائی دے رہی تھیں جن کا انتظار آووں کے دامن میں پھیلی ہوئی

ریت پر کُتے اور گِدھ کرتے رہتے تھے۔

جاوید کا ذہن بیدار ہو گیا۔ وہ سڑک پر ٹہلنے لگا۔ اسے اپنا آپ بھی بہتا ہوا لاشہ سا دکھائی دیا۔ لیکن کس خلاً کو پُر کرنے کے لئے؟ دیہات سے آنے والے مرد اور عورتیں شہر کے خلاً کو پر کرنے کے لئے جا رہی تھیں۔ اور وہ نہیں سمجھ سکتا تھا۔ کہ اس کی زندگی...... اس کی جذبات پرست زندگی کسی خلاً کو پر کرنے کے لئے حسین سرمئی سڑک پر بہی جا رہی ہے۔ کیا کہیں آس پاس ہی کوئی سرد آوا' کوئی خاموش مرگھٹ کوئی مریل سا گِدھ اس کی تاک میں تھا؟ وہ آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر اِدھر اُدھر دیکھنے لگا۔ دریا بہہ رہا تھا اور دریا کے پار نیم عُریاں مزدور کوڑے کرکٹ کے ٹوکرے اٹھائے آووًں کے شکم پر کر رہے تھے نیچے نور باغ کا شمشان دھوپ میں نہار رہا تھا ننگی شاخوں پر بیٹھی ہوئی چڑیاں اُڑ گئی تھیں۔ چنگی کی چوکی پر میلے کچلیے مُنشی بھاری بھرکم کتابوں پر جھک گئے تھے اور پاس ہی پیاز کے کھیتوں میں قرمزی پیرہن پہنے ایک حسین عورت اسے غور رہی تھی۔ جاوید کی نگاہیں اس کے ساتھ ٹکرائیں اور پلٹ آئیں ...... پھر ٹکرائیں...... پھر وہ حسین عورت پیاز کے ننھے ننھے پودوں کو اپنے پاؤں سے روندنے لگی۔ جاوید کو محسوس ہوا جیسے یہ گورے گورے پاؤں اس کے سینے پر ایک ہلکا اور میٹھا بوجھ بن کر آ گئے ہیں وہ اسے دیکھتا رہا۔ اور اس کے گندمی حُسن اور دِل فریب نقش و نگار کا تجزیہ کرنے لگا۔ کاش! میں نے اسے رات کو دیکھا ہوتا تا کہ اس کا سُنہرا جال مکمل ہو جاتا۔ عورت ابھی تک سر جھکائے کھڑی تھی۔ لیکن کبھی کبھی اس کی طرف ایک نگاہ غلط انداز بھی ڈالتی تھی۔ اور اس وقت جاوید کو اپنے بدن میں جھٹکے کا سا احساس ہوتا تھا معاً چُنگی کی چوکی پر شور سا برپا ہوا۔ لوگ ٹوٹے ہوئے دائروں کی شکل میں چبوترے کے آگے جمع ہو گئے تھے۔

''چور ہے سالا! سرکار کو دھوکا دینا چاہتا تھا۔''

''چھانڈے کس صفائی سے اپنی جیب میں چھپا رکھے تھے''

''اس کا چالان کردو۔ ایسے کو چھوڑنا گناہ ہے''

چھانڈے کو چھپانے والا منتیں مان رہا تھا۔ ہاتھ جوڑ رہا تھا۔ سرگین سے بھر ہوا اس کا تھیلا سڑک پر، گر گیا تھا اور اس کے ساتھ ہی میلے کپڑے کی وہ چادر بھی، جو اس نے دستار کے طور پر باندھی تھی، جیب میں چھپائے ہوئے انڈوں نے اسے چوراہے پر ننگا کیا تھا۔ اور سرکاری مالی کے محافظ اس کی بے حرمتی اور عریانی پر قہقہے لگا رہے تھے۔ تماشہ دیکھنے والوں میں سے اکثر کی دلیری اور ہاتھ کی صفائی پر اپنی اُنگلیاں چبا رہے تھے۔

''پکا بدمعاش ہے!''

''گذر وانوں کو دھوکا دیا ہے''

''سُنار کے سو لوہار کا ایک۔'' ''اب حضرت کو چالاکی کا بھاؤ معلوم ہوگا۔''

چھانڈے چھپانے والا کبھی ایک کے پاؤں پکڑتا تھا اور کبھی دوسرے کے۔ اور پھر رحم جو یانہ نظروں سے جمع ہوئے تماشہ بینوں کی طرف دیکھتا تھا۔ وہاں کسی کو اپنا ہمدرد نہ دیکھ کر دوبارہ چپڑاسی کے آگے ہاتھ جوڑتا تھا۔

''یہ بیمار کے لئے ہیں چپڑاسی جی۔ خُدا کی قسم میں چور نہیں ہوں!''

''حرامی اب بہانے بنانے لگا!''

''بہانہ نہیں، چپڑاسی جی! میری گھر والی بہرار کے ہسپتال میں ہے ڈاگڈر (ڈاکٹر) نے اسے انڈے کھانے کو کہا ہے''

چپڑاسی زور سے ہنسا، جیسے کہہ رہا ہو، یہ منہ اور مسور کی دال۔ تمہاری گھر والی اور انڈوں کی فرمائش! ابے حرامی! جھوٹ پر جھوٹ کیوں بولتا ہے؟

جاوید اب تک دور سے یہ باتیں سن رہا تھا۔ وہ اب آگے بڑھا۔ اس کے منہ

پریم ناتھ پردیسی کے افسانے

میں بے شمار باتیں جمع ہوگئی تھیں۔ جنہیں وہ اُگلنا چاہتا تھا۔

ایک موٹر کار بھوں بھوں کرتی ہوئی چبوترے کے سامنے کھڑی ہوگئی تماش بین چند قدم پیچھے ہٹ گئے اور پھر ایک لہر کی طرح واپس آ گئے۔

کار کی پچھلی سیٹ پر سے ایک انگریز شکاری نے کتابوں پر جھکے ہوئے منشی کی طرف انگلی سے اشارہ کیا۔ منشی نے جلد جلد کرسی پر اپنی لوئی پھینک دی اور پگڑی کو ٹھیک کرتا ہوا، کوٹ کے بٹنوں کو کاج میں بند کرتا ہوا اس کے سامنے کھڑا ہو گیا۔

''ویل بابو! ہمارے پاس چھ گیز geese اور چار ڈزن انڈے''

''چھ گیز اور چار درجن انڈے؟''

''ہاں ہاں ہم نے خود مارا ہے۔ ہوکر لیک (hokar lake) میں یہ سب ہمارا پرسنل ہے''

''پرسنل......؟ لیکن حضور انڈا......''

''وہ......وہ ہمارا میم صاحب کو بڑا پسند ہے۔ وہ انڈا دیکھ کر بڑا خوش ہوتا ہے۔ ہم نے اس کے واسطے ایک مسلمان سے خریدا ہے''

''دو آنے حضور......!''

''دو آنے کیوں؟ یہ ہمارا پرسنل ہے''

''بہت اچھا حضور'

''تھینک یو......''

کار فراٹے بھرتی ہوئی شہر کی طرف دوڑی۔ منشی خوش خوش اپنی جگہ آ کر بیٹھ گیا۔

''کتنے نیک لوگ ہوتے ہیں' کچھ بھی نہیں چھپاتے۔'' اس نے تماش بینوں اور چپڑاسیوں سے کہا......اور پھر چاروں درجن انڈے ان لوگوں کے نزدیک ہوتے

ہی کیا ہیں......دو دِن کی خوراک!

''نیک نہ ہوتے تو دُنیا پر راج کیسے کرتے!'' ایک بوڑھے مسلمان نے کہا ......خُدا نیتّوں کا پھل دیتا ہے۔

چھ انڈے چھپانے والا چور اپنے دونوں ہاتھ مل رہا تھا۔ منشی نے اسے دیکھا اور رعب دار لہجے میں کہا لا ایک پیسہ دے آئندہ پھر ایسی کوشش کرے گا تو کھال اُتار دو گا۔

''ایک پیسہ؟ خُدا کے لئے معاف کرو گذروان صاحب!''

ایک چپڑاسی نے آگے بڑھ کر اس کے منہ پر تھپڑ رسید کیا۔ ''حرام زادہ! اب محصول کے لئے بھی نخرے کرتا ہے۔''

اس نے ایک میلے رومال سے ایک پیسہ نکالا اور منشی کے ہاتھ میں دیا۔

''کان پکڑ......اب آئندہ چوری نہیں کرے گا۔'' منشی نے پیسہ لیتے ہوئے کہا۔

اس نے دونوں کان پکڑے۔ پھر دستار باندھی۔ سرگین کا تھیلا سر پر اٹھایا اور شہر کی طرف چلا گیا۔ سڑک پر کار کے دو پہیوں کی لکیریں دھوپ میں چمک رہی تھیں وہ ان سے بچتا ہوا سڑک کے کنارے کنارے ہولیا۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ انجانے میں نیک لوگوں کی لکیریں اس کے ننگے پاؤں سے روندی جائیں، ہجوم منتشر ہوگیا۔ تجربہ کار منشی کے انصاف اور تدّبر پر سب حیران رہ گئے۔ کس قدر آدم دوست اور ترس کھانے والا بندہ ہے۔ چور کو پکڑ کر چھوڑ دیا۔ اور صرف محصول کا ایک پیسہ وصول کر کے۔ حلانکہ وہ اس کے خلاف مقدمہ بنا سکتا تھا۔ لیکن نہیں۔ وہ اس کی کہانی سن کر خُدا کے آگے کیا جواب دیتا۔ جب اس نے کہا تھا ڈاکٹر نے میری بیمار بیوی کو انڈے کھانے کی تجویز کی ہے۔

جاوید کے منہ میں جمع ہوئی باتیں ریت میں پانی کی طرح اندر ہی اندر جذب ہو گئیں۔ امتیاز کے واضح تاثرات نے اس کے ذہن کو دوبارہ منتشر کر دیا۔ اور پھر نیک اور بد کا فلسفہ،خدا اور نیت کا واسطہ...... اس کے محسوسات میں آگ سی لگ گئی۔ کیا یہی سرکاری مالیہ کا تحفظ ہے؟ کار میں بیٹھے ہوئے انگریز سے کچھ بھی نہ لیا جائے اور ایک غریب کو ایک پیسے کے لئے خوار و ذلیل کیا جائے؟

''اس انگریز سے آپ نے کچھ بھی نہ لیا' منشی صاحب!'' اس نے منشی سے زہر خند کر کے پوچھا۔

منشی نے گردن اوپر اٹھا کر کہا۔ اس کے پاس تھا کیا؟

''گیز تھے۔ چار و درجن انڈے تھے جاوید نے اسی انداز میں کہا

لیکن وہ اس کی پرسنل چیزیں تھیں۔ اور پرسنل چیزوں پر محصول نہیں لیا جاتا۔ منشی نے فخریہ انداز میں کہا

''چار درجن کے مقابلے میں صرف چھ انڈے پرسنل نہیں ہو سکتے تھے؟'' اس نے دوبارہ پوچھا۔

منشی مسکرا دیا۔ بولا۔ آدمی کی پوزیشن دیکھ کر پرسنل کا معیار قائم کیا جاتا ہے۔ یہ تو صاف چور تھا۔

جاوید نے طنز آمیز قہقہہ لگایا اور اپنے آپ سے پوزیشن کا لفظ دہراتا ہوا پیاز کے کھیتوں کی طرف چلا گیا۔ منشی نے اس کا طنز محسوس کیا۔ اسے اپنے منہ پر کسی کا لگایا ہوا تھپڑ سا محسوس ہونے لگا۔ لیکن جاوید جا چکا تھا اور دور سڑک کے کنارے پیاز کے کھیت کی طرف دیکھ رہا تھا جہاں حسین عورت کے آگے ایک مرد غصّے سے کانپ رہا تھا۔

''کیا کر رہی تھی وہاں''

''تماشہ دیکھتی تھی!''

''تماشہ...... کیا بندر ناچ رہا تھا۔''

''گذر وان نے چور پکڑا تھا۔ انڈوں کا چور۔''

''چپ...... مالزادی مجھے بہکا رہی ہے میں سب کچھ دیکھ چکا''

''حسین عورت سہم گئی۔ پیرہن کا قرمزی رنگ لپک کر اس کے چہرے پر آبیٹھا اور وہ سر سے پاؤں تک اسی تھرتھراتے ہوئے رنگ میں ڈوب گئی''

''کیا دیکھ چکے؟'' عورت نے مضبوطی سے پوچھا۔ مرد کو عورت کا یہ سوال بہت ناگوار گذرا۔ اس نے اس کے بائیں گال پر ایک طمانچہ رسید کیا۔ کنجری مجھے سبق سکھاتی ہے۔ ہم وہاں پنسیری کا انتظار کرتے ہیں اور تو یہاں آنکھیں لڑاتی ہے۔''

عورت رونے لگی۔ مرد نے اس کا گریبان پکڑا اور اُسے گھسیٹ کر لے گیا اور جاوید ''صمٌ بکمٌ'' ہو کر اُنہیں دیکھنے لگا۔ اس کی سمجھ میں نہ آیا کہ عورت کا قصور کیا تھا۔ اسے مرد پر غصہ آیا۔ اگر اس کا بس چلتا تو اسے وہیں گولی سے مار دیتا۔ جس نے لڑکی کو محض دور سے تماشہ دیکھنے کے لئے اتنی فحش گالیاں دی تھیں اور پھر طمانچہ...... کیا عورت موم کی گڑیا ہے جو آنکھ کے ایک اشارے سے پگھل سکتی ہے۔ کیا مرد اپنے آپ کو اس قدر ذمّہ دار سمجھتا ہے کہ عورت کا تماشہ دیکھنا تک اس کی ذمّہ داری برداشت نہیں کر سکتی؟ نئی دُنیا کو تعمیر کرنے والے غلاموں کے یہ مغرور خُدا کب تک اپنی شہ زوری پر ناز کرتے رہیں گے؟...... وہ ان ہی جذبات کے سیلاب میں بہتا ہوا دریا کی طرف آیا ۔کوڑا کرکٹ ڈھونے والے کچھ مزدور ریت پر کچی اینٹوں کی قطاریں لگا رہے تھے۔ ان سے ذرا دور اُن کا ایک ساتھی چولھے پر چائے پکا رہا تھا۔ تھوڑے فاصلہ پر چند کُتے پانی میں تیرتے ہوئے مردار کو کنارے کی طرف گھسیٹ رہے تھے اور ساتھ ہی ساتھ ایک دوسرے سے لڑتے بھی تھے۔ فضا میں مکروہ صورت سفید گِدھ ننگی گردنیں جھکا کر

منڈلا رہے تھے اور بار بار لڑنے والے کتوں پر جھپٹنا چاہتے تھے بالآخر لاش کنارے پر آ گئی۔ کتے اور گِدھ دونوں اس پر پل پڑے، اس امتیاز کے باوجود کہ ایک خشکی پر دوڑ سکتا تھا اور دوسرا صرف ہوا میں!

جاوید نے بے زبانوں کی اس اشتراکیت پر حیرانی ظاہر کی۔ مکروہ مردار نے دونوں کی حِسوں کو فنا کر دیا تھا۔ اور خودی، برتری اور کمتری کے جذبات یکسر مِٹا دئے تھے۔ آخر کیوں؟ کیا مردار اتنا میٹھا ہوتا ہے کہ کسی دوسری لذّت کو محسوس کرنے کی قوت ہی سلب ہو جاتی ہے؟

وہ دوبارہ اپنے کمرے میں چلا گیا۔ اب باہر کوئی رعنائی نہ تھی۔ کم از کم جاوید کے لئے نہ تھی اس بڑھتی ہوئی زندگی میں بھی نہیں جو دیہات سے آنے والی کچی اور پکی سڑکوں پر رواں تھی۔ جو چنگی کی چوکی کے سامنے خوار و ذلیل ہوتی تھی۔ جو پیاز کے کھیتوں میں گھسیٹی جاتی تھی۔ جسے ہڑپ کرنے کے لئے بدصورت آوے خاموش شمشان اور دریا کے کنارے ہر وقت منتظر رہتے تھے۔

وہ اپنے دِل کو بہلانے کے لئے اہرن برگ کا تازہ ناول پڑھنے لگا۔ لیکن حروف ایک دوسرے سے ملے ہوئے تھے۔ اسے ایسا نظر آیا جیسے سیاہی کی بے شمار سیدھی لکیریں کتاب کے مضموں پر کھچی ہوئی ہیں جن کے کوئی معنی نہیں۔ بے مطلب سی لکیریں۔ جیسے کسی ضِدّی بچے نے کھینچی ہوں۔ ناچار اس نے کرسی پر کتاب پھینک دی۔ اور چارپائی پر دراز ہو کر چھت کی کڑیوں کو دیکھنے لگا۔ متوازی اور سیدھی کڑیاں جو مل کر بہت بڑی عمارت کا بوجھ سہارے ہوئے تھیں۔ کاش!

دُنیا میں کڑیاں ہی کڑیاں ہوتیں۔ اسی طرح متوازی اور سیدھی جو نئی تعمیر کا بوجھ سہار سکتیں۔ اور انہیں دیکھنے والا مبہوت و حیران رہ جاتا۔

اس کے ذہن سے باریک باریک سے تار نکلنے لگے۔ اور وہ ان سے جال

بُننے لگا۔ امیدوں کا سُنہرا جال، خواہشات کا جال۔ لیکن تار کہیں کہیں ٹوٹ جاتے تھے اور وہ خُود بے بس مکڑی کی طرح لٹک جاتا تھا۔ سماج کی قدریں ان تاروں کو آگے لے جانے سے روکتی تھیں۔ لیکن وہ بھی کوشش کرتا رہا۔ حتیٰ کہ کمرے کی کھلی کھڑکی سے آئی ہوئی میلی دھوپ اس کے سر کے اوپر سے گذر کے نکل گئی اور اسے ہوا کے ایک جھونکے سے سردی کا احساس ہوا اور اس کے ساتھ ہی کمرے سے نکلی ہوئی دھوپ کا بھی۔!

اس نے اٹھ کے کھڑکی سے باہر دیکھا۔ کچھ مزدور کوڑا کرکٹ ڈھو رہے تھے۔ کچھ کچی اینٹیں بنا رہے تھے۔ دریا کے کنارے سے منہ کھولے ہوئے آوے تک پاؤں کے نشانوں کی پگڈنڈی سی بن گئی تھی۔ جو آوے کے کھلے منہ پر ختم ہوتی تھی۔ جہاں ایک خوش پوش انسان ایک مزدور سے باتیں کر رہا تھا۔ شاید وہ آوے کا مالک تھا اور کام کی رفتار دیکھنے کے لئے آ گیا تھا۔ باقی مزدوروں میں اس کی موجودگی سے کافی جوش و خروش پیدا ہو گیا تھا۔ اور سب کے سب مشین کی طرح کام کر رہے تھے۔ چائے بنانے والا مزدور چولھے پر مٹی کی ہانڈی کو چھوڑ کر کہیں چلا گیا تھا۔ شاید مالک کو دیکھتے ہی کام کرنے لگا تھا۔ مٹی کی ہانڈی سے بھاپ کی لٹیں اٹھ رہی تھیں اور چولھے میں جلتی ہوئی لکڑیاں آہستہ آہستہ بجھ رہی تھیں۔

تھوڑی دیر کے بعد آوے کا مالک چلا گیا اور تمام مزدور اُچھلتے کودتے کچی اینٹیں بنانے والے کے گرد جمع ہو گئے۔ اور خوشی کے اظہار میں ایک دوسرے کو گالیاں دینے لگے۔ ہوا میں خالی ٹوکرے اور پھٹی پرانی بوریاں لہرانے لگے۔ چائے پکانے والا مزدور جلد جلد چولھے کی طرف متوجہ ہوا۔ لکڑیاں پھر سے چیخ چیخ کر جلنے لگیں۔ اور ہانڈی کے نیچے شعلوں میں شاعری کرنے لگیں۔ شاید وہ بھی مالک کے چلے جانے پر مسّرت کا اظہار کر رہی تھیں۔ جاوید کے ہونٹوں پر خود بخود ہنسی آ گئی۔ اس دُنیا میں خوشی کا فلسفہ کس قدر غلط ہے۔ وہ سوچنے لگا۔ خصوصاً اس خوشی کا جو حقیقت میں خوشی نہیں

ہوتی، ظلم ہوتا ہے۔ جبر ہوتا ہے'' اسے ایک بہت بڑے غیر ملکی مفکّر کا مقولہ یاد آ گیا...... '' ہماری ہنسی ہمارے آنسو کی بدلی ہوئی صورت ہے جو آنکھوں کی بجائے ہونٹوں سے ظاہر ہوتی ہے۔ لیکن مزدوروں کا ایک دوسرے کو گالیاں دینا' ہوا میں خالی بوریاں اور ٹوکرے پھینکنا آنسوؤں کی بدلی ہوئی صورت تھی؟ اسے محسوس ہوا جیسے دریا کے پار سے سب مزدور ایک آواز میں چیخ رہے ہیں' رو رہے ہیں۔ احتجاج کر رہے ہیں اگرچہ انہوں نے بہت بڑے آوے کا بوجھ سہارا ہوا تھا۔ لیکن وہ چھت کی کڑیوں کی طرح نہ متوازی تھے نہ سیدھے۔ ان کی زندگیوں میں خم تھے۔ ان کی قسمتوں میں خم تھے اور کیا تعجّب ہے یہ خم سارے آوے کو ہی گرا دیں۔ ایسا گرا دیں کہ اس کی جگہ لاکھوں خوش پوش انسان بھی نیا آوہ نہ بنا سکیں۔ لیکن کب...... کیا کسی جھٹکے کی ضرورت تھی جو چاروں دیواروں کو اور خم دار کھڑکیوں کے سہارے ہوئے مکان کو زمین بوس کرا دیتا!

یہی سوچتے سوچتے اس کی آنکھ لگ گئی۔ وہ سو گیا۔ اور باہر لمحہ بہ لمحہ گذرتا گیا اور دھوپ کا جال ٹیڑھا ہوتا گیا۔ جب وہ جاگا تو دن بہت آگے نکل چکا تھا۔ اور پہاڑوں پر صبح کا شکاری اپنا جال سکھا رہا تھا۔ اس نے دوبارہ کھڑکی سے باہر دیکھا۔ خُدا جانے اسے اس کھڑکی سے محبت تھی یا کیوں محبت ہونے لگی تھی! اس نے دیکھا۔ کتے جا چکے تھے۔ گِدھ نورباغ کے ننگے چناروں پر اُونگھ رہے تھے اور کناروں پر گھسیٹا ہوا مردار سفید ہڈیوں کے ڈھیر میں تبدیل ہو گیا تھا۔

باہر سُرمئی سڑک پر زندگی کا شور مدھم پڑا تھا۔ البتہ دریا اس روانی کے ساتھ بہہ رہا تھا۔ اور اس کے بندھ کا نغمہ ہر لمحہ بلند سے بلند تر ہو رہا تھا اسے یاد آ گیا کہ اس نے صبح روٹی بھی نہیں کھائی تھی سوچنے کی عادت نے جواب اس کی فطرت ثانی بن چکی تھی' اسے اپنی زندگی سے کتنا بے پروا بنایا تھا۔ معاً اس کے کمرے کا دروازہ کھلا۔ اس کا

بڑا بھائی اس کے سامنے کھڑا تھا۔ ''جاوید......!''

جاوید اُٹھ بیٹھا۔ ''تم دن کو بھی سوتے ہو......؟'' جاوید نے کوئی جواب نہ دیا۔ ''صبح تم نے روٹی کیوں نہیں کھائی ؟......بھوک ہی نہ تھی! میں سب کچھ جانتا ہوں......جاوید کی آنکھیں حیرت میں گیند کے برابر ہوگئیں......آج صبح تم سڑک پر کیا کر رہے تھے؟......کچھ بھی نہیں......''

''جھوٹ! میرے منشی نے مجھے سب کچھ بتا دیا تم اپنی حرکتوں سے باز نہیں آؤ گے'' شاید آپ کو غلط فہمی ہوگئی ہے میں نے کوئی ایسی حرکت نہیں کی! لیکن تم کوارٹر سے باہر گئے ہی کیوں؟ جاوید کا چہرہ غصّے سے سرخ ہوگیا۔ کیا میں قیدی ہوں؟ اس نے اپنے آپ میں مضبوطی پیدا کر کے کہا...... جہاں میری عزت کا سوال ہو وہاں اس سے بھی زیادہ......ان کا بڑا بھائی یہ کہہ کر غصّے سے باہر نکلا اور جاوید اپنے آپ سے کہتا رہا۔ اس سے بھی زیادہ۔ مگر کیوں؟ اس لئے کہ جنت ارضی کے اس پائیں حصہ میں مردہ زیادہ ہوتے ہیں اور زندہ کم!

اس کے جذبات میں آگ لگ گئی۔ میں کسی کا قیدی نہیں ہوں۔ مجھے آزادی کا حق ہے۔ میں لذّتوں کو فنا نہیں کرنا چاہتا۔ میں زندگی کے اقتدار کو جانتا ہوں۔ زندگی کی حقیقی مسرتوں کو سمجھتا ہوں ان اور کسی کے تمام حِس فنا ہو چکے ہوں تو اس کا مطلب یہ نہیں کہ وہ اوروں کو بھی یہی درس دیتا پھرے۔ تمہیں اپنی سرپرستی کا غرور ہے تو جاؤ مجھے اس کی بھی ضرورت نہیں۔ میں سرپرستی کے بغیر ہی زندگی سے اپنے لئے جدوجہد کرنے کی اہلیت رکھتا ہوں۔ تمہارے منہ سے وہی بو آتی ہے جو آووے کے دھوئیں سے آتی ہے۔ جو گِدھوں کی ننگی گردنوں اور سرخ چونچوں سے آتی ہے......وہ تڑپ کر اٹھا اپنا بستر باندھا اور باہر نکلا جہاں رات کی مشاط سسکتے ہوئے لمحوں کو کاجل میں ڈبو رہی تھی۔ باہر منشیوں نے اسے بستر اٹھائے ہوئے دیکھا تو وہ

حیران ہو گئے اور ایک دوسرے کے ساتھ سرگوشیاں کرنے لگے...... بڑا غم خوار بنا پھرتا تھا سالا...... دو چار دن اور ٹھہرتا تو کسی سے محصول بھی وصول نہ کرنے دیتا۔......ہی ہی ہی......اس نے تانگے والے کو آواز دی اور تانگے پر بیٹھ کر جب اس نے مڑ کر دیکھا تو چنگی کے منشی اسے ننگے چناروں پر اونگھتے گِدھوں کی طرح نظر آئے اور دریا سے پار آووٴں پر ایک موہوم خاموشی اور جمود دِکھائی دیا۔ زندگی کے ان منہ کھولے ہوئے خلاؤں کا یہی علاج ہے کہ ان پر ہمیشہ ہمیشہ کے لئے موت کا سا جمود چھایا رہے......اس نے اپنے آپ کو تسلی دیتے ہوئے کہا......تا کہ زندگی ان کی مداخلت کے بغیر ہی دریا کی نرم و نازک لہروں کی طرح مکروہ مرداروں اور لاشوں کو بہائے بغیر آگے بڑھے......آگے بڑھے ......اور بڑھتی ہی رہے۔ وہ چلا گیا......اور پھر شام ہو گئی! زندگی کی تھکی ہوئی آنکھوں میں رات نے کاجل لگا دیا۔

............☆☆☆............

دریا کے کنارے سفید شاہی مہمان خانے کے باہر رحم علی غیر ارادی طور پر ایسے گھوم رہا تھا جیسے نیا نیا جانور جنگل سے پکڑ کر پنجرے میں ڈال دیا گیا ہو۔ آج اس کی چار گھنٹوں والی ڈیوٹی کا ابھی تیسرا ہی دن تھا اور جیسے اس کے تمام داخلی اور خارجی حِسیں ایک لخت بیدار ہو کر اسے جھنجھوڑ رہی تھیں۔ شاہی کوٹھیوں کے دروازوں کی پہرہ داری کس قدر کٹھن اور حوصلہ شکن ہوتی ہے! یہ اسے معلوم نہ تھا۔ وہ آج تک ہمیشہ مفصلات کے تھانوں میں رہنے کا عادی تھا...... جہاں اس جیسا ادنیٰ سپاہی بھی اپنی انفرادی شخصیت کی اہمیت کو شدّت سے محسوس کرتا ہے صرف خود ہی محسوس نہیں کرتا بلکہ اوروں کو بھی احساس دِلاتا رہتا ہے۔ مگر سری نگر جیسے پُر رونق شہر میں جہاں سینکڑوں چھوٹے موٹے افسر گلی گلی کی خاک چھانتے پھرتے ہیں۔ وہ کون تھا؟ اور یہی سوال بار بار نہ جانے کہاں سے رینگ رینگ کر اس کے سامنے آتا تھا اور اس کے قدم تیز تیز اٹھتے تھے رکتے تھے پھر اٹھتے تھے اسے اپنی شخصیت لمحہ بہ لمحہ مٹتی ہوئی سی نظر آتی تھی۔ اس تنکے کی طرح بہتی ہوئی جسے پہاڑی ندی چٹانوں سے ٹکرانے کے بعد کہیں گم کر دیتی ہے کہاں مفصلات کی نوکری اور پانچوں گھی میں اور کہاں مہمان خانے کے باہر ذلیل کتے کی طرح پہرہ دینا۔ وہاں وہ جسے چاہتا ذلیل کرتا۔ جسے چاہتا گاؤں گاؤں پر سوار کراتا۔ لیکن یہاں کیا تھا؟ کچھ بھی تو نہیں۔ زیادہ سے زیادہ

مہمان خانے کے اندر کسی کو داخل ہونے سے روک سکے گا۔ یا بنڈ پر کسی کو شور مچانے نہ دے گا تاکہ اندر وزیر صاحب کا قیلولہ خراب نہ ہو جائے۔

دن کے بارہ بج چکے تھے۔ مہمان خانے میں مکمل سکوت تھا۔ وہ سکوت نہیں جو طوفان سے پہلے سمندر میں ہوتا ہے بلکہ وہ جو پہاڑیوں سے گھری ہوئی جھیل کے پانی میں ہوتا ہے بالائی منزل کی کھڑکیاں کھلی تھیں کمروں کی منقش چھتیں اور چھتوں کے وسط میں لٹکتی ہوئی جھالر صاف نظر آ رہی تھی۔ بنڈ اور مہمان خانے کے درمیان ایک سفید اونچی دیوار حائل تھی جس کے وسط میں ایک چھوٹا سا چور دروازہ تھا۔ اسی چور دروازے کی بغل میں سنتری بکس تھا جہاں قریب کے تھانے سے ہر چار گھنٹے کے بعد نیا سپاہی پہرہ دینے کے لئے آیا کرتا تھا۔

سڑک کے کنارے کنارے دریا کی طرف لکڑی کا جنگلہ لگا ہوا تھا۔ نیچے دریا کا گھاٹ بانجھ عورت کی گود کی طرح خالی اور بے رونق تھا۔ لکڑیوں کی سیڑھی جو مہمان خانے کے چور دروازے سے دریا تک جاتی تھی، چاندی کی اس چمپا کلی کی طرح صاف اور ستھری تھی جو کسی بوڑھی طوائف نے نمائش کے لئے پہن رکھی ہو۔

رحمؔ علی کندھے پر بندوق رکھے اپنے جذبات کی تال پر دیوار کی لمبائی ناپ رہا تھا۔ اور پھر سنتری بکس تک واپس آ جاتا تھا۔ اسے دل ہی دل میں ایسی نوکری پر غصہ آ رہا تھا۔ ذلیل نوکری! کسی نے اس کے تجربے کی قدر نہ کی تھی ورنہ اس جیسا سپاہی مہمان خانے کے باہر پہرہ دینے کے لائق تھا؟ اسے تو ایسی جگہ لگایا جانا چاہئے تھا جہاں وہ اپنا کمال دکھا سکتا اور دُنیا کو دنگ کرا سکتا! اسے یہ فلسفہ بھی سمجھ میں نہ آیا کہ شاہی کوٹھیوں کے دروازوں پر پہرہ بٹھانے کی کیا ضرورت تھی! کیا مہمان خانے کے اندر رہنے والے اس قدر کمزور اور ڈرپوک ہوتے ہیں کہ سپاہیوں کا پہرہ ضروری ہے؟ وہ یہی سوچتا سوچتا قدم اٹھا رہا تھا کبھی کبھی اس کی نگاہیں بالائی منزل کی کھلی

کھڑکیوں سے گھس کر منقش چھت اور جھالروں سے ٹکراتی تھیں۔ وہ حیران تھا کہ اتنے بڑے مکان میں کون لوگ رہتے ہیں۔ کتنے ہیں وہ؟ کیسے ہیں وہ؟ پچھلے دو دن سے اس نے وہاں کسی کی صورت تک نہ دیکھی تھی۔ وہ یہ بھی نہ جانتا تھا کہ یہ کھڑکیاں کب کھولی گئی تھیں، کب بند کی جائیں گی۔ اس نے انہیں کھلا ہی دیکھا۔ اور اب بھی وہ کھلی تھیں۔ ایک عجیب خاموشی عجیب دبدبہ سارے مہمان خانے پر چھایا ہوا تھا۔ اور سفیدی کی ہوئی دیواروں نے جیسے وہاں کسی کو بولتے ہنستے یا قہقہہ لگاتے نہیں دیکھا تھا۔

پہلے اور دوسرے دن کا پہرہ اس کے سر پر بھاری بوجھ کی طرح نہیں کٹ گیا۔ چار چار گھنٹے ہی تو تھے اور پھر نیا پہرہ، نئی جگہ، نیا ماحول سب کچھ حسین ہی نظر آیا۔ حتٰی کہ سڑک کے نیچے خالی اور بے رونق گھاٹ بھی۔ پھر نوجوان میمیں اور انگریزوں کا آنا جانا۔ ان کے قہقہے، سرگوشیاں، ان کی ننگی ٹانگیں، بلوریں باہیں کٹے ہوئے بال، متناسب اعضا اور گول گول کولھے۔ لیکن آج پہرے کا تیسرا دن تھا اور ابھی سے اسے اپنے سر پر بوجھ کا سا احساس ہو رہا تھا۔ رات کی دیکھی ہوئی چیزوں کا نیاپن جیسے ختم ہو گیا تھا اور دریا کا بانجھ گھاٹ بنڈ کی سرمئی سڑک، مہمان خانے کا بیرونی منظر اور اس کی کھلی کھڑکیاں، جیسے اس نے بہت پہلے دیکھی تھیں مانا ان سب میں حُسن ہے مگر خالی حُسن سے پیٹ تو نہیں بھرتا اور رحم علی کو زیادہ افسوس یہی تھا کہ پیٹ کیسے بھر جائے۔ شام کے اخراجات جو دو ڈھائی روپے سے اوپر ہی اٹھتے تھے، کیونکر پورے ہوں۔ مہمان خانے کے باہر پہرہ دیتے دیتے کمائی کی کوئی صورت نہ تھی...... "گدھے تھے وہ جو چار گھنٹے بیل گائے کی طرح یوں سنتری بکس کے پاس بندھے رہے۔" وہ سوچنے لگا۔

سوچتے سوچتے اس کا دماغ تھک گیا۔ سامنے سنتری بکس تھا جس کا

کھلا دروازہ جیسے کہہ رہا تھا...... تھک گئے ہو۔ آؤ سب ہی یہاں بیٹھا کرتے ہیں۔ وہ کچھ اور سوچے بغیر سنتری بکس میں داخل ہوا اور لکڑی کے تختے پر جو آمنے سامنے کی چوبی دیواروں میں کیلوں سے بند تھا بیٹھ گیا۔ کندھے سے بندوق اتار کر رکھ دی اور بنڈ کی طرف دیکھتا رہا۔ لنچ کا وقت ہو رہا تھا۔ سرینگر کلب سے ریڈیو کی آواز گونج رہی تھی۔ شہد اور شراب سے بنی ہوئی میمیں اور انگریز کلب کی طرف بھاگ رہے تھے اور رحم علی اپنے دل میں خلش سی محسوس کر رہا تھا وہ راڑنا چاہتا تھا کہیں وہاں جہاں اسے تسکین ملے۔ بندوق کندھے پر اٹھا کر وہ دوبارہ باہر نکلا۔ دو ہانجی سنتری بکس سے پرے جنگلے کے سہارے باتیں کرتے کرتے جا رہے تھے ایک کہتا...... دنیا میں لینا دینا کیا ہے۔ چار دن کا جینا ہے اور پھر قبر کا حساب و کتاب۔ ہاں نام رہ جائے تو سب کچھ رہ جاتا ہے۔ دوسرا ہانجی سر جھکائے خاموشی سے سن رہا تھا جیسے اس نے بہت بڑا گناہ کیا ہو اور اب اس کی تلافی کے وسائل تلاش کر رہا ہو۔

رحم علی ان کی باتیں سن چکا تھا اور دل ہی دل میں ہنس رہا تھا...... نام...... نام کیا ہے نام میں؟ پیسہ ہونا چاہیے۔ پیشے کے بغیر انسان ایسا ہے جیسے کتا بالوں کے بغیر۔ اس نے چاہا کہ نام کا فلسفہ چھانٹنے والے ہانجی کے منہ پر تھپڑ مار کر کہے۔ کیوں اس بے چارے کی زندگی تباہ کر رہے ہو؟ یہ کون سا شوک ہے اسے اپنا نام زندہ رکھنے کی ضرورت ہے دنیا میں کرڑوں ملاح اور ہانجی پیدا ہو گئے اور مر گئے۔ صرف وہی زندہ ہیں جنہوں نے اپنے بچوں کے لئے تاج محل، سان سوئی، مس امریکہ اور نیو غزل جیسے ہاؤس بوٹ چھوڑے۔ لیکن دونوں نظروں سے اوجھل ہو چکے تھے اور اس کے ہونٹوں پر شرمائی ہوئی سی مسکراہٹ آہستہ آہستہ غائب ہو رہی تھی۔ وہ جنگلے کا سہارا لے کر بہتے دریا کو دیکھنے لگا۔ پار جھونپڑیوں اور بنگلہ نما مکانوں سے بنی ہوئی آرم واری کی بستی تھی۔ دریا کے کنارے ہوس بوٹ، کچن بوٹ اور شکارے تھے۔ اور ان سے پرے ما

ہی گیروں کے جال دھوپ میں پھیلے ہوئے۔ ہوس بوٹوں میں یہ لوگ کیوں کر رہ سکتے ہیں؟...... وہ سوچنے لگا...... نہ صحن نہ باغ نہ گھومنے کی جگہ...... یہ بھی کیا زندگی ہے کہ بیس فٹ لمبی اور آٹھ فٹ چوڑی کشتی میں قیدیوں کی طرح رہو۔ اسے اپنا گھر یاد آ گیا اوڑی سے نیچے سلام آباد میں پہاڑیوں کے دامن میں وہ کتنا حسین دکھائی دیتا تھا۔ آگے باغ اور پیچھے جھاڑیوں سے بھرا ہوا جنگل تین برس متواتر اوڑی کے تھانے میں رہ کر اس نے موروثی جائداد کو کتنی وسعت دی تھی نیا مکان نئی زمین' نیا باغ' کچھ اپنے رسوخ سے حاصل کی ہوئی کچھ رعب ادب سے اور کچھ منت سماجت سے اور پھر اتنا بڑا مکان' جیسے محل ہو۔ اسی لئے اس نے دوسری شادی بھی کی تھی کہ مکان میں ہر وقت گھما گھمی رہا کرے۔ دونوں بیویاں بہنوں کی طرح رہتی تھیں اور ان کے اس سلوک میں بھی رحم علی کے تجربے کا بڑا ہاتھ تھا۔ ورنہ سوکنیں کہیں یوں بھی رہتی ہیں......؟ کتنا ہی بڑا محل کیوں نہ ہو۔ دنوں میں اسے مرگھٹ بنا دیتی ہیں لیکن نہیں۔ رحم علی کی دونوں بیویاں اور ان کے بچے آپس میں ایسے گھل مل گئے تھے کہ کوئی فرق ہی نظر نہ آتا تھا۔ بچوں کے شور و غل سے مکان کے تمام کمرے سارا دن گونجا کرتے تھے۔ کھڑکیاں کھلی بھی رہتی تھیں۔ پھر بھی قہقہے ہوا میں تیرتے تیرتے سارے سلام آباد میں بکھر جاتے تھے۔

رحم علی کافی دیر سوچتا رہا۔ گھر کے تصور کی میٹھی یاد نے اس کے اکھڑے اکھڑے جذبات میں ایک رنگینی سی بھر دی۔ کاش اس وقت اس کے بازوؤں کے بدلے دو پر لگ جائیں اور وہ اڑتا اڑتا سلام آباد پہنچے۔ اپنے مکان کی کھلی کھڑکیوں کے نیچے اخروٹ کے درخت کی اوٹ میں رات گئے تک کھڑا رہے اور بچوں کے قہقہے سن سکے۔

اسی وقت شاہی مہمان خانے کی ایک کھڑکی زور سے بند ہوگئی۔ رحم علی کا سنہرا خواب ٹوٹ گیا۔ اس نے مڑ کر دیکھا۔ کھڑکی بند ہونے کے بعد دوبارہ کھل رہی

تھی۔ ہوا کے ایک جھونکے نے اسے دھکیل کر پھر کھولا تھا۔ وہ جنگلے کے ساتھ ساتھ چہل قدمی کرنے لگا۔ بلور کی طرح صاف سیڑھی کے نزدیک پہنچ کر یکایک اسے خیال آیا۔ کتنی ہوں گی؟ بیس سے کیا کم ہوں گی؟ اس کی ذہانت نے جواب دیا۔ نہیں زیادہ نہیں تیس سے اوپر۔ پانچ کم یا پانچ زیادہ...... اس نے کھڑے کھڑے ہی سیڑھیوں کو گننا شروع کیا لیکن دس سیڑھیوں کے بعد تمام سیڑھیاں ایک دوسرے سے ملتی ہوئی سی نظر آتی تھیں جیسے وہ سیڑھیاں نہ ہوں۔ تراشے ہوئے پتھر کی ایک بڑی سل ہو۔ جو جنم جنم کی پیاس جہلم کے پانی سے بجھا رہی ہو اور پیاس بڑھتی ہی جا رہی ہو۔

اسے اپنے آپ پر غصہ آیا۔ بلکہ کوئی چیز کانٹے کی طرح چبھتی ہوئی سی محسوس ہوئی تھانے میں وہ نوٹوں اور ریز گاری کے ڈھیر محض ایک نظر سے گن ڈالتا تھا اور یہاں چند بے جان سیڑھیاں تک نہیں گنی جا سکتیں۔ کانٹا چبھتا گیا اور روح تک پہنچا۔ اسے لکڑی کے زینے گننے چاہئیں۔ کیا ہوا دس کے بعد وہ سل بنتے ہیں۔ آخر زینے ہی تو ہیں، نوٹ نہیں۔ اس نے مہمان خانے کی طرف ایسی نظروں سے دیکھا۔ جیسے اطمینان کر رہا ہو کہ اندر سفیدی کئے ہوئے خاموش کمروں میں کوئی تو نہیں؟ کھڑکیاں کھلی تھیں اور چھت کی لٹکتی ہوئی مایوس سی جھالر جیسے کہہ رہی تھی۔ یہاں کوئی نہیں۔

وہ آہستہ آہستہ سیڑھیاں گنتا ہوا نیچے اترا۔ کل ۳۷ تھیں یعنی تیس اور سات۔ اسے فخر تھا کہ تجربے نے ذہانت کو شکست دی بیس اور تیس میں کتنا فرق ہے اُس کا اندازہ اُس کی ذہانت نے نہیں لگایا تھا۔ مگر تجربہ فوراً تاڑ گیا تھا۔ تیس سے اوپر ہوں گی۔ پانچ کم یا پانچ زیادہ۔ جب وہ واپس سیڑھیاں چڑھنے لگا تو وہ بے حد خوش تھا۔ روح تک پہنچا ہو کانٹا گرمی لگتے ہی گھی کی طرح پگھل کر گوشت اور پوست میں تحلیل ہو گیا تھا۔

چڑھتے چڑھتے پسینے کی چند بوندیں اس کے چہرے پر نمودار ہو گئیں۔

آسمان پر سورج چمک رہا تھا۔ اور بنڈ پر جنگلے کے ساتھ دو اخبار فروش بچے اسے دیکھ کر ہنس رہے تھے۔

''نیا سنتری ہے۔'' ایک کہہ رہا تھا۔

''پرسوں ایک پنڈت تھا جو سارا دن کوٹھڑی میں چلم پیتا رہتا تھا''

ہی۔ہی۔ہی......شودہ ہوگا۔

''روز بدلتے ہیں یہ۔''

''مگر یہاں کیا کرتے ہیں؟''

''پہرہ......!''

......پہرہ......؟

''ہاں اس کوٹھی میں جو رہتا ہے اس کا......''

''اس کا؟ اس نے کیا کیا ہے جو پلس (پولیس) کا پہرہ لگا۔''

حرامی! منسٹر جو ہے' نہیں لگتا پہرہ؟ بڑا دروازہ نہیں دیکھا۔ وہاں دو ہوتے ہیں......

دو......؟ باخُدا مجھے معلوم نہ تھا۔ مگر پہرہ کیوں لگتا ہے؟

یوں ہی......حاکم جو ہے......

دونوں بچے کھل کھلا کر ہنس دئے۔ جیسے انہیں اعتبار نہ آیا کہ ایسی کوٹھیوں میں رہنے والے ہمیشہ حاکم ہی ہوئے ہیں جن کے دروازوں پر سنتری پہرہ دیتے ہیں۔

رحم علی اب چار سیڑھیاں نیچے تھا۔ اس نے ان کی آخری باتیں سنی تھیں اور وہ بھی مسکرانے لگا تھا۔ سچ ہے' حاکم ہوئے۔ وہ دل ہی دل میں کہہ رہا تھا۔

اوپر پہنچ کر اس نے بیک وقت دونوں سے سوال کیا......''کیا ہے؟''

بچوں نے جھٹ اپنی گود میں اخباروں کو پھیلا کر کہا۔ آج کا تازہ اخبار

سٹیٹسمین۔ ''سول ملٹری''''ڈان...... پڑھو گے؟''

رحم علی انگریزی نہیں پڑھ سکتا تھا۔ اپنی کمزوری کو چھپاتے ہوئے بولا۔ پڑھنے کی فرصت کہاں؟ لاؤ۔ ذرا تصویریں دیکھیں۔

''سول ملٹری'' کے سرورق پر عبوری حکومت کے سرکردہ رکن پنڈت جوہر لال نہرو کی تازہ تصویر دیکھ کر اس کی آنکھوں میں چمک سی پیدا ہوگئی۔ ہونٹ مسکراہٹ میں پھیلتے پھیلتے کانوں تک پہنچنے لگے ''وہی تو ہے'' اس نے اطمینان کرنے کے بعد اپنے آپ سے کہا۔ لیکن ایسے بھی تسکین نہ پاکر ایک بچوں کو تصویر دکھاتے ہوئے بولا۔ جانتے ہو کون ہے؟ اور پھر ان کے جواب کا انتظار کئے بغیر ہی بولا...... جواہر لال ہے جسے میں نے اوڑی میں روکا تھا اور اس پر دو دِن پہرہ دیا تھا۔

بچے حیرت سے اسے دیکھتے رہے۔ انہوں نے آج سے پانچ ماہ پیشتر یہ کہانی سنی تھی اور آج ان کے سامنے جواہر لال پر پہرہ دینے والا سپاہی کھڑا تھا۔ ان کی آنکھیں پھیلنے لگیں۔ جواہر لال پر...... جو شیر کی طرح دھاڑتا ہوا کشمیر آنا چاہتا تھا۔ لیکن نہیں آسکا۔ صرف اس لئے کہ رحم علی نے اس پر پہرہ دیا تھا۔ اور اسے روکا تھا۔ اسی وقت ہوا کے ایک جھونکے سے مہمان خانے کی کھلی کھڑکی پھر زور سے ٹکرائی۔ دونوں اخبار فروش بچوں اور رحم علی نے چونک کر اس طرف دیکھا۔ ہوا کا دوسرا جھونکا پھر کھڑکی کو کھول رہا تھا۔ اور اندر لٹکتی ہوئی جھالر جھوم رہی تھی جیسے کہہ رہی تھی۔ جھوٹ...... سراسر جھوٹ......

اسی وقت دو انگریز کلب سے واپس آرہے تھے بچوں نے انہیں دیکھتے ہی جھٹ رحم علی کے ہاتھ سے اخبار کا پرچہ چھینا۔ اور صاحب اخبار، صاحب اخبار پکارنے لگے۔ دونوں انگریز اخبار دیکھ کر رک گئے اور اخباروں کی سرخیاں دیکھنے لگے۔ ایک نے جیب سے دونی نکال کر ایک بچے کے ہاتھ میں رکھی اور سول ملٹری لے کر دونوں

چل دیئے۔ رحم علی انہیں دیکھتا رہا۔ اس کے ہونٹ بڑبڑانے لگے۔ آنکھوں کی پلکیں تیز تیز جھپکنے لگیں۔ شاید وہ انہیں کہنا چاہتا تھا۔ صاحب! ہم نے اس جواہر لال پراوڑی میں پہرہ دیا ہے۔ ہم سلام آباد کا راجہ ہے ہمارے گھر میں دو بیویاں ہیں۔ لیکن انگریز جا چکے تھے اور رحم علی کے ہونٹوں کا ارتعاش آہستہ آہستہ ختم ہو رہا تھا۔ اسے اخبار کے بک جانے کا بے حد افسوس ہوا۔ ایک ہی پرچہ تھا۔ اور وہ بھی اٹھ گیا۔ قبل اس کے کہ رحم علی تھانے کے افسر، محرر اور سپاہیوں کو تصویر دکھا دکھا کر کہتا کہ میں نے اسے روکا تھا اور اس پر دو دن پہرہ دیا تھا۔

معاً اس کی نظر اس چنار پر پڑی جو سنتری بکس کے پیچھے چند قدم کے فاصلے پر سڑک کے ایک طرف کھڑا تھا تو وہ بھونچکا سارہ گیا۔ پچھلے دو دن اس نے یہ چنار دیکھا ہی نہ تھا۔ ایک تو اس لئے کی چنار سنتری بکس کے عقب میں بہت پیچھے تھا اور دوسرے اس لئے کہ دونوں دنوں کا پہرہ تماشہ دیکھتے دیکھتے ہی گذر گیا تھا۔ مگر اس کے موٹے تنے پر یہ کون لوگ تھے؟...... محمد اکبر، فیروز خان، جین سنگھ، عبدالحمید شاہ، راگو بٹ......

شاید یہ نام اسی طرح کئی برسوں سے کھدے ہوئے تھے اور یقیناً پہرہ داروں کے ہوں گے۔ جو مہمان خانے کے باہر نوکری دے چکے تھے۔ بعض ناموں کے ساتھ نمبر بھی کھدے ہوئے تھے اور بعض کے ساتھ گھر کا پتہ بھی۔ بعض تیز چاقوؤں سے چھیل چھیل کر کھودے گئے تھے اور بعض کند ہتھیاروں سے۔ بعض سے فن کارانہ صلاحیت جھلکتی تھی اور بعض سے الھڑپن۔

حیرت سے رحم علی کی آنکھیں پھیلنے لگیں۔ اُسے یہ جدّت بے حد پسند آ گئی شاید بے کیف پہرے کے وقت کو ٹالنے کے لئے سپاہیوں نے اسے ایجاد کیا ہو۔ وہ سوچنے لگا۔ جدّت بھی کیا ہے۔ اچھی خاصی یادگار ہے جو سینکڑوں برس قائم رہ سکتی ہے

اس نے مدرسے میں اشوک کے کتبوں کے متعلق پڑھا تھا جس نے شہر شہر اپنے احکام پتھروں پر کھدوائے تھے۔ آج اشوک اسی لئے زندہ ہے کہ اس کے کتبے زندہ ہیں ورنہ ہزاروں اشوک آئے اور گئے۔ صرف وہی اشوک زندہ ہے جس کے کتبے بکھرے ہوئے ہیں۔ یقیناً اگر آج اشوک ہوتا تو پتھروں کی بجائے وہ بھی چناروں ہی کو پسند کرتا۔ ہری بھری ٹہنیوں کی چھاؤں تلے موٹے اور کھردرے تنے پر کھدائے ہوئے نام......لافانی کتبے!

اسے چنار کی عظمت کا شدید احساس ہونے لگا جس نے اپنی ننگی چھاتی معمولی سپاہیوں کے تیز اور کند ہتھیاروں سے چھلنی کرادی تھی اور اب ان سب کے نام اپنے سینے پر لئے دنیا کو دکھا رہا تھا۔ دل ہی دل میں نام کھودنے والوں سے نفرت بھی ہونے لگی۔ اسلام کسی کو ایذا دے کر اپنا نام زندہ رکھنے کا حامی نہیں۔ مگر یہاں نام کھودنے والوں میں سِکھ بھی تھے اور پنڈت بھی......اور نام اس ترتیب سے کھودے گئے تھے کہ یہ اندازہ لگانا مشکل تھا کہ سب سے پہلے کس کے دماغ نے اس جدّت کو جنم دیا۔ رحم علی نے اس سے قبل کئی جگہوں پر ایسی بے ہودگیاں دیکھی تھیں لیکن اتنی اہم نہیں جتنے اہم یہ کتبے تھے جہاں پر سپاہی صرف چار گھنٹے کے لئے پہرہ دیتا ہے اور جہاں اندر خاموشی مگر پُر رعب کوٹھی میں وہ جادوگر رہتا ہے جس کی صورت سپاہیوں کو دکھائی تو نہیں دیتی لیکن جس کے سانس کی ہر دھڑکن چالیس لاکھ انسان محسوس کرسکتے ہیں۔

وہ حیران تھا کہ ان سپاہیوں میں اتنی جرأت کہاں سے آگئی کہ انہوں نے چنار کے تنے پر اپنے کتبے لکھے۔ لیکن نہیں......وہ سپاہی تھے جو ڈرتے ہیں۔ جو بے تاج بادشاہوں پر بھی پہرہ دیتے ہیں۔ بشاشت کی اسی لذّت نے اس میں نئی قوت پیدا کردی۔ وہ اکتاہٹ وہ بیزاری اور جس کا احساس جیسے یک لخت مٹ گیا۔ اس نے

جنگلے کے ساتھ کھڑے اخبار فروشوں کی طرف دیکھا اور پوچھا۔ ''چاقو ہے؟ بچے اس کا مطلب نہ سمجھ سکے۔ سہمی سہمی نظروں سے اسے دیکھتے رہے اور اس نے پھر پوچھا۔ چاقو ہے؟'' کیا کرو گے؟ ایک بچے نے ہمت کر کے پوچھا۔

رحم علی کے ہونٹوں پر خود بخود مسکراہٹ بکھر گئی۔ بولا۔ نام لکھوں گا۔

''نام......؟''

''ہاں......اپنا نام۔''

لیکن اس پر نام لکھنا اب منع ہے۔

''منع ؟'' رحم علی کی آنکھوں میں حیرانیاں پھرنے لگیں۔ اسے محسوس ہوا جیسے اس کا سب کچھ یہی ایک لفظ کہہ کر چھینا گیا۔ بہادری' بشاشت' لازوال بننے کی آرزو......!

''کس نے منع کیا ہے؟'' اس نے نزدیک جا کر پوچھا

بچوں نے مسکرا کر کہا۔ ''حاکم نے اور کس نے''

تھوڑی دیر کے لئے رحم علی کھدے ہوئے ناموں کی طرف دیکھ کر سوچتا رہا۔ شاید فیصلہ نہ کر سکا کہ اسے مرگ انبوہ میں شامل ہونا چاہیے یا نہیں۔ قانون کا احترام کرنا سپاہی کا فرض ہے۔ اسے نام نہیں لکھنا چاہیئے۔ حاکم نے منع کیا ہے۔ اسلام بھی ایذا رسانی کا حامی نہیں مگر اشوک......! جواب تک زندہ ہے۔ بچوں کی کتابوں میں لوگوں کے دلوں میں اُجڑے ہوئے شہروں کے کھنڈروں میں ہندوستان کی تاریخ میں ......جو امانت کی طرح صدیوں سے سینہ بہ سینہ چلا آتا ہے اور خُدا جانے کتنے کہاں تک اسے لے جائیں۔ سلام آباد کا محل کسی دن گر جائے گا۔ بہنوں کی طرح رہنے والی بیویاں مر جائیں گی۔ وسعت دی ہوئی موروثی جائداد دھوپ چھاؤں کی طرح کبھی ایک کے پاس رہے گی۔ کبھی دوسرے کے پاس مگر چنار کا نام ہمیشہ زندہ رہے گا۔

کوٹھیاں بدلیں گی۔ گھاٹ آباد ہوں گے۔ وزیر بدلیں گے اور تنے پر لکھا ہوا کتبہ امر ہو جائے گا۔ اسے کوئی نہیں مار سکتا۔ کوئی نہیں مٹا سکتا۔ کوئی نہیں بدل سکتا۔ وہ تاریخ بن جائے گا۔ اشوک کا کتبہ ہو کر رہے گا۔ لافانی اور لازوال!

اسی جذبے سے متاثر ہو کر فوراً بندوق کو ایک طرف رکھ کر اس نے سنگین اتاری۔ اور اس کی نوک سے چنار کی ننگی چھاتی چھیلنے لگا۔ یہ ایذا ضرور ہے۔ مگر اس ایذا کے پیچھے جب ابدیت ابھرنے والی ہو۔ تو ایذا' ایذا نہیں رہتی۔ وہ اپنا نام کھودتا رہا۔ کھودتا رہا۔ ایسی جگہ جہاں اس کی انفرادی شخصیت اوڑی کے تھانے کی طرح جداگانہ حیثیت رکھتی تھی۔ کھودتے کھودتے اسے یقین ہوتا جاتا تھا جیسے وہ اشوک بنتا جا رہا ہے۔ سلام آباد کا اشوک...... پولیس کا اشوک...... جیسے وہ اب کبھی نہیں مر سکتا۔ اسے کوئی نہیں مار سکتا اور جب وہ نام کھود چکا تھا تو سنگین کی نوک چنار کے سفید لہو سے بھیگ چکی تھی۔ مگر اسی لہو کے نیچے سے ایک نئی ہستی ...... نیا اشوک...... ابھر گیا تھا۔ رحم علی۔

اور جب پہرہ ختم ہو کر وہ تھانے کی طرف جانے لگا۔ اس نے ایک بار پھر اپنے کتبے پر نظر ڈالی۔ فرط مسرت سے اس کا سینہ پھٹا جا رہا تھا۔ اس کے پاؤں زمین پر تھے لیکن اس کی روح' اس کا دماغ' اس کا ذہن بادلوں کو چیر پھاڑ کر آسمان کی وسعتوں میں اڑا جا رہا تھا۔ جیسے وہ آسمان کی نیلاہٹ کو چھونے کا قصد کر چکا ہو تو اسے محسوس ہوا۔ جیسے چنار پر لکھے ہوئے نام مسکرا رہے ہوں۔ اور چنار کا چھلا ہوتنا کہہ رہا ہو...... جاؤ...... یہ کتبے میرے پاس امانت ہیں' اس وقت تک جب تک معاوضے کیلئے انصاف کی عدالت فیصلہ کرنے بیٹھے گی اور حاکم اور محکوم کی سچی تعریف کرے گی۔

...........☆☆☆...........

اَن کوٹ

ان کوٹ کی تقریب ہونے والی تھی اور دوپہر کو ہزاروں بچے اور ہمیشہ کے بیمار بھک منگے جمع ہو گئے تھے۔ دھوپ قدرے تیز تھی اور چاند ماری کے میدان کی گھاس مرجھا گئی تھی۔ لوگ برابر خیموں کی طرف بڑھے آ رہے تھے، جہاں چاول کے بورے رکھے گئے تھے اور مہاراجہ گاڈ پہرے پر حاضر تھے۔ میدان کے اردگرد اگرچہ بلند قامت اور تناور چنار کھڑے تھے، لیکن اس وقت ان کے زندگی بخش سایے بے حقیقت تھے، ان کی فرحت بخش خنکی، ہرے ہرے پتوں کی بھینی بھینی خوشبو کسی کو اپنی طرف متوجہ نہ کر سکتی تھی۔ اتاولے آگے ہی آگے بڑھ رہے تھے۔ ان میں سے کتنے ہی خیموں کے بالکل سامنے دھرنا مار کر بیٹھ گئے۔ اُن مُضطرب اور شکست پسند روحیں خاموش خیموں کا طواف کرنے لگیں اور ٹٹولتی ہوئی نظریں اندر جھانکنے لگیں۔ چاول ...... بے شمار چاول! اتنے چاول آئے کہاں سے؟ بازار میں ایک دانہ بھی نصیب نہیں ہوتا اور یہاں چاولوں سے بھرے ہوئے بورے ہی بورے...... پہرے داران کی بے تابانہ سرگرمیوں سے تنگ آنے لگے، تعداد بڑھتی گئی اور اس کے ساتھ ہی اضطراب اور کرید بھی بڑھتی گئی۔ ان پتلی پتلی کم مایہ لہروں کی طرح جو کسی گہری جھیل میں بالکل غیر ارادی طور پر کنکر پھینکنے سے سطح آب پر ابھرتی ہیں اور پانی کی نیلاہٹ پر تیرتی ہوئی اپنے دائرے کو وسیع سے وسیع تر بنائے چلی جاتی ہیں......

اتاؤلے! ابھی ایک ہی بجا ہے اور سارا شہر ٹوٹ پڑا ہے جیسے بھوکوں اور بھک منگوں کے سوا یہاں کوئی رہتا ہی نہیں......!

"کیوں سنتری جی! چاول کس وقت ملیں گے" ایک ادھیڑ عمر کے انسان نے چہرے پر مصنوعی مسکراہٹ پھیلا کر پوچھا۔

چاول......؟ ہاں، شام کو سورج ڈوبنے سے پہلے۔!

"سب کو ملیں گے نا جی؟ اس نے دوسری بار پوچھا اور اس کا جواب سننے کے لئے دوسرے بھک منگے حاجت مند اور ناتواں بوڑھے نزدیک نزدیک آنے لگے۔ سب کے چہروں پر پوشیدہ جذبات کی ایک سنہری لکیر سی نمودار ہوگئی۔ مہاراجہ گارڈ نے بے پروائی سے منہ پھیر کر کہا۔ سب کو ملیں گے نگاہوں ہی نگاہوں میں مسرت اور مبارک باد کے پیغامات دئے جانے لگے۔ دھڑکتے ہوئے سینے اور تھرتھراتے ہوئے اعضاء سہارا پا کر اعتدال پر آنے لگے......' چاول سب کو ملیں گے!"

ادھیڑ عمر کے انسان نے گود میں تھامے ہوئے بچے سے کہا۔ سن لیا، تم کو بھی ملیں گے۔ سنتری صاحب کہتا ہے سب کو چاول ملیں گے۔ بچہ نادانستہ طور پر ہنس دیا۔

دوسرے بچے نے جو زمین پر لکیریں کھینچ رہا تھا۔ چونک کر اپنا سر اوپر اٹھایا۔ اور پوچھا۔ "مجھے نہیں؟" باپ نے ہنس کر کہا۔ ارے تمہیں بھی، یہ چاول سب کو ملیں گے۔ تمہیں بھی، اسے بھی اور مجھے بھی۔

"اور اماں کو نہیں؟" بچے نے دوبارہ پوچھا۔

باپ نے اسی انداز میں کہا۔ نہیں اُسے نہیں، وہ بیمار نہ ہوتی اور یہاں آئی ہوتی جب ملتے۔

بچے کی مسرت چراغ کی اس لو کی طرح بجھ گئی جسے اچانک پھونک مار کر بجھا دیا جائے لیکن دوسرے ہی لمحے میں اس لو کے کثیف دھوئیں سے ایک سوال بن گیا۔

کس کے ہیں یہ چاول؟

باپ نے مسکرا کے کہا۔ مہاراج صاحب کے جو ہمارے مائی باپ ہیں۔ بچہ خاموش ہوگیا۔ اس کی گوری گوری پلکیں تیز تیز جھپکنے لگیں۔ اُس نے پھر خیموں کی طرف دیکھا اور پھر اپنے باپ کی طرف۔۔۔۔۔۔ اتنے چاول کیا کسی مائی باپ کے ہوا کرتے ہیں؟...... اسے سارا میدان ایک خلأ دکھائی دیا۔ منہ کھولے ہوئے' ساکن اور جامد' اور نہ جانے اس نے اس جامع لفظ کے متعلق کیا سوچا' مائی باپ! جن کے گھر میں وہ پیدا ہوا۔ وہ بھی مائی باپ جو اتنے چاول بانٹتا ہے' وہ بھی مائی باپ!

اس نے پھر اپنے برابر بیٹھے ہوئے باپ کی طرف کریدتی ہوئی نظروں سے دیکھا اور دل ہی دل میں اس کی ماتا کو للکار للکار کر پوچھنے لگا۔ ''تمہارے چاول کہاں ہیں؟ خیمے کہاں ہیں؟ سنتری کہاں ہیں؟ کل سے اماں کو فالودہ نہیں ملا اس کی چھاتیوں سے ننھے بچے کے لئے دودھ نہیں نکلا۔ کیوں؟ آخر کیوں؟ تم بھی تو مائی باپ ہو۔''

ماتا سے کوئی جواب نہ پا کر وہ ان ہی لکیروں کو دیکھنے لگا جو کچھ دیر پہلے وہ غیر ارادی طور پر کھینچ چکا تھا اور جن سے اس نے کچھ تسکین سی...... انتظار اور بھوک کی۔ ...... حاصل کی تھی' لیکن اب اس کے اعضأ میں تناؤ سا آ گیا تھا اور اس جذب کرنے کے لئے وسعت اور نہ جانے کس چیز کی ضرورت محسوس ہونے لگی۔ وہ چھوٹا سا گڑھا کھودنے لگا اور کھودتا رہا۔ اپنی اُنگلیوں سے' اپنے ناخنوں سے' اپنے تناؤ کی غیر معمولی طاقت سے' اتنے میں اور پہرے دار خیموں کے پاس جمع ہوگئے ان میں سے ایک نے حقارت بھری نظروں سے ان کی طرف دیکھا' جن کی مری ہوئی آنکھوں میں چاول کے بورے دیکھ کر زندگی کے لال لال شعلے دہکنے لگے تھے' جو اپنے غلیظ گرتے ہوئے اور بوسیدہ جسموں کو گھسیٹ کر' لاٹھیوں کو تھامے ہوئے میدان تک لے آئے تھے جن

کی ننگی پیٹھوں پر پسینے کے قطرے ایک دوسرے سے الجھ رہے تھے اور بہہ کر چیتھڑوں میں غائب ہو رہے تھے جن کی پلکیں ذراسی آہٹ پر تیز تیز جھپکتی تھیں۔ اور زبانیں سوکھ سوکھ جاتی تھیں۔

پہرے دار نے ریڈ لیمپ کا سگریٹ سُلگا کر اپنے ایک ساتھی سے کہا۔

۔۔''یہ ہاتو ہیں ہاتو' انہیں ذراسی ڈھیل دو گے تو سر پر چڑھ جائیں گے' ہٹا دو انہیں پیچھے۔''

اور دوسرے ہی لمحے انہیں خیموں سے بہت دور دھکیل دیا گیا۔ وہ وہاں بھی غیر منظّم طور پر بڑی بڑی ٹولیاں بنا کر بیٹھ گئے اور ایک ہی موضوع پر قیاس آرائیاں کرنے لگے۔ حالانکہ مذہب جدا جدا تھے' عقیدے الگ الگ تھے۔ لیکن مفاد مشترک تھا۔۔۔۔ان کوٹ کے چاول۔۔۔۔۔انہیں پہرے دار کے ذلت آمیز سلوک کا مطلق افسوس نہ تھا اور ہوتا بھی کیوں؟ پہرے دار نے کون سی لاٹھیاں برسائی تھیں' کسے گالی دی تھی کسے تھپڑ رسید کیا تھا؟ حالانکہ ایسے موقعوں پر اس طرح کا سلوک زیادہ بُرا انہیں معلوم ہوتا۔

ٹولیوں میں کچھ ایسے تھے جو اس اَن کوٹ پر پہلی بار آئے تھے' ان کے لئے اتنا ہجوم' اتنے خیمے اور خیموں میں رکھی ہوئی بوریوں اور وردی پوش پہرے دار تعجب خیز تھے۔ کیا ہوگا۔ کیسے ہوگا۔ کب ہوگا۔ وہ ساتھیوں سے یہی سننا چاہتے تھے اور اپنی آنکھوں سے دیکھنا بھی چاہتے تھے............اور کچھ ایسے بھی تھے جنہیں ان کوٹ کی تقریب بالکل اپنی سی دکھائی دے رہی تھی۔ جنہوں نے وہ دن بھی دیکھے تھے جب میدان میں انگلیوں پر گننے کے قابل لوگ آیا کرتے تھے اور بوریاں بھر بھر کر چاول لے جاتے تھے۔ لیکن آج وہ بھی حیران تھے کہ اتنے لوگ آئے کہاں سے؟ اتنی بھوک آئی کہاں سے؟ کیسے آگئی اور کیوں آگئی؟ کرہ ارض روز بروز ٹھنڈا ہوتا جا رہا

ہے۔لیکن اس ارض میں رہنے والوں کے پیٹ کی جہنمی بھٹیاں تپتی ہی جارہی ہیں، دہکتی ہی جارہی ہیں۔ یہ سوال اُن سب کے دماغوں میں گھوم رہا تھا اور دور بٹہ مالنہ، بمنہ اور چھتہ بل سے آنے والی کچی اور پکی سڑکوں پر لوگ رینگتے چلے آرہے تھے، بچوں کو تھامے ہوئے، لاٹھیاں ٹیکتے ہوئے، کھانستے ہوئے اور معلوم ہوتا تھا جیسے سب یہی چاہتے ہوں کہ اپنے ساتھیوں سے پہلے خیموں کے پاس پہنچ جائیں۔

دیکھنے والے انہیں دیکھتے تھے اور دل ہی دل میں سوچتے تھے، کاش ان سڑکوں پر اتنے گڑھے پیدا ہوں کہ کوئی انہیں عبور نہ کرسکے۔ یا کاش! یہ بلند قامت چنار دھڑام سے گر جائیں اور سورج ڈوبنے سے پیشتر راستے مسدود ہو جائیں اور میدان میں صرف وہی رہ جائیں جنہوں نے دھکے سہے تھے، لکیریں کھینچی تھیں، گڑھے کھودے تھے......لیکن آنے والے آتے گئے اور سروں کا دائرہ بڑھتا گیا۔حتی کہ سب مرگ ابنوہ میں شامل ہوگئے۔ نئے آنے والوں نے پھر وہی سوالات دہرانے شروع کئے جوان سے پیشتر آئے ہوئے نے لوگوں ایک دوسرے سے پوچھے تھے۔یا کسی راہ رو سے پوچھ لئے تھے۔کب ملیں گے چاول؟......کن کو ملیں گے؟ کتنی بوریاں ہیں؟ ......کتنے خروار؟......اشتیاق کے اتھاہ سمندر میں بیم و رجا کا مدو جزر اندر ہی اندر پیدا ہوتا رہا، لہریں اُٹھتی رہیں اور اٹھ اٹھ کر ہٹتی رہیں۔

ایک بھک منگے نے تحصیل کے چپڑاسی کو آتے دیکھا تو اپنے لئے ہمدردی پیدا کرنے کی نیت سے خیر عافیت پوچھی۔ چپڑاسی نے قدم روک لئے اور اسے سر سے پاؤں تک دیکھنے لگا۔ بھک منگے نے پوچھا۔ ''نہیں پہچانتے؟ پچھلے سال ماہِ رمضان کے دنوں میں جب پولیس نے میر چالان کر دیا تھا، میں نے تمہیں دونی دی تھی عرضی پر دستخط کرانے کے لئے......اب پہچانا؟''

چپڑاسی نے حقارت آمیز قہقہہ لگایا اور کہا...... ''تم پچھلے سال کی بات کر

رہے ہو۔ یہاں تورات کی بات یاد نہیں۔"

بھک منگا اٹھ کھڑا ہوا۔ اس کے ہونٹ کانوں تک پہنچ گئے۔ بولا۔ "لیکن دونی تو یاد ہوگی۔ ہم یاد نہیں۔ تو نہ سہی؟"

چپڑاسی نے قدم اٹھاتے ہوئے کہا۔ بابا کئی لوگ دونیاں دیتے ہیں، اب کس کس کی دونی یاد رکھیں۔ وہ خیموں کی طرف چلا گیا اور بھک منگا اسی طرح حیران و پریشان دیکھتا رہا۔ اسے چپڑاسی کی یہ غفلت بہت اچنبھی معلوم ہوئی۔ دنیا میں کیا ایسا بھی ہوتا ہے کہ دونیاں تک بھلا دی جائیں؟ کم از کم اس کا حافظہ اتنا کمزور نہ تھا، اسے دس سال سے آج تک ہر وہ پیسہ یاد تھا جو اس کمایا تھا اور تکیے میں سلفے پر لٹایا تھا، اپنے ساتھیوں میں خفت کو مٹانے کے لئے اس نے مصنوعی طور پر ایک ہلکا سا قہقہہ لگایا اور اپنی جگہ بیٹھتے ہوئے بولا...... "خُدا کی قسم! بڑا موٹا ہو گیا ہے، دونی لے کر صاف مکر گیا۔"

دو چار بھک منگے اور بوڑھے سوکھی سی ہنس دیئے اور دو چار بچوں کی آنکھیں سوجھ سی گئیں۔ ان ہی میں سے ایک بچے نے دوڑ کر اپنے باپ سے پوچھا۔ یہ کون تھا؟

باپ نے بالکل مختصر مگر جامع الفاظ میں کہا۔ "یہ ہمارے تحصیل دار صاب کا چپڑاسی ہے، بڑا نیک مسلمان!"

بچہ چپ ہو رہا۔ حالانکہ اس کی روح پھر بھی پیاسی ہی رہی۔ سوچتا رہا، کیا نیک وہی ہوتا ہے جو دونیاں لے کر صاف مُکر جائے......اس کے دل میں دوسرا بلبلے کی طرح ابھرا۔ "اور تحصیل دار صاب؟"

باپ کی آنکھوں میں بہت ساری عقیدت سمٹ کر جمع ہو گئی۔ "بولا وہ بڑا حاکم ہے، ہمارا مائی باپ!"

مائی باپ کا دھندلا سا خاکہ بچے کے ذہن میں دوبارہ چمک اٹھا۔ کتنے مائی باپ ہیں دنیا میں؟ اس نے معنی خیز نگاہوں سے دیکھ کر پوچھا۔ ''تم نے کہا تھا مہاراج صاب (صاحب) مائی باپ ہیں؟''

باپ نے ہلکا سا قہقہہ لگایا اور کہا۔ ''مہاراج صاحب بڑے مائی باپ ہیں۔ اور تحصیل دار صاب چھوٹے''

بچہ پھٹی پھٹی نظروں سے خیموں کی طرف دیکھنے لگا۔ جہاں چاول بانٹنے کے لئے سرگرمیاں شروع ہوگئی تھیں، مہاراجہ گارڈ، تحصیل کے منشی اور چپڑاسی اِدھر سے اُدھر پھر رہے تھے، مائی باپ ہی مائی باپ دماغی اُلجھنوں سے تنگ آکر اس نے کہا۔ ''چلو گھر چلیں، مجھے بھوک لگی ہے''

باپ یہ سننے کے لئے بالکل تیار نہ تھا۔ اس کے سامنے سورج ڈوبنے سے پہلے نئی دنیا آباد ہونے والی تھی اور بچہ اسے واپس جہنم میں لئے جارہا تھا جہاں مٹی کی میلی ہانڈیاں اوندھی پڑی تھیں اور چولھے کے آگے مکڑی نے جالا بن رکھا تھا۔ اس نے غضبناک ہوکر اس کی طرف دیکھا اور کہا۔ ''بھوک لگی ہے نواب زادے کو لیکن گھر میں کھاؤ گے کیا؟ کلیجہ اپنا یا مہری کا؟''

مہری کا خیال آتے ہی بچہ دبک کر بیٹھ گیا۔ باپ کے مقابلہ میں مہری اسے کم پیٹا کرتی تھی، اور تو اور اس نے حال ہی میں ایک ننھا سا بچہ جنا تھا۔ جس سے وہ کھیلا کرتا تھا۔ باپ نے اپنی دھمکی کو ناکافی محسوس کرتے ہوئے کہا۔ ''اگر آرام سے نہ بیٹھو گے تو چاول نہیں ملیں گے اور مہری اور...... مہری کا بچہ دونوں......''

آگ پر پڑے ہوئے پانی کی طرح بچے کے دل اور دماغ، زبان اور آنکھوں سے گرم گرم دھواں اٹھا، بے پناہ دھواں جس سے نہ خیمے نظر آئے، نہ میدان اور نہ میدان میں جمع ہوئے لوگ! جس میں اسے صرف ایک ہی صورت، ایک ہی چہرہ

اداس اور مردہ سا دکھائی دیا......مہری......اس نے چاہا کہ دوڑ کر خیموں کے پاس چلا جائے اور چاول کی تمام بوریاں پیٹھ پر لاد کر بھاگ جائے' بھاگ جائے اس دھوئیں میں اور مہری سے کہہ دے' کھاؤ فالودہ اور جنتی جاؤ بچے۔ اس دُنیا میں چاولوں کی کمی نہیں' یہاں ہزاروں چھوٹے بڑے مائی باپ ہیں جو دونیاں لے کر مُکر جاتے ہیں۔ میدانوں میں چاول بانٹتے ہیں' گالیاں دیتے ہیں' لیکن تمہیں ان سے کیا؟ تمہیں فالودہ چاہیئے اور میرے ساتھی کو تمہاری چھاتیوں کا تازہ دودھ! تم مجھے ہر سال نیا ساتھی دیا کرو۔ میں ہر سال اَن کوٹ کے چاول لایا کروں گا۔

اتنے میں تحصیل دار صاحب تانگے پر آ گئے۔ ہر طرف ایک ہلچل مچ گئی۔ لوگوں کو قطار میں بیٹھایا گیا۔ عورتوں اور بھک منگوں نے گود میں تھامے ہوئے بچوں کو زمین پر بٹھایا۔ تا کہ وہ بہت بڑے دکھائی دیں اور اپنے حصے سے محروم نہ رہیں۔ لیکن ادھیڑ عمر کے انسان کا معصوم بچہ نہ جاگا۔ سورج کی ڈوبتی ہوئی کرنوں سے اسے ماں کی طرح لوریاں سنا سنا کر باپ کی گود میں سلا دیا تھا اور اسے ایسی دنیا میں پہنچا دیا تھا جہاں نہ اَن کوٹ کی تقریب ہوتی ہے نہ مائی باپ چاول بانٹتے ہیں اور نہ مہری فالودے کی منتظر رہتی ہے۔ باپ نے شروع شروع میں اسے آہستہ سے جگانا چاہا۔ لیکن جب کوئی تدبیر کارگر نہ ہوئی تو جل بھن کر ایک تھپڑ مارا۔ بچہ بلبلا کر رونے لگا۔ اس کے نرم و نازک گالوں پر انگلیوں کے نشان لگ گئے۔

''دیکھ چاول مل رہے ہیں' چاول'' باپ نے اسے بہلانے کی کوشش کرتے ہوئے کہا۔ بچے نے روتے ہوئے اپنی آنکھوں سے خیموں کی طرف دیکھا اور آہستہ آہستہ چپ ہونے لگا۔

ایک براہمن نے ان کے سامنے کھڑے ہو کر اپنے ساتھی براہمن سے کہا۔ ''کہاں بیٹھیں' سب مسلے ہی مسلے ہیں۔'' ساتھی نے نفرت آمیز نظروں سے بیٹھے

ہوئے لوگوں کو دیکھا اور پھر جلد جلد اپنا جنیئو پیرہن کے اندر چھپانے لگا۔ جو کھلے سینہ کی وجہ سے دکھائی دے رہا تھا۔

''ارے بھائی جگہ دو گے؟'' اس نے قطار میں بیٹھے ہوئے بھک منگوں سے کہا۔ جو آٹھ دس براہمنوں کے دائیں بائیں بیٹھے تھے۔ بھک منگوں نے اپنی گردنیں اوپر اٹھائیں۔ بڑی مشکل سے انہوں نے پہلی صف میں جگہ حاصل کی تھی۔ پھر یہ اُٹھانے والا کہاں سے آٹپکا۔ ''پیچھے بیٹھو پیچھے۔'' دوسری قطار سے آوازیں آئیں۔ دونوں براہمن کھسیانے ہو کر دوسری قطار میں داخل ہوگئے۔ لیکن وہاں بھی جگہ نہ ملی۔ پھر تیسری قطار میں آپہنچے وہاں کچھ اور براہمن پہلے سے بیٹھے تھے۔ بھائی ذرا جگہ دینا۔ ایک براہمن نے مسلمان بھک منگے سے کہا۔

''کیوں؟ میں تم سے پہلے آیا ہوں''

''ارے وہ بات نہیں، یہاں اپنی برادری ہے اس لئے......''

دوسری قطار میں بیٹھے ہوئے ایک بھک منگے کے سر پر جیسے لاٹھی لگی۔ چمک کر بولا۔ ''کیسی برداری؟' یہ میدان ہے۔ برادری کا اتنا خیال تھا تو آئے ہی کیوں؟''

تمام صفوں میں اس فلسفیانہ نقطۂ نظر پر قہقہے بلند ہوئے۔ کیسی برادری؟ براہمن کھسیانے سے ہوگئے۔ ان کی آنکھوں میں بہت پرانا زمانہ پھر گیا۔ جب براہمن کی توہین کرنے والوں کو سراپ دے کر بھسم کیا جاتا تھا۔ لیکن اب ایسا زمانہ آگیا تھا۔ کہ اسی براہمن کو اَن کوٹ کے چاول لینے کے لئے قطاروں میں جگہ نہ ملتی تھی انہیں ان چند براہمنوں پر بھی غصہ آیا جو اگلی قطاروں میں بیٹھے تھے اور ملیچھ بھک منگوں کے قہقہوں کے ساتھ قہقہے ملا رہے تھے...... پاکھنڈی...... نیچ......

چاول تقسیم ہونا شروع ہوگئے۔ ''مجھے دے دو، اسے دے دو'' کے شور سے آسمان گونج اٹھا۔ پچھلی قطاروں میں ارتعاش سا پیدا ہوگیا۔ سب آگے ہی آگے رینگنے

لگے۔ ادھیڑ عمر کے انسان کی گود میں چھوٹا بچہ تھا اور بڑا بچہ حیرت سے تماشہ دیکھ رہا تھا۔ چاول بانٹنے والا منشی اس کے قریب پہنچا۔ اس نے اپنا حصہ دامن میں لے لیا۔ بڑے بچے کا حصہ رومال میں باندھا، لیکن چھوٹا بچہ...... وہ سو گیا تھا اور منشی اسے نظر انداز کر کے آگے نکل گیا۔

باپ تڑپ اٹھا۔ اسے محسوس ہوا جیسے سارے دن کی عبادت رائیگاں گئی اسے سوئے ہوئے بچے پر اتنا غصہ آیا کہ ایک بار بے اختیاری کے عالم میں اس کا ہاتھ بچے کا گلا گھونٹنے پر بھی اٹھا۔ کم ذات، خبیث، سارا دن جاگتا رہا اور اسی وقت...... وہ اب قطار میں نہ بیٹھ سکا۔ کیسی تنظیم؟ کیسا شیرازہ؟

اس نے بچے کو دوبارہ جھنجھوڑ جھنجھوڑ کر جگایا اور دیوانوں کی طرح بچوں، بوڑھوں اور عورتوں کو پھلانگ کر وہاں پہنچا۔ جہاں چاول بانٹنے والا منشی پہنچ گیا تھا۔

"حضور اسے دے دو۔ یہ سو گیا تھا"

منشی نے نگاہ غلط انداز سے اس کی طرف دیکھا۔ تنظیم میں بیٹھے ہوئے لوگ بے قرار سے ہو گئے اور آپس میں ایک دوسرے سے کہنے لگے۔ "بڑا لالچی ہے دوسری بار لینا چاہتا ہے"

"خدا کی قسم! یہ سو گیا تھا۔ اسے چاول نہیں ملے"

"اب اسے اگلے سال لانا۔" ایک بھک منگے نے ازارہ تمسخر کہا۔

وہ دوبارہ منشی کے پیچھے ہو لیا۔ "حضور مائی باپ ہیں۔ اس کی ماں بیمار ہے کل سے بھوکی ہے۔ اسے بھی دے دو۔"

قطار میں بیٹھے ہوئے وہ لوگ جن کی باری آنے ولی تھی، اس کی بے صبری برداشت نہ کر سکے۔ "اسے باہر نکال دو حضور، ہماری باری پر گڑبڑ مچانے آیا ہے"

منشی کے اشارے پر دو مہاراجہ گارڈ آگے آئے اور اسے بری طرح سے پیٹتے ہوئے باہر دھکیل دیا۔

....

سورج ڈوب گیا۔ بھیڑ ختم ہوگئی اور اس کے ساتھ ہی اگلے سال تک اُن کوٹ کی تقریب بھی، لوگ بٹہ مالنہ، بمنہ اور چھتہ بل کی کچی اور پکی سڑکوں پر جانے لگے، صرف چاند ماری کے میدان سے ذرا ہٹ کر چناروں کے نیچے ادھیڑ عمر کے انسان نے اپنے دامن اور رومال میں چاول کے دو حصے ملا کر تین حصے کر دیئے، برابر برابر اور اپنے سہمے ہوئے دو بچوں کو مخاطب کرتے ہوئے بولا...... "یہ تمہارا...... یہ تمہارا......اور یہ میرا......"

...........☆☆☆...........

سوغات

نیل کنٹھ نے اپنا سر ماں کی گود میں رکھتے ہوئے کہا...... ''تم اطمینان رکھو ماں میں بخیریت لوٹوں گا۔ آخر پندرہ دن ہوتے ہی کیا ہیں؟''

ماں نے اپنے بائیں ہاتھ کی نحیف انگلیوں سے، جن کا گوشت سوکھ گیا تھا۔ آنسو پونچھتے ہوئے کہا۔ ''یہی تو مشکل ہے کہ مجھے اطمینان نہیں ہوتا''

''آخر کیوں؟'' نیل کنٹھ نے جھلا کر کہا۔

''اس لئے کہ پہلی بار کشمیر سے باہر جا رہے ہو۔'' ماں نے اسی انداز سے کہا

نیل کنٹھ کو یہ بات ناگوار گذری۔ یہ بھی کیا محبت ہے کہ ماں بہادری اور حوصلے کا درس دینے کے عوض شکست پسندی کے جذبات کو اُبھارے!

اس نے ماں کی گود سے سر اٹھایا۔ اور فرمانبرداری کے تمام جذبات کو دبا کر ''بولا تو کیا ہوا۔ اگر پہلی بار کشمیر سے باہر جا رہا ہوں۔ آخر بچہ تو نہیں ہوں۔''

ماں اس دلیل پر آہستہ سے مسکرا دی۔ بولی۔ بچہ نہیں تو کیا ہو؟ ابھی تمہارا کنٹھ بھی تو نہیں نکلا۔''

اس بات نے اسے اور تلملا دیا۔ وہ ہاتھ سے اپنے گلے کو ٹٹولنے لگا۔ واقعی ابھی اس کا کنٹھ نہیں نکلا تھا۔ لیکن کنٹھ سے کیا ہوتا ہے۔ یہ فلسفہ اس کی سمجھ میں نہ آیا کیا کنٹھ بہادری کا نشان ہوتا ہے۔ نہیں مجھے کنٹھ نہیں چاہیئے۔ یہ گلے کو بدصورت اور

حُسن کو مکروہ بنا دیتا ہے۔

"مجھے کنٹھ نہیں چاہیے ماں، میں کنٹھ کے بغیر ہی اچھا ہوں۔" اس نے ضدّی بچے کی طرح کہا۔

پرے کونے میں اس کی بیوی چھوٹے بچے کو دودھ پلا رہی تھی۔ وہ ہنستے ہنستے دوہری ہوگئی۔ لیکن ساس کے خوف سے کھل کر نہیں ہنس سکی۔

"تمہیں نہیں چاہیئے نہ سہی۔ لیکن مجھے تو تمہارہ سب کچھ دیکھنا ہے۔ گلے کا کنٹھ گالوں پر اُگی ہوئی گھنی داڑھی، سر پر برف جیسے سفید بال اور ٹیڑھی ٹیڑھی سی کمر اس کی ماں نے اس کے سر پر ہاتھ پھیرتے ہوئے کہا۔

"چپ بھی رہو ماں، میں اتنا بوڑھا نہیں بننا چاہتا کہ سارے گھر پر ایک بوجھ سا بنا رہوں۔" اس نے اندازِ گفتگو میں ملاحت پیدا کرنے کی کوشش کرتے ہوئے کہا۔

"بوجھ!" ماں نے چونک کر پوچھا۔ کیا بوڑھے گھر پر بوجھ ہوتے ہیں؟"

نیل کنٹھ کو اپنی غلطی بلکہ حماقت کا شدید احساس ہوا۔ اس نے بظاہر حقیقت کا اظہار کیا تھا۔ لیکن حقیقت ہمیشہ تخیل سے مختلف ہوا کرتی ہے جس میں کہیں کہیں تلخی بھی آتی ہے اور کھرا پن بھی۔ اس نے پہلو بدلتے ہوئے جلد جلد کہا۔ "میرا مطلب ہے لمبی عمر میں ایک طرح کی اکتاہٹ سی محسوس ہوتی ہے جو ہر وقت جینے والے کے تصوّر کا احاطہ کئے رہتی ہے۔ اسی لئے اسے تسکین ہوتی ہے نہ تشفی۔ ذرا ذرا سی بات پر وہ اپنے جذبات میں ٹھیس سی محسوس کرتا ہے ورنہ اس کا وجود کسی کے لئے بوجھ نہیں ہوتا......"

ماں بیٹے کی دلیل سے ششدر رہ گئی۔ اگرچہ نیل کنٹھ ابھی بچہ ہی تھا، لیکن اتنی پُرمغز باتیں اس نے کہاں سے سیکھی تھیں۔ اور پھر زندگی اور بڑھاپے کا فلسفہ کوئی

ایسا فلسفہ نہیں جسے ہر کوئی لے بیٹھے' وہ پینسٹھ برس سے جی رہی تھی اور اب تک بھی وہ زندگی کے تمام بھیدوں سے واقف نہ تھی۔ لیکن نیل کنٹھ تو جیسے ان بھیدوں سے ہو کر گذرا تھا۔

''یہ سچ ہے'' ماں نے حیرت اور خوشی کے مِلے جُلے جذبات سے متاثر ہو کر کہا۔

''لمبی عمر اکتاہٹ سی ہوتی ہے۔ لیکن پیار اور محبت اس اکتاہٹ کو محسوس نہیں ہونے دیتے۔ پھر بھی ہر شام دیا جلتے وقت میں دعا کرتی ہوں کہ میرا بیٹا میری چِتا میں آگ لگائے۔''

''ایسی دُعا نہ مانگا کرو ماں' میں تمہیں ہمیشہ ہمیشہ اس گھر میں دیکھنا چاہتا ہوں تم گھر کی لکھشمی ہو' عزت ہو' روح ہو......'' نیل کنٹھ نے عقیدت بھرے لہجے میں کہا۔

بوڑھی ماں ہنس پڑی اور پرے کونے میں نیل کنٹھ کی دبکی ہوئی بیوی بھی۔ پھر ماں بولی۔ ''نادان ابھی میں مرنا نہیں چاہتی۔ مجھے تمہاری بہاریں دیکھنی ہیں۔ پھول دیکھنے ہیں۔ پھر بھی اگر تم میری چِتا میں آگ پھونکو تو میں مطمئن ہوں گی۔''

نیل کنٹھ نے اس کے منہ سے منہ لگا کر کہا۔ ''تم کتنی اچھی ہو۔ ماں۔ کتنی سوشیل جیسی چھٹکی ہوئی چاندنی' جیسے دودھ سے بھرا ہو پیالہ۔''

''تم یہ باتیں کرتے ہو' تو میرا دل مارے ہول کے بیٹھے لگتا ہے۔'' ماں بولی۔ ''سوچتی ہوں یہ پندرہ دن تمہیں دیکھے بغیر کیسے کاٹ سکوں گی۔''

نیل کنٹھ کھل کھلا کر ہنس پڑا۔ ''اگر تمہارا بس چلتا تو تم عمر بھر ڈبے میں بند کر کے رکھ دیتیں۔ کیوں ٹھیک ہے نا؟''

''تم ماں کے دل کو کیا جانو۔'' ماں نے آنکھوں میں آنسو بھرتے ہوئے کہا۔

اور پھر اس ماں کے دل کو جس کا متاعِ حیات ایک ہی بیٹا ہو۔"

تھوڑی دیر کے لئے دونوں خاموش ہو گئے۔ دونوں کا تصوّر دھند لے دھند لے سے خاکوں پر چھایا رہا۔ پھر ماں بولی۔ رام جانے کل اس وقت کہاں ہو گے۔ کس پڑاؤ پر' جانے کچھ کھانے کو بھی ملے گا کہ نہیں...... ہائے میرا دل بیٹھا جا رہا ہے......"

نیل کنٹھ نے کہا...... "لاکھ بار کہہ چکا ہوں' دُنیا بدل چکی ہے' نقشے بدل چکے ہیں' اب آدمی جہاں چاہے' ایک دن میں آرام کے ساتھ جا سکتا ہے۔ اب وہ زمانہ نہیں کہ سفر مہینوں لگ جائیں......"

"میں صرف بارہ مولے تک گئی ہوں۔ ماں نے کہنا شروع کیا۔" اور وہ بھی آج سے چالیس سال پہلے جب تمہارا باپ ڈرج میں نوکر تھا۔ ان دنوں نہ سڑکیں تھیں نہ لاریاں اور موٹر' بس بگھیاں ہی بگھیاں تھیں اور بارہ مولے تک پورے تین دن لگتے تھے۔"

"اب وہ بات نہیں۔ اب بارہ مولے کا سفر ایک گھنٹے کی بات ہے۔ چالیس سال پہلے جو زمانہ تھا وہ کب کا گذر گیا۔ اب چاندی چاہیئے چاندی۔ پھر اگر آدمی چاند بھی دیکھنا چاہے تو اڑ کر پہنچ سکتا ہے۔" نیل کنٹھ نے فخریہ انداز میں کہا۔ ہائے رام ......زمانہ کتنا بدل چکا ہے۔ پورا کلجگ ہے جبھی اتنے پاپ ہو رہے ہیں...... ماں نے سہم کر کہا۔

نیل کنٹھ نے مسکرا کر کہا۔ "نہیں تم پاپ کہہ رہی ہو ماں' یہ تو انسان کی ترقی ہے کہ اس نے مشکلات پر قابو پالیا۔"

"ہاں ترقی ہے!" ماں نے حقارت بھرے لہجے میں کہا۔ "جبھی کوئی چیز نہیں ملتی، ہر مُلک میں جنگ چھڑ گئی ہے اور خون کی ندیاں بہہ رہی ہیں۔"

''اِنسانیت کی ترقی کے لئے جنگ بہت ضروری ہوتی ہے ماں، اس سے نئے تجربے ہوتے ہیں۔ نئی چیزیں ایجاد ہوتی ہیں اور پھر جنگ اب ہی تو نہیں چھڑی، پہلے بھی چھڑا کرتی تھی۔ رام نے روان کے ساتھ جنگ کی۔ کورو، پانڈوؤں کے ساتھ لڑے۔''

''وہ تو دھرم یدھ تھے بیٹا۔'' ماں بولی۔ جب پاپ سنسار میں پھیلتا تھا اور بھگوان کے بھگت اس سے دکھ اٹھانے لگتے تھے۔''

نیل کنٹھ نے کہا۔ ''یہ بھی دھرم یدھ ہی ہیں۔ فرق صرف اتنا ہے کہ وہ لڑائیاں عورتوں یا جوئے پر ہوتی تھیں۔ یہ لڑائیاں دولت اور ملکوں کی تقسیم پر ہوتی ہیں۔ انسان جوں جوں ترقی کرتا جائے گا اسے پھیلاؤ کے لئے دنیا سمٹی ہوئی سی، سکڑی ہوئی سی دکھائی دے گی۔ نتیجہ یہ ہوگا کہ جنگ چھڑے گی اور انسانیت ترقی کی طرف ایک قدم اور آگے بڑھے گی۔''

ماں نے دوبارہ حیرت سے بیٹے کی طرف دیکھا جس کا ابھی کنٹھ تک نہیں نکلا تھا۔ ماں کے تحیر کو خوشی میں بدلنے کے لئے نیل کنٹھ نے گفتگو کا موضوع بدلا اور بولا۔ خیر جانے دو یہ باتیں، اب بتاؤ پنڈی سے تمہارے لئے کیا لاؤں......؟''

''میرے لئے؟'' ماں نے چونک کر پوچھا۔

''ہاں۔ ہاں۔ تمہارے لئے!''

''نادان مجھے کس چیز کی ضروت ہے، میرے لئے یہی بہت ہے کہ تم بخیرت لوٹ آؤ۔''

''یہ ٹھیک ہے، پھر بھی......'' نیل کنٹھ نے زور دیتے ہوئے کہا۔

''کیا لاؤ گے میرے لئے! میری عُمر کے لئے کیا چیز ہوگی وہاں، وہاں ان بچّوں کے لئے......''

''وہ تو لاؤں گا ہی، لیکن......''

''بہو دو سال سے دریائی کے پیرہن کے لئے ترستی ہے اور پھر اس کا دوپٹہ بھی پھٹ گیا ہے'' ماں نے کہا۔

نیل کنٹھ خاموشی سے سُنتا رہا۔

ماں نے پھر کہنا شروع کیا۔ ''اور بچّے دھوپ اور کیچڑ میں ننگے پاؤں پھرتے ہیں۔ کپڑے بھی پھٹ گئے ہیں اور پھر گھر میں کئی چیزیں نہیں۔ سرمہ پسینے کا کھرل دودھ پلانے کی بوتل، کپڑے دھونے کا صابون، گرم مصالحہ، ربڑ کی بوتل اور بخار دیکھنے کا وہ آلہ، کیا نام ہے اس کا......''

''یہ سب چیزیں آئیں گی، لیکن تمہارے لئے کیا لاؤں؟ میری قسم ہے! کسی چیز کا نام تو لو......نیل کنٹھ نے دوبارہ زور دیتے ہوئے کہا''

''قسم نہ اُٹھاؤ۔'' ماں نے کہا۔ بھگوان کی قسم! مجھے کس چیز کی ضرورت ہے؟ اور پھر اس عمر میں......''

تم یوں نہیں مانو گی، اچھا میں اب اپنی مرضی کے مطابق تمہارے لئے کوئی چیز لاؤں گا۔ نیل کنٹھ نے مسکرا کر کہا۔

ماں آہستہ سے ہنسی۔

پندرہ دن کے بعد وہ پنڈی سے لوٹا۔ اس نے زندگی میں پہلی بار سفر کیا تھا اور اس قدر متاثر ہوا تھا۔ کہ کوہالہ پُل کو عبور کرتے ہی اسے سارا کشمیر کھڑے پانی سے بھری ہوئی جھیل کی طرح نظر آنے لگا۔ جس میں سڑانڈ پیدا ہو گئی ہو۔ لیکن جس کی سطح پر نظر فریب کائی اُگ آئی ہو۔ کون ہے جو اپنی نرم و نازک انگلیوں سے اس کائی کو ہٹا کر نیچے جھانکنے کی کوشش کرتا ہے اور اصل کشمیر کو جا کر دیکھتا ہے۔ جہاں حوروں اور دودھ کی نہروں کے بدلے مکرہ کیڑے اور غلاظت کے انبار ہیں۔ بے کاری سے تنگ آئی

ہوئی جوانیاں ہیں، افلاس کے سبب کراہتی ہوئی زندگی ہے۔ لیکن یہ چیزیں کسی کو دیکھنے کی ضرورت ہی کیا ہے۔ سیاح آتے ہیں اور پیچیدہ راستو اور دیوہیکل پہاروں کو دیکھ کر لہرانے لگتے ہیں۔ حالانکہ ان ہی چیزوں نے کیشپ رشی کی جھیل میں تعفن پیدا کیا ہے وہ سیماب جیسی تھرکتی ہوئی زندگی سے ...... جو اس نے پنڈی کے بازاروں اور کوچوں میں دیکھی تھی...... لوٹنا نہیں چاہتا تھا۔ ہر طرف زندگی اور خیال، آگ اور شباب، حُسن اور نغمے، کون ان حقیقتوں سے منہ موڑ کر روایتوں کی دُنیا میں آئے اور ساری عُمر حسین خوابوں کے جال بنتا رہے۔

بس سُرمئی سڑک پر دوڑی جارہی تھی اور اس کا ذہن اپنے گھر کا طواف کررہا تھا۔ وہی گندا سا صحن، گندی نالیاں، بلغمی دیواریں اور گرد و غبار سے بھرے ہوئے کمرے جہاں بچّے روتے ہیں، بوڑھے کھانستے ہیں اور جوان کراہتے ہیں اس نے اپنی بوڑھی ماں کو بھی دیکھا جو سرد آہیں بھر کر دُعائیں مانگتی تھی۔ بھگوان میرے بچّے کو جلد لوٹا دے۔ مجھے اسے دیکھے بغیر چین نہیں پڑتا۔

ذہنی بے ترتیبی کو سنبھالتے ہوئے وہ خُدا خُدا کر کے گھر پہنچا۔ ماں نے اسے دیکھا۔ تو گویا اسے اعتبار ہی نہ آیا۔ رو رو کر بولی۔ ''تم آ گئے ہو میرے لال؟ میرے دل۔ کے ٹکڑے، میرے اخروٹ کے بوٹے''

وہ اس کے گلے لگ کر خوب روئی۔ میں نے سنا ہے، پرایا دیس ''لاڈلے بیٹوں کو ماؤں سے چھین لیتا ہے۔'' وہ بولی

نیل کنٹھ زور سے ہنسا۔ ''یہ کہاوت ہے ماں، اور کہاوت ہمیشہ سچی نہیں ہوتی ۔وہ کسی کے بیٹے کو نہیں چھینتا۔ ہاں تخیل میں رنگ بھر دیتا ہے۔''

''تم نہیں جانتے میرے لال، دیس دیس کا کتنا بیری ہوتا ہے اور پھر ہمارے دیس کا، جہاں دیوتا رہتے ہیں......''

''دیوتا؟'' نیل کنٹھ نے چونک کر پوچھا۔ کیسے دیوتا؟ ہاں کیڑے کہو کیڑے۔غلیظ اور مکروہ کیڑے۔''

''کیڑے؟'' ماں پوچھنے لگی

''ہاں، ماں......دیوتا کشمیر چھوڑ کر چلے گئے ہیں، باہر پنڈی میں، ہندوستان میں، جہاں وہ نور کے ہالوں میں رہتے ہیں اور چاندی میں نہاتے ہیں''

ماں حیران رہ گئی۔ تم یہ کیا کہہ رہے ہو، میرے لال۔ کہیں نظر تو نہیں لگی ہے؟ نظر وظر تو کچھ نہیں لگی، سچ کہہ رہا ہوں، کشمیر جہنم ہے اور جہنم میں دہکتی ہوئی بھٹیوں اور غلیظ کیڑوں کے سوا کچھ بھی نہیں۔

ماں کا منہ حیرت سے کھل گیا اور نیل کنٹھ نے پھر کہنا شروع کیا۔ دولت اور زندگی کے بغیر کچھ بھی نہیں ماں......کچھ بھی نہیں......دیوتا بھی جب تک سونے چاندی اور پھولوں کے سنگھاسن پر نہ بیٹھیں، دیوتا نہیں کہلاتے............وہ بھی جب تک پیٹ بھر کر روٹی نہ کھائیں۔ کھلے دل سے قہقہہ نہ لگائیں اور پاؤں پسار کر نہ سوئیں دیوتا نہیں کہلاتے کیچڑ اور مٹی کھانے والے راکھشس ہوتے ہیں۔

''راکھشس......؟'' ماں کی حیرت میں اضافہ ہوگیا۔

''ہاں راکھشس ......یہ دیکھو، میں راکھشس ہوں۔ میرے بچّے راکھشس ہیں۔تم راکھشس ہو۔تمہاری بہو راکھشس ہے۔اس شہر میں جو بھی رہتا ہے، راکھشس ہے۔''

ماں کے منہ سے ہلکی سی چیخ نکلی۔ بہو سہم کر تھر تھرانے لگی اور نیل کنٹھ پھر کہنے لگا......دِلی اتنا بڑا شہر ہے کہ آدمی حیران رہ جاتا ہے، لوٹنے کو جی نہیں چاہتا۔

بارہ مولے سے بھی بڑا ہے......ماں نے پوچھا۔

''بارہ مولہ......اس سے قہقہہ لگایا......بارہ مولہ دِلی کی ایک گلی کے برابر

ہے ماں۔ بس سمجھ لو ہمارے شہر سے کئی گنا بڑا شہر ہے۔ اونچے اونچے مکان...... صاف اور کھلی سڑکیں، مال سے بھری ہوئی دکانیں...... ہر طرف لوگ ہی لوگ جیسے دریا بہتا ہو......"

اور مال بھی سستا ہوگا......؟ ماں نے پوچھا"

"سستا ہی نہیں......کوڑیوں کے بھاؤ بکتا ہے۔ میں کہتا ہوں اگر آدمی کو جی کر مرنا ہی ہے تو دلی جا کر جیئے اور وہیں مرے۔"

ماں کے چہرے پر ہلکی سی مسکراہٹ پھیلی۔ بولی......"دور کے ڈھول سہاونے ہوتے ہیں۔ بھاگوت میں کہا ہے، جتنی دولت اُتنے پاپ...... ہمارا کشمیر رشیوں کا گھر ہے۔ بھگوان ہمیں جُگ جُگ اسی پوتر بھومی میں جنم دے۔"

"یہ تم اپنے لئے مانگو ماں......میں تو ہندوستان ہی میں پیدا ہوں گا جہاں ہجوم ہوتے ہیں اور زندگی شیر کی طرح دھاڑتی نظر آتی ہے"

"ابھی بچّے ہو نا جبھی مچل گئے ہو۔ مگر جانتے بھی ہو، حسین چیز کی جڑ غلاظت میں ہوتی ہے"

نیل کنٹھ ٹھٹھک کر رہ گیا۔ اتنی بڑی بات ماں کے منہ سے......اس کی آنکھیں پھیل گئیں۔

ماں نے کہا۔"وہ چیزیں لے آئے ہو کہ نہیں......"

نیل کنٹھ نے لوہے کے ٹرنک کو اپنی طرف کھینچا اور اس میں سے چیزیں نکالنے لگا۔ دریائی کا پیرہن، ململ کا دوپٹہ، ربڑ کی بوتل، بچوں کے لئے جوتے اور سینڈل اور کئی چیزیں...... ماں دیکھ دیکھ کر ہنسی رہی......

آخر میں اس نے ایک لفافہ نکالا اور کہا......"اس میں تمہارے لئے ایک چیز لایا ہوں......!"

''میرے لئے ......!'' ماں نے کہا۔ بڑے ضدی ہو۔ آخر مجھے کس چیز کی ضرورت تھی۔''

نیل کنٹھ نے کہا۔ تمہیں نہیں نہ سہی۔ مگر میں خالی ہاتھ کیسے آتا......اور پھر رام ہی جانتا ہے اس چیز کے لئے مجھے کہاں کہاں کی خاک چھاننا پڑی۔

ماں کا اشتیاق بڑھتا گیا......اس کے نحیف ہاتھوں کی نیلی رگیں ابھر آئیں۔'' معاً نیل کنٹھ نے لفافہ کھولا۔ ماں نے وہ چیز دیکھی تو اس کے منہ سے ہلکی سی چیخ نکل گئی......یہ......یہ کیا......؟''

نیل کنٹھ ہکا بکا رہ گیا۔ اسے ماں سے داد کی توقع تھی اور داد دینے والی ماں کا رنگ لاش کی طرح پھیکا اور زرد ہو رہا تھا۔

''رام رام پٹ......مگر میں......میں ابھی مرنا نہیں چاہتی ......'' ماں نے مشکل سے یہ الفاظ کہے......

نیل کنٹھ کی آنکھوں سے دھواں نکلا۔ اسے اپنی غلطی کا احساس ہوا۔

اور ماں سامنے پڑے ہوئے رام رام پٹ کو دیکھ کر ایسے محسوس کر رہی تھی جیسے اس کا سارا جسم اس اڑھائی گز کپڑے میں لپٹا جا رہا ہے......زبردستی اور مجبوراً......!

...........☆☆☆...........

سیلز مین

بظاہر اسے انگریزی زبان میں کوئی خاص مہارت نہ تھی لیکن انگریز خریداروں سے اپنا مطلب بیان کرنے میں اسے دِقت بھی نہ ہوتی تھی۔ اسے اپنے تجربے پر ناز تھا۔ جو پچیس سالہ نوکری میں ایسی دکانوں پر کرتا آیا تھا جہاں صرف فرنگیوں ہی سے کاروبار ہوتا ہے۔ اپنے انداز بیان کو رنگین بنانے اور خریداروں پر اس کا اچھا اثر ڈالنے کے لئے اسے مشہور ممالک کے مشاہیر بھی یاد تھے اور جہاں جب داؤ چلتا تھا وہاں محل بے محل انہیں گھسیٹتا تھا' خواہ نفسِ معاملہ کے ساتھ ان کا تعلق ہو یا نہ ہو۔ اسے اگرچہ اپنی کم مائیگی اور بے بضاعتی کا کچھ کچھ احساس تھا۔ لیکن بزعمِ خُود کسی بھی وقت کسی ہوشیار سے ہوشیار خریدار کو بے وقوف بنا سکتا تھا۔ اور یہی اس کے تجربے کی مستحکم بنیاد تھی جس پر کئی دور اندیش پنڈتوں' نافہم خوجوں اور کم مایہ تاجروں نے اپنے مستقبل کی عالی شان عمارتیں کھڑی کر رکھی تھیں۔ اس ہوشیاری بضاعتی اور کم مایہ لیاقت کا نام ان سب نے سیلز مین کی غیر معمولی ذہانت رکھا تھا۔ اسے اس فریب آمیز لقب پر نہ صرف ناز تھا۔ بلکہ یہ لقب سنتے وقت اسے روحانی مسرت سی محسوس ہوتی تھی غیر معمولی ذہانت...... جو ماحول اور واقعات کا پورا پورا فائدہ اٹھاتی تھی اور سیلز مین کے لمبوترے چہرے پر ایسے نقوش پیدا کرنے میں کامیاب ہوتی تھی کہ دکان پر آیا ہوا خریدار اُنہیں حقیقت تسلیم کرتا تھا۔

جنگ سے قبل اگر کوئی جرمن اس کی دوکان پر آتا تو اِدھر اُدھر کی باتوں کے علاوہ وہ جرمن ادب کے پیچیدہ مسائل پر بحث کرنے سے بھی نہ چوکتا۔ ہر جرمن ادیب کے نام کے سوا اسے اتنا بھی، معلوم نہ تھا کہ ادیب کی مشہور تصانیف کون کون سی ہیں اور وہ جرمن ادب میں اپنے کس کارنامے کے بدولت جاودان ہوا ہے لیکن اسے آگے جانے کی کیا ضرورت تھی۔ وہ غیر معمولی طور پر ذہین تھا اور ایسی ذہانت سب کچھ ماننے پر ہر وقت رضامند ہوتی ہے۔

کسی چیز کی تعریف کرتے ہوئے یکا یک گفتگو کا انداز بدلتا۔ اور کہتا۔

''حضور گوئٹے کو جانتا ہے۔ بہت بڑا شاعر تھا۔ واہ واہ......؟''

جرمن خریدار حیرت سے اس کا منہ تکنے لگاتا۔ اور جب سیلز مین کو یقین ہوتا کہ اس کا ہاتھ خریدار کہ نظر پر پڑ گیا۔ تو فوراً کہہ اٹھتا۔ جرمن کی شاعری بہت اچھی ہے ماسٹر......! اور گوئٹے...... بڑا شاعر...... بہت بڑا شاعر......''

خریدار اپنے وطن کے شاعر یا نام سن کر خوش ہوتا۔ حُب الوطنی کا پوشیدہ جذبہ اس کی آنکھوں سے جھلکنے لگتا' گوئٹے ...... جرمنی کا فلسفی شاعر...... جس کی شاعری کی باریکیاں ہندوستان کے ایک دور افتادہ شہر کا ایک معمولی سلیز مین تک جانتا ہے۔ اگر کسی وجہ سے نہیں پھر بھی گوئٹے کے احترام کے طور پر خریدار کچھ نہ کچھ خریدنے پر آمادہ ہو ہی جاتا اور سلیز مین اس کی آمادگی کے آثار دیکھ کر پھر گفتگو کا انداز بدلتا اور کہتا...... یہ نائٹ گون ماسٹر...... بہت اچھی چیز ہے' خالص پشمینے کی......اسے شاعر یعنی جرمن بہت پسند کرتے ہیں۔

خریدار گون کو اُلٹ پلٹ کر دیکھتا۔ بادامی رنگ کا گون۔ جس کے کناروں پر سبز اور سرخ ریشم کے کاڑھے ہوئے پھول اور لٹکتے ہوئے زری پھندنے بہت ہی خوبصورت دکھائی دیتے۔ سیلز مین سوکھی سیم ہنسی ہنس کر کہتا۔ حضور یہ دیکھنے کی چیز نہیں۔

دوسو جوڑوں میں سے صرف یہی ایک بچ گیا ہے، باقی سب جرمن لوگ خرید کر لے گئے ہیں۔ آپ تو ماسٹر بڑا لکی ہے۔ اگر یہ بھی چلا جاتا تو بس ماسٹر...... sorry نہیں ملتا۔ سارے شہر میں نہیں ملتا......"

یہ اس کی گفتگو کا مخصوص اور آخری انداز تھا کہ ہر چیز جس پر خریدار کی آنکھ تھوڑی دیر کے لئے اٹکتی۔ وہ دُکان کی آخری چیز بن کر رہ جاتی۔ حتیٰ کہ وہ چیز پھر سارے شہر میں دستیاب ہونی مشکل ہو جاتی۔ حالانکہ اسی دکان میں ایسے سینکڑوں جوڑے کسی الماری میں گرد کے نیچے محفوظ ہوتے۔

خریدار گون خرید کر چلا جاتا۔ اور سیلز مین تالیاں بجا کر اپنے مالک کے پاس پہنچتا جو اندر کمرے میں کھڑکی کے شیشوں میں سے غیر معمولی ذہانت رکھنے والے سیلز مین کا تماشہ دیکھا کرتا۔

"مار لیا نا سالے کو، بڑا چالاک بنا پھرتا تھا"

"تم تو آفت ہو بھائی، ڈیڑھ گھنٹے سے غریب کی جان ہلکان کر دی......"

"اور کیا کرتا حضرت؟ جب میں نے دیکھا، مچھلی آسانی سے نہیں پھنسی۔ میں نے جھٹ بنسی کے کانٹے مین غدود چپکا دیا۔ اور دوسرے ہی لمحے میں......ہی ہی ہی......"

"مان لیا تم کو۔ خُدا کی قسم، پورے سیلز مین ہو، لیکن یہ تو بتاؤ، یہ گوئٹے کیا بلا تھی؟......"

سلیز مین زور سے ہنستا۔ حضور یہ رہنے بھی دیجئے، گوئٹے کون تھا؟ میں نے سنا ہے، بڑا شاعر تھا......اور تھا بھی جرمن......!

مالک دکان ہنس کر کہتا۔ "واللہ بڑے موقع شناس ہو، اگر میرا بس چلے تو شہر کے تمام مسلمان لڑکوں سے کہتا کہ تم سے آکر انگریزی سیکھیں، خوب کوٹ پتلون پہن

کر کالج جاتے ہیں اور جب انگریز سے بات کرنے کو کہو تو منہ لٹک جاتا ہے روغن کئے ہوئے ڈھول کی طرح خوشنما لیکن اندر سے خالی...... ہوں!''

سیلز مین سنجیدگی سے کہتا۔ ''نہیں حضرت تعلیم تعلیم ہی ہے میں نے بھی پانچ چھ جماعتیں پڑھی ہوتیں تو آپ دیکھتے کہ میں......'' لیکن اب جنگ چھڑ گئی تھی جرمن خریدار عنقا ہو گئے تھے اور سینکڑوں نائٹ گون دُکان میں پڑے تھے۔

مالک دکان سے زیادہ سلیز مین کو ان لوگوں کی فکر تھی۔ جنگ سے قبل اس نے گوئٹے، بسمارک اور ڈاکٹر ہیوئنی کے نام پر کئی سو گون چالاک اور بدطنیت جرمنوں کے پاس فروخت کئے تھے۔ لیکن اب......اب وہ صورت نہ تھی، خرید و فروخت کا پانسہ پلٹ گیا تھا، اب بنڈ پر انگریز یا امریکی نظر آتے تھے یا دہ فرنگی خواتین اور بچے جن کے شوہر اور ابا محاذ جنگ پر جمہوریت کی فتح کے لئے گئے تھے۔ جنگ نے اگر چہ ہندوستان میں مختلف خیالات پیدا کر کے لوگوں میں تفرقہ بازی پیدا کر دی تھی۔ لیکن انگریز اور امریکی روز بروز شیر و شکر ہو رہے تھے۔ جنگ سے قبل کے اختلافات' وسعت تجارت کی جدوجہد وغیرہ رفتہ رفتہ باہمی محبت اور سمجھوتے میں بدل گئی تھی اور سلیز مین ان تبدیلیوں سے واقف تھا۔ وہ جانتا تھا کہ جنگ ہندوستان کی آزادی 'ہندوستان کے تحفظ بلکہ ساری دُنیا کی آزادی اور جمہوریت تحفظ کے لئے لڑی جارہی ہے۔ وہ سارا سارا دن دکان کے برآمدے میں بنڈ پر انگریز اور امریکی فوجیوں اور خواتین کو ایک دوسرے کی باہوں میں باہیں ڈالے دیکھتا تھا۔ لیکن کشمیر کے مال کی خریداری نہیں ہوتی تھی اور یہ بات سلیز مین کو بہت ناگوار گذرتی تھی...... ''حرامی کُتے !صرف ایک دوسرے کی دُمیں سونگھنے کے لئے آتے ہیں۔''

ایک دن وہ صبح ہی سے اداس تھا۔ اس کی بیٹی جس کا بیاہ اس نے گذشتہ سال کیا، امیدواری سے تھی اور رسوم کے مطابق جن کی پیروی ان کی سات پُشتیں کرتی

آئی تھیں، اپنی برادری میں اس کی تشہیر ضروری تھی۔ اسے روپوں کی ضرورت تھی۔ ابھی بیاہ کا قرض سر سے نہ اترا تھا۔ اس لئے کسی سے مانگنے کی ہمت نہ پڑتی تھی۔ اس نے اپنے مالک سے اپنی ضرورت کا تذکرہ کیا تھا۔ لیکن اس نے تسلی دے کر ایک لمبا سا اقرار کیا تھا۔ جو اس کے خیال میں انکار سے زیادہ تلخ تھا۔ اور سلیز مین سوچ رہا تھا...... میں نے زندگی بھر کیا حاصل کیا؟ لاکھوں جھوٹ بولے، ہزاروں کو دھوکے دیئے۔ لیکن کس کے لئے؟ اس خوجے کے لئے جسے آج سے دس برس پہلے خوجا کہنا لفظ ''خوجا'' کی توہین تھی جس کو میں نے، صرف میں نے، معمولی چکن دوز سے لاکھوں کا مالک بنایا اور خود اسی غربت، ہلاکت آفریں افلاس اور شرمناک کم مائیگی کی دلدل میں پھنسا رہا، لیکن اس میں کسی کا کیا قصور؟ قسمت میں یہی محتاجی لکھی ہے، چراغ کی طرح جلنا...... گرد سے اٹنا۔ لیکن اوروں کے تاریک خانوں کو منور کرنا۔

وہ مکان میں اکیلا تھا اور اسی طرح کے خیالات کی تیز دھارا میں بہہ رہا تھا۔ اسے اپنی بدی پر غصہ آ رہا تھا...... نادان...... ابھی خود بچی ہے اور......

لیکن دل کے کونے میں مسرت بھی دب کر رہ گئی تھی کہ وہ اب دادا بننے والا ہے، حالانکہ اس کے خاندان میں اس سے کم عمر والے آج سے کئی برس پہلے دادا بن چکے تھے۔ وہ غصے اور مسرت کے ملے جلے جذبات سے سرشار تھا کہ دکان میں ایک فرنگی جوڑا ہنستا ہو داخل ہوا۔

سلیز میں اُٹھ کھڑا ہوا۔ اس کی طلسمی دُنیا اُجڑ گئی۔ ''سلام حضور، سلام میم صاحبہ......''

''گڈ مارننگ...... گڈ مارننگ!''

''حضور بابا لوگ راضی ہے''

''بابا......؟ نہیں، نہیں۔ ہمارا بابا لوگ نہیں۔ صاحب نے کہا اور میم نے

قہقہہ لگایا جس میں سراپا طنز تھی۔ شاید وہ جوڑا نہیں جانتا تھا کہ ہندوستان میں ہر مرد اور عورت شادی کے فوراً بعد ہی بابا لوگ کی تمنا رکھتے ہیں اور سرد ملکوں میں یہ تمنا جلد سے جلد پوری ہو کر رہ جاتی ہے۔ حقیقی مسرت کے وہ چند دن جو ایک دوسرے کو سمجھنے، ایک دوسرے میں تحلیل ہو کر کھو جانے کے ہوتے ہیں۔ ان ہی بابا لوگوں کو پیدا کرنے اور انہیں غلاظت میں لت پت ہوتے دیکھنے میں گزر جاتے ہیں، یہاں استطاعت پرورش کا سوال نہیں، صرف تمنائیں ہوتی ہیں''

غیر معمولی ذہانت رکھنے والا سلیز مین آسانی سے ہار ماننے والا نہ تھا اس نے جلد جلد مسکرا کر کہا۔

''لیکن بابا لوگ اچھا ہوتا ہے حضور ہی ہی۔''

صاحب سگریٹ سلگاتے ہوئے کہا۔ ''ہم بابا لوگ پسند نہیں کرتے۔ ہمارے پاس وقت نہیں، پیسہ نہیں، آیا نہیں......''

سگریٹ سلگا کر صاحب نے بدیشی بٹنوں کا ایک خوبصورت پتہ ہاتھ میں اٹھایا۔ سلیز مین نے فوراً کہا...... ''ٹھیک ہے صاحب! یہ انگلینڈ کا بٹن ہے، حضور۔ تین روپے دس آنہ ڈزن۔ بڑا چیپ ہے۔''

صاحب نے پتا میز پر رکھ دیا اور بولا۔ ہم امریکہ کا بٹن مانگتا ہے۔ امریکہ کا

سلیز مین نے الماری میں سے دوسرا پتا نکالا اور ہنس کر بولا۔ سمجھ گیا حضور۔ سمجھ گیا۔ یہ لیجئے امریکہ کا پتا...... تین روپے بارہ آنے ڈزن۔ امریکہ کا مال بہت اچھا ہوتا ہے۔ صاحب بڑا چیپ اور مضبوط۔

صاحب نے سگریٹ کا کش لگاتے ہوئے کہا۔ ہو...... تین روپے بارہ آنے ڈزن......!

میم نے صاحب کے ہاتھ سے پتا لیتے ہوئے کہا۔ ''تین روپے بارہ آنے

ڈزن!"۔۔۔۔"مائی گاڈ۔۔۔۔!"

سلیز مین نے ہنس کر کہا......امریکہ بڑا دولت مند ہے، حضور۔ انگریزوں سے بڑا اچھا ہے۔ مال اچھا بھیجتا ہے۔ لوگ اچھے ہیں اور حضور، ابرام لنکن...... بڑا آدمی ......پریزیڈنٹ......ہی ہی ہی......

صاحب اور میم نے حیرت سے سیلز مین کی طرف دیکھا۔ پھر صاحب نے بڑی دلچسپی سے پوچھا۔ "تم ابراہیم لنکن کو جانتا ہے؟"

"حضور جانتا ہے، ہم نے کتاب میں اس کا سارا حال پڑھا ہے۔ بڑا اچھا آدمی تھا حضور......اور یہ بٹن اسے بہت پسند تھا۔ جیکٹ، جیمپر، بلاؤز سب پر لگاتا تھا، حضور......!"

صاحب نے بٹوے سے نوٹ نکالتے ہوئے کہا۔ !I see

سلیز مین نے پتے کی قیمت صندوق میں ڈالتے ہوئے کہا......صاحب بڑا lucky ہے۔ ہمارے پاس صرف ایک پتا رہ گیا تھا۔ مارکیٹ میں اب یہ بٹن نہیں ملتا۔ سارا سٹاک امریکی لوگ خرید کر لے گئے اور سمندر پار جنگ ہے نا، صاحب ہی ہی ہی......

صاحب نے مسکرا کر کہا۔ تھینک یو!

سلیز مین نے الماری میں سے ایک نائٹ گون نکالا اور میز پر پھیلا کر بولا۔ یہ دیکھو صاحب، نائٹ گون! کوئن میری ڈیزائن......فینسی مال حضور......!

میم نے شوق سے نائیٹ گون کو دیکھنا شروع کیا۔ اور صاحب نے دیکھنے کے بعد دیکھا۔ کوئن میری ڈائزائن

سلیز مین نے کہا۔ ہاں حضور، یہ کوئن میری ڈایزئن، یہ دیکھئے واٹر کلر! بڑا چیپ ہے، بس ایک سو پچاس......!

صاحب نے گون کو سلیز مین کے ہاتھ میں دیتے ہوئے کہا ''......نو......نو ......یہ نہیں مانگتا۔ایک ہنکر چیف مانگتا ہے۔''

سلیز مین نے جلد جلد کہا۔ویری گڈ حضور!

پھر اس نے رومالوں کا ایک بنڈل سامنے لا رکھا اور اسے کھولنے کے بعد چند رومالوں کو میز پر بکھیرتے ہوئے بولا۔یہ دیکھئے حضور' نیڈل ورک۔

میم نے کنگ فشر والا رومال پسند کیا اور صاحب کو دکھاتے ہوئے بولی......''fine''

سلیز مین نے مسکرا کر کہا۔''ہاں حضور فائن' صرف ایک رومال رہ گیا ہے 'سارا ہے' صاحب بس پندرہ روپے حضور۔بڑا چیپ ہے۔''

صاحب نے بٹوے سے پندرہ روپے کے نوٹ نکالے اور سلیز مین کو دئے۔وہ باہر جانے لگے۔لیکن سلیز مین کی تسلی نہ ہوئی۔اسنے میز کے گرد چکر کاٹ کر انہیں دروازے پر روک لیا اور ایک چھڑی دکھاتے ہوئے کہا۔''یہ حضور سٹک ......واکنگ سٹک! پچیس روپے' بڑا چیپ ہے حضور!''

''نہں......نہیں......مانگتا۔''

''حضور' آپ کا fore head اچھا ہے۔آپ ضرور اور کچھ خریدیں گے'' صاحب اور میم دونوں رک گئے۔صاحب نے حیرت سے پوچھا۔''ہمارا'' fore head

سلیز مین نے مسکرا کر کہا۔''ہاں حضو بہت اچھا ہے۔بڑا بڑا مال خریدیگا۔''

صاحب نے حیرانی سے پوچھا۔تم پامسٹ ہو' ہاتھ دیکھنا جانتا ہے؟

سلیز مین نے زور سے ہنس کر کہا۔''یس حضور' دیکھنا جانتا ہے۔ہم نے کیرو کی کتاب ساری پڑھی ہے۔''

"وہ، کیرو...... ونڈرفل...... ہمارا ہاتھ دیکھو......!"

سلیز مین بڑی توجہ سے صاحب کا ہاتھ دیکھنے لگا۔ تھوڑی دیر بعد معنی خیز مسکراہٹ پیدا کر کے بولا۔ "گڈلک حضور! برا آفیسر بننے ولا ہے، بڑا لیڈر، ہمارے گاندھی کو جانتا ہے، حضور!"

سلیز مین نے کہا۔ جواہر لال حضور؟ وہ ہمارا بھائی ہے

صاحب نے حیرت سے پوچھا۔ تمہارا بھائی؟

سلیز مین نے کہا۔ "ہاں حضور بائی گورڈ، وہ کشمیر کا ہے۔ بہت بڑا لیڈر۔ اس کا کپڑا افرانس نے دھل کر آتا تھا۔"

صاحب نے کہا...... اوہ...... وہ اچھا آدمی ہے

سلیز مین نے مسکرا کر کہا۔ "تھینک یو سر۔ یہ ہاتھ اسی کے ہاتھ کا موافق ہے حضور کتنا انکم ٹیکس دیتا ہے؟...... چالیس ہزار؟"

صاحب نے تنگ آ کر کہا...... non sense ہمارا بات...... ٹھیک ٹھیک بولو۔

سلیز مین دوبارہ غور سے ہاتھ دیکھنے لگا۔ کبھی الٹ کر، کبھی پلٹ کر...... پھر یکا یک اس نے کہا۔ حضور کسی گرل سے love کرتا ہے بہت لو...... (love) ٹھیک ہے حضور؟

صاحب کا چہرہ خوشی سے کھل اٹھا۔ میم سلز مین کے اور قریب آ گئی اور بڑی توجہ سے اس کے چہرے اور مصنوعی نقوش کو دیکھنے لگی۔

صاحب نے کہا۔ "ٹھیک ہے، ٹھیک ہے، آگے بولو۔ ہم love کرتا ہے۔ ہمارا گرل بڑا خوب شورت ہے اس کا بال سونے کا مافق ہے، لیکن کیا ہمارا شادی ہوگا؟"

سلیز مین کے ہاتھ میں صاحب کی شہ رگ آ گئی تھی۔ وہ پھر صاحب کے پھیلائے ہوئے ہاتھ پر جھک گیا اور کبھی داہنی آنکھ کو گھمانے لگا اور کبھی دریا کی لہروں کو دیکھنے لگا۔ جیسے بہت پیچیدہ مسلے پر سوچ رہا ہو' حالانکہ اس وقت اس کی غیر معمولی ذہانت کام کر رہی تھی۔

پھر صاحب کے ہاتھ پر ہاتھ مار کر بولا......ضرور......ضرور......لیکن جنگ کے بعد......واشنگٹن میں......اور پھر......بابا لوگ......ممی......ڈاڈی...... پاپا...... ہاہاہا!

صاحب نے جلد جلد کہا۔ ''نہیں' واشنگٹن میں نہیں' ممبئی میں ہم نے ایک مل وہاں خرید لیا ہے۔ ہم امریکہ نہیں جائے گا۔''

سلیز مین نے مسکرا کر کہا۔ ''بہت اچھا حضور بمبئی میں سہی' وہاں ہمارا مہاتما گاندھی بھی ہے......آغا خان محل میں......ہی ہی ہی''

صاحب نے کہا......اوہ مسٹر گاندھی......بہت اچھا آدمی ہے۔ ہم اس کو جیل سے چھڑا لیگا۔ وہ کالے آدمیوں کا لیڈر رہے۔ صاحب نے پھر میم کے کان میں کچھ کہا۔ دونوں کھلکھلا کر ہنس پڑے۔ صاحب نے سلیز مین کی موجودگی ہی میں میم کے مرمریں چہرے کا بوسہ لیا اور پھر جلد جلد بٹوے سے کچھ نکال کر پامسٹ کی جیب میں ڈال دیا۔ میم نے بھی بائیں ہاتھ میں تھامے ہوئے بٹوے سے کچھ نوٹ نکالے اور مسکرا مسکرا کر ناز و ادا سے سلیز مین کی دوسری جیب مین ڈال کر بولی...... ''تھینک یو مسٹر سیلز مین! تم بہت اچھا آدمی ہے۔''

اور جب وہ دکان سے باہر جانے لگے تو سلیز مین نے کہا...... ''نائٹ گون حضور۔ کوئن میری ڈیزائن......اپنی میم صاحبہ کے لئے......!''

صاحب نے مڑ کے مسکراتے ہوئے کہا۔ نہیں جنگ کے بعد بمبئی

میں......گڈبائی!

وہ دکان سے اوجھل ہو گئے اور سلیز مین اپنی دونوں جیبوں میں توقع سے زیادہ نوٹ دیکھ کر ناچنے لگا۔ اس کی تنگ دستی کا معمہ اس کی غیر معمولی ذہانت نے حل کر دیا تھا۔

وہ دکان میں اِدھر اُدھر ٹہلتے ہوئے اپنے آپ سے بولا۔ ''اُلو کہیں کے 'جنگ کے بعد خرید لیں گے۔ ایک ہی گون بچ گیا تھا۔!''

اسے اپنی بیٹی بھی یاد آ گئی جو رسوم کے مطابق کچھ روپوں کے لئے منتظر تھی'' خوش نصیب بچی! چھوٹی عمر میں بچہ ہوگا......اور میں......دادا......ہی ہی ہی؟''

............☆☆☆............

بیگار

(رنبیر، جموں۔ ۲۰، فروری ۱۹۳۹ء)

(۱)

رادھا بسنت کے نمبردار کی لڑکی تھی اور زندگی کی چودہ بہاریں دیکھ چکی تھی۔ وہ حسنِ سادہ کی مجسّم تصویر تھی۔ اُس گاؤں میں نمبردار کے گھر کے سوا اور کہیں بھی رونق نہیں نہ تھی۔ رادھا سویرے اُٹھ کر اپنی سہیلیوں کے ساتھ سپُرون کے چشمے پر پانی بھرنے کیلئے جاتی اور لڑکیوں کے پاس پیتل کا گڑا ہوتا۔ وہ اپنے اپنے برتن کٹیا کے چبوترے پر رکھ دیتیں، اور خود درختوں پر چڑھ جاتیں۔ ہر موسم میں کوئی نہ کوئی پہاڑی پھل موجود رہتا تھا۔ کبھی کیفل، کبھی واڑو تو کبھی اخروٹ۔ انہیں روکنے ٹوکنے والا کوئی نہ تھا۔ کیونکہ یہ سارے درخت اس گاؤں کی زمین کے تھے۔ گاؤں کی بوڑھی عورتیں بھی چشمے پر آتی تھیں، مگر وہ اشنان کر کے واپس چلی جاتی تھیں۔ لڑکیاں بہت دیر تک پھل کھاتی رہتی جب سیر ہو جاتیں، تو کچھ ساتھ بھی لے جاتیں۔ گھر میں تھوڑا بہت کام کرنے کے بعد سیدھی نمبردار کے گھر میں اکھٹی ہوتیں۔ اور اُس کی بیوی سے کہتیں ''لو یہ پھل رادھا رانی کیلئے ہیں۔ انہیں قبول کرلو''۔ رادھا رانی کی ماں سب کے تحفے محبت سے لے لیتی۔ اور پھر الماری سے مٹھائی نکال کر تھوڑی تھوڑی سب کو بانٹ دیتی۔ اِس گاؤں میں مٹھائی کی کوئی دُکان نہ تھی۔ نمبردار دوسرے تیسرے دن تحصیل

میں جاتا۔تو چار آنے کی سبھی چیزیں لے آتا۔

(۲)

مٹھائی کھانے کے بعد سب سہیلیاں پھر چشمے پر جاتیں مزے سے نہاتیں ۔کبھی کھڈ میں اُتر جاتیں چھینٹے اُڑاتیں ،ایک دوسرے پر پانی پھینکتیں ،اُچھلتیں ،کُودتیں اوریاں اُڑاتیں جب وہ سُریلی آواز میں ''گنگا راما بھماں'' کا گیت گاتیں تو سپاٹوں کو جانے والے مُسافر ٹرک پر کھڑے ہو جاتے اور جب تک گیت ختم نہ ہوتا قدم نہ اُٹھاتے۔نہانے کے بعد لڑکیاں گھروں میں جاتیں اوراپنا اپنا کھانا لے کر رادھا کے گھر پہنچ جاتیں۔سب مل کر پریم سے کھانا کھاتیں۔رادھا کی ماں دل سے ان نظارے کو دیکھ کر بلّیوں اُچھلنا تھا۔رادھا کو بھی اس بات کا احساس تھا۔کہ گاؤں کی سب لڑکیاں مجھ سے محبت کرتی ہیں۔

(۳)

وہ کھانا کھا کر اپنے اپنے کھیتوں مین کام کاج کرنے کیلئے چلی جاتیں کوئی گئوئیں چراتی تھی۔کوئی گھاس کاٹتی تھی۔کوئی بھٹے توڑتی تھی اور کوئی پہاڑی پر چڑھ کر لکڑیاں اِکھٹی کرتی تھی۔اُن کا یہ وقت بہت مشکل سے کٹتا تھا۔وہ مُنتظر رہتی تھی کہ کب دن ڈھلے اور شام ہو۔اور وہ گاؤں میں جا کر آپس میں ملیں۔غروبِ آفتاب سے ذرا پہلے وہ پھر چشمے پر اکھٹی ہوتیں اور ایک دوسرے کا حال پُوچھتیں رات کا کھانا کھا کر پھر رادھا کے گھر میں جاتیں اور ایک کوٹھری میں بیٹھ کر بہت رات گئی تک کہانیاں سُنتی اور سُناتیں۔سامنے کے کمرے میں گاؤں کے مرد اکھٹے ہو جاتے۔اگر برف باراں کا موسم نہ ہوتا۔تو وہ رات کو گیارہ بجے تک حُقے کو کش لگاتے رہتے۔نمبردار کو دن بھر کے واقعیات سُناتے۔کوئی فصل کا حال سُناتا۔کوئی مقدمے کے متعلق صلاح پُوچھتا۔کوئی اپنے بیٹے بیٹی کے رشتے ناطے کی بابت مشورہ لیتا۔کبھی کبھی سیاست پر بھی بحث چھڑ

جاتی۔ایک دن منگو جاٹ نے گاندھی مہاتما جو پچھلی گرمیوں بڑے لاٹ سے ملنے کیلئے شملے گیا تھا۔اب گلدار خانے (جیل) میں پڑا ہے۔نمبردار بولا افسوس میں نے ان کے درشن نہیں کئے۔جس دن مہاتما کی موٹر آئی تھی۔اُس دن میں بیگار میں پکڑا گیا تھا۔میں کھانا کھا کر گاندھی ماتما کے درشن کے واسطے گھر سے چلا ہی تھا کہ تحصیل کا چپڑاسی آپہنچا۔اُس نے دس آدمیوں کا پروانہ دیا۔اور زبانی بھی کہہ دیا کہ تحصیلدار صاحب نے حکم دیا کہ دس بجے سے پہلے پہلے آدمی اِکھٹے کر کے نیلی دھار کے ٹیلے پہنچ جاؤ۔ایک صاحب شکار کھیلنے آرہے ہیں۔ جانے کو جی تو نہیں چاہتا تھا۔پر کیا کرتا۔حاکم کا حکم تھا۔موت تو شاید ٹل جاتی ہے مگر اِن حاکموں کا حکم نہیں ٹل سکتا ہے۔نہ جاتا تو چپڑاسی پکڑ کر لے جاتا۔تحصیل کے ملازم گالی گلوچ دینے بے عزتی کرنے مار مار کر ادموا کر دیتے اور شاید گلدار خانے میں ڈال دیتے،خیر میں نے بڑے جگڑے اور جھنجھٹ سے منّتوں سے اور دھمکیوں سے کُل سات آدمی جانے کیلئے تیار کئے چُھوٹے سا گاؤں بھلا دس آدمی کو کہاں سے نکلیں؟اور پھر خوشی جاتا۔کون ہے؟سچ ہے بیگار بُری بلا ہے۔بھلا یہ بھی کوئی اِنصاف ہے کہ کام لو اور پیسے نہ دو۔ہم سات آدمی نیلی دھار پر تین دن کام کرتے رہے۔لیکن ہمیں پُھوٹی کوڑی نہ ملی۔یہ کتنا اتیاچار ہے!میں تو مہاتما گاندھی کو تب جانو۔اگر وہ پہاڑ میں بیگار بند کرادے۔

منگو نے کہا۔ہاں نمبردار۔یہ بات تو آپ کی ٹھیک ہے لیکن بیگار بند کرانے کیلئے بھی بہت اتیاچار سہنا پڑتا ہے۔

نمبردار نے پُوچھا ’’وہ کیسے۔‘‘

منگو نے جواب دیا۔’’اگر ہم بیگار دینے سے انکار کر دیں‘تو یہ بند ہو سکتی ہے۔انیائے کے سامنے نہ جُھکیں۔‘‘

نمبردار کی سمجھ میں یہ بات نہ آئی۔ وہ ہنسنے لگا۔ دوسرے آدمی بھی خوب ہنسے۔ اور ہنستے ہنستے اپنے گھر کو چلے گئے۔ لڑکیاں بھی چلی گئیں۔

(۴)

نمبردار اُٹھ کر کھٹری میں آیا۔ تو اُس کی بیوی نے پُوچھا۔ ''آج بیگار کی کیا باتیں ہو رہی تھیں۔''

نمبردار بولا ''تُم جانتی ہو لوگ روز روز کی بیگار سے بہت تنگ آ گئے ہیں۔ آج ہم یہ سوچ رہے تھے کہ اس سے کس طرح چُھٹکارا پا سکتے ہیں۔''

منگو کہتا ہے۔ کہ ہم بیگار دینے سے انکار کر دیں۔ تو بیگار سے چُھوٹ سکتے ہیں، پر میری سمجھ میں یہ بات نہیں آئی۔ کہ یہ کس طرح ہو سکتا ہے۔ میرے منّ میں اِنکار کرنے کا وِچار بھی نہیں آ سکتا۔ کیونکہ اگر ہم پہاڑ کے لوگ بیگار بننے سے انکار کر دیں تو ہم پر مصیبتوں کا پہاڑ ٹوٹ پڑے گا۔ راجہ کے آدمی مار مار کر ہوش ٹھکانے لگا دیں۔ عورت ذات یہ کہہ کر کہ آپ ٹھیک کہتے ہیں۔ چُپ ہو گئی۔ مگر رادھا حوصلہ کر کے بولی پیتا جی! چچا منگو کا خیال بھی اچھا معلوم ہوتا ہے۔۔ میرا جی بھی کہتا ہے کہ انیائے کے سامنے جُھکنا نہیں چاہیے بلکہ اس کا مقابلہ ستیہ سے کرنا چاہئے اور اس کا طریقہ یہ ہے کہ آپ بیگار دینے سے انکار کر دیں۔ جب راجہ صاحب یا ان کا کوئی کرمچاری بیگار مانگے، تو آپ کوئی آدمی نہ بھیجیں۔ پر ایسا کرنے سے مناسب یہ ہے کہ آپ مہاراج سے نویدن کریں۔ کیونکہ یہ رسم نیائے کے وِرُدھ ہے۔ اور اس سے ہمیں بہت کشٹ ہوتا ہے۔ اگر مہاراج یہ بات مان لیں تو اچھا۔ نہیں تو آپ بیگار نہ دیں۔ اور وہ جو آپ کہتے ہیں کہ ایسا کرنے سے ہم پر دُکھوں کا پہاڑ ٹوٹ پڑے گا۔ تو کیا پہلے ہم بہت سُکھی ہیں۔ بیگار دینے میں بھی بہت دُکھ سہنا پڑتا ہے۔ آپ کو یاد ہے کہ پچھلی برس جب مہاراج خود سامنے کے پربت پر شِکار کھیلنے آئے تھے تو بھائی ہیرا

دوسرے بیگاریوں کے ساتھ جنگلی جانوروں کو گھیرنے کیلئے ایک بھالو کے پیچھے دوڑ رہے تھے تو اُس نے پنجہ مار کر اُن کا منہ نوچ لیا تھا۔اگر آپ بیگار دینے سے انکار کردیں تو کیا سرکاری آدمی کسی پر اِس سے بھی زیادہ ظلم کریں گے؟

نمبردار نے دھیرے سے کہا۔رادھا آہستہ بولو دیواروں کے بھی کان ہوتے ہیں۔بیگار کی بابت ہم دربار میں بہت سی عرضیاں دے چکے ہیں۔وہاں کوئی نہیں سُنتا نہ کوئی نیائے ہی کرتا ہے۔نہ کسی کے من میں دَیا آتی ہے۔بیگار سے انکار کی بات تو تم نے ٹھیک کہتی ہو مگر انکار کرنے کی ہمت کیسے کروں۔تمہارے بیاہ سے فرصت پاتا ہوں تو تمہاری بات بھی کر دیکھوں گا۔اس سے پہلے یہ جگڑا چھیڑنا اچھا نہیں۔یہ سُن کر رادھا چُپ ہوگئی۔

رادھا کی شادی ہوگئی۔اُس کا پتی رام کوٹ کے ایک غریب زمیندار کا لڑکا تھا۔لڑکے کا نام تھا تارا۔ وہ بائیس برس کا گبرو تھا۔بہت بھلا مانس، محنتی اور ملنسار۔دسویں جماعت پاس کر چُکا تھا۔اُس کا بوڑھا باپ ایک مدّت سے بیمار چلا آتا تھا۔اسلئے تارا نوکری کی خاطر گھر چھوڑنا نہیں چاہتا تھا۔بیمار اور بوڑھے باپ کی سیوا کو وہ عین راحت سمجھتا تھا۔شادی کے بعد بھی اُس کی خدمت گُزاری اور سعادت مندی میں کوئی فرق نہ آنے پایا۔دِن کھیتی باڑی کے کام دھندے میں گزر جاتا تھا اور رات شام کو ایک گھنٹے کیلئے وہ گاؤں کی بچوں کو ہندی پڑھایا کرتا تھا۔پتھریلی زمین میں کاشتکاری کرنی کوہ کنندہ وکاہ برآوردن والی بات تھی۔لیکن تارا شُغل کے طور پر محنت کیلئے جاتا تھا۔کاشتکاری سے فاہدے کا اُسے چنداں خیال نہ تھا۔پادری سے پندرہ روپیہ ماہوار مل جاتے تھے۔اور پچھلے پانچ چھ برسوں سے مل رہے تھے۔یہ اُس کے اور اُس کے باپ کی گزر اوقات کیلئے کافی تھا۔تارا کی ماں اُس کے بچپن میں ہی مرگئی تھی۔بہن بھائی کوئی نہ تھا۔رادھا بڑی سیانی تھی مگر تھی اَن پڑھ۔اُس کا خاوند

سردی کی لمبی راتوں میں کہی کہی گھنٹے پُستکیں پڑھتا رہتا تھا۔ کبھی کبھی پادری سے اخبار بھی مانگ لاتا تھا۔ اور بیوی کو سُنایا کرتا تھا۔ ایک دن رادھا نے کہا۔

''پتی دیو آپ پادری کے بچوں کو ہندی پڑھاتے ہیں۔ اگر آپ مجھے بھی پڑھا دیا کریں تو کیسی اچھی بات ہو۔''

تارا کو تو پہلے ہی اس بات کا خیال تھا اُس نے رادھا کو ہندی پڑھانی آرنبھ کردی۔ رادھا کی زندگی سُکھ سے گزر رہی تھی۔ اُسنے اچھی خاصی ہندی بھی سیکھ لی لیکن بیگار کی دُکھ جس نے اُس سے شادی سے پہلے میکے میں دکھی کیا تھا۔ کبھی کبھی یہاں بھی ستاتا تھا۔ جب اُس کا خاوند بیگار دینے کیلیٔے جاتا تھا تو رادھا کو بڑی چنتا ہوتی تھی۔ کبھی جھارہ بیگار کیلیئے طلب ہوتی۔ تو کبھی آٹھوارا کیلیئے جاتا۔ تو اِس سے کہیں کہیں روز گھر سے باہر رہنا پڑتا تھا دوسرے دیہاتوں کا بھی یہی حال تھا۔ وہ اکثر پادری کے پاس اپنی تکلیفیں بیان کیا کرتے تھے۔ پادری نیک دل آدمی تھا۔ اُس نے بیگار کیلیئے زبردست آندولن جاری کیا۔ اُس نے دیہاتوں میں پرچار کیا۔ کہ وہ بیگار دینے سے انکار کردیں۔ اُس تحریک میں تارا نے بہت دلچسپی لی۔ اور اپنے دیہاتی بھائیوں کو بیگار کیخلاف اُکسایا۔ پولیس نے اُسے گرفتار کرلیا۔ اور کوئی الزام لگا کر اور اُس کا چالان کردیا۔ بیگار کیخلاف پرچار کرنا کوئی جُرم نہیں تھا۔ کیونکہ یہ قانوناً جائز نہ تھی۔ مگر جس کو دینی ہو۔ اس پر کوئی بھی الزام لگایا جاسکتا۔ پادری کو پولیس نے پکڑا تو نہیں۔ مگر وہ حُکام کی نظروں میں معتوب ہوگیا۔ تارا کو تین ماہ کیلیئے قید خانے میں ڈال دیا گیا۔ رادھا نے یہ خبر سُنی۔ تو وہ چند لمحوں کیلیئے چنتا کے ساگر میں ڈوب گئی۔ لیکن فوراً ہی اِس کے چہرے پر بشاشت کی ایک لہر ڈوب گئی۔ اُس نے سوچا کہ میں چنتا کیوں کروں میں اُس بہادر ہستی کی پتنی ہوں جو اپنے بھائیوں کے کشٹ نِوارن کرنے کیلیئے بندی خانے میں گیا ہے۔ اُسے بیگار کے بارے میں وہ باتیں یاد آئیں جو اُس

نے کنوار پنے میں اپنے پِتا سے کی تھی۔ اِن کی یاد آتے ہی اُس کا حوصلہ بندھ گیا۔ پادری پندرہ روپیہ ماہوار جوتارا کو دیتا تھا۔ رادھا کو دیتا رہا۔ تین ماہ کے بعد تارا آ گیا اور تھوڑے ہی دنوں کے بعد یہ خبر بھی آ گئی۔ کہ اس علاقے میں بیگار بند ہو گئی ہیں۔ یہ سُن کر سب کو خوشی ہوئی مگر سب سے زیادہ خوشی رادھا کو ہوئی۔

(۷)

یہاں کے بعد پہلے برس میں رادھا دو تین دفعہ میکے گئی تھی۔ اب اُسے گھر کا منہ دیکھے نو برس گزر چکے تھے۔ اس عرصے میں وہ دو بچوں کی ماں بن گئی تھی جب اُسے سُپر ون کے چشمے پر پانی بھرنے، سہیلیوں کے ساتھ نہانے، ان پر چھینٹے اُڑانے اور پہاڑی گیت گانے کی یاد آتی تھی۔ تو اُس کے دل میں ایک ہوک سی اُٹھتی تھی۔ اور وہ چاہتی تھی کہ وہ اُڑ کر اُس چشمے پر پہنچ جائے۔ والدین کی یاد بھی اُسے اکثر رُلاتی تھی۔ لیکن اِن کی طرف سے کوئی بھی کوئی بھی بلاوا نہیں آتا تھا۔ لڑکے گھر سے دوڑے چلے گئے ہوں تو جب چاہے گھر چلے آجاتے ہیں۔ ہر شادی کے بعد لڑکیوں کو اپنے گھر بیگانے ہو جاتے ہیں۔ گھر کی یاد انہیں تڑپاتی ہے۔ مگر جب تک والدین نہ بلائیں۔ نہیں جاتی۔ رادھا کہیں برسوں سے گھر کو ترس رہی تھی۔ اس کے بھائی کو شادی ہونے والی تھی۔ تو والدین نے اُسے یاد کیا۔ وہ اپنے خاوند کے ہمراہ پہاڑی نالوں کو پایاب وعبور کر کے بسنت پور پہنچی۔ تو والدین اُسے اور اپنے داماد سے ملا کر پرسن ہوئے۔ بچوں کو دیکھ کر اِن کی خوشی کا کوئی ٹھکانہ نہ رہا۔ رادھا کو بھی اپنے ماتا پِتا اور رشتہ داروں مل کر بہت حسرت ہوئی۔ لیکن گاؤں کے چشمے پر پہلی سی رونق نہ دیکھ کر اُس کی آنکھوں میں آنسوں آ گئے۔ پانی اُسی طرح بہہ رہا تھا۔ مگر اب وہ پُرانی صورتیں نظر نہ آتی تھیں۔

(۸)

رادھا کے بھائی کی شادی ہوگئی۔ تارا واپس چلا گیا۔ رادھا چند ماہ کیلئے ٹھہر گئی۔ اُسے آئے دو مہینے گزرے تھے۔ کہ نمبردار کے نام آٹھوارہ بیگار دینے کا حکم آیا۔ گاؤں کے پٹھواری نے کہا بہادر گڑھ والی سڑک مرمت طلب ہے۔ اپنے اپنے اوزار لیکر سڑک پر پہنچ جاؤ۔ دیہاتی نمبردار کے گھر میں اکھٹے ہوکر آپس میں مشورے کرنے لگے کہ بیگار۔ دیں یا نہ دیں۔ بخشا بخشی کے دینے کا فیصلہ ہوا۔ شاید وہ اب کے بھی بیگار دینے پر رضامند ہوجاتے۔ مگر بات چیت کے بیچ میں بھی انہوں نے رادھا سے پوچھ لیا۔ کہ رام کوٹ والوں نے بیگار سے کس طرح چھٹکارا پایا ہے۔ اُس نے سارا حال بتایا اور کہا آپ کو اس بلا سے چھُڑانے کا ذمہ میں لیتی ہوں۔ آپ میری باتوں پر عمل کریں۔ پہلی بات یہ ہے کہ آپ سب میل میلاپ کریں۔ علاقے کا کوئی آدمی بیگار کیلئے نہ جائے۔ دوسری بات یہ ہے کہ اگر راجا کے آدمی آپ کو مارے پیٹیں تو بھی آپ ان پر ہاتھ نہ اُٹھائیں۔ اِن کی سختیوں کا مقابلہ ستیہ اور شانت مئی طریقوں سے کریں۔ چنانچہ نمبردار نے پٹھواری سے کہہ دیا کہ ہم بیگار نہیں دیں گے۔ پٹھواری نے تحصیل میں اطلاع دے دی۔ پولیس آئی۔ اور نمبردار اور اس کے کہیں ساتھیوں کو گرفتار کر کے لے گئی۔ بسنت پور کے سارے علاقے میں سنسنی پھیل گئی۔ عورتیں اور بچے گھبرا گئے۔ نمبردار کے گھر میں میلہ سا لگ گیا۔ رادھا نے سب کو تسلی دی۔ کہ فکر نہ کرو۔

پولیس نے نمبردار اور اُس کے ساتھیوں پر بہت سختی کی۔ انہیں گالیاں دیں۔ اِن کی بے عزتی کی اور انہیں حوالات میں بند کر دیا۔ پولیس ایک ہفتہ تک سوچتی رہی کہ اِن کا چالان کس دفعہ میں کیا جائے۔ مگر کوئی تجویز راس نہ آئی۔ ریاست کے وزیر سے پُوچھا تو انہوں نے کہا۔ اِس زمانے میں بیگار کی بات چلنے کی نہیں دیہاتیوں

کو چھوڑنا ہی پڑے گا۔

(۹)

بسنت پور کے ستیہ گرحوالات سے چھوٹ کر گاؤں میں آ گئے۔ اُن کی عدم موجودگی میں اِن کے گھروں میں رسد پُہنچانے، کھیتوں کی دیکھ بال کرنے ڈھور ڈنگروں کے چرانے کا سارا انتظام رادھا نے خاطر خواہ طور پر کر دیا۔ لیکن گاؤں کے لوگ پھر بھی سہمے ہوئے تھے۔ ستیہ گرہیوں کے آنے پر گھر گھر میں خوشی شادیانے بجنے لگے۔ خوشی کی سب سے بڑی وجہ یہ تھی کہ بسنت پور والوں کو بیگار سے مخلصی مل گئی تھی۔ آج نمبردار کے گھر میں پھر ایک میلہ سا لگ گیا۔ ستیہ گرہی حوالات کی کہانیاں مزے لے لے کر سُناتے رہے تھے۔ لوگ اِن کی بپتا کی کہانیاں سُن سُن کر اظہارِ ہمدردی کر رہے تھے۔ منگو جاٹ نے کہا۔ اب افسوس کس بات کا دکھ کی جو گھڑیاں گزر گئی اُن کو پار کر کے جی کڑھانے کا کیا فایدہ؟ اب خوشی کا مقام ہے۔ کہ ہم بیگار کے پنجے سے رہا ہو گئے ہیں۔ اور اِس ساری کامیابی کا سہرہ نمبردار کے سر ہے۔ نمبردار نے حلیمی مگر فخر سے کہا یہ سہرا رادھا رانی کے سر ہے۔ رادھا سر جُھکا کر بولی یہ ایکتا، ستیہ اور آہنسہ کی وجے ہیں۔ اِس سپھلتا کا سہرا میرے سر نہیں بلکہ آپ کے سر ہے۔ جنہوں نے ان اصولوں کیلیئے قربانی دی ہے۔ نمبردار نے کہا۔ بیٹا یہ اچھی باتیں تُم نے کس سے سیکھی ہیں؟

رادھا: ''پتا جی آپ کہا کرتے تھے کہ آپ گاندھی جی کو تب جانے گے جب کہ پہاڑ میں بیگار بند کرا دیں گے۔ بسنت پور بیگار اُنہی اُصولوں کے طفیل بند ہوئی ہے۔''

............☆☆☆............

ٹیکہ بٹنی

دُولھا منڈل پر کھڑا ہے۔ اوپر کمرے میں دُلہن کا سنگار رہو رہا ہے۔ پنڈتانیاں رسیلی تانوں ناقابل فہم گیت گا رہی ہیں۔ آنگن میں براتی ہیں مُحلے بھر کے لڑکے اور لڑکیاں ہیں۔ پروہت اور بھک منگے ہیں۔ کچھ اِن میں سے خوش ہیں، کچھ مغموم ہیں اور کچھ حیران و پریشان۔ ایک لڑکی بیاہی جا کر وداع ہو رہی ہے۔ اس کے ماں باپ رحم جویانہ نظروں سے دولھا اور دولھا کے براتیوں کو دیکھ رہے ہیں۔ جیسے کہہ رہے ہوں...... "آج تک یہ لڑکی ہماری تھی، اب تمہاری ہوگئی ہے۔ اسے کوئی تکلیف نہ دینا۔ جہیز اور کُرم کے لئے تنگ نہ کرنا۔ یہ بڑی فرماں بردار بیٹی ہے۔ تمہاری سیوا ٹہل کو اپنی سعادت سمجھے گی اور سرا جسم تمہارے چرنوں میں گذار دے گی۔"

آج تک یہ لڑکی زندگی کے جس ڈگر پر چل رہی تھی۔ وہ شادی کے دوارے پر ختم ہوگیا۔ اب دوسری شاہراہ کی ابتدأ ہے جس پر ماں باپ کا اختیار نہیں، صرف اُن کی دُعاؤں کا سایہ پڑتا ہے۔ نئے ساتھی کا پیار ہوتا ہے، محبت ہوتی ہے، قہقہے ہوتے ہیں۔ زندگی اگر صرف یہیں ختم ہوا کرتی۔ تو یہ شاہراہ ابتدأ سے انتہا تک حسین اور جوان نظر آتی۔ لیکن جُوں جُوں یہ لمبی ہوتی جاتی ہے۔ اس پر سنجیدگی، متانت اور فرض چھا جاتے ہیں اور ابتدأ کے قہقہے کہیں کہیں آنسوؤں میں مبدل ہوتے ہیں اور کہیں کہیں ـــــ پاتال تک چلے جاتے ہیں اور پیار میں تھامی ہوئی باہیں اکثر ڈھیلی پڑتی

ہیں......

مسلمان عورتیں...... بوڑھی اور نو خیز...... آنگن کے ایک طرف پیار اور حیرت کے زیر اثر گا رہی ہیں۔ آنکھیں منڈل پر کھڑے دُولھا کو دیکھ رہی ہیں اور تصوّر سنگار ہونے والی دولہن کے پاس بچپن پر منڈلا رہا ہے، جو آج کے تھر تھراتے ہوئے سورج کے نکلتے ہی ختم ہو گیا۔ کل کی چھوکری پیار اور محبت، فرض اور رسوم سے بے خبر آزاد گلہری کی طرح دھان کے منڈیروں پر ناچتی تھی، گاتی جاتی۔ گاؤں کی کچی سڑک سے آنے والی ہر برات کو دیکھ کر ہنستی تھی، ان کا منہ چڑاتی تھی۔ آج پرائے مرد کیساتھ اسی کچی سڑک سے جا رہی ہے۔ اپنے ماں باپ سے وداع ہو کر، اپنی سہیلیوں سے منہ موڑ کر، اور دھان کی پیاری پیاری منڈیروں کو بھلا کر، دور ندی کے پار اس کے دولھا کا گھر ہو گا، جہاں اس کی ساس، نند اور دیور اس کا انتظار کرتے ہوں گے۔ ندی کا پانی دودھ کی طرح میٹھا ہے لیکن دل بلور کی طرح سخت۔ یہ آر پار کے گاؤں کی ہر لڑکی کو، بچپن سے، ماں باپ سے، کھیتوں سے جُدا کرتی ہے۔

دلہن کا سنگار ہو رہا ہے اور مسلمان عورتیں آنگن میں گا رہی ہیں ؎

سڑکن وتھرے مشکہ کو فورو۔ عشقہ بمبورو لیلہ آکھو

منڈل پر عشق کا بھنورا کھڑا ہے بھنورے کی لیلہ کا سنگار ہو رہا ہے اور ایک بوڑھا پروہت اپنی پوتی سے رازدرانہ لہجے میں کہتا ہے...... ''ٹیکہ بٹنی، جب تیرا دولھا میرے آنگن میں ہو گا......'' اس سے آگے وہ کچھ نہیں کہہ سکتا، اس کے ذہن کا شیرازہ بکھر جاتا ہے اور نو برس کی ٹیکہ بٹنی منڈل پر کھڑے متین صورت بھونرے کو حیرت سے دیکھتی ہے۔ شاید سوچتی ہے، یہ اَن جانا، اَن دیکھا دولہا کہاں سے آ کر ہماری گلہری کو چھین کر لے گیا؟ ہماری سہیلی اسے دیکھ کر روتی کیوں نہیں؟ اس کے ماں باپ نے اس پرائے مرد کو گاؤں سے بھگا کیوں نہیں دیا؟ وہ اپنے بوڑھے دادا کی بات غور سے

سنتی ہے۔ ''ٹیکہ ٹنی جب تیرا دولھا میرے آنگن میں ہوگا......'' وہ یہ سننا چاہتی ہے کہ پھر کیا ہوگا، لیکن دادا اس سے آگے کچھ نہیں کہتا۔ وہ اوپر دیکھتی ہے جہاں دلہن کا سنگار ہو رہا ہے اور رنگا رنگ پوشاک میں ملبوس پنڈتانیاں کھڑکیوں میں ایک دوسری کے اوپر جھکی ہوئی دولھا کو دیکھ رہی ہیں اور وہ دن یاد کر رہی ہیں جب ان کا دولھا بھی اسی طرح آنگن میں منڈل پر کھڑا تھا اور مسلمان عورتیں ایک کونے میں گا رہی تھیں۔

سڑکن وتھرے کشکہ کوفورد۔۔ عشقہ بمبور ولیلہ آکھو

وہ اس دن کسی قدر لرز رہی تھیں، ہر آہٹ پر چوکنی ہو جاتی تھیں۔ لیکن جب وہ سسرال پہنچیں اور انہوں نے اپنے نئے ساتھی کو دیکھا تو ان کا سارا خوف جاتا رہا انہیں محسوس ہوا جیسے وہ اپنے ساتھی کو جنم جنم سے جانتی تھیں۔ اگر بچپن ختم ہوتے ہی ان کے ماں باپ بھونرے تلاش کر کے نہ لاتے تو ان کی زندگی کتنی پھیکی اور بدمزہ ہو کر رہتی۔

گیت بدستور شور وشر کے ماحول میں گونجتا رہتا۔ ان گیتوں کا کیا مطلب ہے یہ ٹیکہ ٹنی نہیں جانتی، البتہ اس کا بوڑھا دادا جانتا ہے، اس کی آنکھیں مسکرا رہی ہیں ۔ بھاری بھر کم جسم جھوم رہا ہے اور زرد اور میلی مونچھوں سے ڈھکے ہوئے ہونٹ کانوں تک پھیل رہے ہیں۔ ہاں یہی زندگی ہے، یہی ایک لڑکی کی جنت ہے کہ اس کے ماں باپ اپنی پیاری بیٹی کے دولھا کو اپنے آنگن میں منڈل پر کھڑا دیکھیں اور کانوں سے بھنورے اور پھول کا دل نواز گیت سنیں۔ اسے اپنا بیٹا یاد آ گیا جو آج سے چار سال پہلے اسے داغ مفارقت دے گیا تھا۔ اور اُسکے بوڑھے کاندھوں پر ٹیکہ ٹنی کا بوجھ ڈال گیا تھا۔ آج وہ زندہ ہوتا تو کبھی گاؤں میں آنے والی ہر برات کے پیچھے پیچھے اپنی پوتی کو لے کر چاول کے چاند لقموں اور سکے کے چند پیسوں کی خاطر نہ آیا کرتا۔ وہ براہمن ہے اور پروہت جو ہر اشٹمی کو کھیر بھوانی میں تانبے کے چند چھوٹے چھوٹے برتن پھیلا کر

بیٹھ جاتا ہے۔ ٹیکہ بٹنی چندن گھستی ہے۔ دادا یاتریوں کو پوجا کراتا ہے اور جب پیسے بانٹنے کا موقع آتا ہے تو ٹیکہ بٹنی کی طرف اشارہ کر کے کہتا ہے۔ ''اسے بھی دو ججمان' یہ میری اکلوتی پوتی ہے اور بھگوتی کی پجارن۔'' سارا دن وہیں بیٹھ کر وہ کچھ روپے بنا لیتا ہے اور پھر پوتی کے مستقبل کے متعلق سوچتا رہتا ہے۔ ایسی برات اُترے گی کی گاؤں میں نام رہ جائے گا۔ اتنے گہنے بنوا دوں گا کہ ہر لڑکی منہ تکتی رہ جائے گی۔ یکا یک اس کا خواب ٹوٹ جاتا ہے' ایک شخص اپنے ساتھی سے پوچھ رہا ہے...... ''یہ لوگ دلہن کو کیوں نہیں لاتے' دولھا منڈل پر کھڑا تھک گیا ہے۔'' بوڑھا پروہت ہنستا ہے اور پوتی کے شانے پر ہاتھ رکھ کر رازدارانہ لہجے میں کہتا ہے۔ ''سنتی ہو' کہتے ہیں دولھا منڈل پر کھڑا تھک گیا۔ دلہن کو لے آؤ۔''

''کہاں لے جائیں گے اسے دادا''

''اپنے گھر بیٹی وہاں ندی کے پار......''

''کیوں دادا' اب وہ ہمارے ساتھ نہیں کھیلا کرے گی؟''

بوڑھا زور سے ہنستا ہے۔ ''کھیل کود کا زمانہ بیت گیا بیٹی' کرم دھرم کرنے کے بعد لاش اور دلہن کو گھر میں نہیں رہنے دیا جاتا۔ یہی مُریادا ہے' آج تک وہ ہماری بیٹی تھی۔ اب کسی کی بہو بن گئی۔ کسی کی دھرم پتنی' کسی کی نند اور کسی کی بھاوج۔ اب وہ عورت ہے بیٹی......عورت......جگت جننی جس نے رام کو جنا ......تمہیں اور مجھے جنا......''

ٹیکہ بٹنی حیران رہ گئی۔ ہماری گلہری ایک ہی چکر میں اتنی بڑی عورت بن گئی وہ دادا کے قریب آ کر اسے حیرت اور خوف کی نظروں سے دیکھنے لگی۔

''لیکن دادا تم مجھے بھی عورت بنا دو گے؟''

دادا ہنس کر کہتا ہے۔ ''میں نہیں بنا دوں گا بیٹی' زندگی بنا دے گی' زمانہ بنا

دے گا۔ ہر بیٹی کو یہی عورت بناتے ہیں اور پھر رام اور بُدھ اس سے مانگتے ہیں۔ ہی ہی ہی......"

لیکن میں ندی پار نہیں جاؤں گی دادا......ان براتیوں کے ساتھ جو رنگا رنگ پوشاک پہن کر آتے ہیں اور گاؤں کی لڑکیوں کو ڈولی میں بند کر کے لے جاتے ہیں۔

"تو نادان ہے ٹیکہ بٹنی۔ ہر لڑکی کو سسرال جانا ہی پڑتا ہے اور پھر ہم براہمنوں کی لڑکیاں اپنے ماں باپ کے گھر میں نہیں رہ سکتیں۔ ہم بڑے اوتم ہیں ودیا پڑھنے اور پڑھانے والے' دان دینے اور لینے والے۔ لیکن تمہیں ڈر کاہے کا؟"

ٹیکہ بٹنی اُن ہی متحیر نگاہوں سے دور بہنے والے خاموش ندی کی طرف دیکھنے لگتی ہے اور سوچتی ہے۔ "کیا یہ ندی چھوٹ جائے گی؟"

دادا اس کا مطلب تاڑ لیتا ہے۔ اس کے بے ترتیب اور میل سے اٹے ہوئے بالوں پر ہاتھ پھیر کر کہتا ہے۔ یہ ندی اسی طرح بہتی رہتی ہے۔ بیٹی یہ گاؤں کی لڑکیوں کو ہم سے جدا بھی کرتی ہے۔ لیکن ان کی جگہ نئی لڑکیوں کو بھی تو لاتی ہے۔ لیکن جب تو چلی جائے گی' تیری جگہ......نہیں کچھ بھی نہیں......اس کی آنکھوں میں آنسو کے دو قطرے چمکتے ہیں۔ کاش ٹیکہ بٹنی تیرا ایک چھوٹا بھائی بھی ہوتا جس کے لئے میں ندی پار سے چاند سی دلہن لاتا اور مرنے کے وقت تانبے کے سارے برتن اس کے حوالے کر کے کہتا۔ "لو بیٹا اپنے دادا کی پونجی' جب اشٹمی آیا کرے تو کھیر بھوانی کے چشمے پر سلیقے سے انہیں پھیلا دینا اور ججمانوں سے کہنا......" دادا چل بسے ججمان اور ٹیکہ بٹنی بیاہی گئی۔ اب سارے پیسے مجھے دو۔ میرے گھر میں ندی پار سے لائی ہوئی چاند سی دلہن بھی ہے۔

میں تمہیں چھوڑ کر نہیں جاؤں گی دادا' میرے بعد تمہارے پاؤں کون دھویا کرے گا۔ بستر کون بچھایا کریگا اور پوجا کے برتن کون صاف کیا کرے گا......

بوڑھا زہر خندہ کر کے کہتا ہے۔ ''میرا کیا ہے بیٹی' میں پروہت ہوں۔ ایک ادتم براہمن۔ جہاں جاؤں گا' مان سے بیٹھوں گا۔ اور پھر دُنیا اسی طرح چلتی رہتی ہے۔ لڑکیاں بیاہی جاتی ہیں۔ بوڑھے مر جاتے ہیں اور دروازوں میں تالے پڑ جاتے ہیں...... کہیں اُجڑے گھر بس جاتے ہیں اور کہیں بسے ہوئے گھر اُجڑ جاتے ہیں......''

''لیکن میں پھر بھی تمہیں چھوڑ کر نہیں جاؤں گی دادا......''

اری ابھی سے کیوں گھلی جاتی ہو۔ ابھی چھ برس کی بات ہے۔ جب مجھے تمہارے لئے دولہا دیکھنا ہوگا' ایک اچھا سا دولہا......

ٹیکہ بٹنی کھل کھلا کر ہنس دیتی ہے اور بوڑھا بھی۔

سنگار ہونے کے بعد دلہن کو سر سے پاؤں تک شال میں لپیٹ کر لایا گیا اور دولھا کے بائیں طرف منڈل پر رکھ دیا گیا' دلہن جھکی رہی اور دولہا سفیدے کی طرح اکڑ رہا......لیکن آزادی گلہری! تو بھی سیدھی کھڑی ہو جا' ورنہ کمر کا یہ خم زندگی بھر نہیں نکلے گا۔ کل تک تو ایک بے خبر چھوکری تھی۔ لیکن آج تو عورت ہے۔ آج زمانے نے تیرے سر پر ایک چمکتا ہوتا تاج رکھا ہے۔ وہ تاج جس کی جگمگ کرنے والی روشنی میں مرد زندگی کے ڈگر پر ٹھوکر کھائے بغیر چلتا ہے۔ آج تو اس رشتے میں پروئی گئی جس کے ہر دانے کی حفاظت کرنا تمہارا ایمان ہے۔ آج قدرت نے تمہارے حُسن اور شباب کی قیمت ادا کر دی۔ اور اس کا حق چکانے کے لئے تمہیں ایسے بیٹوں کو پیدا کرنا ہے جو انسانی بھیس میں لٹیرے نہ ہوں۔ سیدھی کھڑی رہ میری گلہری! اور دُنیا سے سر بلند ہو کہ کہہ' مجھے یہ ذمہ واریاں منظور ہیں۔ ''لیکن دلہن بڑی ضدی معلوم ہوتی ہے۔ وہ نئی زندگی کو' نئے راستے کو' نئے ساتھی کو جھک جھک کر نمسکار کرتی ہے اور سیدھی کھڑی نہیں ہوتی۔ اس کے بدن کا دایاں حصہ دولا کے ساتھ چھو رہا ہے' جو اپنے بدن میں برقی روسی محسوس کرتا ہے۔ ایک ایسا تناؤ جس کی تسکین نہ پنڈتانیوں کے ناقابل فہم

گیتوں سے ہوسکتی ہے نہ مسلمان عورتوں کے دردناک گانوں سے' وہ اس منڈل سے پر لگا کر اُڑنا چاہتا ہے۔ اپنی دلہن کو ساتھ لے کر' جسے ابھی تک اس نے دل کھول کر بھی نہیں دیکھا جس کے مزاج سے' خیالات سے عادات سے وہ ابھی واقف نہیں۔ لیکن اس بات کی ضرورت بھی کیا تھی۔ جب کچھ بھی نہیں ملے گا' وہ اسے چھوڑ کر دوسری شادی کر سکتا ہے' اسے ٹوکنے والا کون ہے' فرض اور ذمہ واریاں تاج اور رشتے' حق اور قیمت سب کچھ لڑکیوں کے لئے ہے جو شاید اسی لیے نیم دائرے بن کر منڈل پر کھڑی زندگی کے نئے ڈگر پر قدم رکھتی ہیں کہ پاک منتروں سے ان کے جسم و جان کا اَن دیکھا مالک انہیں کہیں چھوڑ کر نہ چلا جائے۔''

بوڑھا پروہت یہ منظر دیکھ کر بہت متاثر ہوا ہے۔ اس کی آنکھوں میں آج سے چھ برس بعد ہونے والا واقعہ پھر رہا ہے۔ ٹیکہ بٹنی کا دولہا منڈل پر کھڑا ہے۔ مسلمان عورتیں آنگن میں گیت گا رہی ہیں

سڑکن وتھرے مشکہ کوفورو۔۔ عشقہ مجنونو لیلہ آ کھو

ٹیکہ بٹنی شال میں لپٹی ہوئی نیم دائرہ بنا کر انگور کی بیل کی طرح لرز رہی ہے اور اندر ہی اندر دبی آواز میں دادا سے کہہ رہی ہے...... ''میں نہیں جاؤں گی دادا' مجھے مت جانے دو......'' دادا کی روح اپنی آغوش کھول کر اسے چھپانا چاہتی ہے۔ اسے اس وقت اپنے الفاظ یاد آ رہے ہیں۔ جو آج سے چھ برس پہلے اس نے معصوم ٹیکہ بٹنی کو گاؤں کی ایک لڑکی کے وداع ہونے پر کہے تھے۔ تو نادان ہے بیٹی' ہر لڑکی کو سسرال جانا ہی پڑتا ہے اور کرم دھرم کے بعد لاش اور دلہن گھر میں نہیں رہ سکتے......لیکن تو لاش نہیں' تو آج سے جگت جننی ہے' زمانے نے جو فرائض تم پر عائد کئے' ان کا حق ادا کرنا بیٹی۔ اسے رام اور بدھ دینا' انسان کے بھیس میں لٹیرے نہ دینا' اسی سے میں لازوال بنوں گا اور تیری نسائیت جاوداں ہو کر رہے گی...... ''بوڑھا سب کی نظریں بچا کر اپنے

آنسو پونچھ ڈالتا ہے۔'' یہ آنسو بہانا اس وقت برا شگون ہے براہمن۔ اپنی لڑکی کو آشیر دار دو۔ تمہاری خالی جیبیں سہی، گھر اجڑا ہوا ہی سہی، لیکن تمہارے دل میں آشیر واد تو ہے، وہی اسے دے دو۔ اس بن ماں باپ کی بیٹی کو، جس نے پندرہ برس تمہارے پاؤں دھوئے، برتن صاف کئے اور بستر بچھایا۔

بوڑھا اپنے منطقی وجود سے برسر پیکار ہے یہ بن ماں باپ کی بیٹی نہیں۔ اس کی ماں میں ہوں، باپ میں ہوں، بھائی میں ہوں۔ اسے بن ماں باپ کی بیٹی کہہ کر میرے زخموں کے ٹانکے مت کھولو۔ آج منڈل پر دولھا دیکھ کر ان بند ٹانکوں سے آہستہ آہستہ خون رسنے لگا ہے لیکن تم سارے کے سارے ٹانکے مت کھولو۔

''دُنیا ایسے ہی چلتی ہے براہمن، خون میں بو ہوتی ہے۔ جو جس کے بطن سے پیدا ہوتا ہے اسی کا ہوتا ہے۔ تم سب کچھ ہو کر بھی صرف دادا ہی ہو سکتے ہو۔ منڈل پر اس کا دولھا کھڑا ہے۔ ڈولی اس کا انتظار کر رہی ہے۔ اسے آشیر واد دو کہ جو چیز اسے تمہارے گھر میں نہ ملی۔ وہ اپنے خاوند کے گھر سے حاصل کر سکے؟''

''میں نے اسے سب کچھ دے دیا میری آتما، لیکن گہنے اور کپڑے...... میرا بیٹا...... وہ پھل والا بوٹا...... ایک بیج جوش میرے حوالے کر کے سوکھ گیا۔ میرے پاس جو کچھ تھا، دے دیا۔ پوجا کے برتن، میلا بچھونا، بھکشا میں اپنے ہوئے کپڑے...... اور یہ گھر...... یہ اب مجھے کس کام آئے گا، جب گھر کی روح ہی ڈولی میں بند ہو کر چلی جائیگی تو ڈھانچے کو سنبھال کر میں کیا کروں گا......''

آنگن میں گہما گہمی ہوتی ہے، گیت اونچے سروں میں گونجنے لگتے ہیں۔ ٹیکہ بنی دلہن کے قریب جا کر اسے دیکھنا چاہتی ہے لیکن وہ شال میں لپٹی ہوئی ہے۔ وہ دولہا کو خوف اور حیرت سے دیکھ رہی ہے۔ شاید پوچھنا چاہتی ہے، تم میری گلہری کو کیوں لے گئے۔...... اس نے تمہارا کیا بگاڑا تھا؟ جو تو ایک جماعت ساتھ لا کر اسے

لے بھاگا۔ کیا ندی پار تمہیں کوئی ایسی لڑکی نہ ملی جسے تو اپنی دلہن بنا سکتا؟

وہ پھر حسین وجمیل منڈل کو دیکھنے لگی۔ جو ہلدی، چونے اور سات رنگوں سے بنایا گیا تھا اور جس کے نقش ونگار پر چار پاؤں...... دو مضبوط دو نازک...... زندگی کے نئے ڈگر پا چلنے کے لئے اکٹھے ہوگئے تھے۔ یہ پاؤں سب سے پہلے اس ہلدی اور چونے والے منڈل پر ملتے ہیں۔ پھر ایک ساتھ اٹھتے ہیں، چلتے ہیں اور چلتے رہتے ہین ۔منڈل کے نقوش مٹ جاتے ہیں۔ لیکن ان نقوش کا طلسم نہیں ٹوٹتا۔ ٹیکہ بٹنی اپنے پاؤں دیکھتی ہے، غلیظ اور مکروہ۔ آج کتنے ہی دنوں سے وہ اس آنگن میں گھومتی رہی چاول کے لئے کبھی بھات کے لئے، کبھی چائے کے لئے اور کبھی پیسوں کے لئے۔ جبھی یہ اتنے میلے ہیں ۔ لیکن ان پاؤں کے ساتھ کس کے دو پاؤں اور ملے گے...... مضبوط سے پاؤں...... وہ سوچتی ہے اور دادا اسے دور سے بلا رہا ہے۔ ''ٹیکہ بٹنی...... او ٹیکہ بٹنی!''

''کیا ہے دادا؟ ٹیکہ بٹنی دوڑ کر پوچھتی ہے''

''یہیں رہ بیٹی...... اب ہماری تمہاری باری ہے''

''کیوں دادا...... کیسی باری؟''

پگلی اب دولھا اور دلہن کے سر پر پیسے اور روپے آنے اور دونیاں پھینکی جائیں گی جتنی ہاتھ آئیں، اٹھانا۔

''لیکن دادا، ایسا کیوں ہوتا ہے...... اور پھر روپے اور دونیاں؟''

یہ سارا جگت کپٹی ہے بیٹی۔ اور یہ پیسے پھینکنا بھی کپٹ ہے یہ لوگ ہمیں دکھانا چاہتے ہیں کہ ہم مال دار ہیں...... مال دار...... لیکن بیٹی سب سے بڑا مال پیار ہے جو اس طرح پھینکا نہیں جاتا۔ اور جب تمہارا دولہا میرے آنگن میں آئے گا......''

''تب کیا ہوگا دادا؟'' پوتی معصومانہ انداز میں بڑے اشتیاق سے پوچھتی

ہے۔

''تُو سنے گی ...... سننا چاہتی ہے؟ بوڑھا ہنس کر کہتا ہے۔ میں تم پر پیار کی ورشا کروں گا جو آج تک کسی نے نہیں کی ہے' پیسے ملیچھ اٹھاتے ہیں۔ پیار دیوتا لے جاتے ہیں۔ اور پھر ہم براہمن ہیں۔ اور تم پروہت......''

براتیوں میں سے ایک خوش پوش نوجوان نے رومال کا منہ کھولا۔ بوڑھے نے اسے دیکھ کر اپنی زبان ہونٹوں پر پھیری۔

''اب تیار رہ بیٹی' میں اپنی چادر پھیلاؤں گا۔ تم دامن پھیلانا۔ اور پھر سب کے سب پیسے......ہی ہی ہی......'' بوڑھے نے کہا۔ دونوں ہنسنے لگے۔ رام کرے اس رومال میں بندھے ہوئے سارے پیسے اور روپے' آنے اور دونیاں ان کی چادر اور دامن میں آ آ کر گریں۔

جب شنکھ بجنے لگے اور کھڑکیوں میں ایک دوسری پر جھکی ہوئی پنڈتانیوں نے پھولوں کی ورشا کی۔ خوش پوش نوجوان کا ہاتھ ہوا میں لہرانے لگا۔ اور دولہا اور دلہن کے سر کے اوپر اُڑ اُڑ کر سکے گرنے لگے اور ان کیساتھ ہی مسلمان عورتیں بھک منگے اور بچے ان پر بھوکے پرندوں کی طرح جھپٹنے لگے۔ آنگن میں ایک شور بے ہنگم اٹھا جس میں بوڑھا پروہت اور اس کی معصوم پوتی چادر اور دامن پھیلائے گم ہوگئے پھر ابھرے' پھر گم ہوگئے۔ بوڑھا جوں جوں سکے اٹھاتا جاتا تھا۔ اس کی زبان سے بے اختیا دعائیں نکلتی تھیں۔ ''سدا سکھی رہو' جگت جننی بنو۔ سدا سہاگ وتی رہو' جُگ جُگ جیو......''

جب آنگن خالی ہو گیا اور مسلمان عورتیں' بھک منگے اور بچے اپنے پیسے الگ الگ گننے لگے تو دادا اور پوتی ایک دوسرے سے ملے

''کتنا ملا ہے؟'' بوڑھے نے ہنس کو پوچھا

پوتی نے دائیں ہاتھ کی دو انگلیوں میں ایک چھوٹا سا زرد سکہ دکھاتے ہوئے کہا ''یہ''

بوڑھے کی آنکھوں میں خون اُتر آیا۔ فرٹے مو۔ کمینی ! اتنی مایا میں سے صرف ایک ٹکہ؟

ٹیکہ بٹنی نے رونی صورت بنا کر کہا...... ''جب میں پھینکنے والے کی طرف دامن پھیلا کر جاتی تھی۔ تو وہ دوسری طرف منہ کر کے سکے پھینکتا تھا......''

بوڑھے کا غصہ اور تیز ہو گیا۔ اس کا سارا جسم پھڑ کنے لگا۔ اس نے بے اختیاری کے عالم میں پوتی کے منہ پر ایک طمانچہ مارا۔

''رذیل لڑکی، براہمن لڑکی ہو کر تم اس کے پھینکنے کی طرف نہ تاڑ سکی......کل کو جب تیرا دولھا آئے گا......تب......''

ٹیکہ بٹنی اسے حیرت سے دیکھنے لگی۔ شاید پوچھنا چاہتی تھی۔ تب کیا ہوگا۔ لیکن بوڑھا غصے سے کانپ رہا تھا۔ اس کے حلق میں جیسے ہڈی اٹک گئی تھی۔ وہ ان راستوں کو دیکھ رہا تھا۔ جن پر دولہا کی سواری، بند ڈولی اور خوش پوش براتی قہقہے لگاتے ہوئے سگریٹ پیتے جا رہے تھے، دفعتاً اس نے پوری شدّت کے ساتھ کہا...... ''بدمعاش کہیں کے...... لفنگے......''

....

ا؎ ہم سڑکوں پر تمہارے لئے مشک کافور بچھا دیں گی۔ اے عشق کے بھنورے کیا تُو اپنی لیلیٰ کو لینے کے لئے آ گیا؟

...........☆☆☆...........

جہاں سرحد ملتی ہے

ابھی آسمان پر چاند نہیں ابھرا تھا اور سرحد کے تنگ درّے میں خاموشی اور تاریکی دو سگی بہنوں کی طرح باہوں میں باہیں ڈالے جھوم رہی تھیں۔ اردگرد کے پہاڑ، یونانی مفکروں کی طرح سرنگوں کھڑے تھے۔ ان کے ننگے سینوں پر ہزاروں سال کی تاریخ کھدی ہوئی تھی۔ ان فاتحوں اور غازیوں کی تاریخ جو اس درّے سے گذرے تھے۔ اس انسان کی تاریخ جس نے اپنی تلوار سے دوسروں کو غلام بنایا تھا، انہیں لوٹا تھا، ان کی بہو بیٹیوں کی عصمت دری کی تھی اور پھر فتح ونصرت کے نعرے لگاتا ہوشادیانے بجاتا ہوا لوٹا تھا۔ پہاڑوں کے دامن میں چھوٹی بڑی چٹانیں اب تک سیاہ تھیں۔ جہاں سوداگروں کے قافلے اترے تھے اور گذر گئے تھے جہاں مسافروں نے آگ جلائی تھی اور تلاش معاش کے لئے چل دیئے تھے، جہاں انسان نے انسان کیساتھ تجارت کی تھی۔

اوران ملکوں کو جُدا کرنے والی سفید بت بھی خاموش تھے اور دونوں طرف بنی ہوئی جھونپڑیوں میں رہنے والے وہ لوگ بھی جوان بتوں کے محافظ تھے۔ دو ملکوں کے محافظ تھے عوام کے امن کے محافظ تھے۔

پار کی جھونپڑی میں سے ایک بے اصول انسان کی طرح پریشان حالی میں دھواں نکل رہا تھا اور اندر ایک دھیما سا دیا بھی جل رہا تھا۔ لیکن اس طرف کی جھونپڑی

قبر کی طرح خاموش تھی۔ نوجوان محافظ جھونپڑی کے باہر گیلی زمین پر بیٹھا سفید بت کی طرف دیکھ رہا تھا۔ اس کی آنکھوں میں آگ جل رہی تھی۔ ہاتھ کانپ رہے تھے۔ ہونٹ سوکھ چکے تھے جن پر وہ بار بار اپنی زبان پھیرتا تھا۔ پاس ہی اس کی بندوق تھی جس میں اس نے بارود بھی بھر دیا تھا اور گولی بھی وہ زخمی کتے کی طرح کسی کو کاٹنا چاہتا تھا اور اپنا سارا زہر اس کے خون میں انڈیلنا چاہتا تھا۔ پار کے محافظ نے جو تحقیر اس کی کی تھی وہ اس کی حد برداشت سے باہر تھی۔

بات کچھ بھی نہ ہوئی تھی۔ مگر یہ دوملکوں کی سیاسیات کا سوال تھا۔ دوملکوں کی عزّت کا سوال۔ اور محافظ اس پر خاموش نہیں رہ سکتا تھا۔ مانا عوام سب ایک جیسے ہوتے ہیں۔ ان کی سیاسیات ایک جیسی ہوتی ہے۔ مگر عوام کے حاکم، نواب اور مہارجے جاگیردار اور سرمایہ دار ایک جیسے نہیں ہوتے۔ ان کی سیاسیات مختلف ہوتی ہے۔ ان کی حکومت کے ڈھنگ مختلف ہوتے ہیں ان کا رہن سہن عوام سے مختلف ہوتا ہے جس بات کی اجازت نواب اپنے ملک میں دیتا ہے، مہاراجہ اپنے ملک میں اس بات کی ممانعت کرتا ہے اور جس بات کی اجازت مہاراجہ اپنے ملک میں دیتا ہے، نواب اپنے ملک میں اس کی ممانعت کرتا ہے ایک ملک کے حاکم نے منع کیا ہے کہ اس کی رعایا میں سے کوئی عورت دوسرے ملک میں نہ بیاہی جائے اور دوسرے ملک کے حاکم نے کھلی اجازت دی ہے کہ جہاں سے چاہو عورتیں لے آؤ۔ اور ان سے بیاہ کرو۔ ان سے بچے پیدا کرو۔ قوم کو بڑھاؤ۔ قوم کی دولت میں اضافہ کرو۔

پار کا محافظ نہ جانے کس طرح اس طرف کی ایک حسین لڑکی سآبی سے عشق کر رہا تھا۔ اس طرف کے محافظ کو شروع شروع میں اس عشق بازی کا ہلکا سا شبہ ہوا۔ لیکن اس نے زیادہ توجہ نہ دی۔ وہ جانتا تھا، سآبی ان سفید بتوں سے آگے کسی صورت میں زندہ نہیں گذر سکتی۔ دونوں کا رومان سفید بتوں کے آس پاس ہی بندوق کی ایک

گولی سے ختم ہوگا اور عوام کا امن، عوام کی سیاسیات برقرار رہے گی لیکن اس کا شبہ یقین میں تبدیل ہو گیا تو اس کا ماتھا ٹھنکا۔ اسے امن اور سیاسیات دونوں متزلزل سے نظر آنے لگے۔ اپنی سرحد سے سفید بت سے۔ آگے وہ ایک قدم بھی نہیں اٹھا سکتا تھا۔ کیونکہ یہ اصول ملک کے خلاف تھا۔ قانون حد بندی کے خلاف تھا۔ وہ صرف اپنے بت تک ہی حفاظت کا ذمہ دار تھا؛ اس سے آگے نہیں۔ اور ساآبی کا عاشق بت سے پار رہتا تھا۔

اور آج دوپہر کو پار کے محافظ نے اسے دھمکی دی تھی۔ کچھ بھی ہو، ساآبی آج ہی رات میری جھونپڑی میں ہوگی اور پھر ہمیشہ میری ہو کر رہے گی۔ دیدار سنگھ کو احساس ہوا جیسے دھمکی صرف اسے نہیں دی جا رہی ہے بلکہ اس کے ملک کے تمام لوگوں کو دی جا رہی ہے۔ لوگوں پر حکومت کرنے والے بادشاہ کو دی جا رہی ہے۔ ملک کی سیاسیات اور عزت کو دی جا رہی ہے۔ وہ خاموش کیسے ہوتا؟ اس نے بندوق پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا۔ ''ناممکن......شاہ گل یہ ناممکن ہے۔''

شاہ گل نے کہا۔ ''میں پٹھان ہوں اور پٹھان کبھی جھوٹ نہیں بولتا۔''

دیدار سنگھ نے کہا۔ ''میں بھی سکھ ہوں اور سکھ ہمیشہ آن پر مرتا ہے۔''

شاہ گل نے قہقہہ لگایا اور کہا۔ ''اب ہمارے حکمرانوں کا مقابلہ نہیں، ہمارے عوام کا مقابلہ نہیں۔ ایک پٹھان اور سکھ کا مقابلہ ہے۔ دو قوتوں کا مقابلہ ہے۔ دو ملکوں کے دو محافظوں کا مقابلہ ہے۔ منظور ہے کہ نہیں؟''

دیدار سنگھ نے مونچھوں پر ہاتھ پھیرتے ہوئے کہا۔ منظور......سو بار منظور ......شاہ گل نے پھر مسکراتے ہوئے کہا۔ ''مگر تیرا اور میری کوئی جھگڑا تو نہیں سردار......؟'' دیدار سنگھ بھی اس بار مسکرایا اور بولا...... بالکل نہیں، مگر ساآبی کو روکنا میرا فرض ہے۔ شاہ گل نے کہا۔ ''تم اسے نہیں روک سکتے۔ کبھی نہیں روک سکتے۔ وہ میری

ہے۔ ہماری دل مل چکے ہیں اور دُنیا کا کوئی بادشاہ نہیں روک سکتا۔''

دیدار سنگھ کو بڑا طیش آ گیا۔ اس نے بندوق کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔''دیکھوں خان' میری بندوق اسے روکے گی۔ میرا بت اسے روکے گا۔ میرے ملک کا ذرّہ ذرّہ اسے روکے گا۔ وہ اپنی بیٹی کی توہین برداشت نہیں کر سکتے۔''

شاہ گل نے ایک وحشیانہ قہقہہ لگایا۔ جو سارے درّے میں گونجا اور پہاروں سے ٹکرا کر فضا میں تحلیل ہو گیا۔ اس کے بعد اس نے جیب سے ایک ریشمی رومال نکالا۔ اور دیدار سنگھ کو دکھاتے ہوئے کہا۔''اسے دیکھ رکھو' جب جھونپڑی کے باہر میری لاٹھی پر یہ رومال لہراتا نظر آئے گا تو سمجھ لینا۔ ساؔبی میری جھونپڑی میں آ چکی ہے...... سمجھے؟''

دیدار سنگھ کی آنکھیں پھیل کر بہت بڑی ہو گئیں۔ اس نے دیکھا' رومال کا رنگ سرخ ہے جس کے کنارے سبز دھاگے سے کاڑھے گئے ہیں۔ اس کی آنکھوں کے آگے جنگ کی ایک خوفناک تصویر پھرنے لگی۔ جس میں ہزاروں بے گناہ کٹ کٹ کر گِر رہے ہیں تلواریں چمک رہی ہیں۔ نعرے گونج رہے ہیں ساری دھرتی خون سے لال ہو رہی ہے اور اس تمام منظر کے پیچھے عورت' زمین اور دولت انسان پر قہقہے لگا رہے ہیں۔ حقارت بھرے قہقہے اور یونانی مفکروں کی طرح کھڑے پہاڑوں کے سینوں پر زمانے کا نقاش نئی جنگ کی نئی تصویر کھینچ رہا ہے اور ان پر نئے نئے عنوان لکھتا ہے۔ ایک عورت کے لئے جنگ' جس میں ہزاروں مر گئے' ایک ملک کے لئے جنگ جس میں لاکھوں مر گئے' ایک معاہدے کے لئے جنگ جا میں کروڑوں مر گئے۔

دیدار سنگھ کچھ بھی نہ بول سکا۔ اس کی مونچھوں کے بال پھڑ کتے رہے۔ ہاتھ کانپتے رہے' زبان سوکھتی رہی۔ بڑی مشکل سے اس نے کہا۔''بہت اچھا گل ......خوب لہرانا اپنے رومال کو' مگر یہ بھی یاد رکھنا۔ جب میری بندوق کی آواز سُنائی

دے تو سمجھنا سابی اس دُنیا میں نہیں......"

شاہ گل نے دوسری بار وحشیانہ قہقہہ لگایا اور اپنی جھونپڑی کے اندر چلا گیا۔ ابھی چاند نہیں ابھرا تھا اور سرحد کے تنگ درّے میں خاموش اور تاریکی دو سگی بہنوں کی طرح باہوں میں باہیں ڈالے جھوم رہی تھیں۔ آج رات کو کیا کچھ ہو رہا ہے، انہیں کچھ معلوم نہ تھا۔ البتہ سرنگوں پہاڑ...... جیسے ان کا ہر پھتر کان بن گیا تھا۔ انہوں نے شاہ گل کی دھمکی بھی سنی تھی اور اس کے استقلال کا بھی اندارہ کیا تھا۔ دو ملکوں کی سیاسیات ٹکرانے والی تھی۔ دو ملکوں کے محافظ اپنی اپنی بندوقیں اُٹھانے والے تھے...... ایک لڑکی کے لئے ...... جس کا اپنے ملک سے باہر جانا ملک کے قانوں کے خلاف تھا۔ بادشاہ کے حکم کی توہین تھی۔ لوگون کے امن کے منافی تھا، جس کی ذات مشترکہ تسلیم کرنے کے باوجود بھی ایک محدود دائرے میں قانون نے محبوس کردی تھی۔ جس کا عشق عالم گیر ہونے کے باوجود بھی ملک کے مدبرین نے پابند کر رکھا تھا۔

دیدار سنگھ اب تک گیلی زمین پر بیٹھا غصے سے کانپ رہا تھا۔ اسے شاہ گل پر نہیں، سابی پر زیادہ غصہ آ رہا تھا۔ کتیا کہیں کی، جسے سارے ملک میں اپنے لئے کوئی مرد نہیں ملا۔ کاش آج میرے ہاتھ لگے...... کاش آج کی رات......۔

نمی کا احساس ہوتے ہی وہ اُٹھ کر ٹہلنے لگا۔ اس کے جسم میں عقابی روح داخل ہوگئی۔ معمولی سی آہٹ پر اس کے کان کھڑے ہو جاتے اور ہاتھ خود بخود بندوق پر جا پڑتا۔ اس نے آسمان کی طرف دیکھا۔ تارے جھلملا رہے تھے اور چاند کے نکلنے کے کوئی آثار نہ تھے تاریکی اور خاموشی برابر جھومتی جا رہی تھیں۔ صرف کبھی کبھی ہوا کے جھونکے اکا دُکا درختوں کے پتوں کو جھنجھوڑ کر نکل جاتے اور جہاں گاؤں کے لوگ گہری نیند میں سوئے ہوئے تھے، کبھی کبھی کتوں کے بھونکنے کی آوازیں آتیں۔ اسے افسوس تھا کہ اس نے دن میں سابی کو رکوانے کے لئے کوئی انتظام کیوں نہیں کیا۔ گاؤں کے

لوگوں کو کیوں جمع نہ کیا۔ گاؤں کے حاکم کو خفیہ طور پر شاہ گل کے اِرادوں کی اطلاع کیوں نہ دی۔ مگراس سے نے یہ اقدامات جان بوجھ کرنہیں کئے تھے۔ یہ اس کی اور اس کی جوانمردی کی توہین تھی۔ ایک طرف شاہ گل اکیلا تھا اور دوسری طرف وہ لوگوں کو کیسے اکٹھا کرتا۔ قانون سے کیسے مدد طلب کرتا۔ شاہ گل اس پر طعنے نہ دیتا......" بڑا سورما نکلا ایک لڑکی کے لئے ہجوم کو جمع کیا ہے۔ مزا تو جب تھا جب تیرا اور میرا مقابلہ ہوتا......" اسی خیال کے پیش نظر اور اپنی طاقت کے بل بوتے پر اُس نے شاہ گل کی دھمکی قبول کی اور اب انتظار کرنے لگا...... اگر وہ ساؔبی کو روک سکا تو سارے ملک میں اس کا سکہ بیٹھے گا۔ کس قدر وفادار اور فرض شناس محافظ ہے۔ جس نے اکیلے قانون کی تقدیس کا احترام کیا۔ ملک کے امن کو برقرار رکھا۔

وہ ٹہلتے ٹہلتے یہی باتیں سوچ رہا تھا اور بار بار شاہ گل کی جونپڑی کی طرف دیکھتا رہا جس نے سرِ شام ہی اپنی لاٹھی زمین میں گاڑھ رکھی تھی۔ البتہ جس پر ابھی رومال نہ بندھا تھا۔

شاہ گل کی جھونپڑی سے دھواں نکلنا بند ہوا۔ اور تھوڑی دیر بعد دیا بھی بجھایا گیا۔ دیدار سنگھ اب شاہ گل کے قدموں کی آہٹ سن سکتا تھا۔ اور وہ گیت بھی جو شاہ گل آوارہ لفنگوں کی طرح اپنی محبوبہ کے فراق میں گا رہا تھا۔ وہ کبھی کبھی اسے پکار کر کہتا ---" دیدار سنگھ سُنتے، بڑا مزہ ہے فراق میں ----"

اور دیدار سنگھ طنز میں ڈوبے ہوئے فقرے تیار کر کے کہتا۔" ابھی ساؔبی نہیں آئی کیا۔؟

"جب آئے گی جب جھنڈے لہرائیں گے' لال جھنڈے' فتح کے جھنڈے۔"

دیدار سنگھ اس پر خاموش ہوا۔ اسے یقین تھا کہ ساؔبی کا اور اس کی نظروں سے

بچ کر نکلنا مشکل ہی نہیں ناممکن ہے۔ شاہ گل خوش فہمی میں مبتلا ہے تو ہوا کرے۔ ہر عاشق اس قسم کی خوش فہمیوں میں مبتلا ہوتا ہے۔ وقت ہی بتائے گا کہ فتح کس کی ہوگی، قانون کی یا عشق کی...... سکھ کی یا پٹھان کی......!

رات آہستہ آہستہ پہاڑوں اور درّے کے اوپر سے ریشمی پردوں کی طرح سرکتی ہوئی نکل رہی تھی۔ آسمان کا ایک حصہ چاندنی سے منور ہو چکا تھا۔ مگر چاند ابھی سامنے کے پہاڑوں کے عقب میں تھا۔ شاہ گل کی جھونپڑی میں مکمل سکوت تھا اور اندھیرا...... جیسے اس میں زندگی کے کوئی آثار نہیں۔

دفعتاً پہاڑ کے اوپر سے چاند نمودار ہوا، ہلال کی شکل کا نیم دائرہ، جس کے گرد بہت بڑا ہالا تھا۔ درّے کی ساری فضا منور ہوگئی۔ سرحد کے بُت چمکنے لگے۔ خاموشی اور تاریکی ڈر کے مارے بھاگی ہوئی لڑکیوں کی طرح غائب ہوگئیں۔ یونانی مفکروں کے سینے اوران پر انسان کی لکھی ہوئی ازلی تاریخ نمایاں ہوگئی۔ اور دیدار سنگھ چونک اٹھا۔ جب اس نے شاہ گل کی جھونپڑی کے آگے لاٹھی پر سرخ رومال لہراتا ہودیکھا۔ ساتی آچکی تھی۔ جنگ کا نعرہ بلند ہو چکا تھا۔ زمانے کے نقاش اپنے ازلی قلم تھامے کھڑے ہوگئے تھے۔ پہاڑون نے اپنے سینے اس کے لئے کھلے چھوڑ دئے تھے۔ وہ تھوڑی دیر کیلئے فیصلہ نہ کرسکا کہ اب اس کا فرض کیا ہے۔ اس کا قانون اسے کیا کہتا ہے اس کی سیاسیات کا کیا حکم ہے۔

وہ سفید بت سے آگے نہیں جاسکتا۔ زمین بتوں کے پاس ضرور ملتی ہے مگر بت ایک لکیر ہیں جو دو ملکوں کے درمیان کھینچی گئی ہے۔ عوام اور عوام کے درمیان کھینچی گئی ہے۔ کس لئے؟ عورت کیلئے، زمین کے لئے، دولت کے لئے، جو آدم کے وقت سے ہر جنگ کے پس منظر میں قہقہے لگاتے ہیں۔ انسان کا مضحکہ اُڑاتے آئے ہیں۔ قانون پر فقرے کستے آئے ہیں۔ سیاسیات پر تھوکتے آئے ہیں۔

دیدار سنگھ جوش سے کانپ رہا تھا۔ اس کی آنکھوں میں آگ جل رہی تھی۔ اس نے قانون حد بندی کا کوئی احترام نہ کیا اور چند قدم بت سے آگے بڑھا۔ پھر رکا۔ اور بندوق کو سنبھالنے لگا۔ اسے محسوس ہوا جیسے بت سے آگے کی زمین اس کی اپنی نہیں، کسی اور کی ہے۔ شاہ گل کے حاکم کی، جس کا قانون مختلف ہے۔ سیاسیات مختلف ہے۔ وہ اپنے بت کے پاس پلٹ آیا۔ لیکن پھر بھی اس کا جوش ٹھنڈا نہیں ہوا۔ شاہ گلؔ اور ساؔبی نے اس کے قانون پر تھوکا تھا۔ اس کے بادشاہ کی توہین کی تھی۔ وہ نئے جوش کے ساتھ آگے بڑھا اور بڑھتا راہ حتیٰ کہ وہ جھنڈے کے نزدیک پہنچا۔ اس نے فوراً رومال کو پہچانا۔ سرخ رومال جو دوپہر کو شاہ گلؔ نے اسے دکھایا تھا۔ اور جسے دونوں نے جنگ کا نعرہ قرار دیا تھا۔

وہ بندوق اٹھا کے جھونپڑ کی طرف بڑھا۔ جھونپڑی کی ایک چھوٹی سی کھڑکی سے چاند کی کرنیں اندر آ رہی تھیں۔ اور ایک کھاٹ پر شاہ گلؔ اور ساؔبی باہوں میں باہیں ڈالے مست سوئے پڑے تھے جیسے انہیں کسی کی پروانہ تھی۔

دیدار سنگھ نے دونوں کو اسی حالت میں دیکھا اور شاہ گلؔ کے سینے کی شُست باندھ کر بندوق اٹھائی۔ مگر اُسے فوراً شاہ گلؔ کے الفاظ یاد آ گئے۔ ''تمہارا اور میرا کوئی جھگڑا تو نہیں سردار؟''

دیدار سنگھ نے آہستہ سے بندوق ایک طرف رکھی اور سوچنے لگا۔ شاہ گلؔ سے میرا کون سا جھگڑا ہے؟ وہ کوئی فیصلہ نہیں کر سکا۔ ساؔبی اس جھونپڑی میں آئی کہاں سے؟ وہ یہ نہ سمجھ سکا۔ وہ آہستہ آہستہ باہر نکلا۔ اس بار اسے احساس ہوا جیسے پاؤں تلے کی دھرتی صرف شاہ گلؔ کی نہیں بلکہ سب کی ہے اور اکھنڈ ہے اور یہ سفید بت محض لکیریں ہیں جو انسانوں کو ایک دوسرے سے جدا کرنے کے لئے آدم کے دشمنوں نے کھینچی ہیں۔ صرف چند نوابوں اور مہاراجوں کے لئے جاگیرداروں اور سرمایہ

داروں کے لئے!

اس نے فرط شدّت سے بندوق کی شست سفید بتوں پر باندھی اور گھوڑا دبایا۔ فضا میں ایک مہیب آواز گونجی......

دھن، دھن، دھنا، دھن......شاہ گلؔ اور سابیؔ چونک کر باہر نکلے۔ ''کیا ہے سردار؟''

دیدار سنگھ نے عجیب جوش اور تھرتھراہٹ میں کہا۔ ''انسان نا قابل تقسیم ہے شاہ گلؔ......میں نے بت اڑا دئے ہیں، نفرت کی نشانیاں ہیں، عداوت کے جھنڈے ہیں، جنگ کے نعرے ہیں، ہم سب ایک ہیں، ہماری دھرتی ایک ہے۔''

اور پھر اسی جوش میں کبھی اِدھر اور کبھی اُدھر ٹہلنے لگا اور شاہ گلؔ اور سابی دونوں حیران رہ گئے۔

............☆☆☆............

پھِسلن

آتش دان میں گیلی اور سوکھی لکڑیاں چیخ چیخ کر جل رہی تھیں۔ تین فرنگی سیاح آتش دان کے قریب گرم کپڑوں میں ملبوس کرسیوں پر بیٹھے تھے' ان میں سے دونو جوان تھے اور تیسرا کسی قدر پختہ عمر کا۔

رات کو گلمرگ کی وادی میں دفعتاً نئی برف گری تھی جس سے کھلن مرگ کے سکیٹنگ کلب کی سرگرمیاں کسی حد تک ماند پڑ گئی تھیں۔ تینوں اسی موضوع پر گفتگو کر رہے تھے۔ مارچ کے آخری دنوں میں یہ نئی برف آئی کہاں سے؟ اور پھر جب ان ہی دِنوں دور دور سے سیاح سکیٹنگ کے لئے آتے ہیں اور چند دن دل بہلا کر چلے جاتے ہیں۔ پچھلے کئی سالوں سے اس موسم میں یہاں برف نہیں گری تھی۔ لیکن اب کے تو حد ہی ہو گئی۔

برف باری کے سبب تمام راستے مسدود ہو گئے تھے اور ہوٹل کے کمروں سے نکلنا تک مشکل ہو گیا تھا۔ پارک ہوٹل اور ویسٹ وِیو ہوٹل میں جتنے بھی سیّاح تھے۔ سب ایک ہی طرح کا جشن سا محسوس کرتے تھے۔ لے دے کے شراب نوشی ہوتی تھی یا تاش کے کھیل یا سیاح عورتوں کے ساتھ ہنگامی محبت' جسے سب اتنی سخت سردی میں شدت سے محسوس کرتے تھے۔ پختہ عمر کا سیاح سر سے پاؤں تک راسخ الاعتقاد قسم کا انگریز تھا۔ اسے شراب سے دلچسپی تھی نہ تاش سے اور نہ محبت سے۔ وہ

قدرت کے مناظر کا دلدادہ تھا۔ باقی دو میں سے ایک مرانسیسی رئیس زادہ تھا۔ جو جنگ شروع ہونے سے قبل ہندوستان کی سیر کو آ گیا تھا۔ اور آج تک رکا ہوا تھا۔ تیسرا فوج میں لیفٹیننٹ تھا۔ اور بچوں کی طرح ہر اچھی چیز کو دیکھ کر مچل اٹھتا تھا۔ اس نے گلمرگ پہنچتے ہی ایک نوجوان خاتون سے وقتی آشنائی پیدا کی تھی، جو اپنے دیگر دوستوں کے ساتھ ویسٹ وِیو ہوٹل میں رہتی تھی۔ فرانسیسی رئیس زادہ بھی اس عورت سے رومان لڑانے کی خواہش رکھتا تھا۔ لیکن چونکہ اس کی وضع داری اونچے معیار کی تھی اس لئے لیفٹیننٹ کے مقابلے میں اس کا رومان بے کیف سا دکھائی دے رہا تھا، خود اسے بھی اور انگریز خاتون بالفور کو بھی۔

اِدھر اُدھر کی باتیں کرنے کے بعد رئیس زادہ نے رازدارنہ لہجے میں اپنے دوست سے پوچھا۔ ''کیوں تمہاری محبوبہ نہیں آئے گی جونز؟''

لفٹیننٹ جونز نے سُوکھی سی ہنسی ہنس کر اسی انداز میں کہا۔۔۔۔ ''ضرور آئے گی۔ آج میں نے اسے لنچ پر مدعو بھی کیا ہے۔''

''خُوب خُوب!'' مناشی نے کہنا شروع کیا۔ لیکن دوست بڑے مزے کی لڑکی ہے، بالکل پیرس کی ان لڑکیوں کی طرح جو ناز نخرے بھی کرتی ہیں اور اپنی قیمت سے بھی واقف ہوتی ہیں۔

لیفٹیننٹ کی آنکھیں چمکنے لگیں۔ ''تم احمق ہو مناشی...... بالفور اس قماش کی محبوبہ نہیں جو ہر ایک سے محض پیسوں کے عوض محبت کرتی ہے، وہ سچ مچ میری محبت میں گرفتار ہے۔''

مناشی نے کھل کھلا کر قہقہہ لگایا۔ پختہ عمر کے سیاح کے ہونٹوں پر بھی ایسی مسکراہٹ پھیل گئی۔ جو کہہ رہی ہو۔ ''صاحبزادے یہ تمہارا وہم ہے۔''

جونز دونوں کے قہقہے اور مسکراہٹ کو دیکھ کر کچھ جھینپ سا گیا۔ پھر بالکل فوجی

انداز میں بولا......''ہم لوگ دُنیا کے ثبات کے قائل نہیں۔ ہمارے نزدیک آج کا دن ہی بہت بڑا زمانہ ہے جسے ہم محبت سے' جیسے بھی ہو' گذارنا چاہتے ہیں۔''

پختہ عمر کے سیاح کے ہونٹوں پر ایک سنجیدہ مسکراہٹ نمودار ہوگئی۔ پھر آہستہ سے اس نے کہا۔''یہ بھی ایک خیال ہو سکتا ہے۔ کیوں مسٹر مناشی؟''

مناشی نے سگریٹ سلگاتے ہوئے کہا۔''ہو سکتا ہے صاحب' بشرطیکہ اسے کوئی اور نہ ملے۔ جونز سے زیادہ خوش حال اور خوبصورت۔''

''یہ ناممکن ہے'' جونز نے ارادے کی پختگی کے ساتھ کہا۔''اگر اس ہوٹل کے تمام کمرے بک نہ ہوئے ہوتے تو وہ کب کی یہاں چلی آئی ہوتی۔ لیکن وہ ویسٹ وِیو میں رہنے پر مجبور ہے۔''

پختہ عمر کا سیاح بھی سگریٹ پینے لگا اور جونز کمرے میں بے چین ہو کر ٹہلنے لگا سارا کمرہ دھوئیں سے بھر گیا۔ مناشی اور بوڑھا جلتی ہوئی لکڑیوں کو دیکھنے لگے جن کا کثیف دھواں چمنی کا منہ کنگال کی طرح نگل رہا تھا۔ لکڑیوں اور شعلوں کے نیچے سفید مہین اور گرم راکھ کا ایک ڈھیر سا جمع ہو گیا تھا جس میں کہیں بجھتی ہوئی چنگاریاں اپنی جھلک دکھا کر ہمیشہ کے لئے ختم ہو جاتی تھیں۔

جونز اپنی کرسی پر آ بیٹھا تھا اور وقت کو ٹالنے کے لئے اپنے ذہن میں گفتگو کا نیا موضوع تلاش کر رہا تھا۔ کہ دروازہ کھلا اور بالفور اندر داخل ہوئی۔ گڈ مارننگ ایوری باڈی۔ گڈ مانگ جونز۔

جونز کرسی سے اچھل پڑا۔ اور قبل اس کے کہ وہ اس کا خیر مقدم موزون الفاظ میں کرتا۔ بلفور نے اپنی شہ بھری آواز میں پھر کہا۔

''اگر تم نے مجھے لنچ پر مدعو نہ کیا ہوتا تو شاید اتنی برف میں۔''

جونز' مناشی اور بوڑھا تینوں ہنسے۔ پھر بوڑھے نے اپنی سنجیدہ آواز میں کہا۔

''واقعی آج رات کافی برف گری۔ بہرحال یہ بھی ایک طرح کی تفریح ہے۔''

جونز نے بلفور کی کرسی آتش دان کے سامنے لا رکھی۔ بلفور نے اس پر بیٹھتے ہوئے کہا۔ ''تفریح تو ہے، پھر بھی راہ چلنا مشکل ہو جاتا ہے۔ کہیں راستہ ہی نہیں، برف ہی برف ہے۔ سفید، سرد اور چکنی چکنی...... اور پھر یہاں سے ویسٹ وِیو بھی تو کافی دور ہے۔''

مناشی نے ہنستی ہوئی نظروں سے بلفور کے پیروں کی طرف دیکھا۔ وہ نمدے کا بوٹ پہنے ہوئے تھی جس کی نوک پر برف کے ہلکے ہلکے گالے آگ کی گرمی سے پگھلنے شروع ہو گئے تھے۔

''پھسلن بھی بہت ہو گی مادام؟'' مناشی نے اسی انداز میں پوچھا۔

''بہت...... لیکن خدا کا شکر ہے، میں کہیں بھی نہیں پھسلی، حالانکہ رات کو ہوٹل مین ناچنے کے سبب میں بہت تھکی ہوئی تھی۔''

بوڑھے سیاح نے سگریٹ کی راکھ جھاڑتے ہوئے جونز کی طرف ایسی نگاہوں سے دیکھا جیسے اس سے کہہ رہا ہو۔ کیوں صاحبزادے، اپنے منہ پر تھپیڑ کی گرمی محسوس کر رہے ہو کہ نہیں؟

جونز کا چہرہ سرخ ہو گیا۔ صرف تھوڑی دیر کے لئے شاید اسے یاد آیا۔ ''آج کا دن ہمارے نزدیک بہت بڑا زمانہ ہے۔'' اور اس زمانے کو گزارنے کے لئے ایک حسین و جمیل لڑکی اس کے پہلو میں بیٹھی چہچہا رہی تھی۔ محض اس لئے کہ اس قدر چکنی برف پر وہ ایک بار بھی نہیں پھسلی۔ حالانکہ اگر اتفاق سے پھسلتی بھی، جب بھی وہ تفریح ہو جاتی۔

مناشی نے شرارت کی نیت سے بلفور کو مخاطب کرتے ہوئے پوچھا۔

''تمہیں یہ موسم بے حد پسند ہو گا مادام؟''

بلفور کو جیسے اچانک متلی ہوگئی ۔ نفرت کے انداز میں اپنے پھول جیسے منہ کو سکیڑتے ہوئے بولی ۔ ''مطلق نہیں' مجھے دھوپ پسند ہے' دھوپ ۔ جب انسان آزاد پرندوں کی طرح اُڑ سکتا ہے' گا سکتا ہے ۔''

''اپنا اپنا نقطہ نگاہ ہے ۔'' مناشی نے کہا ۔ مجھے یہی موسم بے حد پسند ہے ۔

''اوئی ۔'' بالفور کے منہ سے ہلکی سی چیخ نکلی اور جونز اسی سے اچھل پڑا ۔ بلکہ اس سے بھی زیادہ خراب موسم' گہرا کُہرا' گھٹا گھٹا سا ماحول' اندھیرا سردی اور پھر تم جیسی ایک حسین لڑکی ۔ مناشی نے فخریہ انداز میں کہا ۔

بالفور اسے حیرت سے دیکھتی رہی ۔ بوڑھا دوبارہ زیرلب مسکرانے لگا ۔ اور جونز غصے میں چلانے کا قصد کرنے لگا ۔ حرام زادہ میری محبوبہ کو ڈرانے اور مرعوب کرنے کے لئے کیا کیا حربے استعمال کرتا ہے ۔

بوڑھے نے آہستہ آہستہ سے مناشی کی طرف دیکھا ور پوچھا ۔ ''اور شراب نہیں مسٹر مناشی؟''

مناشی نے دوسرا سگریٹ سلگایا ۔ اس کا دھواں چمنی کی طرف پھینک کر بولا ...... ''کیوں نہیں' شراب سے تو ہم فرانسیسی عشق کرتے ہیں ۔''

بوڑھے نے مسکراتی ہوئی آنکھوں سے دیکھ کر پوچھا ۔ اور لڑکیوں سے؟

مناشی نے دوسرا کس کھینچ کر جونز کی طرف دیکھا اور کہا ...... ''صرف محبت جو ہمارے جسم کو گرمی پہنچا سکے ۔''

بلفور کے گال سرخ ہوگئے ۔ اس کی گول گول نیلی آنکھیں اِدھر اُدھر گھومنے لگیں ۔ اسے محسوس ہوا جیسے مناشی نے گلمرگ کے ایک کمرے میں بیٹھ کر اسے ماں کی گالی دی ہو ۔ اگرچہ اسے ادبی اصطلاح میں عشق اور محبت کے معنی معلوم نہ تھے ۔ پھر بھی اسے محسوس ہوا جیسے محبت ایک ہلکی قسم کی چیز ہے' ایک خام سا جذبہ' ایک سطحی انداز

کی خواہش، صرف جسم کو گرمانے کا ذریعہ۔ مناشی اس سے رومان بھی لڑانا چاہتا تھا لیکن ساتھ ہی ساتھ اسے نہ سمجھنے والی زبان میں گالیاں بھی دے رہا تھا۔

جونز کا خون اندر ہی اندر سے کھل رہا تھا۔ اس کے ایک بڑے زمانے پر ذلیل قسم کا ایک رئیس زادہ بڑے اطمینان سے تھوک رہا تھا۔ محض اس لئے کہ اس کی وضع داری کا معیار اس سے مختلف تھا اور نقطۂ نظر جدا۔ لیکن اس سے اس کی محبوبہ کو اس قسم کی تذلیل کرنے کا کیا حق تھا۔ اگر وہ اس سے محبت نہیں کرتا نہ سہی، کم از کم اسے میری محبت کا احترام تو کرنا چاہئے ۔ اس قسم کے ہزاروں خیالات اس کے خون کے ساتھ رگوں میں دوڑ رہے تھے۔ لیکن کہیں سے پھٹنے کا راستہ نہ پاتے تھے۔ بالآخر بڑی شدّت کے ساتھ اس نے کہا۔ ''اسی لئے تو تمہارا فرانس اس عالم گیر جنگ میں ہار گیا کہ وہ قنوطیت پسند تھا، عیش پرست تھا۔ صحیح زندگی اور نئے زمانے کا واقف نہ تھا۔

مناشی ہنسنے لگا...... ہنسنے لگا اور ہنستا رہا۔ بوڑھے سیاح کو جونز کی یہ بات ناگوار سی گذری۔ اس کا چہرہ سکڑ گیا۔ لیکن بلفور کی نیلی آنکھوں میں خوشی چمکنے لگی۔ جونز نے صرف مناشی ہی کو نہیں بلکہ مناشی کے سارے فرانس کو گالی دی تھی وہ حیران تھا کہ مناشی اتنی گالیاں کیوں کر برداشت کرسکتا ہے۔ کیا اس کی شخصیت اتنی بڑی اور اسکا ظرف اتنا عالی ہے کہ وہ ہر گالی پر ہنس سکتا ہے۔'

اور مناشی اپنے دل میں سوچ رہا تھا۔ فرانس اس لئے ہارا کہ وہ قنوطیت پسند تھا یا عیش پرست، بلکہ اس لئے کہ تم نے ...... ڈائننگ ہال میں گھنٹی بجنے لگی ۔ بوڑھا سیاح سب سے پہلے اٹھ کر چلا گیا۔

''لنچ ٹائم...... مائی گاڈ۔'' مناشی نے اپنے آپ سے کہا۔ اور کرسی سے اٹھ کر دیوار پر لٹکتے ہوئے کیلنڈر کو دیکھنے لگا جو ۱۹۴۵ء کا تھا اور ابھی تک ہوٹل کے منتظموں نے اسے وہاں سے نہیں اٹھایا تھا۔

جونز اور بلفور ایک دوسرے کو بوسے لینے لگے۔ اور مناشی انہیں چوری چوری دیکھتا رہا۔ پھر دروازے پر پہنچ کر اس نے کہا۔ ''جونز لنچ کی گھنٹیاں بج چکیں......'' اور جلد جلد قدم اٹھاتا ہوا ہال کی طرف گیا۔

جونز اور بالفور بھی دروازے سے نکل کر برآمدے پر آ گئے جس کے جنگلے کے کنارے کنارے برف کی سفید لکیر چمک رہی تھی۔ نیچے میدان میں برف ہی برف تھی۔ مکان اور مکانوں کی جھکی جھکی چھتیں، درخت اور ان کی چوٹیاں، میدان اور ان کے نشیب و فراز، پہاڑ اور ان کی گھنی چھاتیاں سب برف میں لپٹی ہوئی تھیں۔ آسمان پر سیاہ بادل منڈلا رہے تھے اور ایسے معلوم ہوتا تھا۔ جیسے گلمرگ خاموش موت کی سفید وادی ہے۔ مکان، پہاڑ، درخت اس وادی کی منجمد لاشیں ہیں جو زندگی کو تلاش کرتے کرتے ختم ہو گئیں۔ برف کے میدان سے چاندی کی سفید چنگاریاں سی نکل رہی تھیں جوان لاشوں پر ہنس رہی تھیں اور اپنی خاموش زبان میں کہہ رہی تھیں......زندگی کے بدلے سراب زندگی سے لطف اٹھانے والو......ٹھہرو اور صبر کرو۔ جب تک تمازت بخشنے والا آفتاب مشرق سے طلوع ہو......مشرق سے جو ہمیشہ تمہاری دُنیا کو نیا سورج، نیا خیال اور نئی زندگی دیتا ہے۔

''کتنا حسین وِیو (view) ہے؟'' بالفور نے جونز کی طرف ہنستی ہوئی نظروں سے دیکھ کر کہا۔ جونز نے اس کی کمر کے گرد ہاتھ ڈالتے ہوئے کہا۔ ''ونڈرفل ڈارلنگ......گلمرگ سچ مچ جنت ہے۔''

''کاش یہ وادی ہمیں مل جائے، ہم اسے جنت بنا دیتے۔'' بالفور نے پھر کہا جونز کھل کھلا کر ہنس پڑا۔ ''تم کتنی شریر لڑکی ہو، ہندوستانی شہزادوں کے پاس اب بیش قیمت اور اس قسم کی وادیوں کے سوا ہے ہی کیا؟''

بالفور بھی ہنس دی۔ پھر سہمے ہوئے لہجے میں دور اشارہ کر کے بولی......''وہ

کیا ہے پیارے؟''

جونز نے غور سے دیکھنے کے بعد کہا۔ یہ قُلی لوگ ہیں۔ کس کا سامان لے کر آرہے ہیں۔ تم ڈر گئیں کیا؟''

بالفور نے فراغت کا سانس لیا۔ ''میں سمجھی تھی کوئی جنگلی جانور ہیں۔ جو ہماری طرف رینگ رینگ کر آرہے ہیں۔ اُف یہ لوگ کتنے وحشی اور بدتمیز ہوتے ہیں!''

جونز نے مسکرا کر کہا۔ مگر اپنے وطن میں بڑے چالاک ہوتے ہیں۔ ''ہاں جب جنگ میں جاتے ہیں تو خوب خوب مرتے ہیں۔''

بالفور زور سے ہنسنے لگی۔ ''اچھا ہوا مرتے ہیں میں ہمیشہ ان کالے لوگوں سے ڈرتی ہوں۔ میں نے سنا ہے' یہ سانپ پالتے ہیں' جادو جانتے ہیں اور چور ہوتے ہیں۔''

''نہیں یہ غلط ہے ڈارلنگ' ہمیں اتنا تنگ دل نہیں ہونا چاہئے۔ ہم فاتح ہیں ہم نے آزادی اور جمہوریت کے لئے قربانیاں دی ہیں۔ لوگ جاہل ہیں تو ہم انہیں تہذیب بھی سکھا سکتے ہیں۔''

بالفور اسے حیرت سے دیکھنے لگی۔ ''تم صرف ایک لیفٹینٹ ہی نہیں۔ ہمارے ایک اچھے فلاسفر بھی ہو۔''

جونز نے اس کے ہونٹوں پر بوسہ دیتے ہوئے کہا۔ ''فلاسفر نہیں بلکہ اچھا دوست......اچھا محبّ......اچھا عاشق!''

بالفور خوش ہوگئی۔ بولی۔ ''مجھے تم سے بے حد محبت ہے۔''

جونز کے جذبات میں تلاطم آگیا۔ ''کیا یہ صحیح ہے' تمہیں مجھ سے بے حد محبت ہے' بے حد محبت۔ وہ محبت جو جسم کو نہیں بلکہ احساسات کو گرمائے' انہیں رنگین

بنائے، ان میں شراب ملائے۔'' اسی انداز میں اس نے کہا۔'تم میری زندگی میں ایک امید بن کر آگئی ہو ڈارلنگ ایسا سکیٹ (skate) بن کر، جس پر ہم دونوں پھسلتے ہیں، پھسلتے آرہے ہیں، پھسلتے آرہے ہیں، پھسلتے ہی رہیں گے۔ تم میرے لئے اس فتح سے بڑھ کر ہو، جو تین اتحادیوں نے فاشزم پر پائی ہے تم میری محبوبہ ہو۔''

ایک طویل بوسے کے بعد دونوں ہال کی طرف گئے۔ کمرے میں داخل ہونے سے پہلے جونز نے اپنے الفاظ دوبارہ دہرائے۔''تم میری محبوب ہو ڈارلنگ۔ '' بالفور نے ہنستے ہوئے کہا۔''اور مجھے تم سے بے حد محبت ہے۔''

جونز کو بالفور کے ان الفاظ میں جوانی کے دہکتے ہوئے شعلوں کی گرمی کا سا احساس ہوا۔ جس سے اس کا سارا چہرہ تمتما اٹھا۔ سارا خون نئے سرے سے دوڑنے لگا۔ اور ساری زندگی فائن آرٹ کی طرح لطیف، نازک اور حسین نظر آنے لگی۔'' مجھے تم سے بے حد محبت ہے۔''

ہال میں داخل ہوتے ہی اس کی نظر مناشی پر پڑی۔ کم بخت قنوطی، عشق اور محبت کا فلسفہ لے بیٹھا تھا۔ شاید اس لئے کہ بالفور اس کے رعبِ امارت میں آکر اس سے محبت کرے، حرامی ! اتنا بھی نہیں جانتا، محبت دل سے کی جاتی ہے، امارت سے نہیں اور انگریز لڑکیاں پیرس کی کلب گرلز کی طرح جیبوں پر ڈاکے نہیں ڈالتیں۔ وہ صرف دل چراتی ہیں۔ اپنی نیلی نیلی آنکھوں سے دیکھ کر زندگی کو شراب کے پیالے کی طرح پر کیف بناتی ہیں۔ اپنی شہید بھری مسکراہٹ سے شعور اور لاشعور میں خواب ہی خواب بکھیر دیتی ہیں۔

مناشی انہیں دیکھ کر مسکرایا اور اپنے نزدیک خالی کرسیوں کی طرح اشارہ کیا۔ لیکن وہ اس سے دور جا بیٹھے۔

راسخ الاعتقاد سیاح اپنے برابر بیٹھے ہوئے ایک پادری سے باتیں کرنے

میں مصروف تھا۔ شاید وہ دونوں بائبل کی کسی آیت پر نہایت عقیدت مندانہ انداز میں بحث کرر ہے تھے۔

ہال میں جتنے مرد اور عورتیں تھیں، سب باتیں کرر ہے تھے، ہنس رہے تھے کہیں سکنٹنگ کلب کی سالانہ سرگرمیوں اور ریکارڈ توڑنے والوں کو سراہا جارہا تھا اور کہیں ہندوستانی سیاسیات پر گفتگو ہو رہی تھی۔

جہاں بالفور اور جونز بیٹھے۔ وہاں تین فوجی اور ایک میم باتیں کرر ہے تھے۔

''مارچ کے آخری ہفتے میں گلمرگ کتنی اچھی لگتی ہے''

''خصوصاً تازہ گری ہوئی برف میں!''

''جنگ سے قبل میں ہر سال حیدر آباد سے سکیٹنگ کے لئے یہاں آیا کرتا تھا۔ بلکہ کلب کا باضابطہ ممبر بھی رہ چکا ہوں''

''میری منگیتر اپنے ایک دوست کیساتھ پچھلے سال یہاں آگئی تھی۔ اس سال اس نے آنا پسند نہیں کیا۔''

''تم بدنصیب ہو جان......زندگی کے خوشگوار لمحے اپنی محبوبہ کے بغیر گذارنے پر مجبور ہو۔''

''قسمت۔''

''کینٹ مشن کی کوئی تازہ خبر نہیں ملی۔ کل کا اخبار تک نہیں آیا۔''

''ہندوستانی دراصل آزادی چاہتے ہی نہیں۔ وہ خوہ مخواہ ہماری سلطنت کو بدنام کرتے ہیں۔''

''آزاد ہندوستان میں ہمیں گلمرگ سے کیا دلچسپی ہوگی......کچھ بھی نہیں''

''لیکن ہندوستان آزاد کب ہوگا؟ یہ دو قومیں کبھی آپس میں مل سکیں گی؟''

''ہم نے ہندوستان کی بہبودی کیلیئے کیا کچھ نہ کیا، لیکن صِلّہ؟''

''یہ کالے لوگ احسان فراموش ہیں۔ان کا کوئی ضمیر نہیں۔ایمان نہیں۔''

''اگر میرا بس چلتا' میں ان کے لیڈروں کو چن چن کر......''

''ہم فاتح ہیں دوست ہم مارنے سے زیادہ بخشنے میں یقین رکھتے ہیں۔''

''بالکل صحیح......بالکل درست!''

ہال میں باتیں بھی ہورہی تھیں اور لنچ بھی کھایا جارہا تھا۔سارا کمرہ ابلی ہوئی سبزیوں تلے ہوئے گوشت' گرم روٹیوں اور شراب کی بو سے مہک رہا تھا۔جونز اور بالفور آہستہ آہستہ باتیں کرتے جاتے تھے اور ساتھ ہی ساتھ لقمے بھی منہ میں ڈالتے جاتے تھے۔

لنچ کے بعد کمرہ خالی ہوگیا۔نوکر میزوں سے رکابیاں' گلاس' بوتلیں' چمچے' اور دوسرا سامان جمع کرنے لگے۔راسخ الاعتقاد و سیاح سے باتیں کرنے والا پادری ظریفانہ انداز میں ایک بیرے سے گفتگو کرنے لگا۔

''کیا نام ہے تمہارا بیرا صاحب''

''مجید حضور......''

''مجیڈ......بہت اچھا نام ہے اور تمہارا سروس بھی اچھا ہے۔''

''صاحب ہم خدمت گار ہے' نوکر ہے صاحب لوگ کا۔''

''ٹھیک ہے ٹھیک ہے۔کتنا تنخواہ ملتا ہے!'

''تیس روپے حضور......اور بخششیں۔''

''تمہارا بیوی بچہ ہے؟''

''ہے حضور......دو بیوی اور پانچ بچہ' بڑا غریب ہے صاحب؟''

''دو بیوی اور پانچ بچہ۔''

''ہاں صاحب۔......ایک سے بچہ نہیں ہوا۔پھر دوسرا کیا۔اس کا پانچ بچہ

ہے۔"

"پانچ بچہ......"

"صاحب غریب لوگ ہے گذارہ کرتا ہے۔"

"لیکن تم لوگ بڑا بچہ پیدا کرتا ہے۔ تم نے انجیل پڑھا ہے؟"

"نہیں صاحب، ہم نہیں پڑھتا نوکری کرتا ہے۔"

"تمہارا بچہ پڑھتا ہے؟"

"ہاں صاحب، وہ بسکو صاحب کے مدرسے میں پڑھتا ہے۔"

"اوہ، اچھی بات ہے۔ تعلیم خُدا کا نور ہے۔ یسوع مسیح اس کا بیٹا ہے اور بائبل اس کا کتاب......"

پادری ہنستا کمرے سے نکلا۔ شاید سوچ رہا ہوگا۔ کتنی اچھی نسل کا آدمی ہے، پانچ بچہ اور تیس روپے تنخواہ......

کمرے میں لکڑیاں بدستور جل رہی تھیں۔ پختہ عمر کا سیاح اور مناشی وہاں تھے۔ جونز اور بالفور آتش دان کے پاس دو خالی کرسیوں پر بیٹھ گئے اور ایک دوسرے کو چومتے رہے، گُد گُداتے رہے، ہنساتے رہے۔ بعض اوقات جذبات کی شدت سے مجبور ہو کر جونز کا بھرا بھرا ہاتھ بالفور کی کمرے تک پہنچ جاتا۔ بالآخر اس نے اسے اپنے سینے سے لگایا اور کافی دیر تک اسی طرح لگائے رکھا ......تھوڑی دیر بعد جونز نے اکھڑے ہوئے سانسوں میں کہا...... "تم شادی کیوں نہیں کرتی ڈارلنگ؟"

بالفور شاید اس قسم کے بے تکے سوال کی متوقع نہ تھی۔ اسے سارا کمرہ دھوئیں سے بھرا ہوا دکھائی دیا۔ اس کی پلکیں تیز تیز جھپکنے لگیں۔ "بولی۔ شادی؟ کیا میں ابھی اس قابل ہوں؟"

میرا خیال ہے۔" جونز نے کہنا شروع کیا۔" شادی بہترین تحفہ ہے جو ہمیں

شباب عطا کرتا ہے تمہارا اس بارے میں کیا خیال ہے؟"

بالفور کچھ کھوسی گئی، اسے جونز سے نفرت سی ہونے لگی۔ تاہم اپنے خیالات کو منظّم کرتے ہوئے بولی...... یہ پرانا خیال ہے۔ اس میں کوئی تازگی نہیں، صرف عورت کو غلام بنانے کا خوبصورت جال۔ اور ہم فاتح ہیں، آزادی کے لئے کئی بار لڑ چکے ہیں۔

جونز اس کی دلیل سے ششدر رہ گیا۔ بولا۔ "آزادی کے یہ معنی نہیں کہ عورت آوارہ کتیا کی طرح گلی گلی پھرتی رہے۔ آخر دنیا کے کئی فرائض بھی اس پر عائد ہوتے ہیں......"

"ہوتے ہیں...... بالفور نے جواب دیا۔" لیکن اتنے اہم نہیں جتنے تم لوگ سمجھتے ہو......

جونز ہنسنے لگا۔ خُوب خُوب! اسے یاد آ گیا کہ وہ ایک سپاہی ہے۔ آج کے دن کو بہت بڑا زمانہ ماننے والا، جو فتح بھی دلا سکتا ہے اور شکست بھی۔

بالفور نے موضوع بدلتے ہوئے پوچھا۔ سنا ہے تمہارا دوست فرانس کا رئیس زادہ ہے۔ جونز نے نفرت ظاہر کرتے ہوئے کہا۔ جنگ سے پہلے ہر فرانسیسی اپنے آپ کو رئیس زادہ کہنے میں فخر سمجھتا تھا، لیکن اب پانسہ پلٹ چکا ہے۔ وہ ہمارا احسان مند ہے۔"

بالفور عجیب استغنا سے شرمسار ہو کر اسے دیکھنے لگی۔ شاید اسے اپنا آپ ملکہ سے کم نظر نہ آیا۔

آہستہ سے دروازہ کھلا۔ پوسٹ مین نے بلفور کے ہاتھ میں تار دیا۔ اور خود اس کے چہرے کے اتار چڑھاؤ کو دیکھنے لگا۔

بالفور کی آنکھیں تار پڑھتے پڑھتے چمکنے لگیں۔ اس نے اچھل کر جونز سے کہا

"میرا چرڈس کل پہنچ رہا ہے......کل......"

"رچڑڑس......؟ جونز نے حیرت سے پوچھا۔"

"ہاں۔ہاں میرا رچرڑس......" بالفور نے جلد جلد کہا۔

"پوسٹ مین نے ہاتھ پھیلا کر کہا......سلام میم صاحب!"

"سلام! بابو کو ہمار بہت بہت سلام دعا۔" بالفور نے کہا۔ اور پوسٹ مین بادل نخواستہ کمرے سے نکلا۔ پھر وہ دوبارہ تار پڑھنے لگی۔

Reached Baramulla with three

punctures very thirsty Richards

وہ ہنسنے لگی۔ بے چارا' رچرڈس۔ کتنا اچھا لڑکا ہے جو ملتاں سے صرف اسے ملنے کے لئے آرہا ہے اور پھر...... ہاہاہا بے قوف۔ کبھی اصلیت کو نہیں چھپاتا۔ کبھی محبت کے جھوٹے دعوے نہیں کرتا کبھی ڈینگیں نہیں مارتا۔

جونز اپنے دل ہی دل میں سوچ رہا تھا' یہ رچرڈس کون ہے۔ اور اس تار کا مفہوم کیا ہے۔ لیکن بالفور سے وہ پوچھنے کی اپنے میں ہمت نہیں پا تا تھا۔ بالآخر بالفور نے خود ہی مسّرت بھرے الفاظ میں کہا۔ "رچرڈس بہت چھالڑکا ہے وہ ملتان کی برماشیل کمپنی کا سپرانٹنڈنٹ ہے اور میرا بہترین دوست......اس کی آنکھیں نیلی ہیں' بال سنہرے اور باتیں بے حد میٹھی......وہ پیانو پر نارمن شیرز کے تمام گیتوں کی نقل اچھی طرح اُتار سکتا ہے' اس کا باپ چھوٹا ناگ پور کا کمشنر ہے اور اس کی ماں ایک لکھ پتی انگریز کی لڑکی۔ رچرڈس ان کا اکلوتا بیٹا ہے' یقیناً ماں باپ کے مرنے کے بعد وہ کافی امیر ہو جائے گا۔"

جونز حیرت اور غصے سے اس کی باتیں سنتا رہا۔ حالانکہ وہ رچرڈس کے متعلق ایک لفظ بھی نہیں سننا چاہتا تھا اور بالفور کہتی گئی۔ اس کا خیال ہے کہ ماں باپ کے

انتقال کے بعد وہ نوکری چھوڑ دے گا اور اپنا کاروبار شروع کرے گا۔ پھر وہ ایک کار بھی رکھے گا، ایک بنگلہ بھی بنوائے گا اور کئی نوکر خدمت کے لئے ......اس وقت وہ مجبور ہے لیکن تنگ دست نہیں۔

جونز نے تنگ آکر سگریٹ سلگایا اور جلتی ہوئی لکڑیوں کو دیکھنے لگا۔ اسے اپنے ذہن پر ایک بھاری اور سرد سِل کا احساس ہوا جو ہر لمحہ بھاری ہوتا جاتا تھا۔

''مجھے رچرڈس سے کوئی دلچسپی نہیں۔'' اس نے تنگ آکر کہا۔

''کوئی دلچسپی نہیں......؟'' بالفور نے اچھل کر پوچھا۔ ''یقیناً اتنے اچھے لڑکے کی شخصیت سے بھی نہیں جو بہت جلد امیر بننے والا ہو......''

''بالکل نہیں۔'' جونز نے اسی انداز میں جواب دیا۔

''میں سمجھ گئی......'' بالفور نے ہنس کر کہا۔ تم خفا ہو گئے لیکن میں آج رات صرف تمہارے ساتھ ناچوں گی۔ میں نے آج کسی سے وعدہ نہیں کیا ہے۔

جونز نے طنزیہ لہجے میں کہا۔ شاید اس لئے کہ آج رات رچرڈس یہاں نہیں پہنچ سکتا؟

بالفور نے اس کے طنز کو نہیں بھانپا' بولی......صرف اس خوشی میں کہ کل میرا رچرڈس آرہا ہے۔

''شکریہ!'' جونز نے سگریٹ کا لمبا سا کش کھینچ کر کہا۔ میں بہت خوش قسمت ہوں کہ کم زکم آج کی رات تمہارے ساتھ ناچ سکوں گا۔ خدا جانے کل کون ہوگا' پرسوں کون؟ اور پھر......!

''تو تم بہت جلد گلمرگ سے جانے کا قصد کر چکے ہو؟ بالفور نے پوچھا''

''جب دلچسپیاں ختم ہوں تو مزار کے سوا اور کون سا راستہ ہے۔ اس شخص کے لئے جو ایک دن کو ایک زمانہ مانتا ہے۔'' جونز نے بے دلی سے جواب دیا۔

''بالکل ٹھیک ہے، مجھے تم سے اتفاق ہے۔'' بالفور نے اس کے زخم پر نمک چھڑکتے ہوئے کہا۔ ''لیکن آج کی رات؟ تم ناچ پر پہنچو گے نا؟''

رچرڈس کی فتح اور اپنی شکست کے اعزاز میں ضرور...... ''اس نے کہا۔

بالفور قہقہہ لگا کر ہنسنے لگی۔ ''تم سچ مچ فلاسفر ہو۔ ''لیکن اس بار جونز کو یہ کہنے کی ضرورت محسوس نہیں ہوئی کہ فلاسفر نہیں بلکہ اچھا محبوب...... اچھا دوست...... اچھا عاشق! اور بالفور ہنستی رہی۔''

دوسرے دن رچرڈس آ گیا۔ بالفور نے ٹنگ مرگ کی چڑھائی ختم ہوتے ہی پولیس بکس کے نزدیک اس کا استقبال کیا۔ دونوں ایک دوسرے سے بغل گیر ہو گئے۔ ایک دوسرے کو چومنے لگے اور پھر بالفور نے دور ویسٹ ویو کی طرف اشارہ کر کے کہا۔

''میں وہاں رہتی ہوں۔ اس ہوٹل میں جو برفانی پہاڑ پر ہے۔''

رچرڈس حیرت سے ہوٹل کی طرف دیکھ کر بولا۔ ''وہاں...... اتنی دور؟''

دونوں برف کی پگڈنڈی پر آگے آگے جانے لگے اور ان کے پیچھے پیچھے قلیوں پر لدّا ہوا سامان...... برف پر رچرڈس اور قلیوں کے پاؤں بار بار پھسلتے تھے وہ ہر بار بلفور ایک قہقہہ بلند کیا کرتی تھی۔

''یہاں سنبھل کر قدم رکھو پیارے یہ ملتان نہیں گلمرگ ہے۔''

بڑی احتیاط سے قدم اٹھاتا ہوں، پھر بھی پھسلتا ہوں۔

''یہ صرف تمہارا ہی حال نہیں، سب مرد اور عورتیں پھسلتی ہیں''

''اور خود تم؟''

''میں......؟ ایک بار بھی نہیں پھسلی پیارے!''

''ونڈرفل...... ونڈرفل......'' رچرڈس نے خوشی ظاہر کرتے ہوئے کہا۔

''میں دراصل برف پر چلنے کی عادی ہوگئی ہوں''

''مجھے یہ سن کر بہت خوشی ہوئی۔''

''اور پیارے تمہارے ماں باپ؟''

''بہت اچھے ہیں!'' رچرڈس نے کہا۔

ہوٹل کے نزدیک پہنچ کر رچرڈس پھر پھسلا۔ بالفور نے قہقہہ لگا کر کہا۔ ''تم مرد مضبوط ہوتے ہوئے بھی چکنی برف پر پھسلتے ہو۔ اورتو اور میں ایک بار بھی نہیں پھسلی کبھی تفریح کے طور پر بھی نہیں۔ میں نے اس سال ریکارڈ توڑ دیا۔''

برف پر بڑی ہوئی چاندی کی چنگاریاں جیسے یک لخت چلا اٹھیں......

''جھوٹ......سراسر جھوٹ!''

لیکن ان دونوں نے یہ آواز نہیں سنی' البتہ بوجھ سے لدّے ہوئے قلی ایک دوسرے کی طرف دیکھ کر معنی خیز انداز میں مسکرادئے۔

............☆☆☆............

خُون اور سِکّے

جیمہ خان گرمیوں کے موسم میں دریگ کے نیچے کھاٹ بچھا کر پڑا رہتا اور جھونپڑی کے دروازے جو چند قدم کے فاصلے پر تھے' کھلے کے کھلے رہتے۔ ہر راہ گیر چلتے چلتے اس کے کمرہ کا ساز وسامان دیکھ لیتا۔ بان کی چٹائی' مٹی کے میلے برتن' تیل کی کپی اور کمرے کے وسط میں پھیلائی ہوئی رسی پر غلیظ کپڑے جنہیں وہ شاید بچھونے کے طور پر استعمال کرتا تھا۔ اس کے علاوہ وہاں اور کچھ نہ تھا۔ ہاں جھونپڑی کے برآمدے میں کبھی کبھی ایک کدال بھی پڑا رہتا جب وہ خود دریگ کے نیچے بیٹھتا تو کدال کھاٹ کے نزدیک اس انداز میں رکھتا کہ دیکھنے والے کو گمان ہو کہ سڑک کا محافظ ابھی ابھی سڑک کی مرمت کر کے آیا ہے اور اب تھک چور کر کمرے سیدھی کر رہا ہے۔ یہ صرف ایک فریب تھا' ان افسروں کو دینے کے لئے جن کے ذمے کچی سڑک کی نگرانی تھی اور جو دوسرے تیسرے مہینے محض اپنا زادراہ بٹورنے کے لئے اس طرف آنکلتے تھے۔ جیمہ خان کبھی خود بھی سڑک کی اس حد تک نہیں گیا تھا جس حد تک مرمت کرنا اِس کی ڈیوٹی تھی۔ اُسے یہ بھی معلوم نہ تھا کہ اِس کچی سڑک کی کل لمبائی کتنی ہے' وہ صرف یہی جانتا تھا۔ کہ غیر جذباتی اور جلے سیاہ پہاڑوں کے دامن میں لیٹی ہوئی یہ سڑک یا تو گوروں شاہ کی خچروں کے لئے بنی ہوئی ہے جو شہر سے ہلدی' نمک' صابن وغیرہ لاد کر دور دور کے پہاڑی گاؤں کو جاتی ہیں یا ان دیہاتیوں کے لئے جو قرب و

جار کے گاؤں سے ہر صبح دودھ انڈے، بان کے رسے اور دانہ چارہ لے کر آتے ہیں اور اس کے پاس تھوڑی دیر کے لئے ستانے کو بیٹھتے ہیں۔

سڑک سے نیچے کشن گنگا کا پانی جیل سے بھاگے ہوئے قیدی کی طرح بھاگ رہا تھا، جیسے وہ صدیوں کی غلامی سے آزاد ہو کر فتح و نصرت کا راگ الاپتا ہوا جا رہا ہو۔ پانی کا یہ بے پناہ شور جیمہ خان کی زندگی میں اسی حد تک سیرایت کر چکا تھا کہ وہ اس کی زندگی کا ایک جزو بن کر رہ گیا تھا۔ خواب کے عالم میں بھی اسے پانی کے بے ہنگم راگ کا احساس ہوتا۔ اور جوں ہی یہ احساس کم ہو جاتا وہ ایک جھٹکے کے ساتھ پیدا ہو جاتا جیسے اُس کا کچھ چھینا گیا ہو اسب سے پہلے اُسکی نظریں بھاگتے ہوئے پانی پر پڑتیں۔ احساس دوبارہ بیدار ہو جاتا اور تمام اجزاء ایک دوسرے کیساتھ جڑ کر اس کی زندگی کی تکمیل کرتے، بھاگتے ہوئے پانی کا شور اور کچی سڑک کی اداسی ہی جیسے اس کی زندگی کے ضروری اجزا تھے جن سے نہ وہ کبھی اکتا جاتا نہ بیزاری سی محسوس کرتا، دنیا کے قمار خانہ میں سب کچھ لٹا کر اس نے جیسے یہی دو چیزیں پائی تھیں جنہیں وہ پچھلے پندرہ برس سے اپنی روح کے نہاں خانوں میں پرورش کر رہا تھا۔ پندرہ برس پہلے جب وہ ابھی اپنے آپ کو شور دشر کی دُنیا کا ایک ضروری فرد سمجھتا تھا۔ اس نے ہر طرح کے عیش کیے تھے۔ شراب نوشی اس کا محبوب مشغلہ تھا۔ جوان اور خوبصورت چھوکریوں کے پیچھے بھنورے کی طرح منڈلانا، اور پھر انہیں پھانسنا اس کے بائیں ہاتھ کا کرتب تھا۔ زندگی ان دنوں بھی اگرچہ تہی دست ہی تھی مگر روح پیاسی تھی اور پیاس تہی دستی کی قیود کبھی قبول نہیں کرتی۔ وہ اپنے لئے خود وسائل تلاش کرتی ہے، خود اپنے لئے نئی راہیں ڈھونڈتی ہے۔

مگر اب جُوں جُوں عمر بڑھتی گئی وہ دنیا سے بے زار ہونے لگا اور گوشہ نشینی کی تلاش کرنے لگا۔ بڑی مشکل کے بعد اُسے کچی سڑک کی محافظت کا کام دیا گیا اور تنخواہ

کے علاوہ رہنے کے لئے سرکاری جھونپڑی ملی۔ یوں تو اسے تنخواہ حاصل کرنے کے لئے ہر ماہ تحصیل میں حاضر ہونے کا حکم تھا۔ مگر دس میل کی مسافت وہ برداشت نہیں کر سکتا تھا۔ وہ تیسرے چوتھے مہینے جا کر پچھلی تنخواہیں بھی لے آتا۔ اس روز وہ سارے شہر کا چکر لگاتا، جانے پہچانے لوگوں سے ملتا۔ اپنے لئے کھانے پینے کا سامان لے آتا اور جو کچھ بچتا وہ ڈاک خانہ میں جمع کرالیتا۔ اس گوشہ نشینی سے اس کی روح کی پیاس آہستہ آہستہ بجھتی گئی اور بالآخر اِس قدر بجھتی گئی کہ خود بخود پانی کے بے ہنگم شور اور کچی سڑک کی مایوس خاموشیوں میں مقید ہوگئی۔ سڑک کے کنارے ویران سے پہاڑوں کے دامن میں بنی ہوئی یہ جھونپڑی اس کی دنیا تھی جس میں رات دن رہ کر وہ اپنی زندگی کے دن گذار رہا تھا۔

ہر پانچویں دن شہر سے گوراں شاہ کی خچریں آتیں۔ وہی نمک، ہلدی، غلّہ، اور صابن وغیرہ لاد کر اور خچربان خچروں کی ڈھیل کھلی چھوڑ کر تھوڑی دیر کے لئے اس کے پاس آبیٹھتے، چلم گردش میں آتی اور بے تکی سی باتیں شروع ہوجاتیں۔

"سناؤ چاچا...... کیا حال ہے؟"

عمر کے لحاظ سے عام ہندوستانیوں کی طرح سب اس کی عزّت کرتے۔ ورنہ مالی لحاظ سے وہ کسی شمار ہی میں نہ تھا۔ چاچا کا لفظ سن کر اسے بھی دل ہی دل میں اپنی بُزرگی کا احساس ہوتا...... دانتوں کی نمائش کرتے ہوئے کہتا...... "بس جیتا ہوں بیٹا، سناؤ آج کیا مال لادا ہے؟"

"یہی نمک، صابن وغیرہ اور کیا"

"تحصیلدار صاحب کہاں ہیں۔"

"کہتے ہیں گھر گئے ہوئے ہیں۔"

"گھر؟ کچہری کون کرتا ہے، تنخواہ کون دیتا ہے؟"

''کچہری کا کیا ہے، جب آئیں گے تو کریں گے''

''اماں، روز سنتا ہوں تحصیلدار صاحب گھر گئے ہوئے ہیں، کون دیتا ہے اسے اتنی چھٹیاں؟''

خچربان ہنس دیتے۔ ''چاچا کیا پوچھتے ہو افسروں کا، اپنا کام کرو۔''

جیمہ خان کے چہرے پر ہلکی مایوسی چھا جاتی۔ سچ ہی تو کہتے ہیں، کیا پوچھنا افسروں کا بادشاہوں کے کام بادشاہ جانیں، غلاموں کو ان سے کیا واسطہ؟ وہ فوراً بات کا رخ بدل کر پوچھتا۔ ''یہ گوراں شاہ اتنا مال کہاں سے لاتا ہے؟''

خچربان دوبارہ ہنسنے۔ ''ارے چاچا جنگ میں مٹی نہیں کھودی، دولت کمائی ہے، دولت ...... گوداموں کے گودام بھرے پڑے ہیں، تم کیا سمجھتے ہو ہمارے شاہ کو؟ جسے اللہ دے اسے کون لے؟''

جیمہ خان کی آنکھوں میں حیرانیاں ناچنے لگتیں۔ سوچنے لگتا، جنگ میں آدمی مارے جاتے ہیں یا دولت کمائی جاتی ہے۔ لیکن اسے یہ سوال پوچھنے کی جرأت نہ ہوتی۔ ممکن ہے دولت بھی کمائی جاتی ہو۔ خون کے ساتھ سکے بھی بکھرتے ہوں لیکن گوراں شاہ کا ماضی ابھی اسکی نظروں سے اوجھل نہ ہوا تھا۔ خچریں تو رہیں، مریل سا گدھا بھی ساتھ نہ تھا۔ جب پنجاب سے بھاگ کر آ گیا تھا اور ایک دوکان کے بڑھاو پر نمک کی آٹھ دس ڈلیاں قرینے سے سجا کر بیٹھا تھا۔ اس زمانہ میں وہ محض گورا تھا، ایک ذلیل بینا، مگر اب وہی گورا گوراں شاہ بن گیا ہے جس کی خچریں ہر پانچویں روز مال لاد کر دور دور کے علاقوں کو جاتی ہیں اور معاوضے میں گھی، اون اور ریشم لاتی ہیں۔

خچربان چلے جاتے اور جیمہ خان اسی محور کے گرد گھومنے لگتا۔ جنگ اور دولت، خون اور سکے، نمک اور خچریں، گورا اور گوراں شاہ! وہ پھٹی نظروں سے مست خچروں کے سموں کے گہرے نشان سڑک کے گرد و غبار میں دیکھتا رہتا جو ایک بے

ترتیب لکیر کی طرح دور تک نظر آتے۔ اور پھر سڑک کے موڑ پر ختم ہوتے سموں کے یہ نشان جیسے ستارے تھے جو گوراں شاہ کے مطلعٔ تقدیر پر چمک رہے تھے اور جن کے محافظ وہ حال مست تھے۔ جن کا اب بھی یہ اعتقاد تھا کہ جسے اللہ دے اُسے کون لے۔ اس نے کئی بار خواہ مخواہ جذبۂ نفرت کے زیر اثر ان نشانوں کو کدال سے مٹانا چاہا۔ لیکن جب کدال لے کر وہ نزدیک پہنچا تو اس کے بدن میں تھرتھری سی پیدا ہوئی۔ نشانوں کو مٹانا آسان ہے مگر آسمان کے ستارے......؟ صرف کوئی خدا ہی توڑ سکتا ہے اور جیمہ خان کی نظروں میں ایسا کوئی خُدا نہ تھا۔ وہ کدال کو کندھے پہ اٹھا کے واپس آتا اور دریگ کے نیچے کھاٹ پر آنکھیں بند کئے لیٹنے کا بہانہ کرتا، لیکن آج ایک مہینے سے اس کے ذہن پر پندرہ برس پہلے کی پیاس کا ہلکا سا احساس چھا رہا تھا۔ اور اس کی بیزاری زندگی میں ایک نیا انقلاب چور دروازے سے گھسنے کی جدوجہد کر رہا تھا شروع شروع میں جب اسے خواہشات کی اس کش مکش کا احساس ہوا۔ تو اس نے اپنے ضمیر کو خوب خوب ڈانٹا۔ اپنی ڈاڑھی کے سفید بال نوچ نوچ کر اسے دکھائے، اپنے ہاتھوں کی نیلی رگیں اور چہرے کی جھریاں دکھائیں۔ مگر سانپ قابو میں نہ آیا۔ وہ اس ڈانٹ ڈپٹ کے باوجود شدومد سے لہراتا رہا۔ جیسے وہ اسے ہی ڈسنے کا قصد کر چکا ہو، نوراںؔ کا غیر معمولی حُسن، اس کی گذری جوانی اس کا سانولا رنگ اور چھریرا جسم اس کے فہم وادراک پر چھا گیا۔ نئی نئی بیاہتا کا نکھرا ہوا شباب اس کی آنکھوں میں ہر وقت پھرنے لگا۔ وہ ہر دوپہر کو اکیلی اکیلی بان کا گھٹا لے کر گاؤں سے چلی آتی اور جیمہ خان جھونپڑی کے دروازے پر اسے دیکھتا رہتا۔ نوراںؔ اس سے کوئی پردہ نہ کرتی، بلاتکلّف اس کے پاس آ کر گٹھا ایک طرف رکھ دیتی اور ستانے بیٹھ جاتی۔ وہ بھی خچر بانوں کی طرح اسے چاچا ہی کہتی۔ اس وقت جیمہ خان کو اپنی بزرگی پر غصّہ آتا اور اسے روحانی کوفت سی ہوتی۔ ایک دن اس نے پوچھا...... "تم مجھے چاچا کیوں کہتی ہو۔ میں ابھی بوڑھا تو

نہیں ہوں؟''

نوراں کے سفید دانت موتیوں کی طرح چمکے ۔ اس نے کہا۔''اور کیا کہوں؟''

''جمعدار کیوں جیمہ خاں کہو' مگر چاچا نہ کہو۔''

نوراں کھل کھلا کر ہنس پڑی۔۔۔''چاچا بُرا نام ہے کیا؟''

''برا تو نہیں' مگر چاچا بوڑھوں کو کہتے ہیں۔'میں تو ابھی جوان ہوں۔''

''جوان؟''نوراں نے حیرت سے پوچھا اور قہقہہ لگایا......ذرا آئینہ تو دیکھو جوان ہوتے تو جنگ میں بھرتی نہ ہوتے ۔جس طرح ہمارے مرد بھرتی ہوئے ہیں؟

نوراں کی یہ چوٹ جیمہ خان پر سیدھی پڑی۔ وہ ندامت کو چھپانے کیلئے بے مطلب ہنستا رہا اور پھر اِدھر اُدھر کی باتوں کے بعد بولا......''تمہارا خصم کب آ رہا ہے نوراں؟''

نوراں کا چہرہ شرم سے لال ہو گیا۔ وہ گٹھا اٹھا کر بے دلی سے بولی۔''مجھے کیا معلوم' جب پلٹن سے چھٹی ملے۔''اس کے جانے کے بعد جیمہ خان کی روح اور عقل میں مستقل جنگ شروع ہوگئی۔ روح نے کہا ۔میری پیاس بجھا۔ عقل نے کہا۔ کمینے !اس عمر میں؟ روح نے کہا۔ کیا بوڑھے کی خواہشات نہیں ہوتیں؟ اس کے سینے میں دل نہیں ہوتا؟ کیا وہ حسینوں کو دیکھ کر بیتاب نہیں ہوسکتا؟ اسے محسوس ہوا' جیسے خوفناک جنگ چھڑ گئی ہے' خون بہہ رہا ہے؟ سکے بکھر رہے ہیں اور اس جنگ میں نئے گوراں شاہ ابھر رہے ہیں' لیکن یہ خون کس کا ہے؟ اس کا یا نوراں کا؟ سکے کون بکھیر رہا ہے؟ وہ یا نوراں؟ گوراں شاہ کون بن رہا ہے؟ وہ یا نوراں کا خصم؟ وہ کسی نتیجے پر نہیں پہنچا۔ نوراں چلی گئی تھی۔ اس کے قدموں کے حسین نشان اب بھی جھونپڑی کے باہر چھڑکاؤ کی ہوئی زمین پر چمک رہے تھے۔ جیمہ خان کی نظر فوراً کدال پر پڑی اور اسے

ستارے یاد آئے مگر ستارے توڑنا؟ خصوصاً اس کے جو ابھی ابھرا نہ تھا' جو ابھی پوشیدہ تھا۔ اس کے ہونٹوں پر خود بخود ہلکی سی ہنسی پھیل گئی۔ جو پھیلتی ہی رہی' کیوں؟ یہ وہ خود بھی نہ جانتا تھا اور نوراں کے نقوش ستارے بن کر اس کی آنکھوں میں چمکنے لگے......

اس نے عہد کیا' کچھ بھی ہوا نوراں سے کہنا چاہیے۔ تمہاری جوانی جو کچھ طلب کر رہی ہے وہ میں دے سکتا ہوں۔ کیا ہوا' اگر میرے بال سفید ہو گئے ہیں۔ رگیں نیلی پڑ گئی ہیں، جُھریاں اُبھر گئی ہیں۔ میرے سینے کو دیکھو' میری محبت کے تلاطم کو دیکھو اور اس پیار کو دیکھو جو تمہارے لئے اس خاموش سڑک پر منتظر رہتا ہے کون جانے تمہارا خصم لوٹ آئے یا نہ آئے۔ آخر وہ جنگ میں بھرتی ہو کر گیا ہے۔ جہاں آدمی مارے جاتے ہیں۔ خون کی ہولی کھیلی جاتی ہے۔ کس لئے؟ ملک گیری کے لئے خُدا کی مخلوق کو محکوم اور غلام بنانے کے لئے سکے بکھیرنے کے لئے اور غیر اہم شہروں میں نمک کی ڈلیاں لے کر بیٹھنے والے گوران شاہوں کے لئے' مگر تمہیں ان سے کیا؟ تمہاری جوانی اور تمہارے جسم کو ان سے کیا؟ جانیں جو خچروں پر مال لاد کر اپنے ستارے چمکاتے ہیں' جو آسمان سے گولے پھینک کر شہروں کے شہر تباہ کر دیتے ہیں اور خوش ہوتے ہیں کہ ہم نے جنگ جیتی۔ جو جھوٹ اور افترا کی نئی نئی ایجادیں کرتے ہیں اور کہتے ہیں۔ یہی سیاسیات ہے' یہی تہذیب ہے' یہی ادب ہے۔

رات بھر اسے نیند نہ آئی۔ کشن گنگا کا شور اور سڑک کی اداس خاموشی اسی خیال کے نیچے دب کر رہ گئے۔ زندگی کے دو اجزا میں تیسرا جز مل گیا۔ زور اثر' تلخ اور زلزلہ خیز......! پندرہ برس پہلے واقعات ایک ایک کر کے اس کی آنکھوں کے سامنے پھرنے لگے۔ حسین عورتوں سے باتیں کرنا بھی ایک فن ہے اس کیلئے ایک خاص اسلوب کی ضرورت ہوتی ہے جس سے خود غرضی بھی عیاں نہ ہو اور محبت بھی آشکار ہو جائے۔ کیونکہ عورت ہر محبت کا تجزیہ کرتی ہے اور مختلف زاویوں سے مرد کی محبت کو دیکھتی اور

پرکھتی ہے۔

اس نے ساری رات گفتگو کے نئے موضوع تلاش کئے اور بہترین الفاظ کا انتخاب کیا اور جب صبح کے وقت غیر جذباتی پہاڑوں کے پیچھے سے سورج کی کرنیں ریشمی دوپٹوں کی طرح لہراتی ہوئی دھرتی کے سینے پر پڑیں تو وہ جھونپڑی سے باہر نکلا۔ سڑک اس کے سامنے تھی، خاموش اور اکیلی قدموں کے نشان کچھ مدھم پڑ گئے تھے کچھ مِٹ گئے تھے اور کچھ مٹ رہے تھے کشن گنگا کا بے ہنگم شور آس پاس کی پہاڑیوں سے ٹکرا کر ڈوب رہا تھا۔ سڑک پر اکّا دُکّا لوگ چلنے شروع ہو گئے۔ زندگی کے پرشور سمندر کے ساتھ ملنے کے لئے انسانی زندگیوں کی چھوٹی ندیاں اپنے منبعوں سے نکل پڑیں۔ ان میں سے کچھ کی چال میں مستانگی تھی، بے پروائی تھی اور کچھ کی چال میں بے نیازی اور بے انتہا مایوسی!

سورج لمحہ بہ لمحہ اونچا ہوتا گیا، گرمی بڑھنے لگی، پہاڑیوں کی چوٹیوں سے کثیف دُھواں سا اٹھنے لگا۔ دریگ کے چھوٹے چھوٹے پتے تمازت سے جھک گئے۔ کچی سڑک کے گرد وغبار میں حرارت پیدا ہوگئی۔ جیمہ خان نے درخت کے نیچے پانی کا چھڑکاؤ کیا۔ پھر کھاٹ بچھائی اور اس پر لمبا لمبا لیٹا۔ اس کی آنکھوں میں نیند نہ تھی، انتظار تھا، نوراں کا انتظار......!

دوپہر کو اس نے اسے دور سے آتے دیکھا، آج اس کے سر پر بان کا گٹھا نہ تھا۔ صرف کندھے پر سفید چادر تھی۔ اس کی چال میں آج پہلے کی طرح بے پروائی نہ تھی، نہ اضمحلال، بلکہ ایک مستانہ ادا۔ جیمہ خان فوراً رات کا موضوع اور منتخب الفاظ اپنے دل میں دُہرانے لگا۔

نزدیک پہنچ کر نوراں خود بخود مسکرائی۔ جیسے وہ بڑی دور سے اپنی مسکراہٹ کو ضبط کر کے یہاں تک لے آئی تھی۔

''آج گٹھا کہاں ہے؟''جیمہ خان نے پوچھا۔

''آج گٹھا نہیں چاچا!''

''گٹھا نہیں، کیوں؟''

''آج شہر سے سبزی اور گوشت لانا ہے۔''

گوشت اور سبزی سن کر جیمہ خان چونک پڑا۔ جو لوگ روٹی اور لسی کے عادی ہوں انہیں گوشت اور سبزی سے کیا کام؟ اس نے حیرت سے پوچھا۔''وہ کس لئے ؟''نوراں نے کھاٹ پر بیٹھتے ہوئے کہا۔''بس یُونہی۔''

جیمہ خان نے مسکرا کر پوچھا۔''اری چُھپاتی کیوں ہے؟ کہہ بھی دو، ہم تھوڑا مانگیں گے۔''

نوراں نے سر جھکا کر آہستہ سے کہا۔''آج وہ آرہے ہیں۔''

جیمہ خان کچھ بھی نہ کہہ سکا۔ اُس کا منہ کھلے کا کھلا رہ گیا اور اس کی حیرت زدہ آنکھیں نوراں کو دیکھتی رہیں۔ جس کی چال میں آج بلا کی شوخی تھی۔ سوچنے لگا آج وہ آرہے ہیں، وہ جنگ سے لوٹا ہوا سپاہی نئی جنگ لڑنے کے لئے، نیا خون بہانے کے لئے، اور انجام......؟ نئے سکّے، نیا گوراں شاہ......!

نوراں چلی گئی اور گھنٹہ بھر کے بعد چادر میں سبزی اور گوشت لے کر آ گئی اس بار اس نے صرف ہنستی ہوئی نظروں سے جیمہ خان کو دیکھا، جو جھونپٹی کی دیوار سے پیٹھ لگائے اسی انداز میں بیٹھا تھا، جیسے بہت تھک گیا ہو۔ نوراں کی ہنسی میں اسے ایک دعوت سی دکھائی دی۔ وہ جھٹکے کے ساتھ اٹھا اور اپنے منتخب الفاظ دہرانے لگا۔ بولا۔ سنو تو۔

نوراں نے قدم روک لیے۔ جیمہ خان نزدیک پہنچ کر بولا۔''آج تم بہت خوش ہو۔ بات تک نہیں کرتیں۔ آخر ہم نے کیا گناہ کیا ہے......؟''

نوراں نے کوئی جواب نہ دیا۔ وہ ہنستی رہی اور جانے کے لئے قدم اٹھانے لگی۔ جیمہ خان بے قابو ہو کر بولا۔ ''نوراں ہم پر بھی کچھ کرم کرو۔ ہم بھی تم سے محبت کرتے ہیں؟''

نوراں کے چہرے پُر سرخی سی دوڑی۔ اس نے جاتے جاتے کہا۔ ''چاچا جو ٹھہرے......'' اور چلی گئی۔

وہ دُور تک اسے دیکھتا رہا۔ لیکن ایک بار بھی نوراں نے مڑ کر نہیں دیکھا اس نے جیمہ خان کے منہ پر وہ چپت لگائی تھی جس کا احساس جیمہ خان کو اب تک ہو رہا تھا۔ وہ شرمندہ تھا کہ اس قدر ذلیل الفاظ کیوں اس کی زبان پر آ گئے۔ حالانکہ اس کا سوچا ہوا موضوع مختلف تھا اور الفاظ جُدا' وہ شام تک اپنے آپ کو کوستا رہا اور اپنے فن پر لعنت بھیجتا رہا۔

اس کے بعد سات دن تک نوراں نہیں آئی' صرف گوراں شاہ کی خچریں گھی' اون' ریشم لے کر آ گئیں۔ خچر بانوں نے تمبا کو پیا۔ جیمہ خان سے باتیں کیں اور چلے گئے۔ جیمہ خان سارا سارا دن نوراں کا انتظار کرتا رہا۔ کبھی جھونپڑی کے دروازے پر' کبھی دریگ کے نیچے اور کبھی کھاٹ پر لیٹے لیٹے۔ کشن گنگا کے پانی کا بے ہنگم شور گونجتا رہا اور اس کی زندگی میں داخل ہوتا رہا۔ کبھی سڑک کی اُداس خاموشیاں دھکیل دھکیل کر اجزائیں شامل ہوتی رہیں۔

ساتویں دن صبح وہ جھونپڑی کے دروازے پر بیٹھا تھا۔ کہ دور سے نوراں اور ایک مرد آتے ہوئے دکھائی دیئے۔ نوراں نے نیا لباس پہنا ہوا تھا۔ مرد عام فوجی وردی پہنے ہوئے اُس کے سر پر خاکی ٹوپی تھی۔ پیٹھ پر ہلکا سا بستر اور دائیں بغل میں لٹکتی ہوئی جھولی۔

جیمہ خان نے انہیں دیکھ کر کسی قسم کی معمولی حرکت نہ کی۔ جیسے وہ

مر چکا تھا اور اس کے تمام حس سلب ہو چکے تھے۔ جب دونوں نزدیک پہنچے تو مرد نے پوچھا" کیوں جیمہ چاچا' کیسے ہو؟"

یک لخت جیمہ خان کو اپنے بدن میں برقی رو کا سا احساس ہوا۔ اس کے دل میں بے پناہ نفرت پیدا ہو گئی جسے ضبط کرتے ہوئے اس نے کہا۔" اچھا ہوں سناؤ کب آئے؟"

" آج ساتواں دن ہے' بس اب جا رہا ہوں۔"

" خوب جنگ دیکھی ہو گی تم نے...... پر کچھ کمایا بھی کہ نہیں؟"

نوجوان کھل کھلا کر ہنس پڑا۔ نوراں بھی ہنس دی۔" ارے جنگ میں کیا کمائی' وہاں تو جان کے لالے پڑ جاتے ہیں۔"

جیمہ خان کی ساری نفرت ہونٹوں پر آ گئی۔ بولا۔" ایں' تم کیا جانو' تم تو کل کے لونڈے ہو۔ لوگوں نے اس جنگ میں وہ دولت کمائی کہ رہے نام اللہ کا۔"

نوجوان فوجی پھر ہنسا' بولا۔ وہ کیسے چاچا؟

جیمہ خان نے کہا۔" کہتے ہیں اُدھر خون بہہ رہا تھا۔ اِدھر سکے بکھر رہے تھے اُدھر آدمی کٹ رہے تھے' اِدھر گوراں شاہ بن رہے تھے۔"

نوجوان نے نوراںؔ کی طرف ہنسی ہوئی نظروں سے دیکھ کر کہا۔" چاچا اب بوڑھا ہو گیا ہے مگر جوانی میں خوب عیش لٹائے ہیں۔"

جیمہ خان نوراںؔ کو دیکھتا رہا۔ اور جب وہ دونوں اس کی نظروں سے اوجھل ہو گئے تو اسے محسوس ہوا' جیسے جنگ لڑی بھی جا چکی اور ختم بھی ہو چکی۔ خون بہہ بھی گیا اور سکے بھی بکھر گئے۔ پنجاب سے بھاگے ہوئے آ بھی چکے اور گوراں شاہ بھی بن چکے۔ اسے یقین ہوا کہ وہ بہت بوڑھا ہے جس پر زمانے نے محافظت کے فرائض عائد کئے ہیں' کچی سڑک کی محافظت' گوراں شاہ کے ستاروں اور خچروں کی محافظت۔

وہ پھٹی پھٹی نظروں سے صبح کی بھیگی ہوئی زمین پر نوراںؔ کے نقوش پا دیکھتا رہا......ستارے!

نوجوان فوجی نیاز کے ستارے...... نئے گوراں شاہ کے ستارے۔ خون بہہ جانے کے بعد نئے سکوں کی دھندلی تصویریں ......اس نے جذبۂ نفرت کے تحت انہیں اپنے پاؤں سے مٹانا چاہا۔ لیکن جرأت نہ ہوئی۔ اسے فوراً یاد آ گیا کہ وہ صرف جیمہ خان جی نہیں بلکہ محافظ بھی ہے اور ستاروں کی محافظت کرنا اس کا فرض ہے وہ نئے جوش کے ساتھ کدال کندھے پر اٹھا کر کچی سڑک کی حفاظت کے لئے دور تک چلا گیا اور چلتا ہی رہا۔

............☆☆☆............

دیوتا کہاں ہیں

پنڈت رام ناتھ نے اپنے گھر میں بہت بڑے پیمانے پر ہون رچا رکھا تھا۔ گذشتہ منگل کو ہون کا مہورت تھا اور اس دن سے آج تک برابر ہون کنڈ روشن رہا۔ وید منتروں اور اشلوکوں کا اچارن ہوتا رہا۔ اور آج سنیچر کی شام کو خاتمے کی آرتی اترنی تھی۔ دیوتاؤں کو بھوگ چڑھانا تھا اور اس کے بعد برہمنوں کو مہان بھوجن دینا تھا۔

باغیچے میں ایک طرف عالی شان شامیانہ نصب کیا گیا تھا جس کے نیچے ہوَن منڈپ بنایا گیا تھا۔ دوسری طرف صحن کے ایک حصے کو کاٹ کر لنگر کھولا گیا تھا جہاں قسم قسم کے پکوان پک رہے تھے اور یہ سب کچھ دیوتاؤں کے لئے ہو رہا تھا جنہوں نے کچھ عرصے سے پنڈت جی کے کارخانے پر سونا برسانا شروع کیا تھا۔

زندگی کے شروع شروع میں رام ناتھ مذہب کا زیادہ معتقد نہ تھا۔ لیکن یہ بھی صحیح ہے کہ وہ دن اُس کے لئے زندگی میں زیادہ میں شامل نہیں تھے، صرف ایک ناکام سی جدوجہد زندہ رہنے کے لئے یا زیادہ سے زیادہ کارخانے کو چالو رکھنے کی خواہش ...... یہ ہے ان دنوں کی داستان جہاں تیس دن کے بعد مشکل سے دو تھان ریشم کے بُنے جاتے تھے۔ وہ بھی ایسے چار کاریگروں کے ہاتھوں سے جن کی آنکھوں میں ہر وقت زندگی بجھی بجھی سی نظر آتی تھی۔ رام ناتھ سارا سارا دن انہی کے پاس بیٹھا رہتا۔ جب کاریگر حقہ پینے بیٹھتے تو دوسرے دور کے بعد چلم رام ناتھ کے ہاتھ میں پہنچ

جاتی۔ وہ اپنے مستقبل کی رجائیت کا تصور کرتے ہوئے ہوا میں دھوئیں کے مرغولے پھینک دیتا۔ جو چھوٹے بڑے دائروں کی شکل میں آوارہ ہو جاتے۔ اور رام ناتھ کی نظریں ہوا میں تحلیل ہونے تک ان کا تعاقب کرتی رہتیں۔ ان ہی دائروں میں اسے اپنی اور اپنے چار کاریگروں کی زندگی پھیکی پھیکی سی نظر آتی، جو بالآخر غائب ہو جاتی...... کہاں؟ یہ وہ سمجھ نہ سکتا۔

لیکن یہ قیاس خود اس کے حق میں صحیح ثابت نہیں ہوا۔ اس کی زندگی کا دائرہ تحلیل ہونے کے بجائے بڑھتا گیا، حتیٰ کہ وہ ایک اچھے کارخانے کا مالک بن گیا۔ جہاں اب چار کے بدلے پورے چالیس کاریگر جدید قسم کی مشینوں پر ریشم بنتے تھے اور جنگ کی وجہ سے پیراشوٹ کلاتھ کی اس قدر مانگ بڑھ گئی تھی کہ کارخانہ جمعہ کو بھی بند نہیں رہتا تھا۔

استا کریم اور اسے کے ساتھی جنہوں نے رام ناتھ کے ابتدائی دن بے کیف سے کارخانے میں خاموش طریقے سے گزارے تھے، اپنی اور اپنے مالک کی اس حیرت انگیز ترقی پر وہ ہمیشہ فخر کرتے تھے ان کے خیال میں اس ترقی کا واحد سبب رام نابھ کی نیت تھی جو انہیں ہمیشہ بلور کی طرح صاف اور چاندنی کی طرح پاکیزہ دکھائی دیتی تھی۔ ۔ اپنی نیت انہیں شاید ہمیشہ کوئلے کی کان کی طرح کالی اور بدصورت نظر آتی تھی۔ جبھی وہ چوبی نشستوں سے اٹھ کر سپرنگ والی نشستوں پر نہ بیٹھ سکے۔ لیکن پھر بھی انہیں مطلق افسوس نہ تھا۔ وہ دیوتاؤں کے قائل نہ تھے۔ البتہ دعاؤں پر بھروسہ کئے ہوئے تھے۔ جو کبھی کبھی بے اختیاری کے عالم میں ان کے منہ سے نکلتی تھیں...... "یا اللہ ساگ بھتہ دے...... یا اللہ دین وایمان دے...... یا اللہ گھر میں بچے دے......" اور پردہ نشیں خدا انہیں یہ دیتا رہا۔ ساگ بھتہ، دین وایمان اور بے شمار بچے...... اس کے برعکس رام ناتھ کی زندگی کے دائرے بڑھتے رہے اور اتنے بڑھے کہ اسے مذہب سے عشق سا ہونے

لگا۔ وہ جو آج تک صرف آسمانوں پر رہا کرتے تھے اور اس کی آنکھوں سے اوجھل تھے۔ اب اسے ہر جگہ ناچتے، کودتے، مسکراتے اور سونا برساتے نظر آنے لگے۔ مشینوں کے شور میں بھی اسے دیوی دیوتاؤں کی آوازیں، ان کے اشارے، ان کے فیاض ہاتھ دکھائی دینے لگے......دو اور لو۔ کھلاؤ اور کھاؤ............مذہب ایک طرح کی تجارت ہے جو آسمانوں پر رہنے والا خُدا اپنے بندوں سے کرتا ہے جو اس بھید کو نہیں سمجھ سکتا......وہ زندگی بھر ذلیل رہتا ہے اور ساری عمر چوبی نشستوں پر بیٹھ کر گذارتا ہے۔ تم پنڈت ہو، دور اندیش پنڈت......ایسے سستے سودے کو ہاتھ سے نہ جانے دو......

جب کسی سال ہوَن رچانے میں کچھ دنوں کا فرق پڑتا، تو اسے ایسا محسوس ہوتا جیسے دیوتا ناراض ہو گئے ہوں اور نفع نقصان کی زبان میں کہہ رہے ہوں۔ "یہ تمہارا اپنا قصور ہے، آسمانی بنئے کی تھیلیوں پر گرد کی تہیں چڑھ گئی ہیں۔ تم اپنا مال بھیج دو، ہم اپنا مال بھیج دیں گے......"اور یوں ہی ہوتا تھا، ہوَن رچایا جاتا تھا۔ روحانی تجارت کے دلال منتر پڑھتے تھے اور دور اندیش پنڈت سونے سے لد جاتا تھا۔

اور آج بھی شامیانے کے نیچے ہون جاری تھا، گھی شکر کی مہک سے ہوا معطر تھی......اور آگ کے شعلے دیوتاؤں کے بھیس میں ناچ ناچ کر آہوتیاں لے رہے تھے۔ چندن، توت اور چھار کی لکڑیاں چیخ چیخ کر جل رہی تھیں اور رام ناتھ کے چہرے پر ایک غیر مرئی سا جلال پھیلتا جاتا تھا۔ تجارت چل رہی تھی۔ ترازو کا ایک پلڑا ہلکا تھا اور دوسرا بھاری۔ ہلکا پلڑا گھی، شکر اور منتروں کا مال لئے ہوئے تھا۔ اور بھری پلڑا پیرا شوٹ کلاتھ کے بھاری آرڈر لئے ہوئے...... جو رام ناتھ جیسے دور اندیش سوداگر کے اعتقاد کے مطابق صرف آسمان پر رہنے والے بنئے کی رضا مندی کا ثبوت تھے۔ وہ کبھی کبھی منڈپ سے اٹھ کر صحن میں چلا آتا، اطمینان بھری نظروں سے لنگر کی طرف دیکھتا۔ پھر ان مزدوروں کی طرف جو صحن میں برتن مانجھنے، کتوں کو دور رکھنے اور صفائی

کرنے کے لئے مامور ہوتے جو نہ دیوتاؤں پر اعتقاد رکھتے تھے اور نہ تجارت کے بھید کو سمجھ سکتے تھے۔ تھوڑی دیر اِدھر اُدھر ٹہلنے کے بعد وہ واپس اندر چلا جاتا اور آگ میں گھی اور شکر کی آہوتیاں دینے لگتا۔

صبح کو ہلکی سی بارش ہوئی تھی اور براہمنوں کے کہنے کے مطابق ہون کے لئے یہ بہت اچھا شگون تھا۔ تپتی ہوئی دھرتی کی حرارت کو کم کر کے آہوتی قبول کرنا اس بات کا ثبوت تھا کہ دیوتا ہون سے خوش ہو گئے ہیں اور یہ احساس صبح ہی سے رام ناتھ کو دلا یا جا رہا تھا۔ اس کی آنکھوں میں دیوتاؤں کی ساری عقیدت سمٹ کر جمع ہو جاتی۔ وہ ہون کنڈ کی طرف مسرت بھری نظروں سے دیکھتا۔ جہاں آگ کی لپٹیں ایک سالم قند کے گرد طواف کرتی نظر آتیں جو اپنی تمام مٹھاس آگ کے حوالے کر کے آہستہ آہستہ راکھ ہو جاتا۔ اور رام ناتھ کے لئے آسمانوں سے دیوتاؤں کی خوشنودی لے آتا۔ اس منظر کو دیکھ کر رام ناتھ کے دل میں جلتے ہوئے قند کے لئے تھوڑی دیر کے واسطے ہمدردی پیدا ہو جاتی۔ اور آگ سے نفرت سی۔ جس کی لپٹیں بڑی بے دردی سے قند کی زندگی چوس لیتیں۔ لیکن فوراً ہی اسے اپنے دیوتا یاد آتے۔ اور پھر آگ مقدس بھی تو ہے، ایک براہمن کی طرح اور پھر وہ خود بھی تو ایک براہمن ہی ہے...... جس نے آج تک کسی کی زندگی کی مٹھاس نہیں چھینی۔ البتہ دیوتاؤں نے اس کی زندگی میں خود بخود مٹھاس بھر دی...... اس کے چار کاریگر...... راکھ کے راکھ ہی رہے۔

شامیانے کے نیچے ہون ہو رہا تھا اور باہر صحن میں ایک لڑکا اندھے بھک منگے کا ہاتھ پکڑے داخل ہوا۔ اور صحن کے ایک طرف اسے بٹھا کر خود بھی بیٹھ گیا۔ لڑکے کی نظریں ساز و سامان اور گہما گہمی دیکھ کر آوارہ ہونے لگیں اور اندھے کے نتھنے پھڑکنے لگے۔ معطر ہوا نے شاید اس کے جذبات کو جگا دیا۔

برتن مانجھنے والے ایک مزدور نے انہیں دیکھا۔ تو اس کی آنکھوں میں خون

اتر آیا۔ ''حرامی......مفت خورے سونگھ سونگھ کر عین موقع پر پہنچ جاتے ہیں......''

وہ اپنے جذبات پر قابو نہ پا سکا۔ پھٹ کر لڑکے سے بولا...... ''کیوں اس بے چارے کو ذلیل کر رہے ہو، مزدوری کیوں نہیں کرتے......''

لڑکے نے مزدور کا غصہ دیکھ کر اندھے کا ہاتھ زور سے پکڑا۔ اور مزدور پھر بولا۔ جا لے جا اسے یہاں شام کو چاول ملیں گے۔

اندھے نے اپنا سر اسی طرف اونچا کر کے کہا...... بابا ہم تھوڑی دیر ٹھہریں گے، کچھ ملے گا تو لیں گے۔ نہیں تو چل دیں گے۔

''شام تک ٹھہرو گے؟'' مزدور نے دوسرا سوال کیا۔

لڑکے نے سر سے اثبات کا اشارہ کیا۔ لیکن اندھے نے آہستہ سے کہا۔ ''نہیں بادشاہ! دور ٹھکانہ ہے۔''

''دور......؟ کہاں؟''

''عیدگاہ کے پاس، علم صاحب کی مسجد میں۔''

اتنے میں ایک نوجوان بھکارن اپنی گود میں نیم برہنہ بچہ اٹھائے ہوئے صحن میں داخل ہوگئی۔ مزدور نے اسے دیکھا تو حقارت سے ہنسنے لگا۔

بھکارن لڑکے کے پاس آ کر بیٹھ گئی اور استعجاب بھری نظروں سے اِدھر اُدھر دیکھنے لگی۔ اس کا نیم برہنہ بچہ کیچڑ سے کھیلنے لگا۔

''کب بھات ملے گا؟'' اس نے دفعتاً بھک منگے لڑکے سے رازدارنہ لہجے میں پوچھا۔ ''کیا معلوم ...... کہتے ہیں شام کو......'' لڑکے نے مجبوری ظاہر کرتے ہوئے کہا۔

''شام کو......؟''

''کیوں تمہیں بھوک لگی ہے؟''

"مجھے نہیں......اس بچے کو......!"

تو جا کر مانگ لانگری سے......شاید دے دے۔

نوجوان بھکارن خاموش ہوگئی۔ مانگنے کے لفظ نے اسے چپ کرا دیا۔ شاید وہ جانتی تھی کہ عورت خُدا کی وہ تخلیق نہیں جو اپنا ہاتھ پھیلا کر کسی سے کچھ مانگے۔

اور اسی بھک منگے نے اسے اکساتے ہوئے کہا۔ "جا مانگ دے......تمہیں دے دیں گے۔"

نوجوان بھکارن نے بچے کو گود میں اٹھایا اور لنگر کی طرف چل دی۔ بیسیوں پکوان اس کی نظر کے سامنے آ گئے......پوریاں......کھیر......بھات' پکوڑیاں لڈو......

بچے نے اتنی چیزیں دیکھ کر کیچڑ سے بھار ہوا اپنا ہاتھ پھیلا دیا۔ اور مچل کر گود سے اترنے کی کوشش کرنے لگا۔ اور ماں خاموش مگر ٹٹولتی ہوئی نظروں سے اندر دیکھنے لگی۔

ایک لانگری نے اسے دروازے پر کھڑا دیکھ کر پوچھا۔ "کیا چاہتی ہے؟"

"تھوڑا سا بھات اس بچے کے لئے......اس نے کہا۔"

"بھات؟"

"ہاں صبح سے بھوکا ہے......"

لانگری نے اسے سر سے پاؤں تک دیکھا۔ ایک خاموش مگر شکست خوردہ حُسن جو غلیظ پوست اور کپڑوں کے اوپر لاوارث مال کی طرح بکھرا ہوا ہے۔ ایک البیلی جوانی جو ممتا کے سبب ہاتھ پھیلا رہی ہے۔ ایک شرمیلی عورت جو بیگانگی سی محسوس کرتی ہے اور آپ ہی آپ لرز رہی ہے۔

"یہ بچہ تمہارا ہی ہے؟" لانگری نے ہمدردی کے لہجے میں پوچھا۔

"ہاں......" بھکارن نے شرما کر جواب دیا اور خاموش نگاہوں سے اسے

دیکھنے لگی۔ شاید دل میں سوچنے لگی۔ بھات کی ایک رکابی کے لئے رشتے دریافت کرنے کیا ضروری ہیں......کیا اس دنیا میں بھکاریوں کی خیرات بھی پوچھ گچھ کے بغیر نہیں مل سکتی؟

تھوڑی دیر بعد لانگری نے کہا۔ ''تم بیٹھ جاؤ۔ جب دیوتاؤں کا بھوگ چڑھے گا، میں تمہیں سب سے پہلے پیٹ بھر کر بھات کھلاؤں گا۔''

ابھی وہ وہیں کھڑی تھی کہ منڈپ سے رام ناتھ باہر نکلے۔ لنگر کے دروازے پر بھکارن کو دیکھ کر آگ بگولا ہو گئے......ستیاناس ہو گیا۔ ملیچھ عورت......

بھکارن تھرتھرانے لگی۔ اس کا بچہ ہاتھ پھیلا پھیلا کر بھات اور پوریوں کی طرف اشارے کرتا رہا۔ اور ایک مزدور نے ڈانٹ کر اسے صحن میں بٹھا دیا۔ ''چڑیل ......مالزادی......حرامی بچے کو لے کر سر پر چڑھی جا رہی ہے۔''

عورت کی آنکھوں میں آنسو آ گئے......رام ناتھ لانگری سے کہہ رہے تھے ''دیوتاؤں کے پکوان پر ملیچھ عورت کی نظر تو نہیں پڑ گئی......؟''

لانگری لاکھ لاکھ قسمیں اٹھا کر یقین دلا رہے تھے کہ اس کی نظر کسی چیز پر نہیں پڑی......اور تمام پکوان کی تقدیس بدستور قائم ہے......

رام ناتھ مطمئن ہو کر واپس چلے گئے......اور بھکارن سرنگوں ہو کر بیٹھ گئی۔

تھوڑی دیر بعد بھک منگے لڑکے نے آہستہ سے پوچھا۔ ''کیا کہا لانگری نے''

''تم نے نہیں سنا؟ بھکارن نے پوچھا۔''

''نہیں اللہ قسم!''

''نہیں دیا......بولا......پہلے دیوتا کھائیں گے......ان کے بعد تمہیں ملے گا......''

''دیوتا ......؟ وہ کون ہوئے؟'' لڑکے نے حیران ہو کر پوچھا۔ ''مجھے کیا

معلوم......"

اندھا بھکاری ان کی باتیں سن رہا تھا۔اس نے آہستہ سے کہا۔"میں انہیں جانتا ہوں۔وہ شام کو آتے ہیں۔"

"شام کو......؟" بھکارن نے گھبرا کر پوچھا۔

ہاں ......شام کو......وہ دن کو نہیں آتے ......"اندھے نے خود اعتمادی کے لہجے میں کہا۔جیسے فی الحقیقت اس نے دیوتاؤں کو دیکھا تھا یا انہیں جانتا ہو۔

اور جُوں جُوں تاریکی پھیلنے لگی۔وہ ہر آنے والے کو غور سے دیکھنے لگے۔ شاید یہی دیوتا ہو۔لیکن جو آتا تھا وہ یا تو بھک منگا تھا...... یا انسان مانُوس سا انسان!"

اندھیرا چھا جانے کے بعد بھی جب لنگر میں کوئی سرگرمی نہ دکھائی دی۔تو لڑکے نے اندھے سے پوچھا۔"ابا۔دیوتا کیوں نہیں آتے ......؟"

اندھے نے سنجیدگی سے کہا۔"آئیں گے بیٹا' ضرور آئیں گے۔پنڈت کے ہر بڑے دن پر دیوتا آتے ہیں۔"

نوجوان بھکارن کا بچہ روتے روتے سو گیا تھا۔اس کے پتلے پتلے ہونٹوں پر کیچڑ کے داغ سوکھ گئے تھے جو دھرتی کی مٹھاس محسوس کر کے اس نے کھا لیا تھا۔

تھوڑی دیر بعد ایک مزدور ان کے پاس سے گذرا۔اندھے نے پوچھا۔ "کیوں بھائی' بھات کب ملے گا؟ اب تو شام بھی ہو گئی......"

مزدور نے قدم روک کر کہا۔اوہو بڑے نازک مزاج ہو......

بھکارن اس جواب سے بہت مایوس ہو گئی......کاش وہ ماں نہ ہوتی۔اس کا بچّہ بھوک کی وجہ سے زیادہ دیر تک نہ سو سکا۔وہ جاگ کر رونے لگا اور بار بار لنگر کی طرف اشارے کرنے لگا۔اندھے نے اپنے بیٹے سے بادل ناخواستہ کہا۔"میرا ہاتھ پکڑو' چلو چلتے ہیں......"

لڑکے نے اس کا ہاتھ تھاما اور دونوں صحن سے نکلے۔

بھکارن مضطرب ہو کر صحن میں ٹہلنے لگی اور جب اسے بھات تقسیم ہونے کی کوئی صورت دکھائی نہ دی۔ اور نہ دیوتا آتے ہوئے نظر آئے تو وہ بھی دروازے کی طرف بڑھی۔

اندر شامیانے کے نیچے اونچی آواز مین شانتی پاٹھ ہو رہا تھا اور باہر ایک مضطرف اور مجبور ماں اپنے بھوکے بچّے کو بہلانے کی ناکام کوشش کرتی ہوئی صحن سے نکل رہی تھی۔ وہ ہر قدم پر رک رک کر، مڑ مڑ کر یہ دیکھنا چاہتی تھی کہ دیوتا نہیں آئے جو اتنی بڑی تقریبوں پر سب سے پہلے بھات اور پکوان کھاتے ہیں حتّٰی کہ ایک بے زبان بھوکے بچّے سے بھی پہلے!

وہ گویا ہر آنے جانے والے سے پوچھ رہی تھی۔ دیوتا کہاں ہیں؟ دیوتا کہاں ہیں؟

...........☆☆☆............

نئی صُبح

سورج ڈُوبا۔

اندھیرا چھا گیا۔

رات گھنی ہوگئی۔

اور سیماں سوگئی......!

وہ ہر روز اسی طرح گھر کا کام کاج کر کے سو جاتی۔ مگر آج ......اس کا جنوں خیز شباب نہ سو سکا۔ وہ سُبک رفتار ہوا کی طرح گاؤں کی غلیظ گلیوں ،خوش پوش جھونپڑیوں اور ویران کھیتوں میں بھٹکتا رہا۔ جن کے راہرو مکین اور مالک جا چکے تھے۔ وہ خاموشی کے دل افروز سکوت میں کئی کہانیاں سنتی رہی۔ اپنے اس بے فکر بچپن کی کہانیاں جو اس نے اسی گاؤں کی دھول میں اپنی کئی سہیلوں کیساتھ بتا دیا تھا۔ آج جب وہ بچپن اور شباب کے دوراہے سے گزر کر زندگی کی نئی شاہراہ میں داخل ہو چکی تھی، وہ کہاں تھی؟ ایشاں اور فضلی دور کے دیہات میں بیاہی گئی تھیں نوری مر چکی تھی اور رادھا جو مادھو سے بیاہی جانے کے بعد سیماں کی سہیلی بن گئی تھی۔ خُدا جانے آج کہاں تھی؟ اس کا گھر اہرام کی طرح اب تک کھڑا تھا۔ اس کی کھڑکیاں اور دروازے ٹوٹ چکے تھے۔ سامان لوٹ لیا گیا تھا اور وہ چھوٹا سا مندر جو مادھو کے خُدا دوست بزرگوں نے صحن میں چار کچی دیواریں چن کر بنایا تھا، تباہ ہو چکا تھا۔ پتھر کا عظیم بت

جس کے اوپر ہر صبح رادھا چنے ہوئے چاول اور سیماں کے باغ کے پھول بکھیرتی تھی، اوندھے منہ دراوازے پر پڑا تھا۔

اور بھی بہت سے گھر...... ستار بٹ کا، ہردت سنگھ کا، عظیم ماگرے کا، لسہ کاک کا، اسی طرح تباہ ہوکر خاموش کھڑے تھے۔ ان کے صحنوں میں مٹی کے نئے اور پرانے برتنوں کے ریزے، ٹین کے ٹکرے، جلے ہوئے اناج کی سیاہ راکھ، پھٹی ہوئی چٹائیاں، چیتھڑے اور تیل کی میلی کپیاں بکھری ہوئی تھیں جن پر گاؤں کے کتے سارا سارا دن لوٹتے تھے اور چادر پر لیٹی ہوئی سیماں کا مضمحل دماغ سوچ رہا تھا، دیکھتے دیکھتے گاؤں پر بربادی کیسے آگئی؟ یہ ویرانی کیسے چھا گئی؟ کاش اس نے بھی اپنی آنکھوں سے یہ ہولناکیاں دیکھی ہوتیں۔

سیماں نے کروٹ بدلی۔ دراصل ابھی ایک ہی کروٹ لیٹ کر وہ اُکتا نہیں گئی تھی بلکہ اس کے ذہن نے سوچتے سوچتے غم کی اس قدر گرانباری محسوس کی تھی۔ کہ اُسے کروٹ بدلنا ہے پڑی۔ کمرے میں اندھیرا بھی تھا اور سکوت بھی۔۔۔ صرف دریچے کی روزن سے میلی چاندنی کی ایک لکیر مقابل کی دیوار پر کھینچ گئی تھی۔ اس کا خاوند جسے اس کی بوڑھی ماں خانہ نشین داماد بنا کر لائی تھی، دو مہینے سے قومی فوج میں بھرتی ہوکر شہر چلا گیا تھا اور اسے اب تک معلوم نہ تھا کہ وہ کہاں ہے؟ کس حال میں ہے؟ اس کی بوڑھی اور بیمار ماں سو چکی تھی۔ اُسے رات کو تو کبھی کبھی کھانسی کا اتنا شدید دورہ پڑتا تھا۔ کہ سیماں کے لئے اس کمرے میں سونا دوبھر ہوگیا تھا۔ مگر ان کی محبت اسے سب کچھ برداشت کراتی تھی۔ آخر اس بڑھیا کا عزیز اور سیماں کے بغیر اور کون تھا اس دُنیا میں؟ کروٹ بدلتے بدلتے اس نے ماں کے بستر کی طرف دیکھا۔ کثیف رضائی میلی چاندنی کی لکیر سے صاف دکھائی دے رہی تھی، وہ سو چکی تھی۔

سیماں نے نیند لانے کی بہترین ترکیبیں کیں۔ اس کروٹ لیٹی، اس کروٹ

لیٹی۔ آنکھیں میچ لیں۔ مگر نیند نہیں آئی۔ آج اس کی نیم وا آنکھوں کے سامنے رادھا تھی۔ اس کا گھر تھا۔ اس کا چھوٹا سا مندر تھا۔ جس کے بے جان بت نے رادھا اور سیماں دونوں کی دوشیزگی میں پلی ہوئی تمنائیں بھانپ لی تھیں اور اب چند مہینوں کے اندر اندر شباب کا بہترین تحفہ بخشنے والا تھا۔ سیماں اور رادھا نے اسی بخشش کو محسوس کیا تھا اور اسی احساس کے ساتھ وہ اپنے رنگین خوابوں کے طلسم ایک دوسرے پر ظاہر کرتیں اور پہروں بے مطلب ہنستیں!

اس وقت جب باہر رات کے نمناک لمحے سسکیاں لیتے ہوئے گاؤں کے اوپر سے گزر رہے تھے۔ رادھا سیماں سے کہہ رہی تھی۔ سیماں کیا وہ دن پھر لوٹ آئیں گے جب تم اور میں ہنسا کرتی تھیں۔ بہتے پانی کو اچھال اچھال کر خوابوں کے جال بنا کرتی تھیں۔

سیماں کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ جو خود بخود گر کر چادر کے کھردرے پن میں جذب ہو گئے۔ رادھا ایک سوال پوچھ کر چلی گئی تھی۔ وہ سوال جو آج سے بہت پہلے کئی بار سیماں کے ہونٹوں پر آچکا تھا۔ مگر اس کا جواب وہ کس سے پوچھتی؟ گاؤں میں جتنے بھی مرد رہ گئے تھے، سب کے اذہاں پر ایک مبہم خوف سا طاری تھا۔ قبائلی لٹیرے نہ صرف ان کا مال و متاع ہی لوٹ کر چلے گئے تھے۔ بلکہ ان کی ضرورت بھی مفلوج کر گئے تھے۔ ان کے ناپاک حملے کا رستا ہوا زہر اگرچہ گاؤں کی حفاظتی کمیٹی نے محبت اور یک جہتی کے آبِ حیات سے دھو ڈالا تھا۔ مگر تاہم زہر کی تلخی کا ہلکا سا احساس کسی کسی کے فالج زدہ ذہن پر اب بھی موجود تھا۔ اور وہ نہیں جانتے تھے کہ اب کیا ہوگا، کیسے ہوگا؟ لٹیروں کا حملہ اتنا ناگہاں ہوا تھا کہ دیکھتے دیکھتے صدیوں کا بندھا ہو شیرازہ اور بھائی چارہ پاش پاش ہو گیا تھا۔ رستے بستے گاؤں اُجڑ گئے تھے، لہلہاتے ہوئے کھیت جل کر راکھ میں تبدیل ہو چکے تھے اور اس افراتفری اور ویرانی میں کچھ

لوگ جانیں بچا کر بھاگ گئے تھے کچھ مر گئے تھے اور کچھ لا پتہ ہو گئے تھے۔ سیماں اس روز گاؤں میں نہ تھی۔ وہ بچ گئی تھی۔ مگر عزیز وہیں تھا۔ اس نے کئی دن مادھو اور رادھا کو اپنے گھر میں چھپا رکھا تھا۔ مگر آس پاس کے دیہات میں پھیلے ہوئے زہر کے آگے اس کی ایک نہ چلی۔ پھر بھی ایک اندھیری رات وہ دونوں کو اپنا اور سیماں کا لباس پہنا کر گاؤں سے نکالنے میں کامیاب ہو گیا۔ وہ اسی بات پر خوش تھا کہ اس نے سیماں کی غیر حاضری میں اس کی سہیلی اور اس کے سہاگ کو بچایا' جو بحیثیت انسان کے اُس کا فرض بھی تھا اور ایمان بھی۔ مگر جب حملہ آوروں کی پسپائی کے بعد سیماں مراج سے لوٹی تو اس کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔

''تم نے انہیں جانے ہی کیوں دیا؟'' سیماں نے کہا۔

عزیز اس سوال پر قہقہہ مار کر ہنسا۔ ''تم دیوانی ہو سیماں۔'' اس نے کہا۔

''لٹیرے انسان نہیں تھے' ریچھ تھے۔ اگر تم بھی یہاں ہوتی تو......''

اس سے آگے اس نے کچھ نہ کہا۔ مگر سیماں تاڑ گئی کہ عزیز کے پیٹ میں اس سے آگے کیا تھا۔ اس کے کلیجے سے دھواں سا اٹھا۔

''کیا ایسا بھی ہوتا ہے؟'' وہ دل ہی دل میں سوچنے لگی اور عزیز نے پھر کہا۔

''انہوں نے کسے چھوڑا؟ مسلمانوں کو؟ سکھوں کو؟ ہندوؤں کو؟ جو ان کی راہ میں آ گیا 'لٹ گیا' کٹ گیا اور تم کہتی ہو۔ تم نے انہیں جانے ہی کیوں دیا۔ کیا کرتا انہیں روک کر......؟ مرواتا؟''

سیماں نے دوسری کروٹ بدلی۔ دیوار پر چاندنی کی لکیر سکڑتے سکڑتے بالشت بھر رہ گئی تھی اور بڑھیا میلی رضائی کے نیچے بدستور سو رہی تھی۔

عزیز کی جس بات کی قائل وہ آج سے دو مہینے پہلے نہ ہوئی تھی' اس بات کی قائل وہ آج رات کو ہو گئی جب عزیز اس کی مرضی کے خلاف فوج میں بھرتی ہو کر چلا

گیا تھا۔ اس دن سیماںؔ نے اس سے سیدھے منہ بات بھی نہ کی تھی اور کرتی بھی کیوں ؟اس نے اس کی سہیلی کو گاؤں سے نکالا تھا۔ اور اب فوج میں سورما بن کر بھرتی ہونے والا تھا۔ لیکن عزیزؔ اس دن بھی ہنسا تھا۔ اس نے ہنستے ہنستے کہا تھا۔ ''آج شاید تمہیں میرا جانا ناگوار گذرے مگر وقت آئے گا جب تمہیں احساس ہوگا کہ میں کیوں گیا تھا۔ مگر یہ ''کیوں''......آج تک سمیاںؔ کیلئے کیوں ہی رہا۔ مانا اُس نے مادھوؔ اور رادھاؔ کی زندگیاں بچائیں مگر فوج میں بھرتی کیوں ہوگیا؟ وہ سمجھ نہ سکی۔ نہ گاؤں کی کوئی عورت سمجھ سکی تھی، صرف مرد کبھی کبھی کہتے تھے ''یہ ہماری فتح ہے، تین سو ساٹھ سال کے بعد ہمارے نوجوان ہاتھ میں بندوق اٹھائیں گے اور سرحدوں سے باہر دشمن کو نکال کر ملک کو بچائیں گے۔ ''لیکن عزیزؔ کی بات میں صرف اتنا ہی نہ تھا، کچھ اور بھی تھا جو اس نے کہا نہیں۔ کیا اس کے جانے سے رادھاؔ آئے گی؟ ہردتؔ اور لسہ کاک آئے گا؟ ستارؔ اور عظیمؔ آئیں گے؟ یہ کیسے ہوسکتا ہے! آئیں گے تو کیا کریں گے؟ کہاں رہیں گے؟ کیا پہنیں گے؟ کیا کھائیں گے؟ لیٹروں نے ان کا کیا چھوڑا ہے؟''

اُسے یقین ہوا کہ عزیزؔ کی بات کا مطلب یہ نہیں تھا۔ خُدا جانے کیا تھا۔ جو اس نے چھپایا۔ دو مہینے سے اس کی کوئی خبر نہیں آئی تھی کہ کہاں ہے اور کیسا ہے سنا ہے جنگ میں آدمی مارے بھی جاتے ہیں اور زخمی بھی ہوتے ہیں۔ چھنکلیا کے برابر بارودی گولی قوی ہیکل انسان کو ہمیشہ کے لئے خاموش کر دیتی ہے۔ کیا ہوتا ہوگا اس کے اندر؟ گاؤں میں سب کہتے ہیں، لٹیروں نے جس جس کو گولی ماری، ذرا سا خون بہہ گیا اور آدمی ٹھنڈا ہوگیا۔ اس کے دل میں لٹیروں کے خلاف بے بس غصّہ ابھرنے لگا اور وہ ایک دھچکے کے ساتھ اٹھ کھڑی ہوئی۔ بوڑھی ماں نے بھی یہ دھچکا محسوس کیا۔ کثیف رضائی کے ڈھیر تلے حرکت ہوئی اور اس کے ساتھ ہی اس کی مرتی ہوئی آواز ایک کونے سے نکلی۔

''سیماں!''

''کیا ہے ماں؟''

''تم جاگ رہی ہو؟''

''نیند نہیں آتی ماں!''

''مجھے بھی نہیں آتی!''

''دیا جلاؤں؟'' سیماں نے پوچھا۔

بڑھیا نے تھوڑی دیر رک کر پوچھا۔ ''کیا وقت ہوگا' مرغ نے بانگ دی؟''

سیماں کو بہانہ مل گیا۔ اس نے اٹھ کر دریچی کھولا اور باہر دیکھنے لگی۔ چاند بادلوں کے ایک جھنڈ کے پیچھے چھپ گیا تھا۔ آسمان کے ایک کونے میں چند ستارے کرّہ ارض کے سکوت کو دیکھ کر ہنس رہے تھے۔ گاؤں کی کچی اور پکی راہیں چاند کی میلی روشنی اور رات کی پر ہول خاموشی میں زندگی کی راہوں کی طرح اُلجھی ہوئی نظر آ رہی تھیں۔ ویران کھیتوں کے ڈراؤنے پھیلاؤ سے غمناک نغمے ابھر کر کہیں دور ڈوب رہے تھے۔ رازِ کبریائی ہزاروں پردوں میں لپٹ کر اور پیچیدہ ہو گیا تھا اور پیچیدہ ہو رہا تھا...... ''نصف شب ہوگا۔'' سیماں نے ماں کی طرف دیکھ کر جلد جلد کہا۔ کیونکہ اس پر غیر تسلسل کھانسی کا دورہ پڑا تھا اور وہ زخمی کبوتری کی طرح میلی رضائی کے نیچے لوٹ رہی تھی۔ سیماں نے فوراً اس کے منہ کے سامنے دھول بھری کانگڑی رکھ دی جس میں بڑھیا چربی کے ٹکروں کی طرح سفید بلغم تھوکنے لگی۔ اس کی آنکھوں اور نتھنوں سے پانی بہنے لگا اور سیماں اپنے تازہ دھلے ہوئے ڈوپٹے سے اسے پونچھتی رہی۔ جب بڑھیا نے دم سنبھالا تو وہ ہانپ رہی تھی۔

''مجھے لیٹا دو بیٹی۔'' بڑھیا نے اسی ہانپتی ہوئی آواز میں کہا۔ ''آج تو میں مر ہی گئی تھی۔''

بڑھیا لیٹ گئی، کمرے میں تھوڑی دیر کیلئے سکوت چھایا رہا۔ سمیاں نے اٹھ کر کانگڑی کا بلغم دھول سمیت دریچہ سے باہر پھینکا۔ معاً اس کی نظر رادھا کے اُجڑے مکان کی طرف اٹھی جس کی چھت پر اخروٹ کا ایک لنڈ منڈ بوڑھا درخت جھکا ہوتھا اور اس وقت ایسا نظر آرہا تھا جیسے اس پر بھی غیر تسلسل کھانسی کا دورہ پڑا ہے اور وہ اپنا بلغم اسی چھت کی پھوس پر اگل رہا ہے۔ سیماں چونک اٹھی، چاند بادلوں سے نکل آیا تھا اور اسے مکان کے صحن میں مندر کے نزدیک کسی کا سایہ نظر آیا۔ اس کی آنکھیں پھیل گئیں۔ اسے دکھائی دیا جیسے رادھا اپنے بھگوان کے سر پر چنے ہوئے چاول اور پتیاں چڑھا رہی ہے اور بھگوان منہ اندھے پڑا رورہا ہے...... بے اختیاری کے عالم میں سیماں کے منہ سے رادھا نکلا۔......

بڑھیا نے گردن اوپر اٹھا کر حیرت میں پوچھا۔ "کیا ہے؟"

سیماں اسی طرف دیکھ رہی تھی، ایک گیدڑ مُڑ مُڑ کر دیکھتا ہوا صحن کی کچی دیوار کو پھلانگ کر بھاگ رہا تھا۔

سیماں نے ندامت محسوس کرتے ہوئے کہا۔ "کچھ نہیں ماں...... میں ڈر گئی تھی۔"

"ڈر گئی تھی؟" بڑھیا کے تھرتھراتے ہوئے الفاظ میں خوف تھا...... "تین بار تھوکو اور دریچہ بند کردو۔ کیوں کھول دیا تھا؟"

ایک ہلکی چیخ کے ساتھ سیماں نے دریچہ بند کر دیا اور اپنی چادر پر آبیٹھی۔

"زیادہ تو نہیں ڈر گئی؟" بڑھیا نے بے تابی ظاہر کر کے پوچھا۔

"نہیں ماں!"

"کیا دیکھا تھا؟"

"ایک گیدڑ تھا شاید جو مادھو کے صحن میں گھوم رہا تھا۔"

''تم سمجھی رادھا ہے......ہی ہی ہی......'' بڑھیا رضائی سے منہ نکال کر ہنسنے لگی۔ ''اب رادھا کہاں آئے گی بیٹی؟''

سیماںؔ چپ چاپ سنتی رہی۔ اس کے پیٹ میں ہلکا ہلکا درد اٹھ رہا تھا' جیسے وہ ہاتھ پھیلا کر سہلانے کی کوشش کر رہی تھی۔

''سو جاؤ......'' بڑھیا نے پھر کہا۔ ''خدا جانے آج تیلیوں کا مرغ بانگ کیوں نہیں دیتا' کھا گئے ہوں گے مردار خور''

سیماںؔ نے کوئی جواب نہ دیا۔ وہ آنکھیں میچ کر دیوار سے پیٹھ لگائے بیٹھی تھی......

''سو گئی تم؟''

سیماںؔ نے آنکھیں کھولیں......مجھ سے پوچھتی ہو ماں؟'' اس نے پوچھا اور پھر جواب کا انتظار کئے بغیر بولی۔ ہاں۔ سو گئی۔''

اس کے بعد بڑھیا نے کچھ بھی نہ کہا۔ مگر سیماںؔ خیالات کے سمندر میں بدستور تیرتی رہی۔ کبھی اس کی نگاہوں کے سامنے رادھاؔ آجاتی۔ کبھی عزیز......اور کبھی گاؤں کا گاؤں! اور باہر ستارے اور سیارے ایک ایک کر کے ڈوبتے رہے۔

جب صبح ہوئی تو کسی نے ان کے دروازے پر دستک دی۔ سیماںؔ کی آنکھ اس وقت لگ گئی تھی۔ مگر بڑھیا بیدار ہو چکی تھی۔ اس نے آواز سنتے ہی سیماںؔ کو پکارا۔ ''اری کوئی دروازہ کھٹکھٹا رہا ہے۔''

سیماںؔ ایک جھٹکے کے ساتھ چونک اٹھی......دروازے پر بدوستور دستک ہو رہی تھی۔

اس نے دریچہ کھولا......اور سہم کر پلٹ آئی......''ماں!''

بڑھیا اٹھ بیٹھی تھی......''کون ہے؟''

سیماںؔ کی سانس تیز تیز چل رہی تھی۔ اس نے ڈرتے ڈرتے کہا۔ ''کوئی بندوقچی ہے!''

''بندوقچی......؟ بندوقچی......؟'' بڑھیاں کی آواز میں بھی خوف کے مارے لکنت پیدا ہوگئی۔

''کیا وہ پھر آگئے......ہائے میرے اللہ!''

''ماں......صحن سے دستک کے بدلے آواز آئی۔''

''بڑھیا کے کان کھڑے ہوگئے۔ اری یہ تو عزیز کی آواز ہے......عزیزؔ ہوگا یہ......'' یہ کہہ کر وہ گھٹنوں کے بل دریچے کی طرف رینگنے لگی۔

''عزیز!......'' اُس نے رینگتے رینگتے کہا۔

''دروازہ کھولو ماں......''

سیماںؔ نے بڑھیا کے اوپر سے کھلے ہوئے دریچے سے دیکھا۔ ''وہی ہے ماں......وہی ہے۔'' وہ لپک کر دروازے کی طرف دوڑی......اسے کھولا اور سیڑھیاں پھلانگتی ہوئی نیچے پہنچی۔ عزیزؔ آگیا تھا......گاؤں میں یہ خبر آگ کی طرح پھیلی......عزیزؔ خاکی وردی میں ملبوس بندوق لے کر آگیا ہے۔ بوڑھے بچّے، عورتیں سب جمع ہوگئے۔

بچّے اُچھل اُچھل کر اپنے نرم و نازک ہاتھ بندوق پر پھیرنے لگے۔ ''ایک گولی چلاؤ، عزیزؔ کاکا، عزیز کاکا!'' وہ مطالبہ کرنے لگے۔ عزیز ان کی نادانی پر ہنستا رہا۔

بوڑھوں نے پوچھا۔ ''کیسے آگئے؟''

عزیز نے کہا۔ ''ہماری کمپنی ہندواڑہ کے محاذ پر لڑ رہی تھی، اب ہمیں دوسرے محاذ پر بھیجا گیا۔ میں نے سوچا، جاتے جاتے ذرا گھر کی بھی خبر لوں۔''

ارے تم لڑ رہے تھے؟" سب نے حیرانی سے پوچھا۔"

....

عزیز نے مسکرا کر کہا۔ "کیوں نہیں؟" پھر بندوق کی طرف اشارہ کر کے بولا۔ "میں نے اس سے تقریباً تیس لٹیرے موت کی نیند سلا دئے ہیں۔"

"تم نے؟ ارے تم نے ...... ہمارے عزیز کا کانے؟ عورتوں نے اس کی طرف دیکھ دیکھ کر اور مسکرا کر کہا۔"

بڑھیا کے چہرے کی جُھریاں اُبھر آئی تھیں۔ اس کی آنکھوں میں مسرت کی ہنسی کا ایک طوفان کروٹیں لے رہا تھا۔ اس کے عزیز نے تیس لٹیروں کو موت کی نیند سلا دیا تھا، ان لٹیروں کو، جن کا مقابلہ گاؤں میں کوئی نہ کر سکا تھا اور جو ہر چیز کو روندتے ہوئے آگے بڑھے تھے۔

سیماں کے ہونٹوں پر بار بار کوئی بات آتی تھی جسے وہ بزرگوں کی موجودگی میں ظاہر نہیں کر سکتی تھی۔ آخر کار اس نے چپکے سے ایک عورت کے کان میں کہا...... "ذرا اس سے پوچھو، رادھا کہاں ہے؟"

اس عورت نے پہلے سیماں کی طرف شک وشبہ کی نظروں سے دیکھا۔ پھر اسے شرمندہ کرنے کی نیت سے اونچی آواز میں عزیز سے بولی۔ "اسے کہو عزیز کا کا ...... مادھو بٹ کی رادھا کہاں ہے؟" عورتیں اور بچّے اس تمسّخر پر ہنس پڑے۔ مردوں کے ہونٹ ذرا ذرا پھیل گئے۔ بڑھیا نے گردن اٹھا کر سیماں کی طرف دیکھا اور عزیز نے بڑے اعتماد کے ساتھ کہا۔ "وہ بہت اچھی ہے، میں ان سے کبھی کبھی ملتا تھا۔ کہتے تھے۔ "ہم واپس آئیں گے......"

"کب آئیں گے؟" سیماں کے منہ سے بے اختیار یہ الفاظ نکلے اور اس کے ساتھ ہی وہ بیٹھی ہوئی عورتوں کی قطار کے پیچھے اپنا سر چھپانے لگی۔

عزیزؔ نے کہا۔ ہماری حکومت انہیں مکان بنانے کے لئے مفت لکڑی دے رہی ہے۔ برتن دے رہی ہے' اناج دے رہی ہے' کپڑے دے رہی ہے اور گاؤں سے گئے ہوئے سب لوگ ہندو' مسلمان اور سکھ اپنے اپنے گھروں کو لوٹ رہے ہیں۔

سیماںؔ یہ سن کر اچھل پڑی۔ اس کی نظریں خود بخود رادھاؔ کے مکان کی طرف اٹھیں۔ اسے محسوس ہوا جیسے اہرامؔ کا بت ہنس رہا ہے۔ بوڑھا درخت بھی ہنس رہا ہے اور اندھے منہ پڑا ہوا پتھر کا بھگوان بھی......

............☆☆☆............

اِمام صاحب

صُبح ہی سے پانی برس رہا ہے اور اِمام صاحب کھڑکی پر بیٹھے مایوس نگاہوں سے اپنی خستہ حال مسجد کو دیکھ رہے ہیں۔ جس کی کھڑکیاں بند ہیں، دروازہ بند ہے اور جو بارش میں ایسے نظر آرہی ہے جیسے کوئی مفلس بیمار شفاخانے کے باہر بھیگی ہوئی دیوار کے نیچے اُونگھ رہا ہو۔ مسجد کی چھت سے نہ جانے کتنا پانی اندر ٹپکا ہوگا، اس خیال کے آتے ہی امام صاحب تڑپ اٹھے۔ انہوں نے لاٹھی اٹھائی اور مسجد کی طرف گئے۔ ان کی بیوہ بیٹی جسے وہ خان نشین بنا چکے تھے ان کے پیچھے پیچھے ہولی اور اس کا بیٹا نیم عریانی کی حالت مین بے اختیار رونے لگا۔

امام صاحب نے مسجد کا دروازہ کھولا۔ چاروں چٹائیاں پانی سے بھیگ گئی تھیں، باپ بیٹی ایک دوسرے کی طرف ایسی نگاہوں سے دیکھنے لگے جیسے پوچھ رہے ہوں، اب کیا ہوگا، نمازی کہاں بیٹھیں گے؟ بیٹی نے جواب کا انتظار کئے بغیر چٹائیاں لپیٹ لیں اور دیوار کے سہارے کھڑی کیں۔ امام صاحب کو اطمینان سا ہوا۔ وہ دروازے کے باہر دوزینوں والی سیڑھی پر بیٹھ کر ستانے لگے۔ آج جمعہ تھا اور اسی دن انہیں پانچ چھ روپے کی آمدن ہوتی تھی۔ لیکن آثار بتا رہے تھے کہ آج کوئی بھی شخص نماز پڑھنے کے لئے نہیں آئے گا۔ اس خوف کا احساس باپ بیٹی کی آنکھوں میں جھلک رہا تھا مگر دونوں خاموش تھے۔ بڑھاپے اور جوان داماد کی بے وقت موت نے امام

صاحب کو زندہ دوگور کر دیا تھا۔ ان کی آنکھوں کی بینائی خراب ہو چکی تھی، توانائی نے جواب دے دیا تھا۔ لیکن بیٹی اور پوتے کی محبت انہیں زندہ رہنے پر مجبور کر رہی تھی۔ انہوں نے بیٹی کو دوسری شادی کرنے پر بہت زور دیا تھا۔ مگر بیٹی نے بوڑھے باپ کو بے آسرا چھوڑنا گوارا نہ کیا۔ ''یہ چند برس کے صبر کی بات ہے جب بچّہ ریشم خانہ کی مزدوری کے قابل ہو جائے گا۔'' اسی امید پر امام صاحب جی رہے تھے۔ ان کا بوڑھا اور افلاس زدہ دماغ وقت سے پہلے ہی بچے اور سارے خاندان کے مستقبل کے متعلق سنہرے جال بنا کرتا تھا۔

امام صاحب بدقسمتی سے کچھ زیادہ لکھے پڑھے بھی نہ تھے۔ بچپن میں انہوں نے قرآنِ مجید کا درس لیا تھا اور حدیث کی موٹی موٹی باتیں حفظ کی تھیں۔ یہی ان کا سرمایہ تھا۔ فطرتاً وہ کم گو اور تنہائی پسند تھے۔ شاید اس لئے کہ انہوں نے ضرورت سے زیادہ زمانے کا اتار چڑھاؤ دیکھا تھا۔ شروع ہی سے غم اور افلاس، بھوک اور عریانی اب ان کا سارا اثاثہ خستہ حال مسجد کی امامت تھی جو شہر کے بالائی حصّے میں انہوں نے اپنے ہی مکان کے صحن میں بنوائی تھی اور جہاں چند سرکاری دفتروں کے ملازم اور راہ گیر ہر جمعہ کو نماز پڑھنے آیا کرتے تھے انہیں باپ کی طرف سے ایک پرانا چوغہ وِرثے میں ملا تھا۔ پشمینے کا بنا ہوا جس پر کہیں کہیں ریشم کی کشیدہ کاری تھی۔ اس میں ہر چند بے شمار سوراخ تھے مگر امام صاحب اسے کبھی نہ پہنتے تھے۔ یہ صرف جمعہ کو مسجد کے اندر کھونٹے پر لٹکایا جاتا تھا۔ لوگ نماز ادا کرنے کے بعد اس کی جیبوں میں کچھ نہ کچھ ڈال دیا کرتے تھے۔ جب مسجد خالی ہو جاتی تو وہ آہستہ سے چوغا اٹھاتے اور لاٹھی ٹیکتے ہوئے چلے جاتے، چوغے کی جیبوں کے وزن سے وہ اندازہ لگا سکتے تھے کہ اس میں کتنے کی ریزگاری ہوگی جو کسی بھی صورت میں چھ سات روپے سے زیادہ نہ نکلتی۔ دونیاں، چونیاں، آنے، ٹکے اور بعض اوقات ایک آدھ نوٹ بھی روپے کا، جس پر تین

شیروں کی چھاپ ہوتی۔ اسی ریزگاری سے گھر کے اخراجات پورے ہوتے۔

کچھ دیر سستانے کے بعد امام صاحب دو زینوں والی سیڑھی سے اٹھے اور آہستہ آہستہ اوپر چلے گئے، ان کا دل ڈوبا جا رہا تھا، اگر آج نماز کے لئے کوئی نہ آیا تو......

گیارہ بجے کے قریب بارش رُک گئی اور آسمان پر پھیلے ہوئے بادل میں بڑے بڑے شگاف پڑ گئے۔ امام صاحب کی جان میں جان آ گئی، ان کی آنکھیں ناچنے لگیں، ہونٹ لرزنے لگے، ان میں جیسے نئی جوانی عود کر آئی۔ ''مہری'' انہوں نے پکارا۔ ''بادل چھٹ رہے ہیں، جا کر مسجد میں چٹائیاں بچھا دو۔''

مہری نے کھڑکی سے سر نکال کر دیکھا۔ واقعی بادل چھٹ رہے تھے اور آسمان صاف ہو رہا تھا۔ امام صاحب سے اب نہ رہا گیا۔ وہ چوغہ اٹھا کر پھر نیچے آ گئے۔

مسجد میں چٹائیاں بچھ گئی تھیں۔ وہ اب بھی گیلی تھیں۔ لیکن اس کا کیا ہے جو لوگ خُدا کے حضور میں جھکتے ہیں وہ سردی اور گرمی سے بے نیاز ہوتے ہیں۔

ایک بجے کے قریب نمازی آنے لگے۔ امام صاحب نے کھونٹے پر چوغہ لٹکا یا۔ آنے والے سب جانے پہچانے تھے۔ ڈاک خانہ کا کلرک، تار گھر کے بابو، بنک کے ملازم، آس پاس کے چند ہانجی اور دوسرے لوگ سب کی زبان پر بارش کی شکایت تھی۔ اگر کچھ دیر اور جاری رہتی تو شاید نماز بھی ادا نہ ہو سکتی۔

امام صاحب امامت کے لئے کھڑے ہو گئے۔ ان کے پیچھے دو قطاریں لگ گئیں اور قطاروں کے پیچھے جوتوں اور بوٹوں کی قطار......

نماز ادا ہو گئی۔ مسجد سے نکلتے نکلتے کئی ہاتھ کھونٹے پر لٹکتے ہوئے چوغے کی جیب میں گئے۔ لیکن کچھ ایسے بھی تھے جو جوتے پہن کر مسجد سے نکلے۔ مام صاحب کی

نگاہیں ایسے لوگوں کا تعاقب دور تک کرتی رہیں۔

تھوڑی دیر بعد مسجد خالی ہوگئی۔ اِدھر اُدھر دیکھنے کے بعد امام صاحب نے کھونٹے سے چوغہ اتارا۔ مسجد کا دروازہ بند کیا اور گھر کی طرف چلے گئے۔ آج چوغے کی جیبیں انہیں ہلکی محسوس ہوئیں۔ ان کا دل غوطے کھانے لگا۔ مہرؔی کھڑکی پر بیٹھی مسکرا رہی تھی۔ لیکن باپ کے چہرے پر مایوسی دیکھ کر اس کی مسکراہٹ فوراً ایک یاس انگیز سنجیدگی میں بدل گئی۔ اس نے کچھ پوچھنا مناسب نہ سمجھا' کیونکہ اسے معلوم تھا کہ چوغے کی جیبوں سے جو کچھ نکلتا ہے' امام صاحب گننے کے بعد اسے طاقچے پر رکھ دیتے ہیں۔

امام صاحب نے جوتی اتاری' لاٹھی ایک طرف کو رکھ دی اور کھڑکی کے برابر بیٹھ گئے۔ انہیں بہت ملال تھا کہ کچھ نمازی چوغے کا خیال کئے بغیر ہی چل دیئے تھے ایسے لوگوں کو نہ خُدا کا خوف ہوتا ہے نہ اوروں کی مفلسی سے ہمدردی مگر یہ ہو بھی کیسے سکتا ہے' دُنیا نفسا نفسی کا دوسرا نام ہے۔

تھوڑی دیر کے بعد امام صاحب کا کانپتا ہوا ہاتھ چوغے کی جیب ٹٹولنے لگا دائیں جیب سے وہی نکلا جس کا نداز انہوں نے لگایا تھا' تین روپے ساڑھے بارہ آنے۔ دوسری جیب بالکل ہلکی تھی۔ پھر بھی امام صاحب نے اپنا کانپتا ہوا ہاتھ اس میں ڈالا۔ اس میں سے ایک بڑا نوٹ نکلا۔ امام صاحب ہکا بکا رہ گئے۔ کچھ لمحوں تک وہ فیصلہ ہی نہ کر سکے کہ یہ کیا ہے اور کیسے آ گیا۔ ان کی آنکھوں کے آگے اندھیرا چھا گیا۔ انہوں نے گھبرا کر بیٹی کو آواز دی...... یہ دیکھ رہی ہو' جیب سے نکلا ہے۔

مہرؔی نوٹ لیا۔ اسے الٹ پلٹ کر دیکھنے کے بعد بولی۔ ''نوٹ ہے لیکن میں نے آج تک اتنا بڑا نوٹ نہیں دیکھا ہے۔''

''آج کے نوٹ نئے ہوتے ہیں بیٹی۔ یہ پرانا ہے' انگریز کی تصویر نہیں دیکھ

رہی ہو؟'' امام صاحب نے کہا۔

''اس سے کیا ہوتا ہے، نوٹ ہی تو ہے'' بیٹی نے بضد پوچھا۔

''تم نہیں جانتی۔ اب انگریز کہاں' جو ان کا سکہ چلے' انہیں تو ملک سے نکال دیا گیا ہے۔'' امام صاحب نے بڑی سنجیدگی کے ساتھ کہا۔

''تب......؟'' مہری سر سے پاؤں تک ایک سوال بن گئی۔

''کسی نے مذاق کیا ہے، جیب میں کھوٹا نوٹ ڈال دیا۔''

''ان لوگوں کو خدا کا خوف بھی نہیں رہا۔'' مہری نے کہا۔ ''مسکینوں سے بھی مذاق کرتے ہیں۔''

''زمانہ بہت بُرا ہو گیا ہے بیٹی۔''

''کسی کو تو دکھا دو' شاید چل جائے۔ مہری نے کہا۔''

امام صاحب چونک پڑے' ان کے ہونٹوں پر تھرتھری سی چھا گئی...... کیا کہا کسی کو دکھا دوں' جانتی بھی ہو' کھوٹا نوٹ رکھنا بہت بڑا جرم ہے جسے دکھادوں گا' وہی کلائی پکڑ کر تھانے پہنچا دے گا۔

مہری کانپ اٹھی۔ ایک بار اس کے مرحوم شوہر کو پولیس کسی الزام میں پکڑ کر لے گئی تھی' آٹھ دن تک مار پیٹ ہوئی۔ پھر پچاس روپے دے کر گلو خلاصی ہوئی۔

مہری کچھ اور نہ کہہ سکی۔ نوٹ اس کے ہاتھ سے چُوٹ کر فرش پر گر گیا۔ اور وہ اٹھ کر چلی گئی۔ اس کی آنکھوں میں آنسو تھے اور گلا بھرا ہوا تھا۔ چند لمحوں کے بعد امام صاحب نے پھر نوٹ ہاتھ میں اُٹھایا اور اسے بڑی توجہ سے دیکھتے۔ کاش یہ نوٹ آج سے چھ برس پہلے ان کے چوغے کی جیب سے نکلا ہوتا تو گھر کے کتنے ہی اخراجات پورے ہو جاتے۔ مہری کے لئے کریپ کا پیرہن اور شلوار آتا' مسجد کی مرمت ہوتی' بچے کا ختنہ ہوتا اور دودھ کے لئے بکری آجاتی۔ مگر آج اتنی چھاپوں اور اتنے نشانوں

کے باوجود یہ نوٹ ایک کاغذ کے پرزے سے زیادہ حقیقت نہ رکھتا تھا۔ کیونکہ انگریز جا چکے تھے، ان کا سکہ جا چکا تھا، ان کی عمل داری جا چکی تھی...... یہ سب کچھ کیسے ہوا۔ یہ بات امام صاحب کی سمجھ میں نہ آتی تھی۔ اسے محسوس ہوا جیسے نوٹ پر چھپی ہوئی تصویر یہ کہہ رہی ہے، اس میں میرا کیا قصور ہے، قصور ان کا ہے جنہوں نے میرے سکے اور میری حکومت کا خاتمہ کیا اور ملک کے لئے آزادی مانگی۔

امام صاحب کے دل میں نفرت کی ایک ہلکی سی لہر اٹھی۔ ان کی آنکھوں کے سامنے پچھلی جنگ کا زمانہ پھرنے لگا، جب بنڈ پر انگریز ہی انگریز نظر آتے تھے۔ خوش اور خورم، ٹماٹر کی طرح لال اور چکنے، جو پانی کیطرح دولت خرچ کرتے تھے مگر اب...... اب تو کچھ بھی نہیں۔ بنڈ پر نہ چہل پہل ہوتی ہے نہ قہقہے سنائی دیتے ہیں۔ وہ کسی افیونی کی طرح لیٹا ہوا ہے اور لوگ خاموشی سے اسے روندتے ہوئے چلے جاتے ہیں۔ افیونی نہ حرکت کرتا ہے نہ احتجاج۔ جیسے اس کی غیرت ہی مر چکی ہے۔

کانونٹ کے کلاک نے چار بجائے۔ امام صاحب ریز گاری کو طاقچے پر رکھ کر اٹھے۔ ان کے ہاتھ میں نوٹ تھا۔ انہوں نے مذاق کرنے والے کا کھوج لگانے کا عزم کیا۔ مگر جب وہ کچے پُل پر پہنچے تو ان کے قدم خود بخود رُک گئے۔ سوچنے لگے، کہاں تلاش کروں کس سے پوچھوں۔ پھر بھی وہ آہستہ آہستہ سے بنڈ پر آ گئے۔ اور نئی چنی ہوئی پست دیوار کے سہارے بیٹھ گئے۔ اس امید پر کہ شاید مذاق کرنے والا خود بخود معافی مانگنے کے لئے آ جائے۔ امام صاحب اس سے جھگڑا نہیں کریں گے، البتہ یہ ضرور کہیں گے کہ ایسے لوگوں سے مذاق نہیں کرتے جن کی روحیں تک غم اور افلاس میں ڈوبی ہوئی ہوں۔

شام تک کوئی نہ آیا۔ ویسے جانے پہچانے لوگ سلام علیک کہہ کر چلے گئے مگر کسی نے نوٹ کا نام نہ لیا۔

دیے کی ٹمٹماتی ہوئی روشنی میں بھی امام صاحب یہی سوچتے رہے اور جب وہ بجھ گئی اور میلی سی چاندنی کمرے کی ایک کھڑکی سے اندر داخل ہوئی تو امام صاحب کھڑکی پر آبیٹھے۔ ان کے پاس ایسی چیز تھی جو وہ نہ کسی کو دکھا سکتے تھے۔ نہ اپنے پاس رکھ سکتے تھے۔ اسے ضائع کرنا بھی انہیں گوارا نہ تھا۔ ممکن ہے کبھی کبھار مذاق کرنے والے کا پتہ چل جائے' اسی سوچ میں رات نکل گئی۔ ان کے پپوٹے بوجھل ہو گئے تھے ان کا انگ انگ ٹوٹ گیا تھا' پھر بھی وہ صحن میں آکر کسی کا انتظار کرنے لگے۔ کبھی ٹیلے پر کبھی مسجد کے اندر چلے جاتے کبھی آنکھوں کا خمار کم کرنے کے لئے منہ ہاتھ اور پاؤں دھو لیتے۔

معاً دوپہر کے بعد ان کے دل میں ایک خیال آ گیا۔ انہوں نے نوٹ کو پیرہن کی جیب میں چھپایا' لاٹھی ٹیکتے ہوئے نکلے۔ پل کو عبور کیا۔ بنڈ پر چڑھے اور بنک کی طرف چلے گئے۔ وہاں ان کا ایک مرید تھا جو ہر جمعہ کو مسجد میں نماز پڑھنے آیا کرتا تھا' ہر چند وہ کل نہیں آیا۔ تاہم امام صاحب کو اس پر کامل بھروسہ تھا۔

بنک میں کافی بھیڑ تھی' سنیچر کی وجہ سے بنک ایک آدھ گھنٹے کے بعد بند ہو رہا تھا اور لوگ بنک بند ہونے سے پہلے ہی فارغ ہونا چاہتے تھے۔

دروازے پر سنتری نے امام صاحب کو روکا۔ ''بابا یہاں کچھ نہیں ملے گا۔ یہ بنک ہے۔''

امام صاحب نے اوپر سے نیچے تک اپنے آپ کو دیکھا اور پھر ایک نامحسوس ندامت کے جذبے سے متاثر ہو کر کہا...... ''میں گداگر نہیں ہوں' مرید سے ملنا چاہتا ہوں''

سنتری انہیں حیرت سے دیکھتا رہا۔ شاید اسے اعتبار نہ آیا' پھر بھی اس نے مزاحمت نہ کی اور امام صاحب پھونک پھونک کر قدم اٹھاتے ہوئے اندر چلے گئے۔ وہ

اتنی بھیڑ اور اتنے روپے دیکھ کر حیران رہ گئے۔ ساتھ ہی انہیں یہ خوف بھی لاحق ہوا کہ کہیں کوئی ان کی جیب میں کھوٹا نوٹ نہ دیکھ لے۔ وہ پریشانی کے عالم میں اِدھر اُدھر دیکھتے رہے کہ اچانک دور سے آواز آئی...... ''امام صاحب!''

امام صاحب کا دل ربڑ کی گیند کی طرح اُچھلنے لگا۔ انہوں نے آنکھوں کے اوپر داہنا ہاتھ پھیلا کر دیکھا۔ ان کا مرید انہیں بلا رہا تھا۔

''آپ یہاں کیسے امام صاحب؟'' وہ کونٹر سے باہر نکل کر پوچھنے لگا۔

کچھ لمحوں تک امام صاحب کچھ بھی نہ کہہ سکے۔ پھر انہوں نے مرید کا ہاتھ تھام لیا اور کچھ کہے بغیر بنک سے باہر لے گئے۔

''خیر تو ہے امام صاحب؟'' اس نے پھر پوچھا

''خیر ہے ایک کام آپڑا ہے۔'' امام صاحب نے آہستہ سے کہا۔ ان کا دایاں ہاتھ خود بخود پیرہن کی جیب میں گیا۔ ''کل کسی کم بخت نے کھوٹا نوٹ دیا ہے وہی دکھانے آیا ہوں۔''

''کھوٹا...... ؟ کتنے کا ہے......؟''

امام صاحب کا دل پھر دھڑکنے لگا۔ انہوں نے کہا۔ ''دکھا دوں گا، لیکن کسی سے نہ کہنا۔ میں پولیس سے بہت ڈرتا ہوں۔''

مرید ہنس کر کہا۔ ''وہاں تک بات ہی نہ پہنچے گی، آپ دکھایئے تو......'' امام صاحب نے اس کی ٹھوڑی چھو کر منت کی۔ ''میرے بڑھاپے پر رحم کرنا۔'' ''آپ یہ کیا کر رہے ہیں امام صاحب؟ آپ مجھ پر بھروسہ کیجئے۔ مرید نے ہمت دلاتے ہوئے کہا۔

امام صاحب کانپتے ہوئے ہاتھوں سے مرید کے ہاتھ میں نوٹ تھما دیا۔

''یہ......؟ یہ تو سو روپے کا نوٹ ہے امام صاحب۔''

''سو روپے کا۔۔۔۔؟'' امام صاحب کی آنکھیں پھیل گئیں۔

''ہاں ہاں سو روپے کا' مگر یہ کھوٹا نہیں۔ مرید ہنس کر کہا۔''

''کھوٹا نہیں۔۔۔۔؟ یہ کیسے ہوسکتا ہے۔'' امام صاحب سوچنے لگے۔ پھر انہوں نے جلد جلد پُوچھا۔'' مگر اس پر انگریز تصویر ہے۔ یہ کھرا کیسے ہوسکتا ہے۔''

''یہ باتیں آپ نہیں سمجھ سکتے' آپ یہیں ٹھہریئے۔'' مُرید نوٹ ہاتھ میں لیکر اندر چلا گیا۔ امام صاحب کی نبضیں چھوٹنے لگیں۔ وہ اوپر سے نیچے تک پسینے میں شرابور ہوگئے۔ اطمینان دلائے جانے کے باوجود انہیں محسوس ہونے لگا جیسے ابھی ان کے ہاتھوں میں ہتھکڑیاں پڑنے والی ہیں۔ ابھی پولیس کے سپاہی انہیں گھسیٹ گھسیٹ کر تھانے کی طرف لے رہے ہوں گے۔ پھر مار پیٹ ہوگی۔ سوالات پوچھے جائیں گے۔ یہ نوٹ کہاں سے آیا' کب آیا' کیوں آیا'......اور ان باتوں کا جواب امام صاحب کے پاس کچھ بھی نہ تھا۔

انہوں نے بنک سے بھاگنے کا بھی قصد کیا اور ابھی پھاٹک تک ہی پہنچے تھے کہ پیچھے سے مرید نے پکارا۔ ''امام صاحب!''

امام صاحب کے قدم رک گئے۔ مرید نے نزدیک آکر ایک ایک روپے والے سو نوٹوں کا نیا بنڈل ان کے ہاتھ میں تھما دیا۔ ''یہ لیجئے امام صاحب' آپ کا کھوٹا نوٹ بنک نے رکھ لیا ہے۔''

امام صاحب اتنے نوٹ لینے سے گھبرائے۔ بڑی مشکل سے انہوں نے ہاتھ پھیلا دیا اور بنڈل لے لیا۔

مرید نے ہنس کر پوچھا'' مگر یہ نوٹ دیا کس نے تھا؟''

امام صاحب نے اپنے حواس بجا کرتے ہوئے جلد جلد کہا۔'' دیا کسی نے نہیں یہ اپنا ہی ہے......بالکل اپنا......''

یہ کہہ کر وہ واپس چلے آئے۔ بنڈ پر پہنچ کر انہوں نے کھدر کی چادر سے اپنا سر ڈھانپ لیا اور تیز تیز مقدم اٹھاتے ہوئے چلے گئے۔ آتی بار یہ راستہ چند لمحوں میں طے ہوا تھا۔ مگر اب جیسے یہ راستے لمبے ہو رہے تھے، ان کا دل دھڑک رہا تھا، ہاتھ پاؤں کانپ رہے تھے۔ وہ بچ بچ کر چل رہے تھے کہ کوئی انہیں پہچان نہ لے۔

گھر پہنچ کر انہوں نے رازدارانہ لہجے میں کہا۔ ''مہری، نوٹ کھرا تھا...... یہ دیکھ لو۔'' مہری نے نوٹوں کا بنڈل دیکھا تو خوشی سے دیوانی ہوگئی اور امام صاحب نے جلد جلد کہا۔ ''اب کوئی مجھ سے ملنے آئے تو کہہ دینا امام صاحب گھر میں نہیں ہیں، گاؤں چلے گئے ہیں، نہ معلوم کب واپس آجائیں گے۔''

مہری نے حیران ہو کر باپ کی طرف دیکھا اور امام صاحب نے پھر کہا۔

''خبردار کسی کو یہ نہ کہنا کہ میں یہیں ہوں۔ بچے کو بھی منع کر رکھنا۔''

''تو کیا آپ سچ مچ گاؤں چلے جائیں گے؟'' مہری نے پوچھا۔

''نہیں، گاؤں میں میرا کون ہے''۔ امام صاحب نے جواب دیا۔ کمرے کی کھڑکی بند کی اور چادر اوڑھ کر سو گئے......

............☆☆☆............

سنکرات

"ستیو!"

میں نے غیر ارادی طور پر آواز دی اور دوسرے لمحے میں پانچ چھ برس کی ایک ننھی سی لڑکی لال کپڑے کا چیتھڑا اوڑھے میرے سامنے کھڑی ہوگئی۔

"پانی پیو گے......؟" اس نے پوچھا۔

"پانی؟" میں جیسے چونک پڑا۔ "ہاں پیوں گا......مگر ٹھنڈا۔"

ستیو چلی گئی اور میں ہانپتے ہوئے گھوڑے کی طرح، جو لمبا سفر کاٹ کر منزل پر پہنچا ہو، کھاٹ پر دراز ہوگیا۔ اُف! آج کس قدر گرمی ہے اور پھر جموں کی گرمی، جہاں دوپہر کے بعد ہر گول پتھر ایک آفتاب بن جاتا ہے اور ہر مکان ایک مکمل قید خانہ، تاوقت یہ کہ سورج اردگرد کی ننگی اور غیر جذباتی پہاڑیوں کے پیچھے نہ چلا جائے۔

تھوڑی دیر کے بعد ستیو پانی کا گلاس لے کر آ گئی اور میرے سامنے بے حس وحرکت کھڑی ہوگئی۔ میں نے اسے دیکھا۔ اس کا معصوم چہرہ پسینے سے شرابور تھا۔ سر کے بال بے ترتیبی میں ایک دوسرے سے الجھے ہوئے تھے اور ہونٹوں کے کناروں پر کالی لکیر سی چمک رہی تھی۔ میں نے اس کے ہاتھ سے گلاس لے لیا اور ایک ہی سانس میں پی گیا۔

''آج کتنی گرمی ہے ستیو؟''

ستیو کے ہونٹوں پر ہلکی سی مسکراہٹ پھیل گئی جس میں طنز کا پہلو زیادہ تھا اگر وہ کچھ بڑی ہوئی تو شاید نہایت بے باکی سے کہتی۔ ''گرمی ہے تو کیا ہوا، تم کشمیری دھوپ سے کیوں ڈرتے ہو مجھے دیکھو، کام بھی کرتی ہوں اور خوش بھی ہوں۔'' لیکن وہ صرف پانچ چھ برس کی بچی مسکرانے کے سوا کچھ بھی نہیں جانتی۔ وہ پھر کھاٹ پر پڑے ہوئے انگریزی رسالے کو دیکھنے لگی جس کے سرورق پر بچوں کی ایک رنگین گروپ تصویر تھی۔ خُدا جانے وہ اس گروپ میں کسے ڈھونڈنے لگی، کسے پہچاننے لگی۔ مجھے محسوس ہوا کہ اس کے ہونٹوں کی سیاہ لکیر، بالوں کی الجھن اور معصوم چہرے کا پسینہ سوکھتا جارہا ہے اور اس کی جگہ نیا خون اور نئی دھڑکنیں لے رہیں۔

معاً میری طرف دیکھ کر اس نے پوچھا۔''یہ بچے کس کے ہیں......؟ تمہارے؟ میں اپنی ہنسی روک نہ سکا۔''پگلی! یہ میرے بچے نہیں، امریکہ کے ہیں۔ جانتی ہو امریکہ کہاں ہے؟

ستیو نے ہنس کر نفی میں سر ہلا دیا اور میری طرف کریدنے والی نظروں سے دیکھنے لگی۔

دوسرے کمرے سے ایک گھمبیر آواز نے اسے بلایا اور وہ خالی گلاس ہاتھ میں لے کر چلی گئی۔

''کہاں مرتی رہی اتنی دیر؟''

ستیو شاید خاموش رہی یا یونہی مسکراتی رہی۔ آخر پانچ چھ برس کی بچی اس کے سوا جانتی ہی کیا تھی۔

''دیکھ، میں لیٹتی ہوں، ذرا پنکھا جھیل، کہیں اٹھ کر نہ چلی جانا۔''

اور دوسرے لمحے رسیوں کے کھنچے اور پردوں کے ہلنے کی آواز آنے لگی اور

لیٹی ہوئی بھاری بھرکم عورت کروٹ بدلتی ہوئی اپنے آپ سے کہتی رہی......"ہائے رام، آج کتنی گرمی ہے!"

غیر معمولی شدتِ حرارت کے سبب میں بھی نہ سو سکا۔ تڑپتا رہا، جھلستا رہا۔ کمرے کے درو دیوار سے آگ کی لپٹیں آ کر میرے بدن کو چھو لیتی تھیں اور نکل جاتی تھیں۔ انگریزی رسالہ ابھی تک کھاٹ پر پڑا تھا جس کے سرورق پر ہنستے بچوں کی گروپ تصویر تھی اور جنہیں دیکھ کر ستیو نے پوچھا تھا۔"یہ بچے کس کے ہیں......؟ تمہارے؟ شاید اس نے ان بچوں کو مجھ سے اس لئے وابستہ کیا تھا کہ جون کی دوپہر کو میں ٹانگیں پھیلائے کھاٹ پر دراز تھا اور پانچ سالہ ننھی نوکرانی مجھے لمحہ بہ لمحہ پانی پلانے پر مامور تھی۔ لیکن اگر مالکن نہ بلاتی تو میں اس سے کہہ دیتا۔"یہ میرے بچے نہیں ہیں ستیو، یہ امریکہ کے بچے ہیں جہاں جموں کے گول اور چکنے پتھروں کی طرح سونے اور چاندی کی اینٹیں ہوتی ہیں جہاں کے بچے نہ کھاٹ پر دراز آدمیوں کو پانی پلاتے ہیں 'نہ بھاری بھرکم عورتوں کے پنکھے جھلتے ہیں' جہاں نہ ہونٹوں پر سیاہ لکیریں ہوتی ہیں اور نہ پلکوں کے نیچے چھپی ہوئی کریدنے والی نظریں، جہاں کے سماج میں ابھی اتنے بڑے سوراخ نہیں کہ کسی کے ارمان زندگی بھر ان سے سر ٹپکتے رہیں، بہتے رہیں اور کوئی ان کا درد و کرب اپنی پسلیوں میں محسوس نہ کرے، لیکن تمہیں ان باتوں سے کیا؟ تو نوکرانی ہے، اس بھاری بھرکم عورت کی جسے تجھے ڈانٹنے' مارنے اور بیچ کھانے تک کا حق ہے، سماج میں صرف اس لئے قابل عزت ہے کہ وہ جائداد کے کرائے سے ہزاروں روپے کما کر پانچ چھ برس کی ننھی اور معصوم لڑکیوں کو نوکر رکھ سکتی ہے......لیکن ستیو دوسرے کمرے میں تھی، رسیوں کے کھینچنے اور پردوں کے ہلنے کی آواز اب مدھم پڑ گئی تھی اور گرمی کے سبب میرے دماغ میں ابلا ہوا لاوہ یا تو ٹھنڈا ہو کر منجمد ہونا چاہتا تھا یا پھٹ پڑنے کے لئے کسی کمزور جگہ کی تلاش کر رہا تھا۔

میں' اٹھا' مجھے پھر پیاس لگی' دو ایک بار ستیو کو بلایا۔ جب نہ آئی تو برآمدے سے ہوتا ہوا حوض کی طرف گیا۔ دوسرے کمرے کے دروازے سے دیکھا' ستیو پنکھے کی رسی ہاتھ میں لئے اوندھے منہ فرش پر پڑی تھی اور اس کی مالکن اس سے پرے پلنگ پر گرمی کے خلاف احتجاج کرتی ہوئی لیٹ گئی تھی' بظاہر اسی دنیا میں جہاں اس وقت مالکن اور ستیو پہنچ چکی تھیں۔ ان کے درمیان کوئی فاصلہ نہ تھا' لیکن جسمانی طور پر ستیو کے ہاتھ میں پنکھے کی رسی تھی اور ہونٹوں کے کناروں پر سیاہ لکیر......کون جانے اس دنیا میں ایسی لکیریں کہاں کہاں نمایاں ہیں؟......اور کہاں کہاں پوشیدہ!

میں تھوڑی دیر کے لئے دروازے پر ٹھہرا اور دونوں کو دیکھتا رہا۔ ستیو کا میلا کرتا پسینے سے بھیگ چکا تھا' لال چیتھڑا گردن میں پھانسی کا پھندا سا بن گیا تھا اس کی مالکن پنکھے کی ہوا کا دلنواز لمس محسوس کرتی ہوئی سوگئی تھی اور اب تک محسوس کر رہی تھی' شاید وہ نہیں جانتی تھی کہ تھوڑی دیر پنکھا جھلنے کے بعد ستیو اپنے فرض سے بھٹک گئی ہے اور اب در و دیوار سے آگ کی لپٹیں آ آ کر اس کے بدصورت مگر قیمتی بدن کو چھو کر نکلنے لگی ہیں۔

میں پانی پی کر واپس آ گیا' بھاری بھرکم عورت جاگ اٹھی تھی اس کی آنکھوں میں انگارے دہک رہے تھے......ستیو!

ستیو بدستور سوتی رہی۔

"او ستیو......" اس نے دوبارہ آواز دی۔

ستیو آنکھیں ملتی ہوئی اٹھ بیٹھی اور بے اختیاری کے عالم میں رسیوں کو کھینچنے لگی۔

"سوگئی تھی خصماں کھانی......؟" مالکن نے اسی انداز میں پوچھا۔

ستیو کی پلکیں تیز تیز جھپکنے لگیں۔ اس نے کتنا بڑا جرم کیا تھا اور پھر پکڑی بھی

گئی تھی۔

''نیند آتی ہے تو پھر ماں کے پاس جا...... جو کتیاں کی طرح میگھ کے ساتھ بھاگ گئی تھی۔''

اس بار ستیو نے برآمدے کی طرف دیکھا جہاں میں اینٹوں کی پست قامت دیوار کے ساتھ کھڑا تھا۔ اس نے مجھے دیکھا' ایسی نظروں سے جو کہہ رہی ہوں یہ غلط ہے۔ میری ماں کُتیا نہیں' کُتیا اپنے بچوں کو بھول جاتی ہے' پر میری ماں ہر ماہ کی سنکرات کو گلی کے نکڑ پر مجھے ملتی ہے' میں اپنی تنخواہ کا ایک روپیہ اس کے ہاتھ میں رکھ دیتی ہوں اور وہ میرا ماتھا چوم کر چلی جاتی ہے...... یہ غلط ہے...... وہ کُتیا نہیں''۔

چار بجے کے قریب ستیو میرے کمرے میں آ گئی۔ اس کی پتلیوں میں لال لال ڈورے سے تیر رہے تھے' ہونٹوں کی سیاہ لکیر موٹی ہو گئی تھی' وہ تپائی سے ماچس کی ڈبیا اٹھا کر جانے لگی۔ تو میں نے اس کا ہاتھ تھاما۔

''مارا ہے؟'' میں آہستہ سے پوچھا۔

''نہیں تو...... اس نے کہا اور مسکرانے لگی۔ میں اس کی بے مطلب مسکراہٹ پر کٹ گیا۔ مجھے اس وقت اس کی روح بہت پاکیزہ نظر آئی جس کے اوپر گوشت اور پوست کا میلا سا خول چڑھ گیا تھا۔''

میں نے اس کے سر پر ہاتھ رکھ کر ہمدردی کے لہجے میں پوچھا۔ ''کشمیر چلو گی؟''

ستیو نے مسکراہٹ کے اسی انداز میں کہا۔ ''نہیں۔''

''کیوں؟''

''ماں نہیں جانے دے گی۔''

''کہتے ہیں وہ بھاگ گئی ہے۔''

ستیو دوبارہ مسکرائی، بولی۔ "اب آ گئی ہے اور وہاں...... رہاڑی کے پار رہتی ہے۔"

"تو اس سے پوچھ لیتے ہیں۔"

"ہاں مگر سنکرات کے دن، جب وہ تنخواہ کے لئے گلی میں آئے گی۔"

میں دورے سے ایک ہفتے کے بعد واپس آ گیا۔ کمرے کا دروازہ کھولتے ہی میں نے ستیو کو آواز دی۔ وہ میری پہلی ہی آواز پر میرے سامنے پتھر کے بت کی طرح کھڑی ہو جاتی تھی، یا بے مطلب مُسکرانے لگتی تھی۔ پر آج کئی بار بُلانے کے باوجود وہ غائب ہو گئی تھی، حالاں کہ وہ جانتی تھی کہ میں دورے سے اس کے لئے آم لانے کا وعدہ کر چکا ہوں۔

میرے دل میں کئی طرح کے وسوسے پیدا ہو گئے۔ شاید گھر سے اسے جواب دیا گیا ہے، شاید رہاڑی کے پار رہنے والی ماں اسے لے گئی ہے، شاید وہ نوکری چھوڑ کر کہیں چلی گئی ہے۔ اگر ایسا ہی ہو تو کیا ہو گا؟ بھاری بھر کم عورت کا پنکھا دوپہر کے بعد کون جھولے گا؟ مجھے کون پانی پلاتا رہے گا، برآمد میں کون جھاڑ و پھیرا کریگا؟

میں کپڑے بدل کر دوسرے کمرے کے دروازے پر کھڑا ہو گیا۔ ستیو کی مالکن چارپائی پر دراز تھی۔

"ستیو کہاں ہے؟" میں نے پوچھا۔

"ستیو؟" اس نے اپنی گردن اونچی کی اور کہا۔ "ہاں وہ بیمار ہے۔"

"بیمار ہے؟ میں نے حیرت سے پوچھا۔"

"ہاں، رام جانے کیا روگ ہے؟ آج چار دن سے بخار نہیں ٹوٹتا۔" عورت نے بے پروائی سے کہا دوبارہ لیٹ گئی۔

میں اس کوٹھری کی طرف گیا جہاں ستیو تھی اور جہاں وہ کبھی کبھی مالکن کی

نظریں بچا کر ٹوٹے ہوئے شیشے کے ٹکڑے میں اپنا منہ دیکھتی تھی اور بال سنوارا کرتی تھی، ہر چند اس پر اسے کئی بار پیٹا گیا تھا لیکن بقول مالکن وہ کتے کی دم تھی جو ہمیشہ ٹیڑھی ہی رہنے کی عادی تھی۔ میں نے دیکھا، ٹوٹی ہوئی کھاٹ پر وہ بے حس و حرکت پڑی ہے، بخار کی شدت سے اس کا ماتھا، چہرہ اور سارا بدن پھنک رہا ہے، دونوں ہونٹ جل کر کوئلہ بن گئے ہیں۔

''ستیو۔''

اس نے میری آواز پہچانی، آنکھیں کھولیں اور دائیاں ہاتھ میری ٹانگ پر رکھ دیا۔

''بخار ہے؟''

ستیو نے کوئی جواب نہ دیا، صرف اپنی مری ہوئی آنکھوں سے مجھے دیکھتی رہی۔ ''میں تمہارے لئے آم لایا ہوں......کھاؤ گی؟''

ستیو نے کا اپنی زبان جلے ہوئے ہونٹوں پر پھیر دی اور آہستہ سے کہا......

''کہاں ہیں؟''

''میرے کمرے میں......''

یہ سن کر اس نے کوئی اشتیاق ظاہر نہیں کیا، محض مجھے دیکھتی رہی۔

میں کتنی دیر وہاں بیٹھا رہا اور اُسے دیکھتا رہا...... پانچ چھ برس کی بدقسمت لڑکی جس نے اُس مختصر سی زندگی میں جھاڑو دینے، پانی پلانے اور پنکھا جھلنے کے سوا ابھی کچھ دیکھا ہی نہ تھا، جسے دن کی جھلسا دینے والی گرمی سونے کا حق نہیں، جسے خون پسینہ بہا کر کمائے ہوئے ایک روپیہ کو اپنے پاس رکھنے کا حق نہیں جسے مار اور گالیاں کھا کر رونے یا روٹھنے کا اختیار نہیں، جو تصویریں دیکھ کر کھل کھلا کر ہنسنے کی مجاز نہیں، جو کسی کی بیٹی نہیں، لیکن جو سب کی نوکرانی ہے حتیٰ کہ میری بھی جو عادتاً ایک

کمرے میں رہتا ہے۔

تیسرے دن شام کو اس کی حالت اچانک خراب ہوگئی اور وہ بیشتر اوقات بہکی بہکی باتیں کرنے لگی۔ ''میں...... کشمیر...... جاؤں گی...... ماں......اور ہر سنکرات کو تمہارا......'' ایک بار ستیو کی مالکن نے مجھے اپنے کمرے میں بلایا' اس کے چہرے پر ہوائیاں اڑ رہی تھیں' خوف اور ہراس کے سبب اس کے ہونٹ سوکھ گئے تھے اور سانس تیز تیز چل رہی تھی۔

''مجھے اس سے ڈر لگ رہا ہے......! رام جانے انت میں کیا رُوپ دکھائے!'' اس نے مجھ سے کہا۔

میں نے زہر خندہ کر کے پوچھا۔ ڈر کاہے کا......آخر پانچ چھ برس کی بچی ہی تو ہے......

''یہ بات نہیں' دراصل میرا دل بہت کمزور ہے۔ اچھا ہوتا اگر آپ اسے کسی مندر میں......''

اس سے آگے وہ کچھ اور کہنا چاہتی تھی' لیکن میرے چہرے کا اُتار چڑھاؤ دیکھ کر چپ ہوگئی اور میں پھٹی پھٹی نظروں سے اسے دیکھتا رہا۔ وہ مہاجنی نظام سے اس قدر مانوس ہو چکی تھی کہ انسانیت کے تمام اوصاف' آدمیت کی تمام علامات اسی تجارت کے نیچے دب گئی تھیں' وہ شفقت اور پیار کی لازوال کرن جو صرف عورت کے سینے میں روشن ہوتی ہے' سود و زیاں کے پھیر میں پڑ کر بجھ گئی تھی' حتیٰ کہ وہ اپنے گھر سے باہر کسی مندر میں ستیو کی مختصر زندگی سے بھی سودا کرنا چاہتی تھی۔

ستیو اسی رات مر گئی اور میں کوٹھڑی کا دروازہ بند کر کے برآمدے میں ٹہلتا رہا۔ اس کی مالکن سرِ شام ہی کمرے کے دروازے میں تالا لگا کر چلی گئی تھی۔ وہ شاید مرتی ہوئی بدحواس ستیو سے اس قدر خائف ہو چکی تھی کہ راہ فرار کے سوا اسے اپنے

کمزور دل کو سنبھالنے کے لئے اور کچھ نہ سوجھا تھا۔

ستیو کو سپردِ آتش کرنے کے بعد جب میں لوٹا تو گلی کے نکڑ پر ایک جوان عورت نیلی ساڑھی میں ملبوس دُزدیدہ نگاہوں سے مکان کی طرف دیکھ رہی تھی، مجھے اس کی حرکات پر شک سا ہو گیا۔ میں نے قدم روک لئے۔

''کسے دیکھ رہی ہو؟'' میں نے ڈوبی ہوئی آواز میں پوچھا۔

جوان عورت شرما گئی، گھونگھٹ نکال کر بولی۔ ''یہاں میری لڑکی ہے''

''لڑکی؟ کیا نام ہے اس کا؟'' میں نے حیرت سے پوچھا۔

اس نے اسی انداز میں جواب دیا۔ ''ستیو''

''وہ آج رات مر گئی۔'' میں نے نفرت آمیز ہنسی ہنس کر کہا۔

ستیو کی ماں نے گھونگھٹ اوپر اٹھایا اور گھبرا کر بولی۔ ''ہائے رام، مر گئی؟''

میں خاموش اسے دیکھتا رہا۔۔ پھر بولا۔ '' ہاں مر گئی......''

وہ حسرت میں اپنے ہونٹ جن پر سرخ رنگ سا ملا ہوا تھا، چبانے لگی اور پھر چند ثانیوں کے بعد بولی......اور ''اس کی تنخواہ؟''

مجھے یاد آ گیا، آج ساون کی سنکرات تھی......

............☆☆☆............

جُھنجھنا

گنگا دھر کئی لحاظ سے خوش قسمت ہے، پہلی خوش قسمتی یہ ہے کہ نوجوان ہے اور ایک سرکاری محکمے میں مستقل چپراسی ہے۔ تنخواہ صرف بارہ روپے ہے مگر مہنگائی کا الاؤنس اٹھارہ روپے ملتا ہے، دوسری خوش قسمتی یہ ہے کہ اس کے دو بڑے بھائی ہیں، واسدیو اور آفتاب رام۔ یہ بھی شادی شدہ ہیں، حالانکہ کہ دیہات میں رہنے والے ہندوؤں کو آسانی سے گھر گرہست میسّر نہیں ہوتا، انہیں یا تو ہزاروں روپے کی پگڑی دینی پڑتی ہے یا عمر بھر کنوارا رہنا پڑتا ہے۔ تیسری خوش قسمتی یہ ہے کہ اس کے دونوں بھائی گاؤں میں تھوڑی بہت دکانداری بھی کرتے ہیں، تھوڑی بہت جعل سازی بھی، اس طرح سے گنگا دھر پر گھر کا زیادہ بوجھ نہیں۔ چوتھی خوش قسمتی یہ ہے کہ تینوں......

...... تھوڑی بہت سود خواری بھی اور کبھی کبھی دُنیا داری کے لیے تھوڑی بہت جعل سازی بھی، اس طرح سے گنگا دھر پر گھر کا زیادہ بوجھ نہیں۔ ایک اور خوش قسمتی یہ ہے کہ تینوں بھائی اب تک ایک ساتھ رہتے ہیں، حالانکہ دیہات میں ایسا بہت کم ہوتا ہے کہ تین بھائی کماتے ہوں اور اکٹھے رہتے ہوں۔ عام طور پر ایسے ہندو گھرانوں میں کئی طرح کے جھگڑے کھڑے ہو جاتے ہیں وراثت کے، زمین کے، عورتوں کے، مگر لال پور کا یہی ایک ہندو گھرانہ ہے، جہاں اتفاق ہے اور جہاں تینوں بھائی ایک دوسرے پر مرتے ہیں۔ گنگا دھر چونکہ سب سے چھوٹا ہے اس لئے وہ ضرورت سے

زیادہ فرمانبردار ہے، وہ واسدیو کو اپنا باپ سمجھتا ہے اس لئے خوش قسمتی یہ ہے کہ تینوں بھائی صاحبِ اولاد ہیں۔ واسدیو کا لڑکا ہے، چھ برس کا، آفتاب رام کی بیٹی ہے، تین برس کی اور گنگا دھر کا لڑکا ایک سال کا دکان کا سارا کام آفتاب رام چلاتا ہے۔ واسدیو وہاں بہت کم بیٹھتا ہے، اس کا کام گھر کا انتظام چلانا ہے یا گاؤں میں بے مطلب گھومنا، اوروں کی نکتہ چینی کرنا، وہ زبردست قسم کا باتونی اور یاوہ گو ہے جسے وہ دانائی سے منسوب کرتا ہے۔ وہ ہر صبح گاؤں کے شوالے میں زور زور سے منتر پڑھتا ہے جس سے اس کی مذہبی حیثیت سی قائم ہوگئی ہے۔

آفتاب رام بحیثیت انسان برا نہیں مگر اس کی زبان گندی ہے۔ وہ اٹھتے بیٹھتے گالیاں بکتا رہتا ہے۔ خریدار ایک پیسہ کم ادا کرے تو دوسرے ہی لمحے میں اس کے منہ سے غلیظ سی گالی نکل جاتی ہے۔ کئی بار جھگڑا بھی ہوتا ہے، ہاتھا پائی تک تو بت پہنچ جاتی ہے مگر بیچ بچاؤ سے معاملہ دب جاتا ہے، دکان کا یہ شیر گھر میں دبیل جانور کی طرح رہتا ہے نہ بدمزاجی نہ گالی گلوچ۔ واسدیو کا اسے اتنا احترام ہے کہ اسکی موجودگی میں نہ حقہ پیتا ہے نہ دیوار کے سہارے پیٹھ لگائے بیٹھتا ہے اور نہ بیوی بچے سے بات کرتا ہے۔ اگر خدانخواستہ بچی کا ہاتھ بھی جل جائے یا وہ سیڑھیوں سے گر جائے، کیا مجال آفتاب رام اسے اٹھانے کے لئے دوڑے ایسے موقعوں پر واسدیو اندر ہی اندر اپنے میں ایک عجیب بزرگی سی محسوس کرتا ہے۔

گنگا دھر بھی شرم وحیا میں کچھ کم نہیں۔ چھوٹا ہونے کے سبب بڑوں کی تابع داری اس کے فرائض میں شامل ہے، دوسرے بھائیوں سے اخلاقی طور پر بہت اونچا اور برتر ہے۔ وہ نہ بدکلام ہے نہ جعل ساز۔ دفتر سے تنخواہ لیتا ہے تو مہنگائی کے اٹھارہ روپے دوسرے ہی دن منی آرڈر کر کے گھر بھیج دیتا ہے۔ کبھی کبھار چھٹی ملتی ہے تو ہفتہ عشرہ کے لئے گھر چلا جاتا ہے۔ لیکن اب شیواتری آرہی ہے پچھلے چار مہینے سے وہ گھر

نہیں گیا ہے۔اب بڑی مشکل سے پانچ مہینے کی چھٹی ملی ہے، گھر جانے سے ایک دن پہلے اس نے بہت سی چیزیں خریدیں، ساگ، سبزی، ندرو، پالک، مرغابیاں، سبز چائے، ریشمی ونکہ پن، خوشبودار صابون کی ٹکیاں، بچوں کے لئے سرمے کی بوتلیں، کریپ کے پیرہن، آفتاب رام کی بیٹی کے لئے کھوٹے کلابتوں کی ٹوپی اور لکڑی کی رنگ دار سینڈل، واسدیو کے بیٹے کے لئے سلا سلایا کرتا، اپنی بیوی بچے کے لئے اس نے کچھ بھی نہیں خریدا۔ اسے ان کے لئے کچھ خریدنے کا خیال تو آیا، مگر اس خوف سے کہ بھائی اسے بے حیا نہ سمجھیں۔ اس نے ارادہ ترک کر دیا، البتہ چلتے چلتے منیاری کی دُکان سے ٹین کا ایک جھنجھنا ساڑھے تین آنہ میں خریدا اور اندر کی جیب میں ڈال دیا۔

ساری رات اسے نیند نہیں آئی۔ کروٹ پر کروٹ بدلتا رہا۔ جسم سرکاری کواٹر کی ایک مریل سی کوٹھڑی میں تھا، مگر روح سر شام ہی لال پور پہنچ چکی تھی، سوچتا تھا، بچہ اب چل پھر سکتا ہوگا، باتیں کرتا ہوگا۔ بیوی میکے سے آگئی ہوگی، گائے نے بچھڑا جنا ہوگا۔ گاؤں کا سارا ماحول بدل چکا ہوگا، یہ چار مہینے بھی ایک زمانہ ہوتا ہے۔ طویل اور صبر آزما بچے، بیوی اور گھر کی معیت اس کے دل میں ایک تلاطم بن کر اٹھی، جو تھمنے ہی میں نہ آتی تھی۔ گھر پہنچ جاؤں گا تو ساری رات بیوی سے باتیں کروں گا۔ بچے کو سینے سے لگا کر سو جاؤں گا، بیوی چیزوں کا گلا کرے گی تو دو روپے کا نیا نوٹ اس کے ہاتھ میں تھما دوں گا۔ کتنی خوش ہوگی وہ...... ایک دم سے دو روپے پھر جس طرح چاہے خرچ کرے، دودھ پیئے، صابون خرید لے، سرمہ لگا لے، جو چاہے کرے آخر اسے بھی مجھ پر حق ہے۔ اس خیال سے اسے روحانی سکون سا محسوس ہوا۔ اور یہی سوچتے سوچتے اس کی آنکھ لگ گئی۔

گھوسیوں کے مرغ نے بانگ دی تو گنگا دھر جاگ اٹھا۔ اب بستر میں پڑا رہنا اس کے لئے ناممکن تھا۔ وہ اٹھ بیٹھا، دیا جلایا، حجامت بنائی، صابون سے ہاتھ

منہ دھویا۔ سندور کا قشقہ لگایا اور سامان باندھنے لگا۔

لال پور کے اڈے پر صرف ایک تانگہ کھڑا تھا۔ کوچوان اور گھوڑا دونوں فروری کی سردی سے اکڑ گئے تھے' سڑک کے کناروں پر جمی ہوئی برف کی کئی تہیں تھیں جن پر طرح طرح کے نقوش اُبھر آئے تھے۔ پاس کی مسجد میں درود خوانی ہو رہی تھی اور حمام کے بدرو سے بھاپ اٹھتا ہوا پانی منجمد نالیوں میں بہہ رہا تھا۔

گنگا دھر نے اپنی گٹھڑیاں ایک طرف کو رکھ دیں اور پُوچھا۔ ''کیوں چودھری ابھی کتنی دیر ہے؟''

لال پور سرنگر سے بارہ میل دور تھا۔ گنگا دھر عام طور پر پیدل چلا جاتا تھا' مگر آج بوجھ کے سبب ایسی صورت نہ تھی۔ کوچوان نے چونک کر لوئی سے سر نکالا۔ اور پوچھا۔ ''کتنی سواریاں ہو؟''

''صرف ایک...... لال پور جانا ہے۔''

''تو بیٹھ جاؤ' ذرا دم لو' سواریاں آئیں گی تو انشا اللہ چلیں گے۔''

گنگا دھر کی مسرتوں پر جیسے سو من کا ہتھوڑا پڑ گیا۔ اس نے کہا۔ ''مجھے جلدی ہے چودھری۔''

کوچوان نے دلی سے کہا۔ ''میرا کیا اعتراض ہے' سالم تانگے کا کرایہ دو ابھی چلتا ہوں۔''

''سالم کرایہ؟ کتنا ایک؟'' گنگا دھر نے کھڑے کھڑے پوچھا۔

''چار روپے اور کتنا؟''

گنگا دھر کوچوان کی بات سن کر حیران رہ گیا۔ بولا۔ ''مگر چودھری' پچھلی بار جب میں گھر گیا تھا تو بارہ آنے ہی دئے تھے۔''

کوچوان نے اپنا سر پھر باہر نکالا اور کہا۔ ''کب کی باتیں کر رہے ہو' آج

تین مہینے سے کرایہ چڑھا ہوا ہے۔''

''یہ کیوں؟''

''دانے جو مہنگے ہو گئے ہیں، بھوسہ نہیں ملتا۔ باہر سے چنے نہیں آتے، زمیندار لوگ گھاس نہیں بیچتے۔ لالچ نے سب کو بے ایمان بنا دیا ہے۔''

گنگا دھر کا جوش و خروش آہستہ آہستہ ٹھنڈا پڑنے لگا۔ اس نے دس نمبر کا سگریٹ نکالا اور وہیں سڑک پر پینے لگا۔

تمباکو کی خوشبو سے متاثر ہو کر نوجوان نے بڑی عاجزی سے کہا۔ ''ایک مجھے بھی دو بھائی، آج سردی بہت زیادہ ہے، کہتے ہیں کہیں سرد لہریں آ گئی ہیں، مگر تم فکر نہ کرو، سواریاں آئیں گی تو گھوڑا ہوا سے باتیں کرتا ہوا لال پور پہنچ جائے گا۔''

اس اطمینان سے گنگا دھر کی ہمت بندھ گئی۔ اس نے ایک سگریٹ کوچوان کی طرف بڑھایا۔ کوچوان نے کہا۔ ''کھڑے کھڑے کیوں اپنے کو تھکا رہے ہو، تانگے پر بیٹھ جاؤ، سردی سے اکڑ جاؤ گے، یہ لو کانگڑی، ہاتھ سینک لو......''

گنگا دھر نے پہلے اپنی گٹھڑیاں تانگے پر رکھ دیں، پھر خود بھی بیٹھ گیا۔ اس کے بوجھ سے تانگہ ذرا پچھلی طرف کو جھک گیا جس سے اونگھتے ہوئے گھوڑے میں بھی بیداری سی آ گئی۔

''بڑی دیر ہو رہی ہے، اب نو بج رہے ہیں۔'' گنگا دھر نے تھوڑی دیر کے بعد کہا ''اتنی کیا جلدی ہے؟'' کوچوان نے اشتیاق کے ساتھ پوچھا۔

''شوراتری پر چار مہینے کے بعد گھر جا رہا ہوں۔'' گنگا دھر نے کہا۔

''اچھا اچھا سمجھ گیا، پر شادی ہوئی ہے تمہاری؟'' کوچوان نے مڑ کر پوچھا۔

''ہاں ہاں ایک بچہ بھی ہے، سال بھر کا......''

''چار مہینے سے گھر والی کو نہیں دیکھا؟'' کوچوان نے پوچھا۔

''چھٹی ہی نہیں ملی، دیکھتا کیسے؟''

''واللہ تم پنڈت لوگ بڑے گہرے اور صابر ہوتے ہو۔ مسلمان کی شادی ہوئی ہو اور وہ چار مہینے سے گھر والی کو نہ دیکھے، یہ ناممکن ہے۔ وہ تو اس کے دامن ہی سے نہیں نکلے گا اور اسی لئے مسلمان طبقہ تباہ حال ہے۔''

گنگا دھر ہنسنے لگا، بولا۔ ''ملازمت میں یہ نخرے نہیں چلتے، چودھری ورنہ گھر کسے پیارہ نہیں!''

''یہ تو ہے ہی، ملازمت کی وجہ سے مجھے بھی منہ اندھیرے اڈے میں آنا پڑا۔ ورنہ کون ان سردیوں میں اپنا ژندہ چھوڑ کر باہر نکلے۔'' کوچوان نے کہا۔

''یہ تانگہ تمہارا نہیں؟'' گنگا دھر نے پوچھا۔

''ایسی قسمت کہاں، اپنا تانگہ ہوتا تو بارہ بجے سے پہلے کبھی گوڑا نہ جوتتا۔''

''کس کا ہے؟'' گنگا دھر نے پھر پوچھا۔

''ایک نانوائی کا ہے جو مرغ کی بانگ سنتے ہی میرے سر پر لاٹھی لے کر سوار ہو جاتا ہے۔ پیسہ اتنا ہے جتنا دُنیا میں جھوٹ۔ مگر پھر بھی لالچ ہے کہ اسی کا تانگہ سب سے پہلا نمبر حاصل کرے۔ اب بتاؤ کہ آخر زمان ہے کہ نہیں؟''

''جس کا آدمی کھالے اسے برا بھلا نہیں کہنا چاہئے۔'' گنگا دھر کا برتر اخلاق جاگ اٹھا۔

کوچوان چمک اٹھا۔ اس کا کیا کھاتا ہوں، اپنی محنت کرتا ہوں اور اسے بھی کھلاتا ہوں۔ وہ حرامی کس کا کھلانے والا ہے۔

''کیا تنخواہ دیتا ہے؟'' گنگا دھر نے دوسرا سوال کیا۔

''تنخواہ کیا دیتا ہے چھ روپے اور روٹی کپڑا۔'' کوچوان نے غصے میں کہا

''کچھ اوپر سے بھی کماتے ہو؟''

''اور نہیں تو کیا چھ روپے پر ہی زندہ رہ سکوں گا' اس طوفان میں۔ نوجوان نے کہا۔''

''اسے تمہاری بے ایمانی پر شک نہیں ہوتا......؟'' گنگا دھر نے حیران ہو کر پوچھا شک ہوگا بھی تو مجھے کیا کرے گا' میری تنخواہ بڑھائے' میں بے ایمانی نہیں کروں گا۔ کوچوان نے بڑے اعتماد کے ساتھ کہا۔

''نانوائی کی دکان بھی کرتا ہے؟''

''اور کیا کہہ رہا ہوں' تیس چالیس' روز وہاں سے کماتا ہے' آٹھ دس روپیہ میں کما کر دیتا ہوں۔ پھر بھی اس کی پیاس نہیں بجھتی۔ عیال بھی کیا ہے' ایک بیوی اور ایک بیٹی اور پھر تم جانتے ہو' یہ لوگ آج کل آٹے میں کیا کچھ ملاتے ہیں۔''

گنگا دھر نے فلسفی کی طرح کہا۔ ''ساری دنیا بے ایمان ہو گئی ہے چودھری اب یہاں مسکینوں کے رہنے کی کوئی گنجائش نہیں۔''

کوچوان یہ سن کر تڑپ اٹھا۔ اس نے ٹوپی ایک طرف کو پھینک دی اور کہا ''ہم مسکین ضرور ہیں مگر دولت کون پیدا کرتا ہے' اناج کون اگاتا ہے' ریشم اور پشمینہ کون بنتا ہے اس پر بھی ہم بھوکوں مریں' گالیاں کھائیں سردیوں میں اکڑ جائیں۔ اب نہیں چلے گا پنڈت' تم بزدل ہو' نوکریوں کے لئے مرتے ہو' مگر ہم ایسا نہیں ہونے دیں گے۔ ہمیں پیٹ بھر کر روٹی ملنی چاہئے۔''

گنگا دھر نے قہقہہ لگایا۔ بولا۔ ''ایسی باتیں نہیں کیا کرتے۔ حکومت پکڑ کر لے جائے گی۔''

اتنے میں لال پور کی سوریاں آ گئیں۔ گنگا دھر اور کوچوان اپنی گفتگو بھول گئے اور تانگہ لال پور کی طرف روانہ ہوا۔ راستے میں گنگا دھر سوچتا رہا' ان ننگے اور بھوکے مسلمانوں میں کتنی بیداری آ گئی ہے۔ یہ بلا خوف کتنی زہریلی باتیں کرتے

ہیں، بدن پر کپڑا نہیں مگر حوصلے دیکھو! اپنے مالکوں کو کیا کچھ سناتے ہیں۔

گنگا دھر کے آنے سے گھر میں خوشی کے چشمے ابل پڑے۔ آفتاب رام دکان بڑھا کر آ گیا۔ واسدیو نمبر دار کے گھر میں ایک کسان کو عدالت میں مُکر جانے کا مشورہ دے رہا تھا۔ اس نے گنگا دھر کے آنے کی خبر سُنی تو سارا کام چھوڑ کر آ گیا۔ بھاوجیں خیریت پوچھتی رہیں، بیوی چوکے میں چھپ چھپ کر اسے دیکھتی رہی۔ بچے اس کے اراد گرد جمع ہو گئے۔ گنگا دھر کبھی واسدیو کے بچے کو چومتا اور کبھی آفتاب رام کی بیٹی کو، مگر اپنے سال بھر کے بچے کی طرف اس نے نگاہ تک نہ اٹھائی بچہ حیران تھا کہ یہ کون ہے جو اوروں کو چومتا ہے مگر میری طرف آنکھ بھی نہیں اٹھاتا، ایک بار وہ گھٹنوں کے بل اٹھا اور گنگا دھر سے لپٹ گیا۔ گنگا دھر جیسے بجلی کے ننگے تار سے چھو گیا۔ وہ تڑپ کر پیچھے ہٹ گیا اور واسدیو نے گرج کر کہا' اسے پرے ہٹا دو' بے حیا کہیں کی' اپنے باپ کو پہچانتا ہے' پورا کلجگ آ گیا ہے۔

تھوڑی دیر بعد سماوار ابلنے لگا' پھر باتیں ہونے لگیں۔ شہر کی' لوگوں کی' حکومت کی' کنٹرول کی' قیمتوں کی برف اور سرد ہواؤں کی' غرض کوئی مسئلہ موضوع گفتگو بننے سے نہ رہا۔

پھر واسدیو کے اشارے پر آفتاب رام نے گٹھڑیوں کے منہ کھول دئے' ساز و سامان دیکھ کر سب خوش ہو گئے۔ بچے مرغابیاں دیکھ کر پہلے تو سہمے' پھر انہیں چومنے لگے۔

عورتیں وانکہ پن' پیرہن اور دوسری چیزیں دیکھ کر ناچ اٹھیں' معاً واسدیو کی نظر سابون کی ٹکیوں پر پڑی۔ اس نے پوچھا۔ "یہ کیا ہے؟"

گنگا دھر نے آہستہ سے کہا۔ "یہ بھابی کے لئے لایا ہوں۔"

بھابی کے لئے خوشبودار صابون...... واسدیو کے لہجے میں غصہ تھا' آگ

تھی، گنگا دھر سب کچھ تاڑ گیا اور واسدیو نے کہا۔ ''ابھی اس گھر میں ایشور کی مہربانی سے کلجگ نہیں آیا تھا۔ ہاں اگر تم شہر سے لئے آؤ، تو تعجب نہیں۔''

سارے کمرے میں ایک عجیب خوف سا چھا گیا۔ گنگا دھر سر جھکائے بیٹھا رہا عورتیں چوکے میں حیران رہ گئیں اور واسدیو نے پھر کہا۔ ''انہیں دکان پر رکھ دو، ہندو عورت کا زیور مٹی ہے، صابون کنجروں کے گھروں میں ہوتا ہے۔ خبردار آئندہ ایسی حرکت کی، آخر دھرم بھی کوئی چیز ہے۔''

اتنے میں نمبر دار وہیں آ گیا بولا۔ اب یہ بات پکی ہوگئی واسہ کاک کہ عظیم بٹ عدالت میں مکر جائے۔

واسدیو نے ہنس کر کہا۔ اس کے بغیر اور کوئی چارہ نہیں، ہاں اگر کاغذ ہوتا تو مکرنا مشکل تھا۔ نمبر دار نے ہنس کر کہا۔ ''عظیم بٹ گھبراتا ہے، کہتا ہے، جھوٹ کیسے بولوں گا۔'' خیر اب میں نے اسے دلاسہ دیا ہے۔

واسدیو نے ہنس کر کہا۔ ''ان بے غیرتوں کا کیا ہے۔ زرا سی بات پر گھبراتے ہیں اس کے بعد نمبر دار چلا گیا۔ واسدیو نے اپنے آپ سے کہا۔ مسلمان کتنا ہی بڑا کیوں نہ ہو ارادے کا کچا ہوتا ہے۔ نہ دُنیا سازی جانتا ہے نہ دُنیا داری۔''

رات آ گئی اور سب کھا پی کر اپنے اپنے کمروں میں چلے گئے۔ گنگا دھر ساری رات اپنی بیوی سے باتیں کرتا رہا۔ اس خیال سے کہ گھر میں کسی کو ان کی بیداری کا علم نہ ہو انہوں نے سرِ شام ہی مٹی کا دیا بجھا دیا۔

بیوی نے بے شمار شکایتیں کیں، گلے کئے، آنسو بہائے اور گنگا دھر نے شرم وحیا اخلاق اور تابع داری کے واسطے دے دے کر اسے مطمئن کر دیا اور جب صبح ہوگئی تو اس نے بیوی کے ہاتھ میں دو روپے کا ایک نیا گلابی نوٹ رکھ دیا، بیوی کو اعتبار نہ آیا کہ اسے بیک وقت دو روپے مل رہے ہیں۔

گنگا دھر نے کہا۔ رکھ لو کام آئے گا۔ مگر اسے ہوشیاری سے بھنانا' کسی کو کانوں کان خبر نہ ہو' ورنہ آفت آجائے گی اور سب سنیں گے کہ بیوی کو پیسے بھی دینے لگا ہے۔

اس کے بعد اس نے اندر کی جیب سے ٹین کا جھنجھنا نکالا۔ بیوی نے پوچھا۔ یہ کیا ہے؟

ننھے کے لئے لایا ہوں' مگر کوئی اسے نہ دیکھے۔" گنگا دھر نے بڑے راز دار انہ لہجے میں تنبہہ کی۔"

دو روپے کے نوٹ اور ٹین کے جھنجھنے پر اس کی بیوی کو یوں محسوس ہوا جیسے ساری کائنات ایک خواب اا ور رقص کی دُھن پر ناچ رہی ہے اور ہر طرف سے گھنگھرو بج رہے ہیں' قہقہے ہی قہقہے پھوٹ رہے ہیں' خواب ہی خواب بکھر رہے ہیں۔

لیکن اسی صبح قیامت سی آگئی۔ اس کا ننھا بچہ ماں سے آنکھ بچا کر جھنجھنا لے کر نیچے آگیا۔ واسدیو اور آفتاب رام کے بچے جھنجھنا دیکھ کر مچل اٹھے' رونے لگے' ادھر اُدھر بھاگنے لگے۔ ان کی مائیں ایک دوسرے کی طرف دیکھنے لگیں اور چھاتیاں پیٹنے لگیں۔ واسدیو حقہ پی رہا تھا۔ اس نے جھنجھنا دیکھا تو پوچھا۔ "یہ کیا فتنہ ہے؟"

گنگا دھر بڑے تابع دارنہ انداز میں اس کے سامنے بیٹھا ہوا تھا۔ اسے محسوس ہوا جیسے اس کے سر پر پہاڑ ٹوٹ پڑا ہے۔ اسے بیوی کی حماقت پر سخت غصہ آرہا تھا' کم بخت کو چھپانے کا بھی سلیقہ نہیں۔ واسدیو سب کچھ گیا وہ حقہ بھی پیتا رہا اور زہر بھرے فقرے بھی کہتا رہا۔ اب اس گھر میں اتفاق نہیں ہوگا۔ گھر کے لونڈے نے شہر کی نوکری کیا کی۔ گھر میں فتنے اور فساد کا بیج بو دیا۔ یہ بے حیائی کی حد ہوئی۔ ہمارے ہوتے ہوئے اپنے بیٹے کو کھلونے نہیں دئے اوپر جا کر دئے۔ رام جانے اور کیا کچھ دیا ہوگا۔......

گنگادھر کے پیٹ کا پسینہ چھوٹ گیا۔ وہ سر سے پاؤں تک پانی ہی پانی ہو گیا اور اندر ہی اندر سے اپنی رانوں کا گوشت نوچنے لگا۔

تین دن تک کسی نے اس سے بات تک نہیں کی جیسے وہ اچھوت تھا۔ اور جب شیوارتری گذر گئی تو دوسرے ہی دن صبح وہ شہر کی طرف چل دیا۔

ساڑھے تین آنے کے جھنجھنے نے اس کی زندگی میں مستقل طور پر زہر گھول دیا تھا۔ اس کا برترا اخلاق گرادیا تھا اور اسے سارے گھر کا دشمن بنا دیا تھا۔

............☆☆☆............

نئی سڑک

نومبر کا مہینہ تھا اور موسم کے چہرے پر وقت سے پہلے ہی جھریاں پڑ گئی تھیں۔ صبح کی دھوپ بے جان اور میلی تھی اور لیٹے ہوئے ننگے کھیتوں میں ایسی نظر آ رہی تھی۔ جیسے کسی ویران مکان میں غلیظ بتی کی مدھم سی روشنی ٹمٹما رہی ہو۔ توت' چنار' اخروٹ اور بید کے لنڈ منڈ درختوں پر نامحسوس قسم کا خوف لرز رہا تھا۔ گاؤں کی کچی سڑکیں سنسان' ٹھنڈی اور عریاں تھیں جیسے کسی بڑھیا کا گریبان افلاس کی شدّت سے ناف تک چاک ہو گیا ہو اور اپنے کھوکھلے اور سوکھے سینے کی عریانی سے بے نیاز ہو چکی ہو۔

عبؔدل لاٹھی ٹیکتا ہوا اپنے مکان سے نکلا' گاؤں کی ندی کے گیلے اور ٹھنڈے پتھروں کو آہستہ سے پھلانگ کر وہ اپنے کھیتوں میں پہنچا جن میں دھان کی مونڈیں اور مینڈیں اب تک باقی تھیں لیکن جن کے بیچوں بیچ چونے کی دو متوازی لکیریں بہت دور تک کھچی ہوئی تھیں۔ دور ایک ٹیلے پر گاؤں کے کچھ بچے دھوپ سینک رہے تھے۔ عبدل نے یہ لکیریں دیکھیں تو اس کی سوچیں بھٹک گئیں۔ وہ لاٹھی کو ایک طرف چھوڑ کر بڑی توجہ سے انہیں دیکھتا رہا جو بونہ گام سے آ رہی تھیں۔ اور شالہ پور سے نکل کر میر پال کے کھیتوں میں غائب ہو رہی تھیں۔ وہ کچھ بھی نہ سمجھ سکا۔ البتہ اسے ایک مہینے پہلے کا واقعہ یاد آ گیا۔ جب نئی سڑک کے چرچے ہوئے تھے اس وقت

عبدل نے اُسے کوئی اہمیت نہ دی تھی لیکن آج ...... آج سارے گاؤں پر غصہ آرہا تھا' خاص کر نمبردار پر جس نے اس کے کھیتوں میں چونے کی لکیریں کھچوائی تھیں۔ وہ دونوں پاؤں سے لکیروں کو مٹانے لگا اور ساتھ ہی ساتھ دُنیا جہان کو گالیاں دینے لگا۔ ٹیلے پر بیٹھے ہوئے بچے اس کے گرد جمع ہو گئے۔ چاچا' یہ کیا کر رہے ہو؟'' انہوں نے حیران ہو کر پوچھا۔''

عبدل غصے سے کانپ رہا تھا۔ ہٹ جاؤ میرے کھیتوں سے! اس نے چلا کر کہا۔

''یہ نئی سڑک ہے چاچا! '' انہوں نے کہا۔

''نئی سڑک' اسے نہ مٹاؤ۔'' بچوں نے اس کے قریب آکر کہا۔

عبدل نے کچھ نہ مانا۔ وہ برابر لکیروں کو مٹاتا رہا۔ ''ہٹ جاؤ یہاں سے 'نہیں تو میں لاٹھی سے ماروں گا۔'' بچے سہم کر بھاگ گئے۔ وہ چلاتے رہے۔ عبدل چاچا نے چونے کی لکیرں مٹادی ہیں' اس نے نئی سڑک مٹادی ہے۔ عبدل لکیریں مٹانے کے بعد لرزتا کانپتا واپس آیا۔ راستے میں بے شمار گالیاں اس کے ذہن میں آتی رہیں جو وہ بیک وقت سارے گاؤں اور نمبردار کو دینا چاہتا تھا جو اس کے کھیتوں کو سڑک میں بدل رہے تھے۔ زمین کے یہی دو ٹکڑے اس کا سارا اثاثہ تھے جو ایک دوسرے سے ایسے ملے ہوئے تھے جیسے انہوں نے ابد تک نہ چھوٹنے کی قسم کھا رکھی ہو اور واقعہ بھی یہی تھا۔ یہ زمین کے دو ٹکڑے نہیں تھے عبدل کے دو بیٹے تھے جوان اور خوبصورت بیٹے جو اسے ہر سال چھ سات خروار شالی اور مریل سے بیل کے لئے چارہ مہیا کرتے تھے یہ دو بیٹے اس کے ہاتھ سے نکل جائیں گے تو وہ زندہ کیسے رہ سکے گا؟ یہ سوال بار بار اُس کے دماغ میں آرہا تھا۔ اس کی کوئی بیوی نہ تھی' بچہ نہ تھا۔ تین شادیاں کرنے کے باوجود اس کے گھر کا دیا نہ جل سکا تھا جب سے اُس نے ان ہی

دو چھوٹے چھوٹے کھیتوں کو اپنی اولاد بنایا تھا جن کے ننگے سینے پر آج کسی نے سفید لکیریں کھینچی تھیں۔ اسے محسوس ہو رہا تھا' یہ دونوں لکیروں کے بوجھ تلے چیخ رہے ہیں رو رہے ہیں' جیسے یہ سفید لکیریں نہ ہوں' دو چمکتی ہوئی سفید چھریاں ہوں اور انہیں ذبح کرنے کے لئے ان کے گلے پر رکھی گئی ہوں۔

''ایسا کبھی نہ ہوگا' کبھی نہیں'' عبدل غصے میں اپنے آپ سے کہتا رہا۔ کوئی باپ اپنے بیٹوں کو اپنی آنکھوں کے سامنے ذبح ہوتے نہیں دیکھ سکتا۔

گاؤں کے نزدیک پہنچ کر اس کی نظر نمبردار پر پڑی۔ عبدل اپنا دماغی توازن کھو چکا تھا۔ وہ زخمی شیر کی طرح آگے بڑھا اور کانپتی ہوئی آواز میں بولا۔ ''خونی پاجی' کمینہ!''

نمبردار نے سب کچھ بچوں سے سن لیا تھا۔ اسے عبدل کی بدتمیزی پر کوئی غصہ نہیں آیا۔ الٹا وہ مسکراتا رہا۔ ''تم خونی ہو' تم نے میرے بیٹوں کے گلے پر چھری پھیری ہے''۔ عبدل نے پھر کہا۔

''تم غلط سمجھے ہو عبدل۔ نمبردار نے متانت کے ساتھ کہا۔''

''غلط نہیں ہے تم میرے بیٹے مجھ سے چھین رہے ہو۔ میں نے اپنی آنکھوں سے دیکھا ہے۔ اس کے بعد عبدل پھوٹ پھوٹ کر رونے لگا۔

نمبردار نے کہا۔ ''تمہارے بیٹے تم سے کوئی چھین نہیں رہا ہے''۔

''کوئی چھین نہیں رہا ہے' پھر وہ لکیریں کیسی ہیں؟'' اس نے پوچھا۔

''یہ گاؤں والوں نے کھینچی ہیں۔''

''مگر کیوں؟''

''نئی سڑک کے لئے جو ہم سب کو باقی دُنیا سے ملائے گی!''

''مجھے سڑک نہیں چاہیئے!'' عبدل دوبارہ چمک اٹھا''۔ میں اب کسی سے ملنا

نہیں چاہتا۔

"میرے ساتھ آؤ میں تمہیں سب کچھ سمجھا دوں گا"۔

نمبردار آگے آگے اور عبدل اس کے پیچھے پیچھے ہولیا اور ان کے پیچھے بچوں بوڑھوں اور جوانوں کا ایک ہجوم ہنستا ہوا' کودتا ہوا اور سرگوشیاں کرتا ہوا۔

عبدل مڑمڑا کر اپنے کھیتوں کو بھی دیکھ رہا تھا اور لوگوں کے ہجوم کو بھی۔

نمبردار کے گھر پہنچ کر عبدل کے آگے سماوار آ گیا۔ گلابی رنگ کی نمکین چائے کی خوشبوں اس کے نتھنوں سے گذر کر اس کی روح سے ٹکرائی۔ نمبردار نے کہا۔ "پی لو تم ابھی گرم ہو۔"

عبدل چائے پینے لگا۔ بچے' بوڑھے اور جوان ایک طرف کو بیٹھ گئے۔

نمبردار نے ایک صندوقچے سے کچھ کاغذات نکالے اور ایک کاغذ کو چٹائی پر پھیلا کر اس نے عبدل سے کہا۔ "یہ دیکھ لو نقشہ!" عبدل نے پیالی فرش پر رکھ دی اور پھٹی پھٹی نظروں سے نقشے کو دیکھنے لگا۔ ہلکے آسمانی رنگ کے کاغذ پر بے شمار لکیریں سیدھی' ٹیڑھی' الجھی ہوئی اور ایک دوسرے سے ملی ہوئی ایک جگہ انگلی رکھ کر نمبردار نے کہا "یہ تمہارے کھیت ہیں۔"

"یہ؟" عبدل نے حیران ہو کر پوچھا۔ اتنے چھوٹے؟

سب ہنس پڑے۔

نمبردار نے ہنس کر کہا۔ "اس عمر کو پہنچ کر بھی تمہیں زمینداری کا سلیقہ نہیں آیا صرف تاؤ کھانا سیکھ لیا ہے۔ یہ کاغذ ہے' زمین نہیں اور کاغذ پر کھیتوں کے ایسے ہی نشان ہوتے ہیں۔"

عبدل نے کچھ بھی نہ کہا۔ اور لوگ برابر ہنستے رہے۔ تھوڑی دیر کے بعد نمبردار نے پھر کہا۔ "یہ دیکھ لو رمضان ڈار کے کھیت ہیں' یہ سلام نائی کے' یہ تیلیوں کے

اور یہ تمہارے۔اب گاؤں والے چاہتے ہیں کہ ان کھتیوں کے اوپر سے نئی سڑک بنائی جائے۔''

''یہ نہیں ہوسکتا۔ میں اپنے کھیتوں کے اوپر سے سڑک کو گذرنے نہیں دوں گا۔'' عبدل نے تکرار کیساتھ کہا۔

نمبردار نے کہا۔'' یہ زبردستی نہیں' اپنی رضا کا کام ہے' جو چاہے گا' اس کے لئے اپنی زمین کا کچھ حصہ دے گا۔اور عاقبت کے لئے ثواب حاصل کرے گا۔''

سب نے نمبردار کی ہاں میں ہاں ملائی ۔''یہ سارے گاؤں کا معاملہ ہے 'یہاں کسی کو جھکنا پڑے گا اور جو نہیں جھکے گا اسے جکانا پڑے گا۔''

عبدلؔ کا پارہ پھر چڑھ گیا۔''کون جھکائے گا مجھے' یہ گنجا تیلی' وہ بوڑھا کھوسٹ ؟ یہ کل کا چھوکرا' جس کے منہ سے اب تک دودھ کی بو آرہ ہے' میں گیا گذرا ضرور ہوں مگر ابھی میرے ہڈیوں میں اتنی قوت ہے کہ آٹھ آدمیوں کو ڈھیر کرسکتا ہوں۔''

کمرے میں زور کا قہقہہ گونجا' ایک نوجوان نے طنزاً کہا۔کیا کہنے تمہارے قوت کے' سڑک کیلئے چند گز زمین نہیں دیتا اور ڈھیر کرنے چلا سارے گاؤں کو۔مجمع میں سے ایک اور نے عبدل سے ہمدردی ظاہر کرتے ہوئے نرم لہجے میں کہا۔......''بات سنو چاچا' گاؤں والے کسی پر ظلم نہیں کریں گے' تم چاہوں تو اس کا معاوضہ لے لو' ہم تمہارے لئے پیسہ پیسہ جمع کریں گے اور تمہیں دیں گے!''

''پیسہ لے لو۔'' عبدلؔ کے الفاظ میں غصّہ بھی تھا اور حقارت بھی'

''آج تک کس نے اپنے بیٹے بیچ کھائے ہیں؟''

''تو ادلا بدلی میں کھیت لے لو۔''اس نے بات سمجھاتے ہوئے کہا۔

''میرے کھیتوں میں سے جو تمہیں پسند ہوں وہ لے لو۔'' مجمع میں ایک عجیب قسم کی

حیرانی سی پھیلی۔ اتنا بڑا دل، اتنی بڑی قربانی۔ سب ایک دوسرے کی طرف دیکھتے رہے، لیکن عبدل پھر بھی نہ مانا۔ مجھے کھیت بھی نہیں چاہیئے، صرف اپنے بیٹے چاہیں جنہیں میں، میرا باپ، میرا دادا، میری سات پشتیں اپنے خون اور پسینہ سے پالتی آئی ہیں۔عبدل نے ضدی بچے کی طرح کہا۔

''تمہارا کہنا ٹھیک ہے چاچا، لیکن خود سوچ لو، جب نئی سڑک بنے گی تو گاؤں کی کایا پلٹ جائے گی، ہمارے ٹٹو شہر جاسکیں گے، ہمارے گاؤں تک ٹمٹم اور لاریں آئیں گی، ہمارے بچے نئے مدرسوں کو جائیں گے۔''

''میرا کوئی بچہ نہیں، میرے کوئی ٹٹو نہیں، میں اکیلا آیا ہوں اور اکیلا ہی جاؤں گا۔''عبدل اپنی ضد پر اڑ گیا۔

دُور سے ایک بوڑھے نے کہا۔''گاؤں کے بچے ہمارے بچے نہیں، جب بیمار پڑتے ہو تو تمہاری دیکھ بھال کون کرتا ہے؟ جب فصل کاٹتے ہو تو دھان کے گٹھے سر پر کون اٹھا کر لاتا ہے؟ جب کلوان کا موسم آتا ہے تو تمہارا ہاتھ کون بٹاتا ہے؟ اس وقت تم اپنے بے جان بیٹوں کو کیوں نہیں بلاتے؟ آج ہمارے بچے تمہارے بچے نہیں۔مگر جب وقت پڑتا ہے تو ان ہی کو سب کچھ کہتے ہے۔''

عبدل لاجواب سا ہو گیا۔اس نے تنگ آ کر کہا۔ مجھے سڑک نہیں چاہیئے۔
نمبردار نے کہا۔نہیں چاہتے تو نہ سہی لیکن جانتے ہو، اگلی نسلیں تمہیں کیا کہیں گی؟ وہ تمہاری قبر پر تھوکیں گے، تمہاری سات پشتوں کو گالیاں دیں گی اور کہیں گی، یہی وہ بدبخت ہے جس نے شالہ پور میں نئی سڑک نہیں بننے دی تھی۔جس نے اپنے بھائیوں اور بچوں، ماؤں اور بہنوں کی ان تکالیف کا احساس نہیں کیا جو برف میں انہیں مینڈھوں پر چلتے چلتے اٹھانا پڑتی تھیں، جس نے ہمیں دوسرے بھائیوں سے اس وقت ملنے نہیں دیا جب سب ایک دوسرے کے قریب آرہے تھے اور ہاتھ میں ہاتھ ڈالے آگے بڑھ

رہے تھے۔ جاؤ کھیت نہیں دیتے نہ سہی گاؤں میں سڑک بھی نہیں بنے گی۔ نمبردار کو غصہ آ گیا تھا، مجمع میں سے ایک نوجوان اٹھا۔ اس نے اس کے آگے حُقّہ رکھا اور وہ اسی انداز میں حُقّہ پینے لگا۔

عبدلؔ گردن جھکائے بیٹھا تھا اور لوگ ایک دوسرے کے ساتھ کانا پُھوسی کر رہے تھے۔ کم بخت کو لالچ نے اندھا بنا دیا ہے'' نہ ادلا بدلی میں کھیت لیتا ہے نہ پیسے اور نہ سڑک بننے دیتا ہے!''

''گاؤں میں اس کا حُقّہ پانی بند کرنا چاہیئے' یہ انسان نہیں' شیطان ہے!''

''ہمیں سڑک کا رخ بدلنا چاہیئے' ایک آدمی کی ضد سے سارا گاؤں کیوں نئی سڑک سے محروم ہو جائے۔''

''ہمارے بچے عمر بھر مدرسے کا منہ تک نہیں دیکھ سکیں گے۔ عبدلؔ نے ان کے مستقبل پر مہر لگا دی ہے!''

عبدلؔ زہر میں بجھے ہوئے یہ تیر کھاتا رہا اور چپ رہا۔ اور جب تھوڑی دیر کے بعد اس نے اپنی گردن اوپر اٹھائی تو اس کی سفید داڑھی آنسوئں میں ڈوب گئی تھی اور ایسے نظر آ رہی تھی جیسے خزاں زدہ باغ کے کسی کونے میں مکڑی کے پرانے جالے پر اوس گر گئی ہو۔ وہ ایک مستقل سوالیہ نشان بن گیا تھا۔ اُس کی رُوح اور جسم کے درمیان یک بڑا خلا پیدا ہو گیا تھا جس کے بیچوں بیچ وہ معلق تھا۔

''رو رہے ہو؟ ایک ہم عمر نے طنزاً پوچھا۔''

عبدلؔ نے کچھ بھی نہ کہا۔

''بالشت بھر زمین کے لئے آنسو؟ حیف ہے تمہاری زندگی پر' لوگ اپنے بھائیوں کے لئے دین اور دُنیا قربان کرتے ہیں اور تو مٹی کے چند ٹکروں کے لئے آنسو بہا رہا ہے۔''

عبدلؔ نے پھر بھی کچھ نہ کہا اور اس کا ہم عُمر بولا۔ ''اب اس دُنیا میں تمہارا ہے کیا؟ دو نہیں تو چار سال اور زندہ رہو گے اور پھر مٹی میں ایسے غائب ہو جاؤ گے جیسے تھے ہی نہیں۔ مگر جیتے جی نئی سڑک بنے گی تو سر اونچا کر کے چل سکو گے اور زمانہ اپنے سینے پر لکھے گا۔ اس سڑک کے نیچے جس پر آج آدمیوں اور گاڑیوں کا ہجوم چل رہا ہے، عبدلؔ کے کھیت ہیں، اس سڑک کے نیچے جس نے پسماندہ شالہ پور کے کسانوں کی کایا پلٹ دی ہے، عبدلؔ کی سات پشتوں کا خون پسینہ ہے۔''

عبدلؔ پھٹ پڑا۔ بس اب اور نہ کہو میاں دیوانہ ہو جاؤں گا۔ یہی کہتے کہتے وہ اٹھا اور گھر چلا گیا۔ صحن میں اس کا مریل سا بیل کوڑے کرکٹ کے ڈھیر پر اُونگھ رہا تھا ۔اس نے مالک کو آتے دیکھا۔ تو وہ اٹھ بیٹھا۔ عبدلؔ کو محسوس ہوا جیسے اس کی آنکھوں میں بھی آنسو ہیں۔ عبدلؔ آہستہ سے اپنا نخیف ہاتھ اس کی پیٹھ پر رکھا اور کہا۔ ''سندر اب کیا ہوگا' وہ ہم سے ہمارے بیٹے چھین رہے ہیں۔ سندر نے اپنی گردن اوپر اٹھائی جیسے کہہ رہا ہو' یہ کیسے ہوگا مالک۔؟''

عبدلؔ نے کہا۔ ''وہ کہتے ہیں یہ اگلی نسلوں کا معاملہ ہے' سڑک نہیں بنے گی تو وہ میرے قبر پر تھوکیں گی۔ عبدل کو محسوس ہوا جیسے سُندر کہہ رہا ہو' وہ سچ کہتے ہیں مالک' دُنیا ماضی کی آواز نہیں سنتی' مستقبل کی آواز سنتی ہے۔''

دن بھر عبدلؔ کو قرار نہیں آیا۔ وہ کبھی بھنوروں ڈُوبتا اور اُبھرتا رہا۔ شام کو گاؤں کے کہی بچے اُس کے گرد جمع ہو گئے'' چچا اب مدرسے کھلیں گے، ہم انگریزی پڑھیں گے اور حلقہ دار بنیں گے، تحصیلدار بنیں گے۔''

عبدلؔ نہ چاہتے ہوئے بھی بچوّں کی باتیں سن کر مسکرانے لگا۔ ''یہ منّہ اور مسور کی دال۔ تن پر لتا نہیں اور خواب دیکھ رہے ہو تھانے داری اور تحصلیدار کے......''

چاچا وہ کہتے ہیں' نئی سڑک بنے گی۔ تو لڑکوں کے الگ اور لڑکیوں کے الگ

مدرسے کُھلیں گے اور ہم سب پڑھا کریں گے، اسی طرح جس طرح شہر کے بچے پڑھتے ہیں۔

عبدل نے غیر ارادی طور پر کہا۔ ''ٹھیک ہے مجھے سب کچھ معلوم ہے۔''

بچے چلے گئے تو عبدل جیسے کانٹوں پر لوٹنے لگا۔ بچوں کی باتیں اُسے سارے کمرے میں گونجتی سنائی دیں۔ ''ہم سبق پڑھیں گے جیسے شہر کے بچے پڑھتے ہیں۔'' ہم تھانیدار بنیں گے، تحصیلدار بنیں گے۔

دُوسری صُبح سارے گاؤں میں اُس کے چرچے تھے۔ عبدل نے اپنے کھیت دے دیئے تھے۔

نئی سڑک پر کام شروع ہو گیا۔ کھیت ہموار ہو گئے، روڑی بچھ گئی، دن بھر سڑک پر گاؤں کے بچوں اور لڑکوں کا ہجوم لگنے لگا۔ لیکن جب سیاہ انجن چیخیں مارتا ہوا اور دھوئیں کے بادل اُڑاتا ہوا عبدل کے کھیتوں تک پہنچ گیا تو وہ پھر تڑپ اٹھا۔ اس نے لاٹھی اٹھائی اور چل دیا، جیسے اس کا زخم پھر کھل گیا ہو۔ آج وہ اپنے کھیتوں کی منڈھیں بھی نہ پہچان سکا۔ دور سے اسے ایسا نظر آیا، جیسے یہ کھیت نہیں ہیں، گدلے پانی کی ایک ندی دور سے آ کر سمیر پال کیطرف جاری ہے اور جس کے نیچے اس کے بیٹے ڈوب گئے ہیں۔ مزدوروں نے اسے بے مطلب گھومتے دیکھا تو کئی بار اُسے ڈانٹا، مگر عبدل خاموش رہا۔ اس کی روح جیسے مر چکی تھی، بچے اُسے بہلاتے رہے۔ ''چاچا نئی سڑک بن رہی ہمارے لئے۔ ہم اس پر چل کر مدرسے جایا کریں گے۔''

ایک بار جب انجن روڑی کو دباتا ہوا اس کے نزدیک پہنچ گیا تو اس سے نہ رہا گیا۔ اُس نے دونوں بازو پھیلائے اور سینہ تان کر انجن کے سامنے کھڑا ہو گیا...... ''اسے واپس لے جاؤ، اسے واپس لے جاؤ، میرے بیٹے اس کا بوجھ نہیں سہہ

سکیں گے' اسے واپس لے جاؤ۔ بچوں نے اُسے تھام لیا۔'' ایک طرف کو ہٹ جاؤ چاچا! انجن روڑی نہیں دبائے گا تو سڑک کچّی رہے گی اور ہم مدرسے نہیں جا سکیں گے۔

لیکن عبدل نہیں ہٹا۔ انجن سیٹی پر سیٹی بجاتا رہا۔ کام میں ہرج ہوتے دیکھ کر ٹھیکیدار کے آدمی نے اسے گھسیٹ کر سڑک سے پرے دھکیل دیا۔

بچے تڑپ اٹھے۔ انہوں نے ٹھیکیدار' اس کے آدمی اور نئی سڑک تک کو گالیاں دیں' چھوٹے چھوٹے بچے اپنے چاچا کی بے بسی پر بے اختیار رو پڑے اور یہ سب بڑے عبدل کو اٹھا کر لے گئے۔

عبدل کی پسلیوں میں چوٹ آ گئی تھی' اس کا سانس گھٹ رہا تھا۔ وہ گھر جاتے جاتے بھی نئی سڑک کو مڑ مڑا کر دیکھتا رہا۔ لیکن زبان سے کچھ نہ بولا۔ شام کو اسے بخار آ گیا۔ سر سے پاؤں تک وہ آگ میں جلنے لگا۔ گاؤں کے بچے' بوڑھے اور جوان اُس کے گرد جمع ہو گئے۔ لیکن جو ہمدردی' خلوص اور محبت بچوں کی حرکات سے ظاہر ہو رہی تھی وہ کسی سے ظاہر نہ ہوتی تھی۔ معلوم ہوتا تھا جیسے وہ خود بخار میں پُھنک رہے ہیں۔

کئی دن تک عبدل بستر پر پڑا رہا اور اس دوران میں سڑک بھی بنتی رہی۔ شالہ پور سے لے کے سمیر پال تک' بیماری کے دوران صرف بچے ہی بچے اُس کے گرد منڈلاتے رہے' اسے کی تیمار داری کرتے رہے۔ اسے سماوار میں گرم پانی ابال کر پلاتے رہے۔ پسلیوں پر تیل کی مالش کرتے رہے۔ اسی دوران میں پہلی بار برف بھی گری اور ساری وادی پگھلی ہوئی چاندی کے نیچے ڈھک گئی۔ شالہ پور بھی' سمیر پال بھی' نئی سڑک بھی اور ویران سے کھیت بھی۔ پھر یہی برف فولاد بن گئی۔ ندی اور نالے منجمد ہو گئے' کچی نالیوں میں شیشے بہنے لگے......

بیس دن کے بعد جب عبدل آ بستر سے اٹھا تھا تو علی الصباح وہ کھیتوں کی طرف نکلا۔نئی سڑک کے قریب پہنچ کر وہ کافی دیر تک اس کے کنارے کھڑا رہا اور دور تک سفید فولادی ندی کو دیکھتا رہا' جس پر بچوں کے چھوٹے چھوٹے پاؤں کے نشان اب تک موجود تھے اور ایسے دکھائی دے رہے تھے جیسے ناچ رہے ہوں......ہنس رہے ہوں۔معاً جانے اس کے دل میں کیا خیال آیا' وہ ننگے پاؤں سڑک کے وسط تک گیا اور آہستہ سے منجمد برف پر بیٹھا جہاں دو تین چھوٹے چھوٹے پاؤں کے نشان منجمد تھے' وہ ان پر جھک گیا اور ان کے بوسے لئے۔

جب وہ اٹھا تو اس کی روح آنکھیں اور اس کا مستقبل جیسے مسکرا رہا تھا جیسے لاکھوں اور کروڑوں بیٹوں سے بغل گیر ہو چکا ہو۔

............☆☆☆............

بہتے چراغ

مئی کا دوسرا ہفتہ ہے اور جہلم کے دونوں کنارے بے حد حسین نظر آ رہے ہیں۔ سیاحوں کی غیر معمولی آمد نے اس سال انہیں وقت سے پہلے ہی شباب اور حُسن بخشا ہے، ہر ہاؤس بوٹ میں قہقہے ہیں، روشنیاں ہیں، خوشبوئیں ہیں اور نغمے ہیں اور ان کیساتھ لگے ہوئے کچھ بوٹوں سے سیاہ دھواں بے ترتیبی سے یوں اٹھ رہا ہے جیسے کسی رنگین وادی میں عیش پرستوں کیساتھ ساتھ کوئلہ نکالنے والے مزدور آوارہ پھر رہے ہوں۔

کناروں پر کہیں کہیں چناروں کے نیچے بڑی بڑی چھتریاں نصب ہیں، کہیں سبزے کے چھوٹے چھوٹے خطوں میں میز کرسیاں لگی ہوئی ہیں اور کہیں درختوں کے جھنڈ میں جھولے پڑے ہوئے ہیں۔ ہندوستان کی آزادی کے بعد اگرچہ جہلم کا حسن کم نہیں ہوا، مگر اس میں مشرقیت بہت زیادہ آ گئی ہے۔ پاندان، تھوک دان، جھولے، چوکیاں اور نہانے کے لوٹے جگہ جگہ ظاہر ہو گئے اور ان کیساتھ ہی تھوڑی بہت بدتمیزیاں بھی، پیشاب اور غلاظت کی، کوڑے کرکٹ اور چھلکوں کی، مگر اس کے باوجود جہلم جوان ہے، اس کی خاموشی حسین ہے، اس کا بہاؤ سنجیدہ ہے۔

سیاسی کروٹ کا یہ نتیجہ ملہ قادر کی سمجھ میں بہت پہلے آ چکا تھا۔ مگر اسے امید نہ تھی کہ یہ سب کچھ اتنی جلدی ہوگا اور جہلم کے بالائی حصے سے مغربیت کا غازہ اتر کر

اس پر مشرقیت کا معصوم حسن غالب آجائے گا۔ اس کا اپنا ہاؤس بوٹ تھا۔ لوٹس کوئین (lotus queen) جس کے ہر کمرے میں مغرب کی تصویریں تھیں واٹرلو کی لڑائی کی تصویریں، فرانسیسی شکار گاہوں اور رقاصاؤں کی تصویریں، افریقہ کے بعض جانوروں اور حبشی غلاموں کی تصویریں، خدا جانے یہ تصویریں اس نے کہاں کہاں سے حاصل کی تھیں، مگر جو بھی غیر ملکی سیاح اسے کے بوٹ میں رہتا تھا۔ وہ ملہ قادر کے مذاق اور حسن انتخاب کی داد دیتا تھا آج اسی بوٹ میں ایک بنگالی جوڑا رہتا تھا۔ پر پھول اور اس کی بیوی نلنی۔ پر پھول فوج میں کپتان تھا اور تین مہینے کی چھٹی پر آیا ہوا تھا۔ وہ پچھلی جنگ عظیم میں نازیوں اور جاپانیوں کے خلاف کئی محاذوں پر لڑا تھا، اس کی ٹانگوں پر اب بھی زخموں کے کئی نشان تھے۔ مگر اب اسے جنگ سے نفرت ہوگئی تھی۔ اس کی آنکھوں نے لاکھوں بے گناہوں کو موت کی نیند سوتے دیکھا تھا، لہلہاتے ہوئے کھیتوں کو وحشت ناک بم باری سے خاکستر ہوتے دیکھا تھا اور انسانی خون......اس کا تو کوئی حساب ہی نہ تھا۔ یہ پانی سے سستا ہو کر بہا تھا، پر پھول کا خیال تھا کہ جنگ کے خاتمہ کے بعد ساری دُنیا میں امن قائم ہوگا۔ مگر ابھی جنگ کے شعلے پوری طرح سے بجھنے بھی نہ پائے تھے کہ تیسری جنگ کی چنگاریاں سلگنے لگیں اور وہی لوگ اسے ہوا دینے لگے جو کل تک دائمی امن کی دُہائیاں دے رہے تھے۔ سیاسیات کے اسی ہیر پھیر نے پر پھول کو جنگ سے متنفر کر دیا۔ سنجیدہ اور خاموش طبع ہونے کی وجہ سے وہ اپنے خیالات کا کسی سے اظہار نہ کرتا، البتہ جب شام کو ''لوٹس کوئین'' کی چھت پر میاں بیوی چائے پینے بیٹھتے تو پر پھول امن کی ضرورت پر ایک آدھ فقرہ کہہ ہی ڈالتا، امن انسانیت کا زیور ہے، امن ترقی کی شاہراہ ہے، امن محبت کا شیرازہ ہے۔ یہ بکھر جائے تو انسانیت کچن بوٹوں سے اٹھتے ہوئے دھوئیں کی طرح آوارہ ہو جاتی ہے، اسے اپنے بڑوسی سے بے حد نفرت تھی جو ان کے ساتھ ہی دوسرے بوٹ میں اپنے آدرجن

بچوں کے ساتھ رہتا تھا۔ بمبئی میں یہ شخص کپڑے کا کاروبار کرتا تھا۔ دوسری جنگ عظیم میں اس نے لاکھوں روپے کمائے تھے مگر جب سے ہندوستان کو آزادی ملی تھی، اس کا کاروبار مندہ پڑ گیا تھا۔ وہ کبھی کبھی پرپھول سے پوچھتا۔ سنا ہے کپتان صاحب ! جنگ ہونے والی ہے۔

پرپھول نفرت آمیزہ ہنسی کے ساتھ کہتا۔ ''جنگ نہیں ہوگی سیٹھ جی، اب جنگ کا کوئی امکان نہیں، کم از کم ہمارے ہندوستان میں نہیں۔''

پرپھول کا یہ جواب اسے بہت ناگور گذارتا۔ پھر بھی اس کا مذاق اڑاتے ہوئے وہ کہتا۔ ''جنگ ہوگی تو ہندوستان کیسے بچ سکے گا؟''

''اس لئے کہ ہندوستان گاندھی جی کے اصولوں پر چل رہا ہے۔''

سیٹھ یہ جواب سن کر قہقہہ لگاتا۔ ''ہندوستان بچے یا نہ بچے بھاؤ ضرور چڑھ جائیں گے کپتان صاحب!''

''ایسا نہ کہیں سیٹھ جی، لوگوں میں اب بھاؤ سہنے کی قوت نہیں۔''

''پیسہ بڑا چلتا ہے کپتان صاحب جنگ میں !'' سیٹھ بڑے رازدارانہ انداز میں کہتا۔

''امن میں اس سے بھی زیادہ چلے گا سیٹھ جی، آپ نے صرف جنگ کا زمانہ دیکھا ہے، امن کا نہیں دیکھا ہے۔''

''خاک چلے گا امن میں، جیسے ہم نے انگریزوں کے زمانے میں امن دیکھا ہی نہیں۔'' سیٹھ سن کر کہتا۔

پرپھول کی سوچیں اس جواب سے بھٹک جاتیں۔ اجلے کھدر کے لباس میں ملبوس سیٹھ اندر سے کیا تھا اور باہر سے کیا اور سیٹھ پھر کہتا۔ ''جنتا کو خوش حال ہونا ہے تو ایک جنگ اور ہوتی چاہیے۔ ابھی آپ کو معلوم نہیں کہ جنگ سے کیا کیا فائدے ہوتے

ہیں۔"

"جنگ سے خون بہتا ہے سیٹھ جی!" پرپھول غصے میں کہتا اور اسی خون کی تجارت سے آپ لاکھوں کماتے ہیں۔

"ہم تجارت نہیں کرتے، جنتا کی سیوا کرتے ہیں، کارخانے چالو رکھتے ہیں تاکہ لوگوں کو کپڑا ملتا رہے۔"

پرپھول اس پر قہقہہ لگاتا۔ وہ قہقہہ جس میں جنگ کے اس دعا گو کے خلاف بے پناہ نفرت پوشیدہ ہوتی۔

اس دوران میں ملہ قادر، پرپھول اور اس کی بیوی کی زندگی کا ایک اہم جزو بن گیا۔ وہ انہیں ہر شام کشمیر کے ماضی کی کہانیاں سناتا۔ بڈشاہ اور للتادتیہ کی کہانیاں، لل عارفہ اور شیخ العالم کی کہانیاں، حبہ خاتون اور ارنہ مال کی کہانیاں ......وہ کہانیاں جن میں محبت ہی محبت اور امن ہے امن ہے۔ چنانچہ ساٹھ سالہ بوڑھا ہانجی بھی انہیں اوپر سے نیچے تک امن اور محبت کا مجسمہ دکھائی دے رہا تھا جس کے دل میں غیریبی کے باوجود لالچ نہیں، وہ جو کچھ بوٹ کے کرایے سے کماتا، اس پر قانع تھا۔ حالانکہ یہ کمائی اس کے بچون کی تعداد کے مقابلے میں بہت کم تھی۔ ملہ قادر ہر وقت شکایت کرتا کہ قدرت نے اولاد کے معاملے میں اس سے انصاف نہیں کیا ہے۔ اسے اتنے بچے دئے ہیں جو موسم سرما میں اکثر ننگے رہتے ہیں اور موسم گرما میں بھوکے، مگر وہ ابھی مایوس نہیں۔ یہ اخروٹ کے بوٹے ہیں بی بی جی!" وہ بڑے اعتماد سے کہتا۔" جو چند برس کے بعد پھل دینا شروع کر دیں گے۔

پرپھول کی بیوی بوڑھے ہانجی کے اُس اعتماد سے بہت متاثر ہوئی تھی۔ مگر وہ اپنے دل کی بات کا اظہار نہ کر سکی تھی، اس کی شادی کو چھ برس ہو چکے تھے، لیکن اب تک اس کی گودی ہری نہیں ہوئی تھی اور یہ کانٹا آہستہ آہستہ اس کی جوان روح میں پیوست

ہو رہا تھا۔

ایک شام پر پھول کہیں باہر گیا ہوا تھا۔ نلنی بوٹ میں اکیلی تھی۔ آسمان پر تیرتے ہوئے چاند کی دودھیا روشنی بہتے پانی پر تھرک رہی تھی۔ ملہ قادر نے کہا۔ ''یہ دریا نہیں ہے بی بی جی' یہ ہماری ماں ہے' مائج ویتھ!''

''ماں!'' نلنی چونک اٹھی......اور ملہ قادر نے پھر کہا...... ''لیکن ہمیں اس سے شکایت ہے' اس نے آج تک ہمیں اپنی چھاتیوں کا دودھ نہیں پلایا' ہاں اوروں کے دامن بھر دیئے۔''

''وہ کیوں؟......نلنی نے ہنس کی پوچھا۔''

''یہ معلوم نہیں کیوں'' لوگ کہتے ہیں' ہمیں مانگنے کا سلیقہ نہیں' مگر آپ بھی تو ماں ہیں' آپ ہی کہتے ان کی بات ٹھیک ہے؟''

نلنی کے چہرے پر ہلدی سی پھیل گئی جیسے اس کی روح میں تیز کانٹا چبھ گیا ہو اور بوڑھے نے پھر کہنا شروع کیا۔ ''یہ ہم سے روٹھ گئی ہے' اس لئے یہ اوروں کو سب کچھ دیتی رہی ہے اور ہم سے بے نیاز ہے مگر آپ ہی بتایئے' ہم کر ہی کیا سکتے تھے؟''

نلنی کا چہرہ پسینے سے شرابور ہو گیا' ملہ قادر کے انکشاف میں اسے ایک امید سی دکھائی دی۔ اس کا حرف تمنا ہونٹوں پر آتے آتے پلٹ گیا۔ خُدا جانے یہ بوڑھا سچ کہتا ہے یا نہیں اور بوڑھے نے پھر کہا۔ مگر اب ہم نے فیصلہ کیا ہے' ہم اس سے سب کچھ لیں گے' اب اس کی آغوش ہماری ہے' اب اس کا سارا پانی ہمارا ہے' اب ہم اس سے نہریں نکالیں گے اور اپنے ویران کھیتوں کو سیراب کریں گے ہم اس سے بجلی نکالیں گے اور گھر گھر ماں کے پیار کی روشنی پہنچائیں گے یہ کشیپ رشی بیٹھ ہے!

کشیپ رشی......؟

''ہاں بی بی جی! آپ نے نہیں سنا ہے' ہمارا ملک پانی میں ڈوبا ہوا تھا پھر

کشیپ رشی اٹھا اور اس ملک کا سارا پانی بارہمولے کے راستے سے باہر نکالا۔''

نلنی بے اختیار ہنس پڑی۔''یہ کہانی ہے اور ہمارے بنگال میں ایسی سینکڑوں کہانیاں چلتی ہیں۔''اس نے کہا......''کہانی!''بجز ایہ سچ ہے۔ ملہ قادر قسمیں کھانے لگا۔''آپ گھی کا ایک چراغ جلا کر اس میں بہا دیجئے!''پھر دیکھئے ہماری ماں' آپ کی مراد کیسے پوری کرتی ہے' یہ میں نے اپنے بزرگوں سے سنا ہے۔'' نلنی کی ہنسی حیرت میں بدل گئی۔''گھی کا ایک چراغ! اس نے پوچھا۔

''ہاں ہاں بی بی جی' ایک چراغ!''

نلنی کا حرف تمنا ایک متلاطم دریا کی طرح ہونٹوں کے کنارے توڑ کر امڈ آیا جسے وہ اب تک بڑے ضبط سے روکے ہوئے تھی۔ اس نے کہا۔''بابا''

''ہاں بی بی جی!''

''تمہیں معلوم ہے' ہمارے ہاں کوئی اولاد نہیں۔''نلنی کے الفاظ میں عاجزی اور بے بسی تھی۔

ملہ قادر کی آنکھیں کھلی کی کھلی رہ گیئں۔''کوئی اولاد نہیں!''

''میری ساس کے بھی کوئی بچہ نہ تھا۔ نلنی نے کہنا شروع کیا۔''پھر اس نے ان پورنا کی منت مانی اور تمہارا کپتان پیدا ہوا' تم ٹھہرو' میں تمہیں اپنی ساس کی تصویر دکھاتی ہوں۔ وہ عورت نہیں تھی' دیوی تھی۔ نلنی اندر چلی گئی اور دوسرے ہی لمحے میں ایک پرانی تصویر لے کر باہر نکلی۔

ملہ قادر نے تصوری دیکھی تو حیران رہ گیا۔ یہ۔ یہ کون ہے بی بی جی؟

''یہ کپتان کی ماں اور میری ساس ہے!''

''آپ مذاق کرتی ہیں بی بی جی' یہ عورت ہوتی تو اس کا سر منڈھا ہوا نہ ہوتا۔ یہ کوئی جوگی ہے۔''نلنی ملہ قادر کی سادگی پر ہنسی اور بولی۔''بنگال میں جس عورت

کا خاوند مر جاتا ہے، وہ اپنے سر کے بال منڈوا دیتی ہے۔"

"دوسری شادی نہیں کرتی؟" ملہ قادر نے پوچھا۔

"نہیں۔ ہمارے ملک میں اس کا رواج نہیں، خیر چھوڑ دو ان باتوں کو، تم دیکھتے ہو کپتان کو اس کی کوئی پروا نہیں۔ نلنی نے اپنا مطلب بیان کرتے ہوئے کہا۔ مگر ایک بچے کے بغیر عورت کی زندگی بے کیف ہے۔"

"میں سمجھ گیا بی بی جی، آپ کل شام کو نہا کر گھی کا ایک چراغ دریا میں بہا دیجئے خُدا آپ کی مراد پوری کرے گا۔ دس برس پہلے یہی چیز ایک انگریز کی بیوی نے بھی کی تھی اور دوسرے سال ان کے بچہ ہو گیا۔ انہوں نے وہیں سے مجھے پچاس روپے انعام بھیج دیئے۔ اللہ خوش رکھے، بڑی نیک جوڑی تھی، انہوں نے بھی چراغ جلا کر بہایا تھا۔"

"سچ کہتے ہو؟" نلنی نے حیران ہو کر پوچھا۔

"ہاں بی بی جی، بخُدا جھوٹ نہیں ہے!"

رات کو پرپھول نے یہ کہانی سنی تو وہ دیر تک ہنستا رہا۔ "عورتیں بڑی توہم پرست ہوتی ہیں۔" اس نے کہا۔ جو دریاؤں سے بچے مانگتی ہیں۔

نلنی اندر ہی اندر شرمندہ ہو گئی۔ پرپھول کی باتوں نے اُس کے رجحان پر زبردست چوٹیں لگانی شروع کیں۔ مگر ان پورنا نے بھی تو ماں کی مراد بوری کی تھی۔ نلنی نے ہمت کر کے پوچھا۔

مجھے اس بھی اعتماد نہیں ڈارلنگ، دُنیا بہت آگے نکل چکی ہے، اب افسانوں کا زمانہ نہیں، حقیقتوں کا زمانہ ہے اور پھر آج کے زمانے میں بچے؟ جو ہمارے جنگ پسند پڑوسی کے لئے اپنا خون بہا کر دولت پید کریں، جو لاکھوں کی تعداد میں کٹ مریں اور درجن بھر ہوس کاروں کی امیدیں پوری کریں؟۔

بات آئی اور گئی مگر نلنی رات بھر نہ سو سکی۔ اُس نے دریا کی طرف کی کھڑکی کھول دی ور پلنگ پر لیٹے لیٹے ہی بہتے پانی کو دیکھتی رہی، آسمان کی وسعتوں میں چاند تیر رہا تھا اور نیچے جہلم کے دونوں کنارے نیند کے خمار سے بوجھل تھے۔ گھاٹوں سے لگے ہوئے بوٹ ایسے دکھائی دیتے تھے جیسے نیند کی مستی میں کوئی حسینہ اپنے بازو بستر سے باہر نکالے سو رہی ہو۔ درختون سے چھو کر ہوا ایسے چل رہی تھی جیسے کوئی دوشیزہ چنار کی چھاؤں میں اپنا ریشمی دوپٹہ سکھا رہی ہو۔ نلنی کو محسوس ہوا جیسے اسخاموش نیلے پانی میں سچ مُچ کچھ بخشنے کی صلاحیت ہے۔ صبح کے وقت اُس کی آنکھ لگ گئی اور جب وہ جاگی تو سورج دو نیزے اوپر آ چکا تھا، پر پھول منہ میں سگریٹ دبائے ایسے ہنس رہا تھا جیسے اس کی توہم پرستی کا مذاق اڑا رہا ہوا۔ وہ حجامت سے فارغ ہو چکا تھا اور اپنے ناشتے کا انتظار کر رہا تھا۔ ''آج بہت دیر تک سوئی ہو؟'' اس نے پوچھا۔

نلنی شرما گئی، واقعی دن بہت چڑھ آیا تھا۔

''اب کیا ارادہ ہے؟'' پر پھول نے دوسرا سوال کیا۔

''بہادوں گی!'' نلنی نے ہلکی سی مسکراہٹ کیساتھ کہا۔ بوڑھا کہتا تھا، ایک انگریز کی بیوی کو بھی جہلم نے بچہ دیا تھا۔

''non sense!'' پر پھول نے ہنس کر کہا۔ ''گھی کے چراغوں میں اتنی جان ہوتی تو میں ہر روز امن کے لئے سینکڑون چراغ جلا جلا کر بہا دیتا!''

نلنی نے اس کا کوئی جواب نہ دیا۔ اس کا فیصلہ اٹل تھا۔ شام ہونے سے پہلے ہی وہ نہا دھو کر فارغ ہو گئی اور جب ملہ قادر آ گیا تو وہ بہت خوش ہوا۔ نلنی نے گھی کا چراغ تیار کر رکھا تھا۔

پر پھول بوٹ کی چھت پر تماشہ دیکھتا رہا اور نلنی نے بوڑھے ہانجی کی ہدایت کے مطابق گھاس کے دائرے پر جلتا ہوا چراغ دریا میں بہا دیا اور دل ہی دل میں بچے

کے لئے دعائیں مانگتی رہی۔

چراغ پانی کی سطح پر بہتا گیا۔ سیٹھ کے بچوں نے بہتا چراغ دیکھا تو شور مچانے لگے۔ سیٹھ دھوتی کو زور سے تھامنے ڈیک پر نکلا۔ کیا بات ہے؟ وہ زور زور سے پوچھنے لگا۔ معاً اس کی نظر پر پھولؔ پر پڑی۔ کپتان صاحب یہ کیا تماشہ ہے؟ اس نے پوچھا۔

''یہ نلنی نے بہایا ہے سیٹھ جی' اسے بہنے دیجئے۔ پر پھولؔ نے وہیں سے جواب دیا۔''

''مگر کیوں؟ کچھ پتہ تو چلے!'' سیٹھ نے گھبرا کر پُوچھا۔

''دوسرے ہانجی نے سیٹھ کے کان میں کچھ کہدیا جس سے اس کی آنکھوں میں بے پناہ حیرانیاں چھا گیئں۔''

''یہ بات ہے......وہ بار بار کہنے لگا۔ تب تو ہم بھی جلائیں' اپنے' کاروبار کے لئے!'' وہ یہ کہہ کر جلدی سے بوٹ کے اندر داخل ہو گیا اور دوسری شام جب سیٹھ کا جلتا چراغ بہنے لگا تو بوٹ کی چھت سے پر پھولؔ نے چراغ کو اپنے پستول کا نشانہ بنا دیا۔ ماحول میں ایک گونج پیدا ہوئی۔ چراغ دریا میں ڈوب گیا' البتہ گھاس کا دائرہ پانی کی سطح پر بہتا رہا۔

اس پر بڑا ہنگامہ ہوا۔ سیٹھ جی بہت زیادہ برہم ہو گئے۔ وہ وہیں سے پر پھولؔ کو گالیاں دینے لگے......''بزدل کہیں کا' کائر' زن پرست!'' پر پھولؔ چھت پر کھڑا ہنستا رہا اور جب سیٹھ جی کا غصہ ٹھنڈا پڑ گیا تو اس نے کہا۔''اب آپ کی چراغ نہیں جلیں گے' سیٹھ' دُنیا کو امن کی ضرورت ہے!''

............☆☆☆............

سچی پرارتھنا

لالہ دُرگا داس کو فوت ہوئے دو سال گزر چکے تھے۔ وہ اتنی حیثیت کا مالک نہ تھا کہ اس کا چار سالہ بچہ اور نو جوان بیوی اس پر زیادہ دیر گزارہ کر سکتے۔ بیچاری لجاوتی جس کے کئی رشتہ دار آسودہ حال تھے، مگر اس وقت کوئی بھی مددگار نہ تھا۔ اپنی زندگی اور اپنے اکلوتے بیٹے کے مستقبل کا خیال کر کے اکثر رویا کرتی۔ کبھی دل میں ٹھان لیتی کہ اپنے بھائیوں کے پاس جاؤں یا کسی رشتہ دار سے مدد طلب کروں۔ کسی کے آگے ہاتھ دراز کرنا اس کی غیرت اجازت نہ دیتی۔ اس کے خاوند کا سرمایہ، جو سرکار کی طرف سے اس کے فوت ہونے کے بعد ملا تھا...... اب ختم ہونے لگا تھا۔ اسے تمام دنیا تاریک نظر آرہی تھی۔ ہر طرف سے نا امیدی ہی نا امیدی دکھائی دیتی تھی۔ جائیداد منقولہ و غیر منقولہ بھی اس قدر نہ تھی کہ اس کو فروخت کر کے اپنے مصیبت کے دن کاٹ سکتی۔ اس نے اپنے ننھے بچے کو گود میں اٹھالیا۔ بچے کے معصوم چہرے پر نگاہ پڑتے ہی لجاوتی کو دو سال پیشتر کا زمانہ یاد آیا۔ آہ وہ بچہ بھی ایشور سے رشوت دے کر لیا تھا۔ اب روٹی کیلئے ترستا ہے۔ اس کی آنکھوں سے بے اختیار آنسو برسنے لگے۔ اس نے پرائیویٹ نوکری کیلئے بہت تلاش کی۔ سینکڑوں گھروں میں روز جاتی اور شام کو پھر اپنے بچے سمیت گھر واپس آجاتی۔ مگر ہر طرف سے کورا جواب ملتا۔ آخر بڑی کوششوں سے ایک جوفروش کی دکان پر دانے صاف کرنے پر ایک جگہ مل گئی۔ اب لجاوتی جو کبھی شاہانہ

زندگی بسر کرتی تھی۔ ایک بھکاری کی طرح صبح گھر سے نکلتی اور آفتاب کے غروب ہونے کے بعد کچھ ٹکے لیکر واپس آتی۔ آہ وہ بھی وقت تھا، جب اس کے ہاں کئی سادھو سنیاسی اور حاجت مند لوگ فیض یاب ہوتے تھے۔ لیکن گردش فلک نے یہ حال کر دیا کہ وہ خود اوروں کے دروازوں پر روٹی کو ترسی ہے۔ دکان پر وہ اپنے بچے کو بھی ساتھ لیتی۔ بچہ دن بھر بازار میں لڑکوں کے ساتھ کھیلتا۔ ماں اپنے خون پسینہ کو اناج صاف کرنے میں بہاتی۔ اس کی مستقبل کی تمام امیدیں ننھے کرشن کی ہستی سے وابستہ تھیں۔ وہ اتنی محنت اور ایسی مصیبت پر کم ہمت نہ ہوتی تھی کیونکہ وہ بخوبی سمجھتی تھی کہ دنیا میں رنج وراحت ایک گول پہیے کی طرح پھرتے ہیں۔ جن کا سایہ ہر شخص پر یکساں اپنے اپنے وقت پر پڑتا ہے۔

دیپ مالا کا دن...... ہر طرف سے چہل پہل تھی۔ حلوائیوں، آتش بازوں اور تصویر فروشوں کی دکانیں عروسِ نو کی طرح بنی ٹھنی ہوئی تھیں، ہر شخص خوش خرم دکھائی دیتا تھا۔ غریب لجاوتی آج بھی حسب معمول اپنی دکان پر چلی گئی۔ دیپ مالا کی رونق اور شہروں کی سجاوٹ دیکھ کر اس شیشۂ دل پر ٹھیس لگی، اس کی آنکھوں سے دریا بہہ نکلا۔ آہ یہ وہی دیپ مالا ہے جو میں بھی کبھی اپنے پتی کی موجودگی میں بڑی شردھا اور خوشی سے مناتی تھی۔ آہ آج میں بشاش ہوتی تھی۔ میرا گھر آج شام کے وقت چراغوں کی روشنی سے کیسا بقعہ نور بنا ہوتا تھا۔ آہ آج بھی دن ہے اور وہی میں ہوں۔ صرف قسمت کا پھیر ہے لکشمی دیوی تیری بڑائی کو میں نمسکار کرتی ہوں۔

شام ہوئی۔ لجاوتی کو سیٹھ صاحب کی بیوی نے بلایا۔ وہ ننھے کرشن کو لے کر چلی گئی۔ سیٹھانی نے پوجا پاٹ کر کے کچھ میٹھائی اور پیسے لجاوتی اور کرشن کو دے دیئے۔ لجاوتی نے نہایت عاجزی سے یہ لے لئے اور گھر کو روانہ ہوئی۔

بازار کی دھوم دھام دیکھ کر کرشن حیران ہوا۔ اس کو معلوم نہ تھا کہ آج کا دن

کس لئے اتنی شان سے منایا جارہا ہے۔ بازاروں میں غیر معمولی بھیڑ بھاڑ، سجاوٹ اور آراستگی دیکھ کر اس نے اپنی ماں سے پوچھا۔

''اماں جان۔ آج اس وقت یہ لوگ کدھر جا رہے ہے۔ انہوں نے نئے کپڑے پہنے ہوئے ہیں۔ وہ دیکھو۔ دکانوں پر کیسی مٹھائیاں بکتی ہیں۔ وہ بچے کس طرح مٹھائی خریدتے ہیں۔ کوئی موم بتیاں خریدتا ہے۔ کوئی پٹاخے لیتا ہے۔ کوئی آتش بازی کا سامان لیتا ہے۔ اماں مجھے بھی پیسے دو۔ میں بھی انہی کی طرح مٹھائی، پٹاخے اور موم بتیاں خریدوں۔ دیکھو میرے کپڑے کتنے میلے ہیں۔ تم نے مجھے بھی کیوں نئے کپڑے نہیں پہنائے''۔

کرشن کے منہ سے یہ الفاظ نکلے ہی تھے کہ لجاوتی کی آنکھوں سے گنگا جمنا بہہ گئی۔ اس کے پرانے زخموں پر نمک پاشی ہوگئی۔ اس کا دل گو کہ مصیبت آموز تھا مگر بچے کے الفاظ اور خواہشات، جن کیلئے وہ کسی زمانے میں روپیہ پانی کی طرح بہاتی تھی، سن کر تاب نہ لاسکی۔ وہ ہچک ہچک کر رونے لگی۔ اپنے دل کو ذرا تقویت دے کر اس نے کرشن کو گود میں اٹھالیا۔ اور بوسہ لیکر کہا۔

''میری آنکھوں کے تارے آج دیپ مالا کا دن ہے آج لکشمی جی کی پوجا کرتے ہیں۔ دیوی مٹھائیوں، پٹاخوں، اور موم بتیوں سے خوش نہیں ہوتی۔ وہ صرف پرارتھنا سے خوش ہوتی ہے۔ ہم بھی گھر پہنچ جائینگے۔ تو وہاں لکشمی جی کی پوجا کریں گے۔ یہ دیکھو۔ سیٹھ کے گھر سے جو پتاسے ملے ہیں۔ ہم ان کو دیوی پر بھینٹ چڑھائیں گے۔ وہ سب سے زیادہ ہم سے خوش ہوگی''

بچوں کا دل کسی دلچسپ چیز اور خصوصاً کھیلنے والی چیزوں پر آتا ہے تو وہ کب

اپنے ماؤں کے ایسے حیلے بہانے سننے کو تیار ہوتے ہیں۔ بلکہ ایسے حیلوں سے ان کی ضد اور بھی زور پکڑ جاتی ہے۔

کرشن کو نہ ماننا تھا، نہ مانا۔ وہ اپنی ضد پر بدستور اڑا رہا۔ اور سر بازار اتنا رویا کہ اس کی سسکیاں بند نہ ہوتی تھیں۔ اسے کیا علم تھا کہ میری ماں تنگ دست اور پیسے پیسے کی محتاج ہے، وہ مجھے کھلونا دینے کے قابل نہیں ہے۔

بچے کا یہ حال دیکھ کر ماں نے بہت ضبط کیا لیکن ماں کے آنسو بھی نہ رکے۔ وہ معنی خیز نگاہوں سے آنے اور جانے والوں کی طرف دیکھتی۔ اس کی آنکھیں بذات خود اسکی محتاجی کی ترجمان تھیں۔ اس نے اپنی پھٹی ساڑی سے سیٹھ جی کے پیسے نکالے اور بچے کو دیکھ کر کہا "یہ لو پیسے۔ آؤ تم کو پتاسے اور موم بتیاں خرید کر دیتی ہوں" پیسے کی صورت دیکھ کر کرشن چپ ہو گیا۔ اس کے چہرے پر مسرت آ گئی۔ ماں نے اس کو ہاتھ سے پکڑا اور ایک دکان سے موم بتیاں اور پتاسے خرید کر گھر روانہ ہو گئے ۔ کرشن کو خوش دیکھ کر اس کا دل بھی مسرت کے جزبے سے لبریز ہو گیا۔

گھر پہنچ کر کرشن نے لکشمی کی تصویر جو ایک کمرے میں آویزاں تھی، اتروادی اور مٹھائی پتاسے اس کے آگے رکھ کر موم بتی روشن کی۔ ماں کی ہدایت کہ لکشمی جی صرف پرارتھنا سے خوش ہوتی ہیں۔ اس کے دل پر نقش ہو گئی تھی۔ اس نے آنکھیں بند کر کے بھولے بھالے الفاظ میں دیوی کی پرارتھنا کی۔ اور جو پرارتھنا ماں نے راستے میں اس کو سکھائی تھی، لفظ بہ لفظ پڑھی۔ آنکھیں کھولی اس کے چہرے پر ایک نورانی چمک تھی۔ اس کا دل بشاش تھا۔ اس کے ضمیر کو تسکین حاصل ہو چکی تھی۔ گویا معلوم ہوتا تھا کہ دیوی اس کی پرارتھنا سے پرسن ہوئی ہے۔

دن گزر گئے۔ مہینے گزر گئے۔ اور مہینوں سے سال گزر گئے۔ کرشن کو کو بھی پانچ سال کی عمر میں مکتب میں بٹھایا گیا تھا۔ اگرچہ وہ غریب تھا مگر اس کی تقدیر غریب

نہ تھی۔اس کے خوبصورت چہرے سے معلوم ہوتا تھا کہ اس کی خفیہ تقدیر کسی نہ کسی دن بیدار ہوگی۔اور یہ غریب بچہ جو آج روٹیوں کو ترستا ہے۔کسی دن سورج کی طرح اپنے علم و ہنر سے دنیا کو منور کر دے گا۔

امسال اس نے انٹرنس کا امتحان دے دیااور یونیورسٹی میں اول نمبر پر رہا۔ایسی شاندار کامیابی پر یونیورسٹی نے کرشن کیلئے وظیفہ مقرر کر دیا۔کرشن کی بھی خواہش تھی کہ کالج میں داخلہ ہو۔وظیفہ مقرر ہو جانے سے اس کی خواہش مستحکم ہو گئی۔وہ کالج میں داخل ہوا۔اوراسکول کی طرح اس نے کالج میں بھی بہترین کامیابی حاصل کی۔کوشش کر کے وہ کئی طلباء کا پرائیوٹ اتالیق مقرر ہو گیا۔اور وہاں سے بھی کافی معاوضہ ملتا رہا۔ماں کو خرچہ دینے کے علاوہ وہ خود بھی اچھی طرح گزارہ کرتا رہا۔

گو وہ ابھی آرام کی زندگی بسر نہیں کرسکتا تھا۔مگر کچھ سال قبل جیسی حالت بھی نہ تھی۔اس کی ماں نے جوفروش سیٹھ کی نوکری ترک کر دی۔وہ کرشن کے وظیفہ پر ہی گزارہ کرتی رہی۔کرشن نے دن دوگنی رات چوگنی ترقی کی۔

ایم اے کے امتحان میں بھی وہ حسب معمول اول رہا۔یونیورسٹی نے اس قابل ہونہار نوجوان کو گورنمنٹ کالج میں پروفیسری کی آسامی پر مقرر کیا۔

کرشن کمار کی شادی ہو چکی تھی۔اس نے شہر سے دور ایک عمدہ ہوادار بنگلہ کرایہ پر لے لیا تھا۔نانی کی گود میں دو ننھے بچے بھی کھیل رہے تھے۔لجاوتی اپنے بیٹے کرشن کمار کے نونہالوں کو دیکھ کر خوشی سے پھولے نہ سماتی تھی۔وہ صبح اپنی موٹر کار میں ماں، بیوی اور بچوں کو سیر و تفریح کیلئے باہر لے جایا کرتا اور واپسی پر کالج چلا جاتا۔دو بجے کے قریب کالج سے واپس آ کر مطالعہ کتب میں مصروف رہتا۔اس کو اپنی گزشتہ زندگی پیش نظر تھی۔وہ ہر وقت ایشور کی یاد میں مگن رہتا۔اس کی طبیعت عاجز اور سلیم تھی۔

لجاوتی اس آرام دہ زندگی کا باعث وہی دیپ مالا اور کرشن کی سچی پرارتھنا سمجھتی۔اس نے آج تک کرشن کمار کو یہ راز نہیں بتایا تھا۔اب ان کے کئی رشتہ دار پردہ غیب سے ظہور میں آئے۔مگر لجاوتی نے ان سے کبھی اپنی غربت میں مدد نہ کرنے کی شکایت نہیں کی۔اسے علم تھا، مصیبت اور غربت کے وقت قریبی رشتہ دار بھی مدد کرنے سے دریغ کرتے ہیں اور ایسا رویہ اختیار کر لیتے ہیں۔گویا وہ ان کے رشتہ دار ہی نہیں۔

آج دیپ مالا کی چھٹی تھی۔پروفیسر کرشن کمار دن بھر شام کی پوجا کیلئے سامگری منگوانے میں مصروف رہا۔اس کو اس دن کی اتنی برکت کا علم نہ تھا۔جونہی شام ہوگئی، ہر طرف دیپ جلائے گئے۔بنگلہ بجلی کے لیمپوں سے جگمگا اٹھا۔پروفیسر صاحب اپنے پروہت جی کے ساتھ پوجا والے کمرے میں داخل ہوئے۔اور اس کے ساتھ ہی لجاوتی اور اس کی بہو، بچے بھی داخل ہوئے۔پروہت جی زور زور سے پرارتھنا کرنے لگے۔اور پروفیسر بڑی بھکتی سے لکشمی جی کی نقرئی مورتی پر پشپ چڑھاتے رہے۔یکایک پیچھے سے رونے کی آواز سنائی دی۔کرشن کمار نے دیکھا تو اس کی ماں رو رہی تھی۔اور پھوٹ پھوٹ کر رو رہی تھی۔اس نے تعجب آمیز نگاہوں سے اپنی ماں کی طرف دیکھا اور سبب پوچھا کہ ایسے وقت جب سب لوگ خوشیاں منانے میں مصروف ہیں، تم کیوں رو رہی ہو۔ماں کی آنکھوں سے اور بھی ٹپ ٹپ آنسو گرنے لگے۔اس نے محبت بھری نگاہوں سے اپنے بیٹے کی طرف دیکھا اور کہا۔آہ میرے بیٹے۔یہ وہی دیپ مالا ہے۔جس نے مجھے ایک رات زار زار رلایا تھا اور وہی دیپ مالا جس نے تمہاری سچی پرارتھنا کے اثر سے آج یہ خوش نصیب دن دکھایا ہے۔

............☆☆☆............

PREM NATH PARDESI KE AFSANE

Edited & Compiled by

Dr. Mohd. Afzal Mir

ڈاکٹر محمد افضل میر مرکز کے زیر انتظام جموں و کشمیر کے ضلع بڈگام، تحصیل بیروہ کے ایک خوبصورت اور معروف گاؤں "آری پانتھن" میں 05 جنوری 1981ء میں زمیندار گھرانے میں پیدا ہوئے۔ انہوں نے بنیادی تعلیم پرائمری اسکول آری پانتھن اور مزید تعلیم ہائی اسکول آری پانتھن سے حاصل کی۔ اس کے بعد امر سنگھ کالج سرینگر سے 2004 میں بیچلر آف آرٹس کی ڈگری مکمل کی۔ ڈاکٹر محمد افضل میر نے طاہرہ خانمز کالج آف ایجوکیشن سے 2006 میں بی۔ایڈ مکمل کیا۔ کشمیر کے نامساعد حالات کے سبب کشمیر یونیورسٹی میں داخلہ ملنے کے باوجود انہوں نے مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی سے فاصلاتی تعلیم کے ذریعے ایم۔اے اردو سال 2009 میں مکمل کیا۔ اس دوران انھوں نے اندرا گاندھی نیشنل اوپن یونیورسٹی سے ماسٹرس اِن ٹورزم اینڈ ٹراول مینجمنٹ بھی امتیازی نمبروں کے ساتھ پاس کیا۔ مزید برآں ازدواجی رشتے میں بندھنے کے باوجود تعلیمی سلسلے کو منقطع نہیں ہونے دیا بلکہ مسلسل جستجو کے بعد 2010 میں شعبہ اردو، برکت اللہ یونیورسٹی میں انھیں داخلہ ملا۔ بالآخر 2014 میں پی ایچ ڈی کی ڈگری ڈاکٹر انیس سلطانہ کی نگرانی میں تفویض ہوئی۔ ڈاکٹر محمد افضل میر 2014ء ہی میں ہائیر ایجوکیشن ڈیپارٹمنٹ میں بحیثیت لیکچرر تعینات ہوئے۔ موصوف گذشتہ چھے برسوں سے ڈگری کالج بیروہ میں اپنے فرائض بہ حسن و خوبی سرانجام دے رہے ہیں۔ ڈاکٹر محمد افضل میر کی ایک تحقیقی کتاب "پریم ناتھ پردیسی عکس در عکس" 2017 میں شائع ہوئی ہے۔ جس کی ادبی حلقوں میں خاصی پذیرائی ہوئی۔ ان کے مضامین کشمیر اور بیرون ریاست کے مختلف رسائل و جرائد میں وقتاً فوقتاً شائع ہوتے رہے ہیں۔ ان کی ایک اور کتاب "کلیات پریم ناتھ پردیسی" بھی زیر طبع ہے جو بہت جلد قارئین کی نذر کی جائے گی۔ "پریم ناتھ پردیسی کے افسانے" پردیسی کے تعلق سے موصوف کی دوسری کتاب ہے۔ پریم ناتھ پردیسی جموں و کشمیر کے پہلے افسانہ نگار ہیں۔ اس لیے پیش نظر کتاب میں آپ کو ریاست کے اولین افسانہ نگار کے سبھی نایاب اور اہم افسانے پڑھنے کو مل جائیں گے۔ ہمیں امید ہے قارئین اس کوشش کو سراہیں گے اور مزید اپنے مفید مشوروں اور آراء سے نوازیں گے۔

GNK PUBLICATIONS

Head Office : Near Old Bus Stand, Kumar Mohalla
Charari Sharief, Budgam - 191112 J&K
Email : gnkpublications@gmail.com
Mob : 7053562468, 7006738304
Ph : 01951-295207

ISBN 978-93-84717-62-8

GNK URDU
GNK URDU
gnkpublications
GnkPublications